

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کسب نہیں کا۔ مجھ سے
سنسنی

ماہنامہ
پس

فروری 2017

نگار علی
معراج رسول

FEB-2017 PRICE RS. 500=

www.paksociety.com

Monthly Subscription

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سائنس اور انسان کی ترقی پر
ایک صاحب نظر کی گفتگو

07
انشائیہ

جون ایلینا

16

شما و سحر

الیاس سینا پوری

ماضی کا آمیت۔ باختیار اور بے اختیار
انسان کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

08

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپیشل کی مجلس مشاورت و دست رخی کی
شعریں بالمشاورت شکوے اور مسئلوں مشورے

67

ممنوع عادت

راحیل انجم

ایک بے بسی کی پیچیدہ کپڑوں کی
انجمن کا دلچسپ اور مختصر قصہ

61

باتنہ

طاہر جاوید مغل

چاندنی راتوں میں ایک غیر متوقع
انجام اور غیر متوقعی روایت

105

شکست

تنویر ریاض

میر میں نمایاں فرق ہونے کے
بوجود کیونکہ تیر کی شہزاد

70

شیش محل

اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوفہ طرز
بدلتی واردات قلبی کی دکھاس دلچسپ داستان

151

قتل کی لکیر

آصفہ طہا احمد

ایک مجرم کی بے بسی و بے
کسی کا عیب کا اظہار

116

نسلی امتیاز

ملک صفدر حیات

پولیس کی سرگرمیوں پر عمل ملک
صاحب کی ڈائری سے ایک اور واقعہ

جلد 47 شمارہ 02 فروری 2017ء در سالانہ 800 روپیہ قیمت فی جلد 60 روپیہ

خط کتابت کاپتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com



168

محفل شعروں کا

قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک نئے رنگ رنگ
آپ کی سحر آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

176

مارو کوئی

ایک چھوٹی روپ کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی
عنایتوں رفاعتوں اور رفاقتوں ایک دل بیا سلسلہ

171

فنکر بریٹ

سلیم انور

مجھواری سے چلتے چلتے اچانک مٹی کے
جہل میں پھنسے والے قانون شکن کا قصہ

225

حضرت مجبو سبجانی
غوث پاک

ضیاء نسیم بلگرامی

حضرت عبدالقادر جیلانی کی
زندگی کے ایمان افروز واقعات

213

نایاب سودا

نور عباس

لحاف سنی خیز
حالات پر مشتمل ایک دلچسپ تحریر

247

عکس

منظر امام

ایک بھولے بس سے چہرے میں
پناہیت کا پرتو دیکھنے والی وہ شیراز کا ماہر

239

دھوپ

علی اختر

رسم و رواج کے بھیا ننگ غبار
میں گرنے والوں کی دیدہ دلیری

**

کتر میں

راویہ

دنیا بھر سے اوسر اوسر سے لطیفے چٹکے
اقتباسات مسکراتے ہیں اور تپتے ہیں پتھر کے لیے

252

چھپر چھپاؤں

محمد زبیر سلیمانی

ازدواجی زندگی کی باریکیاں مجھاتی اور محبت کی انجھی
دشمن کو سلجھاتی ایک پتھر اور چرخہ داستان

پبلشر پرو پرائٹر: دستان رسول، مقام اشاعت: گرافک فلور-C-63 میز آ آیکس پریس، ڈیفنس، مین گورنمنٹی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، محلہ: ابن حسن چرائی، پتھر ہاکی اسٹیڈیم کراچی



بازیافت

ہم شام سے سائنس کی فیروز مند یوں کا اندازہ لگا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں، بات اس مصنوعی ستارے سے چلی تھی جو مریخ کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ ہم نے اس سچ میں سائنس کو کتنی ہی داد اور کتنی ہی دعائیں دیں۔ یوں بھی ہم لوگ سائنس کو بس دعائیں ہی دے سکتے ہیں یا پھر بددعائیں زیادہ دی جاتی ہیں۔

بڑی بات ہے، ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں سائنس کے دعا گو ہیں۔ پر ابھی چند لمحوں پہلے میرے دماغ میں جہالت بھڑک اٹھی ہے۔ وہ کھانسا ہوا نوجوان جو ابھی یہاں آیا تھا اور ہم عیاشوں اور بد معاشوں کی محفل کا مزہ کر کر کر کے چلا گیا ہے، اس کے حوالے سے ہم سائنس کی آسمان نشیں مرائیوں کو کس طرح دیکھیں گے۔ اس کے معاملوں اور مسئلوں سے فضا نورد سائنس کی بے سروکاری آخر ہمیں ذہن کی کس حالت سے دوچار کرتی ہے جس تو ذہن کی ایک دماغ سوز حالت سے دوچار ہوں اور ایسے کتنے ہی نوجوان اور ان کے مسئلے انسان اور اس کے مسئلے ہیں جن سے سائنس کے اس عہد کے انسان کو کب کا فارغ ہو جانا چاہیے تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ سائنس آخر کس لیے ہے اور کس کے لیے ہے۔ ایسا رکاز آخر یہ کونسا جذبہ ہے کہ انسان سائنس کو خود اپنے کام میں لانے سے جھجک رہا ہے۔ سائنس انسان کی معجز نمائی کا دوسرا نام ہے پر یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ یہ معجز نمائی خود انسان اور اس کے مسئلوں کے دائرے سے باہر ظہور میں آرہی ہے۔ جو انسان آج فضاؤں میں سر بلند پایاں حاصل کر رہا ہے، اسے اس زمین پر کتنا سر بلند اور سر فراز ہونا چاہیے تھا۔ زمین پر اس کی شکستیں اور غمناکیاں کم و بیش وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے تھیں۔ اس پر دیوانگی کے وہی دورے پڑتے ہیں جو قرونوں پہلے پڑا کرتے تھے۔ کیا علم اور آگہی کی اس روشنی میں انسان کو اتنا ہی سیاہ کار اور اتنا ہی تیرہ دروں ہونا چاہیے تھا جتنا وہ ہے۔ ارجمند سائنس کے اس بد بخت خداوند نے اپنے آپ کو ذرا بھی نہیں بدلا۔ سوچا جائے کہ فطرت کے اس کماؤ پوت نے کیا پایا اور کیا کمایا۔ میرے خیال میں یہاں ان ایجادوں کی فہرست پڑھ کر سنانا ہرگز مناسب نہ ہوگا جو معجز نمائیں سائنس کی دین ہیں۔ وہ حیران کن فہرست اپنی جگہ ہے اور انسانوں کا حرمان اور خسران اپنی جگہ بلکہ اس فہرست کے چشم نظر جب اس حرمان اور خسران کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو احساس زیاں کی عذاب ناک ہڈیاں پگھلا دیتی ہے۔ کیا انسان نے ایجادوں کی شکل میں جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ وہی کچھ ہے جس کی سائنس سے امید رکھی جاتی ہے؟ ہاں سائنس کے ذریعے افسانوں نے بہت کچھ کمایا ہے، انسانیت نے شاید کچھ بھی نہیں پایا ہے۔

سائنس کے کارنامے دل میں بڑی جولانی پیدا کرتے ہیں پر وہ جی بھی بہت جلاتے ہیں کہ ان کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی انسان اسی قدر بچ، پوچ اور لچر ہے جتنا کبھی پہلے تھا۔ سیاروں کے مداروں میں دنگ کر دینے والی مہارت دکھانے والی سائنس کا آفریدہ گارڈمین پر ایک مضحکہ اور ایک مذاق بنا ہوا ہے۔ انسانوں کے جو غول بھوک اور بیماری سے نڈھال ہیں، جو قبیلے سیاست کی بے حس شاہ اندازیوں کے پاتال ہیں، جو بے مقدور قومیں قہرمان قوتوں کی دہشت سے بے حال ہیں، ان کے لیے اس خبر میں بھلا کون سی خوش خبری ہے کہ آج خلائی سائنس کے فلاں طائفے نے فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کر تب دکھایا اور کل فلاں طائفہ فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کمال دکھائے گا۔

جون ایلیا! فلاں کی یہ نگرار کچھ جچی نہیں۔ نہ سچے میں کیا کروں؟ مگر میرے بھائی، بیان کا ایسا بولا دینے والا بھونڈا پن! یہاں میں بیان کے بھونڈے پن کو دیکھوں یا انسان کی اس ذہنیت کو جو اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ اتنی بھونڈی کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی سلسلہ خیال میں کمی یہ نتیجہ نکالے کہ جہالت کی خاکساری کا دوسرا نام علم ہے تو اس کی بات کو جھٹلاتا بہت مشکل ہوگا۔ ایک طرف سائنس کے معجزے ہیں اور دوسری طرف اس حیوانیت کے مقابل انسان کی شرمناک عاجزی۔ انسانوں کے باہمی رویوں پر آج بھی انسان کے حیوان ہی کا فرمان چلتا ہے۔ انسان اپنے حیوان کا ایک فرد دست ہے اور کچھ بھی نہیں۔

نیرا شوب تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ سے بری طرح شکست کھائی ہے یا پھر یوں کہہ لو کہ تاریخ کا سب سے زیادہ ناخوشگوار حادثہ خود انسان ہے۔ تم نے اپنے علم، اپنے تجربے، اپنے ہنر اور اپنی مہارت کو آسمانوں میں تو سیاروں کی تغیر کے لیے مامور کر رکھا ہے اور زمین پر انسانیت کی تخریب اور تباہ کاری کی ورزش میں لگ دیا ہے۔ کیا زمین پر یہی کام سائنس کے سپرد کیا جانا چاہیے تھا کہ وہ جنگ اور جنون کے حوصلے بڑھائے اور جب چاہے اور جہاں چاہے زندگی اور شائستگی کی بستیوں کو روند کر بے نشان کر ڈالے؟

سائنس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے گفتگو کی یہی تھی اور زہر ناک ہی ہم میں سے کسی کو بھی زیب نہیں دیتی، پر یارو! یہ غصہ سائنس پر نہیں ہے، اس سیاست پر ہے جو مقررہ کے ہاتھوں آگہی کو زہر دلوادے اور مسج کے ہاتھوں نیکی کو سولی پر چڑھا دے۔ اس سیاست نے عام طور پر زمین پر سائنس سے یہی کام لیا ہے اور ہے یوں کہ انسانی شعور کے بغیر سائنس انسانوں کو کوئی بھی مڑہ نہیں ستا سکے گی۔ سارا رونا انسان کے حیوانی رویوں کا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سائنس کے دور میں انسان کی فطرت تو بڑھی ہے پر دانش کم ہوئی ہے۔



عزیز قارئین!
السلام علیکم!

فروری 2017..... لیجئے جناب نئے سال کا دوسرا شمارہ بھی آپ کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے..... وقت کا کام ہے تیزی سے گزرتے رہتا مگر..... وقت کی رفتار کو ذرا دھیمی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی چال کو تھوڑا تیز اور چلن کا قبلہ درست کر لیا جائے تب کہیں جا کر یہ وقت کا جن کچھ قابو میں آ سکتا ہے، ورنہ ہر سال ہم یہی کہتے رہ جاتے ہیں کہ ”لیس جی یہ سال بھی یونہی گزر گیا اور پتا بھی نہیں چلا“ ظاہر ہے جب سارے مسائل اور حالات جوں کے توں رہیں گے تو تبدیلی کا احساس کیوں کر ہوگا۔ ارے ہاں تبدیلی سے یاد آ یا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے جیسے کہ اس سال بجلی کے نرخوں میں بالخصوص کراچی والوں کے لیے مزید اضافہ کر کے اپنا بیت کا بھرپور احساس دلایا گیا ہے۔ ہمیں آج تک یہ فارمولہ سمجھ نہیں آیا کہ نہ صرف ہمارا ملک زرخیز ہے بلکہ ذہانت کی زرخیزی بھی بہت زیادہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے بھی ہیں۔ پھر ہم کیوں اتنا پریشان رہتے ہیں جبکہ ماشاء اللہ ہمارے سیاسی قائدین کے پاس بھی ذہانت کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اقتدار سے باہر رہ کر نعرے لگاتے ہیں کہ ہم اقتدار میں آ کر تباہ حال ادارے بحال کر دیں گے، روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں گے، محنت کشوں کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے والوں کا احتساب کیا جائے گا مگر..... اقتدار میں آنے کے بعد کیسا احتساب، کیسا خواب..... ان کے سارے حساب کتاب کے گوشوارے کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اب تک ”ایک چپ سو کو ہرائے“ کے فارمولے پر عمل کر کے حکومتی گاڑی کو بڑھایا جاتا رہا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے ہماری گفتگو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، یہ ٹھیک ہے کہ تعلیمی معیار اور سرگرمیوں کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں حائل ہیں مگر حکومت کی ایک کاوش کی داد تو دینا پڑے گی۔ نوجوانوں کو ہنرمندی کی تربیت کے لیے ووکیشنل ادارے قائم کر کے ایک مثبت قدم تو اٹھایا ہے۔ مگر ابھی ان اداروں کا معیار کافی پست ہے۔ جب تک نوجوان طبقے پر ان کے نمایاں مثبت نتائج مثبت ہوتے نظر نہیں آئیں گے، اس وقت تک ان کی افادیت سے مطمئن بھی نہیں ہوا جاسکتا۔ ظاہر ہے یہاں بھی اخراجات کو بڑی وجہ بنا کر پیش کیا جائے گا تو جناب یہ بڑے بڑے وزراء اور ریسروں کو اربوں روپے کے قرضے دے کر پھر انہیں محاف کرنے کا ڈراما کرنے سے بہتر ہے کہ یہی رقوم نوجوانوں کے بہتر مستقبل، ان کی فلاح اور ترقی کے حوالے سے روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر خرچ کر دی جائیں تو وہ دن دور نہیں جب یہی پاکستان معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو گا مگر..... افسوس اہم باتوں پر توجہ دینا تو شاید ہم بھول ہی چکے ہیں۔ یاد رہا تو فقط غیروں کی تقلید کر کے خوشی محسوس کرنا جیسے کہ ”پپی نیو ایئر“ کوئی تہوار ہو یا ایجاد، کوئی خاص تاریخ ہو یا دن..... انہیں یاد رکھنے اور منانے کا اہتمام کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ معاشرے کے لیے کسی طور نقصان کا سبب نہ بنیں۔ دنیا بھر میں نئے سال کا جشن منایا جاتا ہے مگر پاکستان میں جانے کیوں یہ لمحہ بہت سے دلوں پر قیامت ڈھا جاتا ہے۔ بھلا خوشی مناتے ہوئے انسانی جانوں سے کون کھیلتا ہے۔ فائرنگ کے شور میں، موٹر سائیکل سواروں کا سیلابی ریل جس طرح طوفان بدتمیزی مچاتا، دندنا تا ہوا گزرتا ہے۔ کیا کوئی قانون، کوئی حد بندی، کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ویلنٹائن ڈے، ماہ فروری کا خاص تحفہ..... اور نئی نسل اس تحفے سے ہر سال خوب خوب محفوظ ہوتی ہے۔ اللہ جانے یہ اونٹ کس کل بیٹھے!! بات وہی آ جاتی ہے کہ ہم چیزوں کا استعمال چاہے مثبت کر لیں چاہے منفی اور پھر ویسے ہی نتائج بھگتنے کے لیے ہمیں تیار بھی رہنا پڑے گا۔ تیار تو ہم اپنی پیاری سی محفل میں جانے کے لیے ہیں جہاں بہت سارے دوست ہمارے منتظر ہیں۔

فضا شاہ، لاہور سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ”ناٹل گرل شادی کے سیزن کی مناسبت سے تیار شیار نظر آئی۔ مہندی کا ڈیزائن اگرچہ سادہ سا ہے تاہم اچھا لگا۔ کانوں میں ٹاپس پرانے اسٹائل کا تھا جسے شاید وہ اتارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ انشائیہ ایلیمینٹری کے مخصوص انداز میں نئے سال کے حوالے سے تھا۔ ایک فقرہ جس نے دل کو چھو لیا۔ ”اور وہ حقیقت کیا ہے؟ جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے۔ اور وہ سب سے بڑی حقیقت گزرتا، گزرتے رہتا اور گزر جاتا ہے۔“

ہے۔“ ادارہ میں آپ نے کیڈٹ کالج میں استاد کے جارجانہ روئے کا ذکر کیا۔ اس کا ایک اور پہلو جو زیادہ خطرناک ہے کہ ڈی سی اوصاحب نے میڈیا پر آکر بیان دیا کہ ”تشدد کا کوئی واقعہ نہیں ہوا“، بعد میں تحقیق سے تشدد ثابت ہوا تو ان کا پورٹن تھا کہ میرے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ آپ کی ملک و ملت کے لیے کی گئی دعاؤں پر دل سے آمین نکلتی ہے۔ رانا بشیر احمد ونگ پوائنٹ پر موجود تھے۔ رانا صاحب! سسٹمز کی یہی تو خوبی ہے کہ ہر عمر اور طبقے کے افراد کے لیے اس میں دلچسپی کا سامان موجود ہے بھی والد بزرگوار خود منگوا رہے ہیں وگرنہ اکثر گھروں میں بچوں، خاص طور پر لڑکیوں کو پڑھنے سے روکا جاتا ہے کہ در سالے نہ پڑھیں، چاہے وہ کیبل اور انٹرنیٹ پر جو بھی دیکھتے پڑھتے رہیں۔ شیش محل کی سابقہ قسط اگر آپ میں سے کسی نے نہیں پڑھی تو رانا صاحب کے تجربے میں خلاصہ پڑھ سکتے ہیں۔ حکیم رضا شاہ سیکنڈ پوزیشن پر براجمان تھے اور جولیٹ اور فاروق دادا کے ملن کے لیے سفارش کرتے پھرتے تھے۔ مرد، عورت کی چچائش کو اچھے ہیرائے میں بیان کیا حکیم صاحب نے۔ رمضان پاشا، زرین قمر سے شکست فاطمہ کو حقیقی واقعے سے کہانی کے قالب میں ڈھالنے پر ناراض نظر آ رہے تھے، بریکٹ میں ادارے کا جواب شایدان کی لکھی کردائے۔ صفدر معاویہ بھائی! اسلامی فلاحی ریاست کے فرائض میں وہ سب شامل ہے جو آپ نے لکھا لیکن کیا کریں جو اسمبلیوں میں جاتے ہیں، ہم ہی انہیں بھیجتے ہیں۔ بس اپنے پیٹ کے لیے عوام کو ڈرامے دکھا کر خوش کیا جاتا رہا ہے۔ شمارے کے اختتامی صفحات پر کاشف زبیر کی آخری تحریر آخری لمحہ دیکھی تو سب سے پہلے پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مرحوم کی اس سے پہلے بھی زندگی کے آخری لمحات پر مشتمل تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ گل پور کے ارد گرد کے خوب صورت منظر کو جامعیت سے بیان کیا گیا۔ ظہیر اور سلمیٰ کے مثبت کرداروں کے ساتھ ساتھ رفیق اور نورین کے منفی اثر رکھنے والے کردار حقیقی زندگی کے عکاس نظر آئے۔ یونیورسٹی کے ماحول کو فصاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ عالیہ کی جرأت مندی مومنہ اور دیا کی عزت و جان کے بچانے کا سامان بن گئی۔ عالیہ کی قبر کا سیلاب میں صبح و سالم رہنا اللہ کی خوشنودی کا استعارہ تھا۔ شیش محل کی حالیہ قسط نہایت شاندار رہی اور تیزی کا تاثر اجاگر ہوا۔ بھلا کی موت کے ساتھ ساتھ وکرم کی لاش کا منظر عام پر آنار بن دادا کی مشکلات میں اضافہ کرتا نظر آیا۔ فاروق کی لندن روانگی اور نواب اسد اللہ کی تلاش ایک ساتھ عمل پزیر ہوئی۔ ماروی میں بھی اس بار تقریر کی لہریں کروٹیں لیتی نظر آئیں۔ عابد علی منگی کو انتہائی عیاری سے ہلاک کروایا گیا۔ شام جمیل کی میں کیا کروں، میں جارج کے قول پر وف منصوبے کے باوجود بھی جارج بیوی کے قتل میں پھنس کر رہ گیا۔ منگھری کا منصوبہ جو اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے بنایا اس سے سو فیصد مماثلت نے جارج کو پھنسا دیا۔ ڈونگ ڈیا تک فونگ میں رائٹر نے جنگ لڑنے والے فوجی کی اندر کی جنگ کو بیان کیا ہے۔ جنگ کے دوران کیے گئے مظالم نے اس کی زندگی کو اس کے لیے ایک مستقل جنگ کے میدان میں بدل ڈالا ہے اور ضمیر کی عدالت اسے رہا کرنے پر تیار نہیں، سبق آموز تحریر تھی۔ شمر عباس کی خوش خیالی ڈیرن لیسنر کو لے ڈوبی۔ اپنی طرف سے اس نے مکمل احتیاط کی لیکن اس کے جوتے اسے پھنسا گئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ زمان اور شازبیہ کی محبت کی دلخراش داستان تھی۔ بزرگوں کی چچائش نے دوبار کرنے والوں کو ایک دوسرے سے محروم کر دیا۔ یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے جانے والے شاہ زمان کو کیا معلوم تھا کہ اس کی محبت اس کی شازی پہلے سے وہاں قبر میں مٹی اوڑھے پڑی ہوگی۔ انتہائی اداس کر دینے والی داستان محبت تھی۔ میری بات تو سنو میں گزشتہ چند ماہ پہلے بچوں کے اغوا اور ان سے میڈیا میں پھیلائی گئی سنسنی کو مغل صاحب نے موضوع بنایا۔ اچھے رائٹر کی یہی پہچان ہے کہ وہ حالات حاضرہ کے موضوعات کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ آپا بیگم نے جو تصور اپنے ذہن میں بنایا ہوا تھا، اس کے مطابق ہی ری ایکٹ کیا جو ان کا بچپن تاوا بن گیا۔ مغل صاحب کا قلم درد کا تانظر آیا۔ ماضی کی داستان آخری معرکہ بھی دلچسپ انداز میں تاریخ سے آگاہ کرتی ہوئی پائی گئی۔ شعرو سخن میں ظفر اقبال ظفر اور صفیر آفاق کے مختصر اشعار زبردست رہے۔ لطائف میں قابل غور کے نام سے شائع شدہ کترین نے بہت مزہ دیا۔“ (آپ کا تجربہ کافی دلچسپ رہا)

✽ اور لیس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں ”سرورق ذوق کی تسکین کا باعث بنا۔ سرورق کے بعد انشائیے سے مستفید ہوئے۔ ادارے کے بعد خطوط کی دنیا میں داخل ہوئے اور رانا بشیر احمد ایاز سرفہرست نظر آئے، مبارکباد۔ سب ہی دوستوں کی حاضری بھر پور تھی۔ پھر حسب معمول الیاس سیٹا پوری کی آخری معرکہ پڑھی جس میں بھرپور انداز میں تاریخ سے متعارف کراتے ہیں الیاس سیٹا پوری کہ مزہ آجاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو طاہر جاوید مغل کے انداز تحریر میں کھو گئے۔ میری بات تو سنو نے بڑا مزہ دیا پھر سکون قلب کا بھی الگ ہی رنگ تھا۔ اس کے بعد اسما قادری کی شیش محل پڑھی جس کے بے چینی سے فتنہ رہتے ہیں۔ کہانی دن بدن دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتی جا رہی ہے۔ قسط ختم ہوتی ہے تو لکھی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تنویر ریاض کی پلاٹ بھی اچھا تاثر دینے والی کہانی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ ایک منفرد انداز کی کہانی بھی بہت پسند آئی جو جیتے ہوئے ماضی کا الیہ سنار ہی تھی۔ ماضی میں پوشیدہ یادوں کا خزانہ ہوتا ہے۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک ہل، گزرے وقتوں کا ہر رنگ نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو انسان اس میں کھوجاتا ہے جیسے وقت پھر ماسا جاتا ہے۔ محفل شعرو سخن میں اشعاروں کی چاشنی نے

بھی بہت محفوظ کیا۔ میں کیا کروں بھی اچھی لگی۔ خوش خیالی میں ایک چور نے کافی دیدہ و لیری دکھائی اور جیکٹ چرائی مگر تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ گارڈ کے سامنے اس کی ویلیں غیر موثر رہیں اور اس نے ثابت کر دیا کہ اس نے چوری کی ہے۔ اس کے بعد ضیا نسیم بلگرامی نے حضرت عبدالقادر جیلانی غوث پاک غوث الاعظم جیلانی کی حیات طیبہ کی روشنی سے دل کو منور کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ ڈونگ ڈیانگ فونگ بھی دلچسپی سے پڑھی مگنی۔ آخری کہانی کاشف زیر کی آخری لکھی تھی۔ ان کی تحریر تعریف کی محتاج نہیں ہوتی۔ بڑے اچھے انداز میں متاثر کرنے والی کہانی تھی۔ اقوال زیریں معلومات وغیرہ پر مبنی کترنیں بھی ڈائجسٹ کی جان تھیں (بہت اچھا لگتا ہے جب آپ کسی کہانی یا سلسلے پر دلچسپ جملہ لکھتے ہیں)

طاہرہ گلزار پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں "تمام دوستوں، رائٹرز صاحبان اور ادارے والوں کو نیا سال مبارک۔ میری دعا ہے کہ یہ سال میرے تمام دوستوں، گھر والوں، تمام مسلمانوں اور خاص کر کشمیر، فلسطین اور عراق کے مسلمانوں کے لیے مبارک اور خوشیوں بھرا سال ہو اور پاکستان کے لیے بھی یہ سال پُر امن، خوشیوں اور کامیابیوں والا ہو۔ آمین۔ 2016ء کا سال گزر گیا جس میں ہمارے پیارے رائٹرز نواب انکل، کاشف زیر اور مختار آزاد ہم سے جدا ہو گئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے اور JDP کا ادارہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر کے تاقیامت ادب کے آسمان پر جگمگا تار ہے۔ آمین۔ جب جاسوسی کے اندر سائنس کا اشتہار دیکھا اس میں بڑے عرصے بعد ایک ساتھ پھر تین لیجنڈ مغل اعظم، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور میرے پیارے بھائی کاشف زیر ایک ساتھ جلوہ گر ہوئے، بہت اچھا لگا۔ آج حسب عادت سہنس 19 دسمبر شام 5 بجے ملا۔ خط شائع نہ ہونا اور حد تو یہ کہ کالی کلونی ماسی مصیبتی نوکری نے بھی میرا خط قبول نہیں کیا، کیوں۔ (ہا ہا ہا۔) اف اتنا غصہ۔ ارے بھی ڈاک کا نظام ہے۔۔۔۔۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے) سرورق یہ تو انکل ڈاکر ایک یرقان زدہ سی حینہ کو لائے ہیں جو اپنے مہندی بھرے ہاتھ دکھا کے کہہ رہی تھی کہ یہ ٹاپس میرا ہے کہیں آپ بھیس خان عرف بیلو کا نہ سمجھ لیں۔ میرے کچھ نا دیدہ بھائی اس حینہ کو بھی حسب عادت گھور رہے ہوں گے اور ٹھنڈی آہیں لیتے ہوں گے یہ اور بات کہ اس بار سردی نام کو ہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ خیر کی بارش ہو جائے تاکہ یہ بیمار یاں ختم ہو جائیں، آمین۔ اس بار جون ایلیا انشائیہ میں نیا سال لے آئے۔ واقعی ان کا ایک ایک لفظ ان کی دعا ہم سب کے گزرے اور آنے والے زمانے کی تشریح کر رہا تھا۔ اتنے بڑے اور مشکل حالات میں بھی ہم اچھی امید کا دامن تمام کے چل رہے ہیں کہ کبھی تو ہمارے ساتھ بھی اچھا ہوگا۔ انکل نے ایک بار پھر نیا سال، تعلیم کے حوالے سے اپنے دل سوز الفاظ ہمارے ساتھ شیئرز کیے ہیں۔ یہی تو ہمارا الیہ ہے کہ ان 20 سالوں میں تعلیمی نظام پست ہو گیا ہے ہر جگہ سے اساتذہ کے مظالم سامنے آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب رشوت کے زور پر کم پڑھے لکھے اساتذہ آئیں گے تو اس معاشرے کا یہی انجام ہوگا ہم خود ہی تو اس ملک کے معماروں کو کمزور اور ذہنی مریض بنارہے ہیں۔ اپنی تاریخ، اسلامیات اور اردو کو کمزور کر کے غیروں کی تعلیم کو آگے ہی آگے لارہے ہیں۔ آج کے بچے سے اگر آپ پوچھیں کہ قائد اعظم اور علامہ اقبال کون ہیں تو مشکل سے ہی جواب دیں گے لیکن گوشتے، شکیپیران کو فریاد ہوں گے۔ ہم مسلمانوں اور خاص کر پاکستانیوں کے لیے شرم کا مقام ہے۔ انکل اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ آمین۔ چلتی ہوں دوستوں کی محفل خطوط کی طرف۔ پہلے نمبر پر رانا بشیر احمد ایاز بہت شاعر اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ مبارک مبارک!۔۔۔۔۔ دوسرے نمبر پر ہمارے سرگزشت کے بہت محترم تبصرہ نگار حکیم سید محمد رضا شاہ آخر ہمارے بار بار کہنے کا بھرم رکھ کے اس بار حاضر۔ ویکم رضا جی! اب غائب مت ہو جانا۔ حکیم صاحب اپنی عادت کے مطابق معاشرے پر گہرا طنز فرما گئے۔ کورنگی والے بھائی محمد خواجہ اپنا بھرپور جامع اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر۔ ایک ایک لفظ ان کی پسندیدگی کی سند، سہنس کی کہانیوں کے لیے ویلڈن۔ شہباز بھائی ہمارے اس معاشرے میں تقنی نگینہ اور شہینہ ہیں اور صنفدر جیسے بے غیرت شوہروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ کوئی بھی ان کو ٹھیک کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ بابر عباس وہ بوڑھی حینہ نہیں آپ کی ہم عمر حینہ تھی جو آپ کو یاد کر رہی تھی، آپ کی نظر کمزور ہے۔ ایک بار پھر ادارے کو ان کا کیا ہوا وعدہ یاد دلا دوں کہ نئے سال کا سہنس بھی آگیا لیکن آپ نے پیغمبروں والا سلسلہ ابھی تک شروع نہیں کیا۔ پلیز توجہ دیں۔ (ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے۔ بس کچھ دن اور صبر کریں) شیش محل، بملہ کی انتہا پسند طبیعت کی وجہ سے ایسا ہی ہونا تھا۔ فاروق وہاں سے خیریت سے نکل گیا۔ اختر ایک بار پھر اپنی کینگی کے ساتھ حاضر۔ واقعی کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ ربن آخر دادا ہے، کس صفائی سے فاروق کو لندن بھیج دیا۔ عالیہ نے اختر کے ساتھ جو کیا بہت اچھا کیا، مرگیا، خس کم جہاں پاک۔ آخر جولیت نے فاروق کو محب اللہ کے نام سے پہچان لیا لیکن اب کہانی نے الگ روپ میں بڑھتا ہے۔ ویلڈن اسماعیلی۔۔۔۔۔ ماروی بہت تیزی سے دیوتا ثانی بن رہی ہے۔ مختصر کہانی خوش خیالی شمر عباس کی تحریر کچھ خاص نہیں لگی۔۔۔۔۔ ضیا نسیم بلگرامی نے اس بار تو دل خوش کر دیا غوث پاک لکھ کر۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ڈونگ ڈیانگ فونگ امریکی فوجیوں کی بربریت اور بعد کے ذہنی ڈپریشن پر مبنی ایک اچھی تحریر۔ اللہ تعالیٰ کاشف زیر بھائی کو جنت کی خوب صورت ترین جگہ میں رکھے۔



آخری تحریر کیا شاندار تحریر، ایک ایک لفظ پہ آنسو گریں۔ اس معاشرے کا کیسا رنگ ہمیں دکھا کے گئے ہیں۔ انہوں نے عالیہ کے روپ میں ایک ایسا کردار اور واقعہ ہمارے لیے لکھ چھوڑا ہے کہ ہر سمجھ دار بندہ جو دنیا کو صرف دنیا کے طور پر لے وہ اس کہانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور کون اس کے قریب ہے۔ وہی جانتا ہے کہ وہ زوہیب، دیا یار مین نہیں بلکہ عالیہ ہے جو مضبوط کردار کی مالک تھی۔ کاش ادارے والے ایک احسان اور کر دیتے کہ کہانی کے ساتھ کاشف زبیر کی تصویر بھی شائع کر دیتے۔ طاہر جاوید مغل کی سسپنس کے لیے ایک انوکھی تحریر میری بات تو سنو، ہمارا معاشرہ ہے ہی ایسا دوسروں کی نہیں سنتے، بس کر گزرتے ہیں۔ جیسے بغیر سوچے سمجھے بابا سرمد کے ساتھ کیا، ویلڈن مغل اعظم..... ایک اور تحریر اپنے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی۔ اپ ڈیٹ سچی محبت پر لکھی ہوئی ایک زبردست تحریر جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ زمان اور شازی کی ناکام محبت۔ شوہر حضرات تو ہمیشہ اپنے 80 فیصد کارنامے بیوی سے چھپاتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر بھٹی کہیں یہ کہانی آپ کی اپنی تو نہیں؟ کچھ تھوڑے رد و بدل کے ساتھ۔ آخر آپ اتنے بڑے رائٹر ہیں، بابا بابا..... اس بار نظر فریب میں امجد بیگ صاحب نے نادرہ کا کیس تحریر کر کے بہت دھمکی کر دیا اور مردوں سے نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ آخر ہلا کو خان کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ الیاس سیتا پوری کی تحریر سے یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی ہلا کو خان نے ہمارے سامنے موت کو گلے لگایا..... سلیم انور کی مغربی تحریر سکون قلب اچھی تحریر، اچھا طریقہ سکھایا جان چھڑانے کا..... جتنے اقوال زبیر اور مراسلے تھے، بہت اچھے اور معیاری تھے۔ اس بار کا سسپنس تو واقعی سنبھال کے رکھنے کے قابل ہے۔ ایک معیاری ہونے کی وجہ سے اور دوسرا کاشف زبیر کی آخری تحریر کی وجہ سے۔ آخر میں تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے ایک بار پھر التجا، واپس آ جاؤ۔ جب پرندے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ شاخ گل تو اب بھی موجود ہے تو واپس اپنے ٹھکانے پہ آ جاتے ہیں آپ بھی واپس آ جائیں۔ ہم J.D.P. والے بھی ایک ہی خاندان ہیں۔ کوئی ایک بھی کم ہو تو دکھ ہوتا ہے۔ (بہت شکریہ اتنا طویل اور بامعنی تبصرہ لکھنے کا۔ بہت اچھی لکیں آپ کی باتیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون کون آپ کی پکار پہ لبیک کہتا ہے)

صادق معاویہ، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اکتوبر 16ء میں خود متعدد بیماریوں سے نبرد آزما رہا اور نومبر 16ء میں والد گرامی دل کا روگ لیے ہاسپٹل ایڈمٹ ہو گئے۔ دسمبر 16ء کا شمارہ ہاسپٹل میں ملا۔ کرسی صدارت پر پیارے بھائی صفدر معاویہ کو جلوہ قلن پایا۔ دلی خوشی ہوئی۔ اگلے ہی لمحے دل دکھ سے بھر گیا کہ آنجناب کے والد گرامی عالم بقا کو سدھار گئے۔ صفدر معاویہ بھائی یہ ایک اہل حقیقت کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے قبر کے پیٹ میں اترنا ضرور ہے۔ 8 دسمبر 16ء میرے والد گرامی بھی اس دکھ بھری دنیا میں ہمیں اکیلا چھوڑ کر وار بقا کو سدھار گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ (اللہ تعالیٰ آپ کے والد گرامی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل دے) اب جنوری 17ء کا سسپنس زیب نگاہ ہے۔ اپنے ہی ضلع کے محترم رانا بشیر احمد ایاز پوری جج دھج کے ساتھ کرسی صدارت پر متمکن تھے۔ مبارک اسائیں۔ پورے سسپنس کا احاطہ کیے مکمل اور جامع تبصرہ لائق محسن ہے۔ حکیم محمد رضا، رمضان پاشا، عبدالجبار رومی انصاری، محمد خواجہ، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے جاندار اور دلکش تھے۔ مرزا گل جیسی بہن تو باعث فخر ہے۔ بابر عباس، مایین بابر کا جدا گانہ انداز دل کو بھار گیا۔ صرف میری بات تو سنو، شیش محل اور پیارے کاشف زبیر کی آخری لمحہ پڑھ سکا ہوں۔ مغل اعظم! میری بات تو سنو، ہمارے رویوں کی عکاس، دلچسپ اور پراثر تحریر تھی۔ کیا کہنے مغل اعظم کے۔ جناب! آخری صفحات پر بھی جلوہ نمائی فرمائے۔ شیش محل کی یہ قسط انتہائی تیز رفتار تھی۔ اسما قادری جی ذرا دھیرج لگتا ہے اب شیش محل کی بساط لپٹنے والی ہے۔ پیارے کاشف زبیر کی آخری لمحہ برستی آنکھوں کے ساتھ پڑھی۔ نہایت جاندار، پر مغز، واقعتاً یادگار، پڑھ کر لطف آ گیا اور دیر تک کاشف زبیر کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا۔"

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس بار سسپنس کا گیٹ اپ اچھا نہیں لگا۔ نئے سال کے پہلے ماہ کے شایان شان نہیں تھا، شاید پچھلے دنوں جوالم ناک سانچہ رونما ہوا اس کے پیش نظر ڈاکر صاحب نے سرورق کو سنوارنے سجانے سے گریز کیا ہو۔ البتہ انشائیہ نئے سال کے موافق تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے رانا بشیر احمد ایاز بھائی کو مبارکباد، بھائی صاحب کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ محمد خواجہ صاحب آپ کا شکریہ کہ میرے شعر کو خاص اشعار میں شمار کیا۔ نیازی صاحب تبصرہ جارحانہ؟ میرا تبصرہ جارحانہ ہوا تو سیدھا ردی کی نوکری میں جا کر رہے گا۔ کیوں مجھے محفل سے نکلوانے کی بات کرتے ہو۔ میری بات تو سنو، مغل صاحب کی چھوٹی کہانی اچھی لگی۔ اس میں کمزور انسان کی مظلومت کا ذکر تو ہے مگر انوکھا کاروں کی سفاکی کا احوال بیان نہیں ہوا۔ کہانی سکون قلب بھی دلچسپ اور ٹھیک تھا کہ بھی۔ یادداشت کے بینک سے الفاظ نکال نکال کر جملے بناتا ہوں۔ شیش محل اور ماروی پر تبصرہ کرنے کے لیے اب مذکورہ بینک میں کچھ نہیں بچا، اب کیا کروں؟ پلاٹ میں وہ لطف نہیں آیا جو اس قسم کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ نظر فریب، بیگ صاحب کو کیا ہی خوب کیس ملا، عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا لیکن اختتام دردناک تھا۔ بھٹی صاحب کی کہانی اپ ڈیٹ نے بھی دل پر کافی اثر چھوڑا۔ خوش خیالی شرم عباس نے ہمیشہ ہمیں اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں لیکن اس بار انہوں نے مایوس کیا۔ مقدس اور متبرک مضمون غوث پاک پر تبصرہ اس کے اختتام پر کروں گا۔ ڈونگ، ڈیا گنگ، ٹونگ، شہ شاہ صاحب ایک بار پھر

عجیب اور منفرد عنوان کے ساتھ تشریف لائے۔ کہانی سچائی سے بھرپور تھی۔ میرے پسندیدہ اور محبوب قلم کار کاشف زبیر کی آخری کہانی کو آنکھوں سے لگایا اور سننے سے لگا کر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی، پھر پڑھنا شروع کیا۔ مرحوم جاتے جاتے بھی ایسی کہانی چھوڑ گئے کہ مدتوں یاد رہے گی، ویسے بھی یہ کہانی وی اسٹوری آف دی منٹ ہے۔“ (بے شک..... پسندیدگی کا شکریہ)

عبدالجبار رومی انصاری، چوتھ لاهور سے محفل کی زینت بنے ہیں ”دو شیزہ کا کیا خوب صورت انداز ہے نئے سال کی آمد پر اور نئے سال کے آنے پر اس کے استقبال کے لیے پہلے سے تیاری شروع ہو جاتی ہے اور دسمبر کی آخری رات تک جاری رہتی ہے اور نئے سال کے آنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے اور اس ایک لمحے کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ آسمان گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھتا ہے اور آتش بازیاں اپنا سماں باندھ دیتی ہیں اور زمین پر جو گل کھلائے جاتے ہیں وہ الگ ہیں۔ لوگ کتنے پیسے خرچ کر ڈالتے ہیں اس ایک لمحے کے لیے۔ کاش یہی پیسے وہ اس خوشی میں کسی فلاح و بہبود کے کام لے آئیں تو کتنا اچھا ہو اور خدا کی راہ میں نیکی بھی ہو۔ لیکن اس کے لیے تو لمحہ آگیا چاہے نا۔ آخری لمحہ میں عالیہ بہت اچھی لڑکی تھی جسے اس کا باپ اور وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے پھر باپ حادثے کا شکار ہو گیا مگر عالیہ کو جو آگیا بچپن میں ملی تھی، وہ مختلف انداز سے آخر تک اس کے ساتھ رہی اور صنف نازک ہو کر کسی پل بھی اس کے قدم نہ ڈگمگائے۔ وہ پُر اعتماد اور مضبوط ارادوں کی مالک تھی اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیا اور جان تک دے دی لیکن جنہیں آگیا نہیں تھی، انہوں نے عالیہ کو اپنے قبرستان میں دفنانے سے انکار کیا تو جنگل سے ڈرنے والی عالیہ کو جنگل ہی نے پناہ دی اور اس کی قبر کو گزار کر دیا۔ کاشف زبیر صاحب کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں رکھے۔ ان کی آخری کہانی بے حد عمدہ رہی۔ وہ ایک خوب صورت انداز کے خوب صورت رائٹر تھے ہمیشہ یاد آئیں گے۔ میری بات تو سنو، کون سنا ان کی بات کیونکہ مارنے والے لوگوں کو آگیا جو نہیں تھی سوا ایک بے گناہ اور فحشی فاطمہ کو تلاش کرنے والے بزرگ کی جان لے لی گئی۔ اپ ڈیٹ نے اینڈ پے آ کے دل کو بھی میں جکڑ لیا۔ شازی نے اپنی محبت کی لاج رکھی اور بچپن کی نشانی اسی برگد کے نیچے اپنی قبر بھی بنوائی۔ زمان اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے آیا تو اسے شہر بجا کے ویکم بھی کیا کہ آپ کی محبت بھی یہیں موجود ہے۔ نظر قریب میں کامران کو اپنے کپے کی سزا مل گئی۔ نادرہ نے بھی اپنی محبت سے کامران پر اعتماد کیا جس سے خود ہی پر باد ہو گئی۔ ایسی صورت میں اس نے کیا جینا تھا، سو جیل میں ہی مر گئی بیچاری۔ باقی عدنان کے لیے بیگ صاحب نے خوب بندوبست کیا۔ آخری معرکے نے ہلا کو خان کی ماں کی تدفین پر خوب ہنسیا۔ پادری نصیر الدین طوی کو مروانا چاہتے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مسلمان علم و فضل سے ان سے بڑھ کر ہے، سو ہلاکت انہی کے گلے پڑ گئی۔ ایک عام سے آدمی تردی نے بادشاہوں کے دل میں خوب جگہ بنائی۔ اس کے کردار نے بہت محفوظ کیا۔ ہلا کو خان بر قاتی کو زہر دینا چاہتا تھا لیکن اس کو ہی زہر مل گیا۔ ایسا سیتا پوری کی تاریخی کہانیوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔ فاروق بھی محب اللہ کی صورت شہزادہ نکلا جو لندن جا رہا ہے اور اسد اللہ کو نہیں مل سکے گا۔ دین کا فاروق کو نہ چاہتے ہوئے بھی جتنا ایسا لگ رہا ہے جیسے فاروق کو نہیں خود رہن کے ساتھ کچھ انہوٹی ہوئی دالی ہے اور پھر اس کی آنے والی قسطیں دل تمام کے پڑھنا ہوں گی۔ شیش محل نے عجیب سا جیس قائم کر لیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، ان کو کون نہیں جانتا، جو مہمان بننے کے لیے انتہائی غریب گھرانے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ اپنے عہد کے عظیم ولی تھے جن کے وعظ پر ہزاروں لوگ بعد شوق اٹھ آتے تھے۔ خطوط کی محفل میں بھی قارئین نے خوب رنگ جمایا جن میں رانا بشیر احمد ایاز، حکیم سید محمد رضا شاہ، رمضان پاشا، محمد خواجہ، بابر عباس، مامین بابر اور رضوانہ قریشی نے بھرپور اور عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ شعرو سخن میں طلحہ کمال، شاعظیم اور نگہت علی چھا گئیں۔“

محمد شہباز ناز، گجر کالونی، سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ناٹل گرل دیکھنے میں جتنی خوب صورت ہے، خاص کر اس کی ہاتھوں کی مہندی، باریک ناک اس کے حسن میں اضافہ کر رہی ہے۔ اللہ کرے نیا سال بھی ہمارے لیے اتنا ہی خوب صورت ثابت ہو۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا، ہمیشہ کی طرح دانش مندانہ باتیں کی۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی کہانی نظر قریب پڑھی، جس میں نادرہ کا شوہر دھوکے باز نکلا۔ اس کا سارا مال، کوٹھی، پیسہ سب کوچ ڈالا اور فرار ہو گیا جس کی وجہ سے نادرہ کا ذہنی توازن خراب ہو گیا غصے میں اپنے شوہر کو مار ڈالا۔ بیگ صاحب نے بڑی مہارت سے اس کو پھانسی لگنے سے بچالیا۔ اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد عبدالرب بھٹی کی کہانی اپ نوڈیٹ پڑھی جس میں بھٹی صاحب نے اپنی لوائسٹوری کے بارے میں بتایا۔ یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے جس کو لگ جائے وہ مرتے دم تک یاد کرتا ہے۔ عمدہ تحریر تھی۔ اسما قادری صاحبہ کی کہانی شیش محل پڑھی۔ بہت ہی دلچسپ تھی! خاص کر دین دادا کا کردار۔ محب اللہ عرف فاروق لندن کے لیے روانہ ہو جائے گا یا پھر پکڑا جائے گا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ شمس جمیل کی کہانی کیا کروں پڑھی جس میں دو دوستوں نے ایک ہی رات اپنی اپنی بیوی کو مارنے کا پروگرام بنایا اور کسی کو پتا بھی نہ چلا، اچھی تحریر تھی۔ طاہر جاوید محفل کی کہانی میری بات تو سنو بہت ہی دلچسپ کہانی تھی۔ ضیا نسیم بلگرامی ٹوٹ پاک کی زندگی کے حوالے سے تحریر لے کر آئے۔ واقعہ پڑھ کر دل کو سکون آ گیا۔ کاشف زبیر کی کہانی بہترین تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے دعا گو ہوں اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے، آمین۔“

✽ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں جنوری 2017ء پہلا شمارہ 18 کو خانیوال میں ملا۔
 سرورق کو ایک خوب صورت اور دلربا ماڈل سے سجایا گیا۔ سال پر لگا کر گیا۔ فروری کا سسپنس ملے گا تو نواب صاحب اور
 کاشف زبیر کو سال گزر جائے گا۔ آہ کیسی کیسی ہستیاں ہم کو چھوڑ کر اپنی حقیقی منزل کی مسافر ہوئیں جہاں ہم سب نے جانا ہے۔
 جون ایلیا کے پاس پہنچے، اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے کے ساتھ گنگنانا چاہیے تاکہ جمہوریت زندہ رہے۔
 پاکستان تائبہ رہے، نئے سال پر بہت خوب صورت تجزیہ کیا۔ آپ کا ادارہ پڑھا، میں آپ کے ہر لفظ کی تائید کرتا ہوں اور آپ کی اچھی
 باتوں کے لیے دعا گو بھی ہوں۔ اپنوں کی محفل میں آیا تو رانا بشیر احمد ایاز کو کرسی صدارت پر بہترین تبصرے کے ساتھ موجود پایا۔ مبارک
 ہوں جی۔ محمد خواجہ صاحب بھی اپنے تبصرے کے ساتھ محفل پر چھائے ہوئے تھے۔ کہانیوں میں بات ہو جائے پہلے ہماری ہر دھڑکن
 شخصیت محترم جناب محمد کاشف زبیر مرحوم کی۔ کیا اب ہم کو کاشف زبیر کی کوئی تحریر پڑھنے کو نہیں ملے گی؟ دل ڈوب سا گیا۔ آخری لمحہ
 بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ عالیہ کی ثابت قدمی نے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں کر دی کہ اگر انسان خود پختہ کردار اور اعصاب کا
 مالک ہو تو کوئی گناہ اس کے دامن کو داغدار نہیں کر سکتا، نہ ہی اس کے قریب آ سکتا ہے اور تحریر میں لڑکیوں کی تعلیم کو بہترین طریقے سے
 اجاگر کیا گیا۔ اللہ کاشف زبیر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ الیاس سیتاپوری کی آخری
 معرکہ پڑھی۔ ہلا کو خان کو موت کا پیالہ پینا پڑا۔ لاکھوں انسانوں کو دہشت زدہ کرنے والا خود موت کی دہشت برداشت نہ کر سکا۔ طاہر
 جاوید محفل کے قلم سے میری بات تو سنو حقیقت میں رونے پر مجبور کر گئی۔ واقعی میڈیا تھوڑی سی بات کو بھٹکا بنا کر پیش کرتا ہے جس سے ایسے
 واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سلیم انور کی سکون قلب بھی اچھی رہی۔ شیش محل کی یہ قسط بہت ہی دھواں دار رہی۔ فاروق اصل محب اللہ نواب
 خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ نواب صاحب رحلت فرما گئے تو وہیں آخر کی موت، جس کم جہاں پاک والی بات ہے۔ ربن دادا کو کئی مشکلات
 کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تنویر ریاض کی پلاٹ میں گول نے پاورز سے اچھا بدلہ لیا، مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے نظر فریب آئی، جس میں
 محبت کے نام پر کھلوڑا کیا کامران نے نادرا کے ساتھ کہ اس کی روح تک کو زخمی کر دیا۔ پر بیگ صاحب نے نادرا کے لیے بہت خوب
 صورت انداز میں مقدمہ لڑا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ بھی بہت خوب صورت تحریر رہی۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ میں کیا
 کروں..... جارج کو بہت صفائی سے کیا گیا قتل گلے پڑنے والا ہے کہ ٹھکری نے اس کے ہی طریقہ واردات سے اپنی بیوی کو ٹھکانے
 لگایا۔ ماروی میں آئے تو عالیہ کی موت کا دکھ لے بیٹھا اتنی جلدی عالیہ چلا گیا۔ اب وہ کردار شاید دانش ادا کرے۔ شرمسار کی خوش خیالی بھی
 عمدہ رہی۔ حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی کے بارے میں پڑھ کر دل کو سکون حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عبادت و ریاضت کے
 بدلے میں مقام ہی ایسا اونچا عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ڈونگ ڈیا تک فونک میں امریکی فوجیوں کے کالے کرتوت عیاں کرتے نظر
 آئے۔ مجموعی طور پر ڈائجسٹ عمدہ رہا، کتر نہیں بھی اچھی رہیں۔“ (اتنی پسندیدگی کا شکریہ)

✽ محمد انعام، لودھراں سے تبصرہ کر رہے ہیں: ”کئی ماہ غیر حاضر رہا جس کی وجہ پڑھائی میں مصروفیات ہیں۔ کسی بھی دوست
 نے بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ اس لیے دوستوں کے خطوط کا بایکاٹ کرتے ہوئے سید حاشیش محل میں پہنچ گئے جہاں پر بہت سے
 انکشافات ہو رہے ہیں۔ جولیت کو حقیقی باپ کی محبت کے ساتھ محب اللہ علی مل گیا اور فاروق خیریت سے لندن پہنچ جائے گا جس کا اصل
 مقصد لندن میں انتقام لینا ہے۔ اس کے بعد آخری معرکہ پڑھی۔ جہاں ظالم بادشاہ ہلا کو خان کا سورج ہمیشہ کے لیے ظلم کی داستان
 کے ساتھ غروب ہو گیا۔ تردی کے حالات زبردست تھے۔ تردی ہلا کو خان اور برقائی خان کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ برقائی خان کا
 قتل ناکام ہوا۔ اس کے بعد آخری لمحہ پڑھی جس نے مرحوم کاشف زبیر کی یاد تازہ کر دی۔ بڑی مزے دار کہانی تھی۔ عالیہ نے
 یونیورسٹی میں اپنا مقصد صرف پڑھائی کو رکھا۔ اس لیے مسلسل پانچ سمسٹر میں ٹاپ کرنے والی پہلی طالبہ بن گئی۔ دوسروں کی عزت
 بچانے کی خاطر جان و دے دی لیکن اس کی بے گناہی ثابت نہ ہوئی جبکہ سیلاب نے عالیہ کی بے گناہی ثابت کر دی۔ نظر فریب دلچسپ
 اور سبق آموز کہانی۔ کسی کا اعتبار اور محبت کا قتل کرنے سے انسان زندہ لاش بن جاتا ہے۔ کامران نادرا کے ہاتھوں ہی انجام کو پہنچا
 جبکہ بیگ صاحب نے اپنی قابلیت کے بل بوتے سزا تو کم کرائی لیکن نادرا جو کہ زندہ لاش تھی، سزا پورے ہونے سے پہلے خالق حقیقی
 سے جا ملی۔ غوث پاک حضرت عبدالقادر جیلانی کے حالات زندگی پڑھ کر ایمان کو تقویت حاصل ہوئی۔ آپ کی زندگی کے حالات

انتقال پر ملال

2017ء کی ابتدا ہوتے ہی ایک اور کہنہ مشق قلم کار ہم سے بچھڑ گیا۔ 4 اور 5 جنوری کی درمیانی شب کہانی لکھتے لکھتے سلیم فاروق
 کی طبیعت اچانک بگڑی اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے اس غم میں برابر کا
 شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

سسپنس ڈائجسٹ 13 فروری 2017ء

ہمارے لیے مشکل راہ ہیں۔ میری بات تو سنو میں غلط فہمی سے ایک جان چلی گئی۔ اپ ڈیٹ دل کو نگین کر گئی۔ دو مجاہدین بچھڑنے کی وجہ خاندانی اختلافات تھے۔ اگر شازی بیرون ملک میں اپنی اولاد کی اچھی پرورش کرتی تو وہ اسے شیئر ہوم میں نہ ڈالتے۔ میں کیا کروں، میں جارج اگر وقت پر پولیس کو اطلاع دے دیتا تو شاید مشکل حل ہو جاتی۔ منگمری وقت پر پولیس کو اطلاع دے کر بیوی سے چھٹکارا پانے کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے بچ گیا۔ باقی شمارہ زبردست تھا۔“

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے شریک محفل ہیں۔ جنوری 2017ء کا شمارہ، سرورق حسب معمول ایک دو شیزہ اپنے حنائی ہاتھ سے کان کی خوب صورت بالی کو ٹھیک کر رہی ہے یا نمائش۔ ہر نئے سال پر ہم سب کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس کے مبارک ترین ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ ساری مبارکبادیں امراء اور سیاستدان لے جاتے ہیں اور ہم عوام پاس امید، پریشائیاں چہروں پر سجا کر یہ سال بھی خندہ پیشانی سے گزار دیتے ہیں۔ اس دفعہ تو میڈیا نے سال کے لیے بڑی تباہ کن پیش گوئیاں سنارہا ہے۔ یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ کسی بھی خبر میں کوئی خوشگوار تاثر نہیں دیا جا رہا ہے۔ اللہ ہمارے حالوں پر رحم کرے۔ جب جب انسان بے بس ہو جاتا ہے، خدا کی قدرت جوش میں آتی ہے۔ یا اللہ ہمارے ملک کی مٹتی ہوئی ہر طوفان سے بچا کر کنارے پہنچا دے۔ آمین۔ انشائیہ میں نئے سال، زمانے اور لوگوں کے لیے انتہائی فلسفیانہ تحریر لکھی ہے۔ سب کچھ اس میں سمودیا ہے۔ آخر میں نیک تمنائیں اور خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ ہم سب کی دعا ہے اللہ قبول کرے۔ کرپشن اور جھوٹ اگر ختم ہو جائے تو ہم کو اپنا خواہشوں سے جگمگاتا پاکستان مل جائے گا۔ غلطی کی محفل رنگارنگ تبصروں اور خیالات کا مجموعہ۔ رانا بشیر احمد کا خط کرسی صدارت پر مبارک ہو۔ بڑی تفصیل اور بہت دلچسپی سے تحریر کیا ہے۔ تفصیل سے ہر چیز پر عمدہ تبصرہ۔ واہ۔ رمضان یا شاہد بہت مختصر تحریر کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ اشعار زیادہ شوق سے لکھتے ہیں۔ تمام دوستوں کو نیا سال اچھا سال بننے کی مبارکباد۔ آخری معرکہ، الیاس سیتا پوری کی ہر تاریخی کہانی اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ ہم زمانہ قدیم میں چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک نکتے کو سنوارتے ہیں۔ جتنی تعریف کروں ہے۔ کہانی میں ترویج کے کردار کو بہت اہمیت ملی ہے۔ میری بات تو سنو، ایک تمناؤں کی جستجو میں کمزور انسان کی رلا دینے والی داستان۔ کاش کوئی تو اس کی بات سنا۔ یہ وہی عوام ہے جو غصے میں بھی شرارت میں گامزویوں پر پتھر اڑھاتے ہیں، چاہے گزرنے والے کا قصور ہو ہی نہیں۔ ایسے واقعات ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ سکون قلب، یورپ کی عجیب کہانی۔ جہاں عورت کی اپنی زندگی اور مرد کی اپنی۔ ساتھ ہیں مگر ایک دوسرے سے بیزار۔ مرد نے بڑی ذہانت دکھائی۔ کیوں عورت نے ہی اس کو موقع فراہم کیا اور مرد نے فائدہ اٹھا کر عورت سے جان چھڑائی وہ یورپ کا ماحول۔ مشرق میں عورت مرد کے لیے اور مرد اپنی بیوی کے لیے زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ اس کو عزت اور خوشیاں دینے میں زندگی بھر ہر جبر اور مشقت کو اٹھا لیتے ہیں۔ شیش محل، شمارے کی شاہکار داستانوں میں سے ایک۔ مصنفہ کی گہری معلومات اور لکھنے کا فن۔ تانے بانے کو جوڑنا، مختلف کہانیوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ اب رہن کو آخری انجام تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ پلاٹ، ایک پیچیدہ اور بے مزہ کہانی۔ شاید میری ہی کچھ میں نہ آیا ہو۔ (یقیناً یہی ہوا ہوگا) نظر فریب، وکیل صاحب کی لا جواب تحریر، کارنامہ۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی بازی پلٹ دیتے ہیں لیکن اس دفعہ انہوں نے واقعی قتل کی مجرمہ کا کیس لڑا اور بہت معمولی سزا پر اس کی جان چھڑائی۔ واقعی اگر مرزا امجد بیگ نہ ہوتے تو وہ خاتون سید سے سیدھے تختہ دار پر پہنچ چکی تھیں۔ اپ ڈیٹ، اس ماہ کا ایک شاہکار۔ دلہوز داستان۔ واقعی دل میں تیر کی طرح بیہوش ہونے والی کہانی۔ ایک محبت کی انتہا۔ یادداشت کو تازہ کرنے کے عزم نے اس کو دکھوں سے بھر دیا۔ ایک محبت کو زندہ رکھنے والی نے زندگی بھر اور کردی۔ اگر وہ شخص یادداشت کو تازہ کرنے نہ پہنچتا تو قیامت تک اس محبت کو محسوس نہ کرتا۔ یہ شمارے کی بہترین کہانی کہلانے کی مستحق ہے۔ میں کیا کروں، جرم کی دنیا میں قدم رکھنے والے لوگوں کی کہانی۔ ایک ہی وقت میں دو آدمیوں نے ایک ہی ڈراما چاہا، وہ بھی ایک رسالے کو پڑھ کر۔ ڈرامے میں اتنی مماثلت تھی کہ بازی جیت کر بھی ہار ہو گئی۔ خوش خیالی، بچے کی خواہش اور جرم کی کہانی۔ جرم کو چھپانے اور چوری کرنے والے کا کتنا خوب صورت انجام۔ ساری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ غوث پاک، بڑی ایمان افروز کہانی۔ کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر آج پھر مزہ آیا۔ ایمان زندہ ہو گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستیاں۔ کاش ایسی ہستی ہمارے دور میں بھی اللہ بھیج دے تو زندگی کی مشکلات پھولوں میں تبدیل ہو جائے۔ آمین۔ آخری لمحہ، کاشف زبیر مرحوم کی آخری کہانی ایک سوغات تھی۔ حالانکہ یہ کہانی بہت طویل تھی۔ زمینداروں سے شروع ہو کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام حالات۔ بہر حال کاشف زبیر خدا حافظ، اللہ آپ کی مغفرت کرے۔ آپ نے بہت سی اچھی کہانیوں سے ہم بہت سوں کو بہت کچھ دیا۔ آمین۔ محفل شعرو سخن بہترین اشعار کا مجموعہ دیا۔“ (آپ کے تبصرے کا بہت شکریہ..... جہاں تک آخری کہانی سے متعلق آپ نے تحریر کیا۔ واضح کر دیا جائے کہ آپ کا خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے)

بابر عباس، فضل عباس، گلپانہ روڈ، کھاریاں سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ سرجی سسٹمز کا نیا شمارہ جو کہ جنوری 2017ء کا پہلا شمارہ تھا اپنے غیر فطری سرورق کے ساتھ اس طرح ملا جیسے دھڑلے پولیس کو جرم ماننے کے لیے کوئی بے وقوف سا

سپنس ڈائجسٹ فروری 2017ء

سادہ سا ڈرائیور ملتا ہے۔ سرورق کی حسینہ شاید کوئی نشہ کر کے آئی تھی اس لیے کچھ حواس باختہ سی نظر آرہی ہے۔ ذاکر صاحب سے یہ امید نہ تھی۔ سرجنی اس سے پہلے کہ مزید کچھ لکھوں، آپ کو بتانا چلوں 24 دسمبر بروز ہفتہ شام 6:20 پر رب کا نکات نے میری ذات پر اپنی رحمت کی بارش کرتے ہوئے اپنے خزانے سے مجھے ایک انمول ہیرا عطا کیا ہے یعنی مجھے بیٹا عطا فرمایا ہے جس کا نام میں نے فضل عباس رکھا ہے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے اور اس بچے کو صحت و سلامتی اور لمبی عمر دے۔ مٹھائی کہاں ہے جی!) فہرست کو بالکل اس طرح چیک کیا جس طرح آج کل ہمارے جج صاحبان پانامہ کیس کو چیک کر رہے ہیں۔ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ ہمارے سسٹمز کے کسی رائٹر نے کرپشن تو نہیں کی مگر ماشاء اللہ ہمارے سارے رائٹر کرپشن سے پاک نکلے۔ یہ اپنے معراج رسول صاحب کی خاص مہربانی کا نتیجہ ہے۔ جون ایلیا مرحوم کے بارے میں میں بھلا کیا کہوں۔ دریا کو کوڑے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جون ایلیا صاحب ایک درویش صفت انسان تھے، اپنی تمام باتوں کا نچوڑ ہمیں دیتے تھے۔ نیا سال بھی گزر جائے گا پھر نیا سال آئے گا۔ سرجنی نہ کیا کریں سچ باتیں، ان باتوں کا کسی پر اثر نہیں ہوگا۔ ہمارا تعلیمی معیار کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں، یہ سب سوچنا ہمارے حکمرانوں کا کام ہے۔ وہی نہیں سوچ رہے۔ اس بار کرسی صدارت ہم پر بڑا احسان کرتے ہوئے احسان پور سے اپنے چن مائی رانا بشیر احمد ایاز صاحب نے سنبھالی، کرسی صدارت سنبھالتے ہی رانا صاحب نے کھی کھی کرنا شروع کر دی۔ واہ جی وا! اس بار تو اپنے حکیم رضا صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ اپنے خیرہ گاؤں زبان وغیرہ نے کر حکیم صاحب خوش آمدید۔ محمد زبیر ساگر صاحب یہ ہماری پیاری سی محفل بڑی خوب صورت اور کھٹی میٹھی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ یہاں جو بندہ متواتر آئے اسی کی جے جے کا رہتی ہے، باقی سسٹمز والوں کو بددعا میں نہ دیں۔ سرجنی! حسب معمول دی گریٹ رائٹر ویری موسٹ سینئر رائٹر لفظوں کے بے تاج بادشاہ ولڈر یکارڈ ولڈر سسٹمز کی شان ہماری جان نواب صاحب کی باروری پڑھی۔ نواب صاحب کی ہر تحریر بول کے ہمیں کہتی ہے، مجھے پڑھو اور سمجھو پھر بتاؤ میں کیا ہوں۔ مس ماروی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کاش نواب صاحب زندہ ہوتے۔ آخری صفحات پر ایک زبردست اور خوب صورت رائٹر کی خوب صورت اور پیاری تحریر، آخری لمحہ کاشف بھیا کی ایک معیاری اور دلوں میں اترنے والی تحریر کہانی نے سطر سطر ہمیں یہی احساس دلایا کہ کاشف بھائی ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یقین کریں سرجنی بڑے دھمی دل کے ساتھ پڑھی۔ جمود طاری کرنی ہوئی شیش محل اسما قادری صاحبہ سے انتہا ہے کہ اگر کہانی کو بوریٹ سے بچانا ہے تو منظر نامے کو ذرا چھوٹا کریں۔ میں سانس لینے کے لیے رکا اور پھر حسام بٹ صاحب کی تحریر کردہ مرزا امجد بیگ صاحب کی نظر فریب کو فریبی نظر سے دیکھا۔ وہی سب کچھ، وہی ہوا اور بیگ صاحب کیس جیت گئے، ونڈر فل بٹ صاحب۔ سرجنی چونکہ باقی کی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں، یہی کہہ سکتا ہوں معیاری اور اچھی ہوں گی۔ سسٹمز کے عین مطابق۔“ (بہت شکریہ)

✽ عبداللہ بدلی شریف، رحیم یار خان سے اس ماہ کا مختصر ترین تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔ سال 2017ء کا ابتدائی شمارہ اپنی رنگینیوں سمیت وسط دسمبر میں ہی مل گیا۔ ادارہ میں کی گئی سچ باتوں کو اللہ رب العزت، خوش گوار باتوں میں تبدیل فرمادے اور آپ کی باتوں کو قبولیت کا درجہ عطا فرمائے۔ نئے سال کا شمارہ بہت ہی پُر اثر تھا۔ خصوصاً آخری صفحات پر کاشف زبیر مرحوم کی تحریر نے انٹل نقوش چھوڑے۔ گزارش ہے کہ ناہید سلطانہ اختر کی معاشرتی زندگی پر پُر اثر تحریر ہر ماہ دیا کریں۔“

✽ ذیشان خان، بونیر سے محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہے ہیں۔ سسٹمز کی بارونق محفل میں پہلی بار گھسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لہذا مدید اعلیٰ صاحبہ اور نگران اعلیٰ صاحب سے گزارش ہے کہ مجھے محفل میں جگہ دیں۔ (اگر آپ گھسنے کے بجائے شرافت سے بھی آتے تو ہم آپ کو خوش آمدید کہتے) سسٹمز اس بار 23 کولم۔ اگر سرورق پر تبصرہ کیا تو ذاکر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ خیر محفل میں رانا بشیر بھائی کو کرسی صدارت پر دیکھا۔ بہت بہت مبارک ہو بھائی۔ دوسری سیٹ پر حکیم رضا..... مجھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ رمضان پاشا کا تبصرہ بہت خوب صورت رہا۔ عبدالباقار بھائی اور صفدر معاویہ بھائی آپ دونوں کا تبصرہ تو میں شیش محل سے بھی پہلے پڑھتا ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کہانی بے حد دلچسپ موڑ پر آگئی ہے۔ بہت خوب اسما قادری صاحبہ۔ باروی میں عابی کی موت۔ بہت برا ہوا، خیر دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ آخری معرکہ الیاس سینا پوری صاحب کی بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ میری بات تو سنو، طاہر جاوید مغل صاحب کی اس تحریر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آخری لمحہ، کاشف زبیر صاحب کی آخری تحریر۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ منظر امام صاحب سے گزارش ہے کہ کوئی اچھی سی تحریر لے کر آئیں۔“ (منظر صاحب تو ہمیشہ ہی اچھی تحریر لے کر آتے ہیں..... آپ کو کس بات پر اعتراض ہے.....؟)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
:تیاز احمد، منڈی بہاؤ الدین۔ جنید احمد ملک۔ کراچی۔ اطہر حسین، کراچی۔ محمد اقبال، کورنگی، کراچی۔ جہانزیب احمد، لاہور۔ احمد خان، پشاور۔ اعجاز احمد، سیالکوٹ۔ نجمی رحمان، نامعلوم مقام۔ اورنگزیب، ایبٹ آباد۔

شاہنشاہ

الیاس سیتا پوری

زمین پر ایک فاتح کی حیثیت سے طویل عہد گزارنے والی منگول قوم... جس کے اتحاد نے نہ صرف اسے عروج بخشا بلکہ اس کا وحشیانہ انداز اس کی سرکشی میں بھی اضافے کا سبب بنتا چلا گیا... لیکن عقلمندوں کے لیے اشارہ ہے کہ رات کا ڈھلنا، صبح کا نکلنا اور... پھر سے صبح کا رات میں ڈھل جانا اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ نہ دن ہمیشہ رہتا ہے اور نہ رات... جیسے جیسے کمزوریاں اور برائیاں بڑھتی جاتی ہیں بالکل رات کے مانند سیاہی میں لیپٹتے لیپٹتے بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب منگولوں کا ظلم اور مفاد آپس میں نفاق کا باعث بنا تو تنزلی نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے اور بنا آہٹ کے زوال نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ بالآخر آج تاریخ کے صفحات ہمیں ایک اور ہی داستان سناتے ہیں۔ داستانوں کا سننا اور پڑھنا بے شک ایک الگ لطف دیتا ہے مگر... سیکھنے والوں کے لیے بہت سا عبرت کا سامان بھی ملتا ہے... تو بے کوئی جو ماضی سے اپنا حال درست کرنے کا اگر سیکھے اور اپنا مستقبل محفوظ کر لے!

ہماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



Downloaded From
Paksociety.com



Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”والد بزرگوار! آپ جلت نہ کیجیے اور ترمہ شیریں کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔“

ابا قہ خان نے بحالت برہمی حکم دیا۔ ”ارغون! ترمہ شیریں کو میرے حوالے کر دے۔“

شہزادہ ارغون ڈر گیا، وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی۔ اس کو دھکا دے کر ابا قہ خان کے سامنے گرا دیا، بولا۔ ”سنبھالیے اپنی ترمہ شیریں کو..... مگر والد بزرگوار! میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ ترمہ شیریں کو قبول کر لیتا آپ کے شایان شان نہیں۔“

ابا قہ خان نے ترمہ شیریں کو سنبھال کر اٹھایا اور پھر پھرتی سے بٹھا کر ارغون کو گدی سے پکڑ لیا۔ ”گستاخ لڑکے! ذرا سی کامیابی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔“ اس نے ولی عہد نکودار کو حکم دیا۔ ”ارغون کو قید کر دیا جائے۔“ لیکن نکودار نے ارغون کی حمایت کی، بولا۔ ”پدر محترم! ارغون جذباتی نوجوان ہے، اسے ایک بار معاف کر دیا جائے۔“

ابا قہ خان نے نکودار کو بھی ڈانٹ دیا۔ ”اگر تو بھی میری نافرمانی کرے گا تو میں کسی اور کو ولی عہد بنادوں گا۔“ نکودار چھتا مور سرداروں کو لے کر ارغون کی طرف بڑھا اور ارغون کے کان میں کہا۔ ”ارغون! میں مجبور ہوں لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے ساتھ زیادتی نہیں کروں گا، میں تجھے گرفتار کرتا ہوں۔“

نکودار نے ارغون کی کمر میں بندھی ہوئی پٹی کھلو کر اپنے قبضے میں کی اور اس کے خنجر اور پیش قبض کو ایک سردار کے حوالے کر دیا، بولا۔ ”اس کو احتیاط سے رکھنا، یہ ایک شہزادے کی امانت ہے۔“

ارغون کو محل کے ایک حجرے میں قید کر دیا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس سارے واقعے کو دلچسپی سے دیکھا اور منہ پھیر پھیر کر مسکراتی رہی۔ جب ارغون کو قید خانے میں ڈال دیا گیا تو ترمہ شیریں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”افسوس کہ اس کی ساری محنت اکارت گئی، اب اس کا کیا ہوگا؟“

لیکن ابا قہ خان ترمہ شیریں کو جواب دیے بغیر محل میں چلا گیا۔ ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی۔ یہاں اس کو چند نئی لڑکیاں نظر آئیں..... ترمہ شیریں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آچکی ہیں؟“

ابا قہ خان کی ذہنی کیفیت بگڑ چکی تھی۔ وہ ترمہ شیریں پر بگڑ گیا۔ ”آخر یہ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ ترمہ شیریں! میں

ارغون فاتحانہ شان سے مراۃ میں داخل ہوا۔ ابا قہ خان اور ولی عہد نکودار نے اس کی شاندار پذیرائی کی۔ ابا قہ خان ترمہ شیریں سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن وہ اپنی اس بے چینی کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ ابا قہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اسے شاباشی دی۔ ”ارغون! میں تجھ پر فخر کر سکتا ہوں۔ تجھ میں سو بدائی بہادر جیسی دوراندیشی اور میرے باپ ہلا کو جیسی بہادری پائی جاتی ہے۔ ترمہ شیریں کہاں ہے؟“

ارغون اپنی تعریف سن کر آڑا تر چھا ہو گیا، بولا۔ ”میں نے سونجاق کو وہ سبق دیا ہے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ رہی ترمہ شیریں، تو اب وہ آپ کے کس کام کی۔ کیونکہ میں نے سنا ہے شیریں کا جھوٹا نہیں کھاتا۔“

ابا قہ خان نے ارغون کو ایسی نظروں سے گھورا، گویا وہ ارغون کے جواب سے بہت برہم ہے، اس نے پوچھا۔ ”ارغون! آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق نے جھوٹا کر دیا ہے۔ اب وہ آپ کے کسی کام کی نہیں رہی۔“

ابا قہ خان نے طیش میں کہا۔ ”لیکن میں انسان ہوں، جانور نہیں۔ ہمارے جد اعلیٰ چنگیز خان کی بیوی پورے کو دشمن قبیلے نے اغوا کر کے دو سال تک اپنے پاس رکھا تھا، پھر جب چنگیز خان نے پورے کو دوبارہ حاصل کر لیا تو اس کے کسی عزیز رشتے دار نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیریں کا جھوٹا نہیں کھاتا، اس نے پورے کو بھی رکھا اور اس کے ناجائز بیٹے جو جی کو بھی پیار محبت سے پالا اور جب وہ جوان ہو گیا تو روس کی حکومت اس کے حوالے کر دی۔ کیا میں اپنے جد اعلیٰ چنگیز خان کی اتباع نہ کروں؟“

ارغون لا جواب ہو کر چپ ہو گیا۔ ابا قہ خان نے پھر سختی سے پوچھا۔ ”ترمہ شیریں کہاں ہے؟“

ارغون نے پڑمردگی سے جواب دیا۔ ”پدر محترم! آپ خاطر جمع رکھیں۔ ترمہ شیریں آپ کو مل جائے گی۔“ نکودار نے اپنا تیر چلایا۔ عرض کیا۔ ”پدر محترم! بھائی ارغون، ترمہ شیریں کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے ہیں۔“ ابا قہ خان نے غصے میں ادھر ادھر ٹھلنا شروع کر دیا اور سپاہ کو حکم دیا۔ ”ترمہ شیریں کو برآمد کر کے میری خدمت میں پیش کیا جائے۔“

شہزادہ ارغون نے ناگواری سے منہ بتایا اور کہا۔

ایل خان ہوں، تم سب کا حکمران۔ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں پھر تو نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا کہ ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آچکی ہیں؟“

ترمہ شیریں بھی سہم گئی، بولی۔ ”مجھ پر رحم کر دیجیے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔“

ابا قہ خان نے بدستور درشت لب و لہجہ میں کہا۔ ”میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے ساتھ کیوں چلی گئی تھی اور میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے علاوہ کس کس کے پاس رہی۔ میں نے تجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور تو مجھ سے سوال کر رہی ہے، خوب!“

ترمہ شیریں کا خون خشک ہو چکا تھا۔ ابا قہ خان ٹہلنے لگا، وہ ٹہلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ ”میں نہ تو کسی کا باپ ہوں اور نہ کسی کا عاشق۔ میں ایل خان ہوں۔ یہاں کا سب سے بڑا اور سب سے طاقتور حکمران۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔“

اسی دوران شراب اور گوشت کا انتظام کر دیا گیا۔ ابا قہ خان بڑبڑاتا اور ٹہلنا بھول گیا اور گوشت کو بھوکے بھیڑیے کی طرح جلدی جلدی کھانے لگا۔ حسین و جمیل لڑکیاں اس کے چاروں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ابا قہ خان کو شراب کے جام پیش کیے۔ وہ انہیں جلدی جلدی خالی کرنے لگا۔ ترمہ شیریں منہ پھلائے اس سے ذرا دور بیٹھی ہوئی تھی۔

جب نشہ چڑھا تو اسے اچانک ترمہ شیریں یاد آگئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ترمہ شیریں کو قریب بلا لیا۔ ”تو وہاں، اتنی دور بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ میرے پاس آ جا۔“

ترمہ شیریں بے دلی سے اٹھی اور ابا قہ خان کے پاس بیٹھ گئی۔

ابا قہ خان نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور شرمندگی سے کہنے لگا۔ ”ترمہ شیریں! کیا تو ناراض ہے مجھ سے؟ مگر کیوں؟ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا تجھ سے۔ تو مجھے چھوڑ کر شہزادہ سونجاق کے پاس چلی گئی تھی۔“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! میں مال غنیمت ہوں، لوٹ کا مال..... حملہ آور آتے ہیں اور مجھے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں کسی کے ساتھ کیوں جانے لگی۔“

ابا قہ خان نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ ”ترمہ شیریں! جب میں نے یہ سنا تھا کہ شہزادہ سونجاق تجھے لے گیا تو مجھے دکھ بھی پہنچا تھا اور غصہ بھی آیا تھا۔ ہم منگول اب فاتح اور حکمران کم اور عاشق زیادہ ہو گئے ہیں۔“

ترمہ شیریں اب بھی ناراض تھی، بولی بھی اسے شہزادہ

سونجاق یاد آ رہا تھا۔ جذباتی نوجوان، پرجوش شہزادہ..... وہ ابا قہ خان سے بڑا عاشق تھا اور پیارا محبوب بھی۔ ابا قہ خان نشے میں اسے دیر تک مناتا رہا۔ ترمہ شیریں من گئی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اگر وہ نہیں بھی مانتی تب بھی ہونا وہی ہے جو ابا قہ خان چاہے گا۔

ابا قہ خان اس کی خاموشی کا یہ مطلب لے رہا تھا کہ شاید وہ شہزادہ سونجاق کو یاد کر رہی ہے۔ اس وہم نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس نے ترمہ شیریں کا چہرہ اپنے روبرو کر لیا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے ترمہ شیریں! تو کیا سوچ رہی ہے؟“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”محترم خان! میں جو کچھ سوچ رہی ہوں، اگر اس کا اظہار کر دوں تو آپ اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔“

ابا قہ خان نے ترمہ شیریں کے سر کو کئی بار جھٹکا دیا۔ ”تو بیان تو کر، میں برداشت کر لوں گا۔“

ترمہ شیریں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”اب اس بات کو رہنے دیجیے۔ میں نہیں چاہتی کہ فاتح کے خاندان میں پھوٹ پڑ جائے۔“

ابا قہ خان کا نشہ ہرن ہو رہا تھا۔ اس نے ترمہ شیریں کو ایک سخت جھٹکا دیا، بولا۔ ”میں تجھ سے معلوم کر۔ کہ رہوں گا کہ تو کہنا کیا چاہتی ہے۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”آپ مجھے جھٹکے نہ دیں اور جس بات کو میں چھپانا چاہتی ہوں، اس کے اظہار پر مجبور نہ کریں۔“

ابا قہ خان پاگل ہوا جا رہا تھا، اس نے ترمہ شیریں کے بال پکڑ لیے، بولا۔ ”ترمہ شیریں! میرا امتحان نہ لے۔ اول تو تجھے ایسی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر کی ہے تو اس گرد آلود مطلع کو صاف کر دے۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔“

ترمہ شیریں نے ابا قہ خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پوچھا۔ ”تب پھر میں بتا دوں وہ بات؟“

ابا قہ خان نے بے باکی سے جواب دیا۔ ”ہاں بتا دے وہ بات۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”آج جب شہزادہ ارغون سے آپ نے مجھے طلب کیا تھا تو اس نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا کہ شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”اس نے یہ کیوں کہا تھا، آپ نے کچھ سوچا؟ ارغون میرا تیسرا عاشق ہے۔ پہلے عاشق آپ ہیں، دوسرا عاشق شہزادہ سونجاق ہے اور تیسرا عاشق شہزادہ ارغون ہے۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے تین بڑوں

کے دل جیت لیے ہیں۔“

جھیل رہے ہیں۔“

ابا قہ خان دم بخورہ گیا، پوچھا۔ ”کیا تو یہ سچ کہہ رہی ہے؟“
ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”میں جھوٹ کیوں
بولوں گی۔ جب شہزادہ ارغون مجھے لے کر آ رہا تھا تو راستے
میں کئی جگہ اس نے مجھ سے اظہارِ عشق کیا اور میں اس کو ٹالتی
رہی۔ اس نے میرا سفر کرنا دو بھر کر دیا تھا۔“

ابا قہ خان نے پوچھا۔ ”کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟“
ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”میں بالکل سچ کہہ رہی
ہوں اسی لیے میں اس کو چھپا رہی تھی۔ میں جانتی تھی آپ
میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔“

ابا قہ خان نے کہا۔ ”شہزادہ ارغون اپنے کیے کی سزا
پا کر رہے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔“

ترمہ شیریں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ
ارغون کو اس لیے سزا دلوانا چاہتی تھی کہ اس نے ترمہ شیریں
کو شہزادہ سونجاق سے جدا کر دیا تھا۔

☆☆☆

شہزادہ ارغون قید خانے میں بند اپنی بد قسمتی پر غور کر
رہا تھا۔ ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق سے چھین لینے کے بعد
وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جملہ عساکر کا سپاہ سالار بنادیا جائے گا مگر
عین وقت پر قسمت نے منہ پھیر لیا اور وہ قید خانے میں ڈال
دیا گیا۔ قید خانے کے باہر پہریداروں کی بھاری جمعیت
پہرہ دے رہی تھی۔ اسی عالم میں ارغون کو مطلع کیا گیا کہ
سعد اللہ یہودی اس سے ملنا چاہتا ہے۔

سعد اللہ یہودی جب اس سے ملا تو اس نے اپنا چہرہ
ایک بڑے رومال سے چھپا رکھا تھا۔ ایک سپاہی ان دونوں
کے قریب کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتا
تھا۔ سعد اللہ یہودی نے پوچھا۔ ”میرے آقا! یہ کیا ہو گیا؟
یہ میں آپ کو کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”سعد اللہ! میری قسمت مجھ
سے آنکھ پجولی کھیل رہی ہے اور میرے سر پر بھی خوش قسمتی کا
سورج طلوع ہو جاتا ہے اور بھی میری بد قسمتی کے بادل سایہ
فلن ہو جاتے ہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے دلی زبان میں کہا۔ ”میرے
آقا! انسان کی بیشتر مصیبتیں اس کی زبان کے بے جا استعمال
کی پیداوار ہوتی ہیں۔ آپ کو ترمہ شیریں سے عشق نہیں کرنا
تھا اور اگر عشق کیا ہی تھا تو اس کو اپنے سینے میں چوری کی قیمتی
شے کی طرح چھپا کر رکھنا تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور
اپنی بے احتیاطی اور زبان کے لگائے ہوئے زخم کی افیتیں

ارغون نے پوچھا۔ ”پھر اب میں کیا کروں؟“
سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”آپ اگر چاہیں تو
اب بھی اپنی بد قسمتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتے ہیں۔“

شہزادہ ارغون نے بے چینی سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“
دانا یہودی نے جواب دیا۔ ”آپ فی الحال ترمہ
شیریں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اور ابا قہ خان کو یہ
باد رکھ دیں کہ آپ نے جو غلطی یا جرم کیا ہے، وہ بحالتِ نشہ
کیا ہے اور آپ اس پر شرمندہ ہیں۔“
شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ ”کیا اس طرح میرا باپ
مجھے معاف کر دے گا؟“

یہودی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے اس کو معاف
کر دینا چاہیے کیونکہ آپ کا باپ بہت عقل مند اور شفیق ہے۔“
شہزادہ ارغون اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اس نے بڑے
کرب سے کہا۔ ”افسوس کہ میں جملہ عساکر کا سپاہ سالار نہیں
بن سکا۔“

سعد اللہ یہودی نے اسے تسلیاں دیں۔ ”شہزادے!
آپ مایوس نہ ہوں آپ ابھی اپنی بازی ہارے نہیں ہیں۔
وقتی تعطل آپ کو ہر اسال اور مایوس کر رہا ہے، مگر آپ اب
بھی سپاہ سالار ہیں۔ سپاہ سالار بننا آپ کا مقدر ہے، آپ کی
قسمت اور خدا کی مشیت ہے۔“
شہزادہ ارغون کے چہرے پر امید کی چمک پیدا ہو گئی
کہا۔ ”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“

سعد اللہ یہودی نے آہستہ سے آمین کہا اور شہزادے
کو سمجھانے لگا۔ ”شہزادے! دنیا کے جملہ ناکام انسانوں
میں ایک قدر مشترک ملے گی، ایک نقص عام، ایک مشترکہ
غلطی۔ دنیا کے سارے ناکام، جذباتی، غیر محتاط اور زبان
کے ہلکے ہوتے ہیں۔ آپ میں بھی یہی عیوب پائے جاتے
ہیں۔ اب جب آپ کی اپنے باپ سے ملاقات ہو، آپ
اس سے معافی مانگ لیجیے گا۔ اللہ نے چاہا تو حالات اور
قسمت ایک بار پھر آپ پر مہربان ہو جائیں گے۔“

پہرے دار سپاہی نے سعد اللہ یہودی کو مزید رکنے
اور باتیں کرنے سے روک دیا۔ سعد اللہ نے پہرے دار کو
سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میرے عزیز دوست! میں چند
لمحوں بعد چلا جاؤں گا، بس چند لمحے اور۔“
سپاہی نے درشت آواز میں کہا۔ ”بس جناب! میں
اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔“

شہزادہ ارغون کو غصہ آ گیا، بولا۔ ”دو درہم کے

چھوٹے بھائی! یہ تو کسی باتیں کر رہا ہے؟

شہزادہ ارغون کی خدمت میں موجود سعد اللہ یہودی شرارتا مسکرایا اور شہزادے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ ”شہزادے! خدا کے لیے اپنی جذباتیت کم کر دیں۔ آپ کی آزادی کا سبب فوجی سرداروں کی یہ دھمکی ہے کہ اگر شہزادہ ارغون کو رہا نہ کیا گیا تو فوجیوں کی بہت بڑی تعداد بغاوت کر دے گی۔“

شہزادہ ارغون اپنی رہائی سے بہت خوش تھا۔ سعد اللہ یہودی سے پوچھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

یہودی نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد..... اس کے بعد پھر کسی مناسب موقع پر آپ موجودہ حکومت کے خلاف.....“

وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ سعد اللہ یہودی کچھ کھسایا ہوا تھا، بولا۔ ”اور جب آپ یہ محسوس کریں کہ فوج کی فضا آپ کے حق میں سازگار ہے، آپ فوراً یہاں سے کہیں اور.....“

شہزادہ ارغون بڑی تشویش میں تھا، کہا۔ ”فضا میرے حق میں ذرا بھی سازگار نہیں ہے شاید، کیونکہ ابھی میرا باپ اباقہ خان اور اس کی فوج کے حمایتی سردار موجود ہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”پھر بھی کوشش کر دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

شہزادہ ارغون بہت دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ چہرے پر مایوسی اور بیزاری کے آثار موجود تھے، بولا۔ ”آپ کہتے ہیں تو یہ کوشش بھی کر دیکھوں گا ورنہ مجھے امید کی کوئی تھی سی کرن تک نہیں نظر آرہی۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”شہزادے! آپ ہمت نہ ہاریں۔ آپ کی باتوں سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”سعد اللہ میرے مشفق ساٹھی..... میں نے ہرات کے میدان میں چغتائیوں کو شکست دے کر اور ترمہ شیریں کو حاصل کر کے اپنے باپ سے یہ آس لگائی تھی کہ وہ مجھے اپنے جملہ عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ بنا دے گا مگر اس نے میرا مرتبہ بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا اور میں قید کر دیا گیا۔“

سعد اللہ یہودی نے برہمی اور مایوسی سے کہا۔ ”شہزادے! میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ اپنی جذباتیت اور غلبت پسندی سے بچنا چھڑا لیں، پھر دیکھیے گا آپ کے

خدمت گار! اگر میں بادشاہ بن گیا تو تجھے دیکھ لوں گا، آخر تو خود کو سمجھتا کیا ہے۔“

سپاہی ایک دم اکھڑ گیا، سختی سے کہا۔ ”اب میں ایک لمحہ بھی نہیں دوں گا تجھے۔ مجھ سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے یہاں کس قسم کی باتیں کی تھیں تو میں کیا جواب دوں گا۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”جب تجھ سے کوئی اس قسم کا سوال کیا جائے تو صاف صاف کہہ دینا کہ ہم دونوں اپنے باپ اباقہ خان کے خلاف سازش کر رہے تھے۔“

سعد اللہ یہودی ایک دم برہم ہو گیا، بولا۔ ”پھر وہی زبان کا ہلکا پن اور جذباتیت۔ شہزادے! میں آئندہ آپ سے نہیں ملوں گا۔“

شہزادہ اس کو روکتا ہی رہ گیا مگر وہ نہیں رکا۔ بعد میں شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اباقہ خان شہزادہ ارغون خان سے بہت ناراض تھا۔ کئی سبتوں سے شہزادہ ارغون کے لیے سفارشی بھی آئیں مگر اباقہ خان نے اسے معاف نہیں کیا۔ سعد اللہ یہودی شہزادہ ارغون کے لیے فوج میں کام کر رہا تھا۔ وہ فوجیوں کو ورغلا رہا تھا کہ جب ان کا سپاہ سالار ایل خان کی قید میں پڑا ہے تو فوجیوں کی طرف سے یہ خاموشی کیوں؟ اس نے فوجیوں کو بغاوت پر اکسایا اور انہیں مشورہ دیا کہ اباقہ خان کے خلاف اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔

شمس الدین جوینی حالات سے باخبر تھا۔ اس نے ولی عہد نکودار کو سمجھایا۔ ”اس سے پہلے کہ بغاوت ہو، آپ سفارش کر کے شہزادہ ارغون کو رہائی دلوادیں۔“

شہزادہ نکودار نے پوچھا۔ ”مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ”اس سے دو بھائیوں کی رجشیں کم یا بالکل ختم ہو جائیں گی اور سعد اللہ یہودی اپنے ارادوں میں ناکام ہو جائے گا۔“

وزیراعظم کے مشورے پر ولی عہد نکودار نے اپنے بھائی شہزادہ ارغون کو رہائی دلوادی۔ جب وہ آزاد ہوا تو قید خانے کے دروازے پر اسے خوش آمدید کہنے والوں میں ولی عہد نکودار بھی تھا اور سعد اللہ یہودی بھی۔ شہزادہ ارغون نے ان دونوں پر اچھتی نظریں ڈالیں اور پھر ولی عہد نکودار سے پوچھا۔ ”ولی عہد بہادر آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟“

سوال کے پیچھے جو طنز چھپا ہوا تھا، ولی عہد نکودار نے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا، بولا۔ ”بھائی ارغون! میرے

سارے کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے۔“
شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ ”شہزادہ نکودار میری طرف
دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے، میں کیا کروں؟ دوست بن جاؤں
یا دور دور رہوں؟“

سعد اللہ یہودی نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔
”سبحان اللہ سبحان اللہ، کیسی خوش خبری سنائی ہے شہزادے
آپ نے! بخدا آپ اس سے فوراً دوستی کر لیں اور میری یہ
بات ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ اپنے دشمن کو دشمن بن کے
نہیں، دوست بن کے جیسی شکست دی جاسکتی ہے کسی اور
طرح ممکن نہیں ہے۔ آپ شہزادہ نکودار سے پہلی فرصت میں
دوستی کر لیں۔“

شہزادہ ارغون سوچتے سوچتے اٹھا اور سیدھا ولی عہد
نکودار کے پاس پہنچا۔ اس وقت شمس الدین جوینی ولی عہد کو
عقل و دانش کی باتیں بتا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”ولی عہد
بہادر! کھلے دشمن کا مقابلہ کرنا آسان ہے مگر دوست نما دشمن
سے جیتنا تقریباً ناممکن ہے۔ اعتماد کرنا بڑی اچھی بات ہے مگر
اعتماد نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔“

جب خدمت گار نے اندر داخل ہو کر ولی عہد کو یہ بتایا کہ
شہزادہ ارغون باریابی کا خواستگار ہے تو شمس الدین جوینی اور ولی
عہد نکودار ایک دوسرے کا سوالیہ انداز میں منہ دیکھنے لگے۔
شمس الدین جوینی نے کہا۔ ”ولی عہد بہادر!
ہوشیار۔ جس طرح حبشی لاکھ بار نہانے سے گور نہیں ہو سکتا،
اسی طرح بد باطن احسان کے بوجھ تلے دب کر احسان مند
اور شکر گزار نہیں ہو سکتا۔“

ولی عہد نے پوچھا۔ ”کیا میں شہزادہ ارغون سے
ملاقات کروں یا نہ کروں؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”آپ ملاقات ضرور کریں مگر
مجھ کو یہاں سے چلا جانے دیں کیونکہ میری موجودگی میں
شہزادہ اپنے دل کی باتیں نہیں کر سکے گا۔“
ولی عہد نے کہا۔ ”بہتر ہے۔“

وزیر چلا گیا اور شہزادہ اندر داخل ہوا، راستے میں ان
دونوں کا آمناسامنا جو ہوا تو دونوں ہی لمحہ بھر کے لیے ایک
دوسرے کے مقابل رکے، ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں
اور اپنی اپنی راہ لی۔

شہزادہ ارغون کے درجہ حرارت میں کچھ اضافہ ہو
چکا تھا، اس نے طنزاً پوچھا۔ ”برادر محترم! یہ مسلمان وزیر
آپ سے کس قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے؟“

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”شمس نے اس کی باتیں کبھی

غور سے نہیں سنیں۔ وہ بولتا رہتا ہے، میں سنا رہتا ہوں لیکن
یاد کچھ بھی نہیں رکھتا۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”مجھے جوینی کی شکل تک سے
نفرت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ ہمیں یا ہمارے آدمیوں کو
مسلمان کر لے گا۔“

ولی عہد نے موضوع بدلنا چاہا۔ ”شہزادے! آپ کی
تشریف آوری کا مقصد؟ کوئی خدمت میرے لائق؟“
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اس دن جب میں
آپ کی سفارش پر آزاد ہوا تھا، میں نے آپ کے اتنے
بڑے احسان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا۔ اب میں اپنے ضمیر
سے تنگ آ کر معافی مانگنے حاضر ہو گیا ہوں۔“

ولی عہد نے شہزادے کی پیٹھ تھپتھپائی، کہا۔ ”اس کی
کیا ضرورت ہے شہزادے! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔“
شہزادے نے جواب دیا۔ ”برادر محترم! میں شرمندہ
ہوں میرا ضمیر شرمندگی کے اس بوجھ تلے دبنا چلا جا رہا ہے۔“
ولی عہد نے کہا۔ ”عزیز از جان بھائی! جب میں بار
بار یہ کہہ رہا ہوں کہ جا میں نے تجھے معاف کیا، تب پھر یہ
شرمندگی اور ضمیر کا دباؤ کیوں؟“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”اچھا چلیے آپ نے تو مجھے
معاف کر دیا، اب آپ یہ بتائیے کہ میں پدر بزرگوار سے
کس طرح معافی مانگوں؟“
ولی عہد نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا وہ اب بھی ناراض
ہیں تجھ سے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہاں جناب! شاید وہ
مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے ہیں۔“
ولی عہد نے وعدہ کیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ
پدر بزرگوار تجھے معاف کر دیں۔“

شہزادہ ارغون نے ولی عہد کے تحت پر چند کتابیں
رکھی ہوئی دیکھیں، اس نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان
میں ایک تو شیخ سعدی کی گلستان تھی اور دوسری سنسکرت کی شیخ
ستتر کا عربی ترجمہ کلیلہ دمنہ۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”ان
کتابوں میں کیا لکھا ہے؟“

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”ان کتابوں میں انسانی
تجربوں کا نچوڑ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ چونکہ قافی انسان لمبی
عمریں لے کر نہیں آتا، اس لیے یہ کتابیں جو بہتوں کے
تجربات اور علم و دانش کا احاطہ کرتی ہیں، ہماری راہنمائی
کرتی ہیں۔“

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ ”کیا میں انہیں پڑھ اور

کتابیں

کتابیں اپنے آپ کی ہم نے یورپ میں بہت دیکھیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں جواب بلیک فرائز روڈ پر ایک نئی اور شاندار بلڈنگ میں منتقل ہو گئی ہے۔ برٹش میوزیم میں اور اسکول فار اورینٹل اسٹڈیز کے کتاب خانے میں لیکن دلی ہمارا سی پارہ نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر کہ ہمارے ہاں یہ خزانے ہوتے بھی تو کبھی کے لٹ چکے ہوتے۔ کون ان کو سینت کر رکھتا اور ان کی فہرست بندی کرتا اور دوسروں کو دیکھنے دیتا۔ ان لوگوں نے کم از کم ان کو سلیقے سے محفوظ تو کر دیا اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے تو خیر یہ تاجدار تھے لیکن جاپان اور چین کی کتابیں، نیپال، تبت اور کوریا کی کتابیں، افریقی زبانوں کی کتابیں، مخلوط تصاویر، جو یورپ جائے ان کو دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ اکثر صورتوں میں ان کی نقلیں یا عکس منگوا سکتا ہے۔ یہی حال آثار کا جائے۔ اب تو خیر ہم بھی اپنی چیزوں کی قدر اور حفاظت کرنے لگے ہیں اور قاہرہ کا اپنا میوزیم بھی مصری آثار سے اٹا پڑا ہے۔ ورنہ ہم سے پہلے لوگوں کے لیے یہ چیزیں کنکر پتھر تھیں۔ مصر میں لوگ اہرام میں نقب لگا کر میسوں کے کفن اور زیورات کھینچ لے گئے۔ پیرس میں کنکارڈ کے میدان میں ایک پرانا مصری نوکیلا مینار نصب ہے جو محمد علی پاشا نے پولین کو یا نہ جانے کس کو نذر کر دیا تھا۔ لندن میں بھی میوز کے کنارے پر کلویٹرا سوئی پڑی ہے جس کا بوجھ ایسا ہے کہ لانے والا جہاز ڈوب گیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکالنے والا نکال کر لایا اور کئی چیزیں دیکھیں جن پر لکھا تھا کہ محمد علی پاشا نے تحفہ دیا..... ہمارے خیال میں یہ کہہ دیتا ہوگا کہ ”ارے میاں! لے جاؤ ہمارے کس کام کی ہیں یہ چیزیں..... کتابوں کے بارے میں بھی ہم ایسی ہی بے نیازی برتتے ہوں گے۔“

ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

مانبرہ سے عسیم سب بر کا تھا ہاں

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”پڑھ تو سکتے ہو مگر سمجھ نہیں سکتے۔“
شہزادے نے پوچھا۔ ”کیا میں انہیں سمجھنے کے لیے ہر روز آپ کے پاس آ سکتا ہوں؟“
ولی عہد نے جواب دیا۔ ”تم میرے پاس آنے کے بجائے وزیر جوینی کی صحبت اختیار کرو کیونکہ شمس الدین جوینی علم کا سمندر ہے۔“
شہزادہ مایوس ہو گیا، بولا۔ ”لیکن وزیر تو اسلام کی باتیں کرنے لگتا ہے اور مجھے اسلام کی باتیں ذرا بھی پسند نہیں۔“
ولی عہد نے تلخ رویہ اختیار کیا، بولا۔ ”اور وہ سعد اللہ یہودی فتنہ و شرارت کی جڑ۔ کیا وہ یہودیت کی بات نہیں کرتا؟“
شہزادہ ارغون جب لا جواب ہوا تو چپ ہو گیا۔
ولی عہد دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ شہزادہ اس کی باتیں بہت توجہ سے سنتا رہا۔ آخر میں یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ اب وہ ولی عہد اور جوینی کی صحبت اختیار کرے گا اور رفتہ رفتہ سعد اللہ یہودی سے نجات حاصل کر لے گا۔

☆☆☆

ولی عہد کدو دار نے ابا قہ خان سے شہزادے ارغون کی سفارش کی اور باپ نے اسے معاف کر دیا۔ سعد اللہ یہودی نے اسے مبارک باد پیش کی اور کہا۔ ”شہزادے! اگر تم اسی طرح میرے مشوروں پر عمل کرتے رہے تو ایک دن تم کامرائیوں کی معراج دیکھ لو گے۔“
شہزادہ، سعدی کی گلستان لیتا آیا تھا۔ سعد اللہ یہودی اس کی حکایتیں شہزادے کو سنانا اور پھر خوب ہنس ہنس کر ان حکایات اور شیخ سعدی کا مذاق اڑاتا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے شہزادہ ارغون کو یہ یقین دلاتا کہ گلستان میں شیخ سعدی کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ سعدی نے بھی ادھر ادھر سے لے کر اپنا گلستان سجایا ہے۔ اس نے مزید کہا۔ ”اور اس سے زیادہ علم و دانش کی باتیں تو عہد نامہ قدیم میں کہی گئی ہیں۔“
ولی عہد نے شوق ظاہر کیا۔ ”شہزادے! میں عہد نامہ قدیم پڑھنا چاہتا ہوں۔“

شہزادہ بہت خوش ہوا، بولا۔ ”برادر محترم! اس سلسلے میں آپ کو سعد اللہ یہودی کی صحبت اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ وہ جدید اور قدیم مذہبی ادب کا مجموعہ العلوم ہے۔“
ولی عہد نے کہا۔ ”اس شرط پر کہ وہ مجھ سے مذہبی باتیں نہیں کرے گا۔ اس کے دین کی بڑائی اور برتری سے مجھے کیا لینا دینا لیکن یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ہندو نصاریٰ کا بھی بدل کر کسی انسان میں داخل ہو جاتی ہیں تو اسے ہاتھی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

ترمہ شیریں کو بہت زیادہ نہیں سنا، اب ارادہ ہے کہ اس کو بلا کر سنوں، شاید میری بات رونہ کی جائے کیونکہ ان دنوں میری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔“

شہزادہ ارغون نے تڑپ کر درخواست پیش کر دی، بولا۔ ”برادر محترم! ترمہ شیریں کو سنتے رہنے کی تو حسرت ہی رہ گئی دل میں۔ اب پتا نہیں پھر بھی سن سکوں گا یا نہیں۔“

ولی عہد نے مغنیہ کو حکم دیا۔ ”تو چپ کیوں ہو گئی؟ گاتی کیوں نہیں؟“

مغنیہ پھر گانے لگی۔ شہزادے نے اسے ٹوک دیا۔ ”اسی دھن میں، اسی انداز میں، ترمہ شیریں والے انداز اور دھن میں۔“

مغنیہ نے ایک بار پھر ترمہ شیریں کے انداز میں گانا شروع کر دیا۔

ولی عہد کا تو حال ہی کچھ اور تھا۔ جب گانا ختم ہو گیا تو ایک مغنیہ نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کچھ اور بھی نہیں گے یا نہیں؟“

ولی عہد نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔ شہزادہ ارغون بہت زیادہ پی جانے کے سبب اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھاس کے فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اوپر آسمان کے علاوہ کوئی سا تباں بھی نہیں تھا۔ ولی عہد نے شہزادے کو جھنجھوڑا۔ ”اٹھ شہزادے اٹھ، یہ کہاں سو گیا تو؟“

شہزادے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، بولا۔ ”میں یہیں رہوں گا۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔“

ولی عہد نے خدمت گاروں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ ”شہزادے کو اٹھا کر بڑی کٹھری میں ڈال دو پھر جب اسے ہوش آجائے تو مجھ کو بلوالیانا۔“

خدمت گاروں نے حکم پاتے ہی شہزادے کو دیوچ لیا۔ وہ نشے میں چورا انسان اس وقت تک نشے میں رہا جب تک اسے ننگے فرش پر نہایت بے دردی سے شیخ نہیں دیا گیا۔ خدمت گار کٹھری کو باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ اس بار ولی عہد کو دوا بھی وہاں سے مل گیا۔

فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے شہزادہ ارغون کے سر میں چوٹ آگئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں تکلیف محسوس کی۔ اس نے ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس جگہ کا معائنہ کیا جو ہر طرف سے بندھی، پھر اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ بھی نہیں کھلا۔ اس نے ولی عہد کو آواز دی۔ ”ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟“

اس کی آواز قید خانے ہی میں گونجنے لگی، جیسے کوئی اور اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ ”ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟“

اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ ”ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟“

کی طرح پچھاڑ دیتی ہیں۔“

شہزادہ ارغون ولی عہد کی عاقلانہ باتوں سے لطف حاصل کر رہا تھا۔ محل کے اندرونی حصے سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شہزادے کی توجہ گانے کی طرف منعطف ہو گئی۔ ولی عہد نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”شہزادے! کیا گانا تمہیں بہت زیادہ پسند ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”واہ جناب! کیا گانا بھی کسی کو ناپسند ہو سکتا ہے۔ موسیقی روح کی غذا ہے، اس غذا سے محروم روح خشکی اور بے کیفی کا شکار ہو جائے گی۔“

ولی عہد شہزادہ ارغون کو اندر لے گیا جہاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چند حسینائیں بیٹھی گا رہی تھیں۔ جب یہ دونوں ان کی لاعلمی میں ان کے سروں پر جا کھڑے ہوئے تب بھی انہیں کسی کی آہٹ سنائی نہیں دی۔ وہ گانے میں اس حد تک منہمک تھیں کہ انہوں نے اپنے وجود کے سوا سب کچھ بھلا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد آخر انہیں معلوم ہو گیا اور وہ سب ادھر ادھر دیکھنے لگیں لیکن ولی عہد نے انہیں حکم دیا۔ ”شہزادہ ارغون اس وقت تمہاری محفل میں موجود تمہارے فن سے محفوظ ہونا چاہتا ہے۔“

دونوں گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ان کے خدمت گار دیر تک ان کی خوشامدی کرتے رہے کہ وہ کچھ کھانی لیں لیکن دونوں کچھ کھائے پیے بغیر ہی وہاں بیٹھے رہے۔ اس محفل میں جس انداز میں گایا جا رہا تھا، اس میں ترمہ شیریں کی جھلک پائی جاتی تھی۔ شہزادہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے مغنیہ کو ٹوک دیا، پوچھا۔ ”تو نے یہ فن کس سے سیکھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کسی ایک سے نہیں میرے کئی استاد ہیں۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”اور یہ جواب بھی ابھی تو گار ہی تھی؟“

مغنیہ نے پورا سوال بھی نہیں سنا، بولی۔ ”اس گانگی میں ترمہ شیریں کا فیض شامل ہے کیونکہ اس انداز اور دھن میں ترمہ شیریں سے اچھا کوئی اور نہیں گا سکتا۔“

ولی عہد کو شہزادہ ارغون پر حیرت تھی کہ اس نے انداز اور دھن سے اس کے استاد کا پتا چلا لیا تھا۔ دوسری طرف ترمہ شیریں کے ذکر نے شہزادہ ارغون کے صبر و قرار کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا پہلو بدلتا رہا پھر بولا۔ ”اس انداز اور اس دھن میں ترمہ شیریں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

ولی عہد نے اس کے دل کو ٹوٹنا چاہا، بولا۔ ”میں نے“

سپنس ڈائجسٹ فروری 2017ء

شہزادہ ارغون نے ذرا زور سے آواز دی۔ ”ولی عہد شہزادے! تم کہاں چلے گئے ہو..... آتے کیوں نہیں؟“
لیکن جواب پھر نہیں ملا۔ اب تو وہ گھبرا گیا۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹپکنے اور ٹپکنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر کی جستجو کے بعد اس کو احساس ہوا کہ یہ بدترین قید خانہ ہے، وہ سوچ رہا تھا مگر اس کو قید کیوں کیا گیا؟
وہ ایک بار پھر بیٹھ گیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے وحشت نے زور کیا اور وہ ایک بار پھر تڑپ کر اٹھا اور آوازیں دینے لگا۔ ”ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟ یہ مجھے قید کس نے کیا ہے؟“

اس کو اپنی کسی بات کا بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ ایک ایسا قید خانہ تھا جس میں سلاخ نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، ٹھوس چوحدی دیواروں کے علاوہ ایک دروازہ بھی تھا لیکن اس دروازے میں جبری یا سوراخ نہیں تھا۔
شہزادہ ارغون بیچ و تاب کھاتا تھا، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے قید کس نے کیا ہے لیکن یہ معلوم تھا کہ محل کے اس حصے میں ولی عہد نکودار کے علاوہ کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ اسے اپنی موت صاف نظر آرہی تھی۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کو نہایت چالاک اور ہوشیاری سے راہ سے ہٹایا جا رہا ہے۔

باہر شہزادہ ارغون کی گمشدگی کی خبر گشت کرنے لگی۔ سعد اللہ یہودی سب سے زیادہ فکر مند تھا۔ ولی عہد نکودار نے اضطراری حالت میں جو کر دیا تھا، اس سے خود بھی پریشان تھا۔ ابا قہ خان بھی شہزادہ ارغون کی گمشدگی سے حیران تھا۔ کچھ لوگوں نے ابا قہ خان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شہزادہ ارغون سپاہ سالاری نہ ملنے کی وجہ سے خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے اور وہ جب بھی ظاہر ہوگا ایک باقی کے روپ میں ظاہر ہوگا۔

ولی عہد نکودار کے خاص محرم راز خدمت گار نے جب شہزادہ ارغون کو کھانا پہنچایا تو اس نے اپنا چہرہ ایک چادر میں چھپالیا تھا۔ اس خدمت گار کے ساتھ کئی خدمت گار اور بھی تھے اور ان سبھوں نے اپنے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ یہ ساتھی خدمت گار کو ٹھہری کے باہر کسی ناخوشگوار ہنگامی واقعے کے انتظار میں موجود تھے۔ شہزادہ ارغون نے کھانا لانے والے کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”بتا مجھ کو یہاں کس نے قید کر رکھا ہے؟“

خدمت گار نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر شہزادہ ارغون کی مضبوط گرفت نے اسے نہیں چھوڑا۔ شہزادہ اس

کے چہرے پر سے چادر ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن طاقتور خدمت گار نے سخت مزاحمت کی اور منہ سے عجیب و غریب بے معنی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ ان آوازوں کو سن کر دوسرے خدمت گار تیزی سے اندر داخل ہوئے اور کھانا لانے والے خدمت گار کو شہزادہ ارغون کی گرفت سے آزادی دلا کے باہر نکال کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ اندر شہزادہ ارغون غصے میں چیخ رہا تھا۔ ”بد معاشو! تم یہ سب کس کے ایما اور کس کے حکم سے کر رہے ہو؟ میں باہر نکل کر ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس سازش کے سرغنہ کا نام بتا دو۔“

لیکن خدمت گاروں نے شہزادے کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

ولی عہد نکودار کو جب اس ناخوشگوار واقعے کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو کر شمس الدین جوینی سے ملا اور اس کو پورا واقعہ بتا کے پوچھا۔ ”وزیر محترم! اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ ”پہلے آپ یہ بتائیں کہ ایسا آپ نے کیا کیوں؟“

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”میرے بھائیوں میں شہزادہ ارغون ہی میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش ویرانے میں پھینک دوں۔“

شمس الدین نے کہا۔ ”ولی عہد! آپ کی سوچ غلط ہے۔ اس طرح آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“
ولی عہد نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد میں کسی فکر اور اندیشے کے بغیر حکومت کروں گا۔“

شمس الدین نے مشورہ دیا۔ ”ولی عہد! شہزادہ ارغون زندہ اور آپ کے آس پاس موجود رہے اور آپ اس کی سازشوں اور حرکتوں پر اپنے فکر و تدبیر سے قابو پاتے رہے، یہ ہے ایک کامیاب اور لائق و فائق حکمران کی خوبی۔ اگر آپ نے شہزادہ ارغون کو ہلاک کر دیا تو ہلاک خان کا پورا خانوادہ آپ ہی پر شبہ کرے گا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ دنیا کی ہمدردیاں مظلوم کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ہلاکت کے بعد شہزادہ ارغون مظلوم قرار پائے گا اور آپ ظالم۔ آپ کو اس وقت اس فتنے سے بچنا چاہیے۔“

ولی عہد نے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
وزیر نے جواب دیا۔ ”آپ قید خانے میں جائیے اور شہزادہ ارغون سے منہمی منہمی باتیں کر کے قید خانے سے باہر لائیے۔“

ولی عہد نے بے چینی سے پوچھا۔ ”اور پھر؟ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”میں سب کچھ بتاؤں گا ولی عہد بہادر! آپ پریشان نہ ہوں۔ قید خانے سے باہر نکلتے ہی شہزادہ آپ سے پوچھے گا کہ اس کو قید کس نے کیا تھا؟ آپ اس جرم میں چند ناکارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیں.....“

ولی عہد بات کاٹ کر بولا۔ ”کون سے ناکارہ آدمی؟ اور وہ ناکارہ آدمی اپنے ناکارہ جرم کا اقرار کریں گے ہی کیوں؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”ولی عہد! حکومت اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔ جرم کرنے والے اپنے جرم کا اقرار کب کرتے ہیں، اقرار تو زبردستی کرایا جاتا ہے۔ آپ بھی ان سے زبردستی اقرار جرم کرائیں گے اور اقرار کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“

ولی عہد کو شہزادہ ارغون کی رہائی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، بولا۔ ”وزیر محترم! میرا خیال ہے قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑ دینا بہت بڑی غلطی ہے۔“

وزیر نے سختی سے انکار کیا، بولا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ غلطی پر ہیں۔ اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔“

ولی عہد مجبور ہو گیا۔ ”اچھا، میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن بعد میں اس کے نتائج کا مقابلہ آپ کو کرنا ہوگا۔“

وزیر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“ ولی عہد تحلیلہ میں چلا گیا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنا چاہتا تھا۔ گھنٹوں کے غور و فکر کے بعد وہ وزیر ہی کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے وزیر ہی کے مشورے سے جارنا کارہ آدمیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں ایک تو شامان تھا، مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے والا۔ ایک گویا تھا جو گویا ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا، مسخرہ شاعر، دوسروں کی جو کہنے والا۔ تیسرا بزم خود ایک ایسا عقلمند تھا جو خود تو دوسروں کے دسترخوان سے پیٹ بھرتا تھا مگر دوسروں کو نہایت قیمتی مشورے دیا کرتا تھا۔ یہ تیسرا شخص ہلاکو خان کے بیٹے طوقا کی کا بیٹا الغو خان تھا۔ چوتھا شخص ایک قسمت آزما شمشیر زن تھا۔ سانبیر یا کارہنے والا اور اباقہ خان کی ملازمت میں اس لیے آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جنگوں

میں شریک ہو کر مال و زر حاصل کرے گا۔ اس کا نام قتلغ نویان تھا۔ ولی عہد کو دار نے ان چاروں کو گرفتار کر لیا۔ الغو خان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ زمام حکومت اباقہ خان سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ شامان پر یہ الزام لگا کہ اس نے یہ جھوٹی پیش گوئی کی تھی کہ حکومت آخر کار الغو خان کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

گوئیے پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے اپنے اشعار میں الغو خان کی تعریف کی تھی اور اباقہ خان اور اس کے بیٹوں کو خوب خوب برا بھلا کہا تھا۔ یہ چند اشعار بھی کسی سے کہلو کر تیار رکھے گئے تھے۔

خود ساختہ عقلمند پر یہ الزام لگا کہ وہ اباقہ خان کے خانوادے کی بربادی کے درپے تھا۔ ان چاروں کو گرفتار کر کے انہیں ان کی فرد جرم سنائی گئی۔ چاروں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور اس وقت تک اقرار نہیں کیا جب تک انہیں بدترین جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچا کر، انہیں ناکارہ جرائم کا اقرار کرنے پر مجبور نہیں کر دیا گیا۔

ان چاروں سے باری باری پوچھا گیا۔ ”اب تم سب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

گوئیے نے جواب دیا۔ ”ولی عہد بہادر! ہماری پٹائی کیا ہم سب سے پوچھ کر کی گئی تھی؟“

شمشیر زن نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنے فن اور اپنی طاقت کو اباقہ خان کے نام ہبہ کر دیا ہے اور میں ہی اباقہ خان سے لڑنے کا منصوبہ بناؤں گا، تھوٹو۔ شرم شرم۔“

الغو خان نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”ہم نے ہلاکو خان کی زندگی ہی میں اباقہ خان سے وفاداری کا عہد کیا تھا پھر اب ہم ہی غداری کریں گے، ایسا نہیں ہو سکتا۔“

ان چاروں کو اباقہ خان کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ گوئیے کو راستے ہی میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کر لے گا تو اس کو آزاد کر دیا جائے گا لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ بقیہ تینوں کو اپنا شریک جرم قرار دے گا۔

گوئیے نے وعدہ کر لیا لیکن ساتھ ہی زور دے کر اقرار کرایا کہ وہ اقرار جرم کے بعد آزاد کر دیا جائے گا۔

اباقہ خان نے چاروں سے فرداً فرداً ان کے جرائم کی بابت پوچھا۔ تین نے تو اپنے اوپر عائد کردہ جرائم کو ماننے سے انکار کر دیا مگر گوئیے نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس نے کہا۔ ”چونکہ الغو خان نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب میں زمام حکومت سنبھالوں گا تو تجھے مالا مال کر دوں گا۔“

اباقہ خان نے سختی سے اتر کر گوئیے کے رخسار پر ایک

دل کی دھڑکن

مریض اپنے دوست سے۔ ”کل میرے دل کی حرکت بہت تیز ہوگئی چنانچہ مجھے اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔“

دوست۔ ”پھر ڈاکٹر نے دل کی حرکت کم کرنے کے لیے کیا کیا؟“

مریض۔ ”انہوں نے ایک بوڑھی سی نرس میرے پاس بھیج دی۔“

شرم

بچ چور سے۔ ”تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

چور۔ ”جناب! آتی ہے۔“

بچ۔ ”پھر؟“

چور۔ ”پھر چلی جاتی ہے حضور!“

واقفیت

ایک صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔ ایک لڑکی کو دیکھ کر رک گئے اور بولے۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”ضرور دیکھا ہوگا۔ میں پاگل خانے کی نرس ہوں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اسٹیمپ

ایک دفعہ ایک صاحب ساری رات سوچتے رہے کہ میں کراچی خط بھیجتا ہوں تو آٹھ روپے لگتے ہیں اور خود جاتا ہوں تو چار سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں، کیوں نہ میں بھی ڈاک کے ذریعے پہنچ جاؤں۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے نہادھو کر ڈاک خانے گئے۔ آٹھ روپے کا ٹکٹ خرید کر ماتھے پر لگایا اور ایک بڑا سالیئر بکس دیکھ کر اس میں سر ڈال دیا۔ جب ڈاک ڈاک ٹکٹ لگانے پہنچا تو اس نے خیال کیا کہ کوئی چور ہے جو ڈاک چوری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کر مرمت شروع کر دی۔ وہ صاحب جب پانچ چھ جوتے کھا چکے تو چلا کر کہنے لگے۔

”اب بس بھی کرو، ٹکٹ تو میں نے ایک ہی لگایا ہے اور مہر میں تم اتنی لگائے جا رہے ہو۔“

مرسلہ۔ محمد الیاس، قلعہ سبیلہ بلوچستان

طمانچہ رسید کر دیا اور پوچھا۔ ”شہزادہ ارغون کہاں ہے؟“

گوئیے کی سٹی کم ہو چکی تھی، بولا۔ ”میں کیا جانوں شہزادہ ارغون کہاں ہے۔“

اس کے بعد گوئیے نے ولی عہد کی طرف دیکھا، ولی عہد نکودار نے جلدی جلدی عرض کیا۔ ”پدر بزرگوار! میں اس شخص کو تحفیے میں لیے جا رہا ہوں تاکہ تحفیے میں اس سے شہزادہ ارغون کا پتا معلوم کروں۔“

ابا قہ خان نے مشورہ دیا۔ ”یہ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ اس سے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بات کرنا اور دیکھنا اس پر کڑی نظریں بھی رکھنا تاکہ یہ مسخرہ بھاگ نہ سکے۔“

ولی عہد اس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے محل کی راہداری میں چلا گیا، بولا۔ ”دیکھ خبردار جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے اس سے بھر نہ جانا۔ میں تجھ کو شہزادے ارغون کے قید خانے میں لے جاؤں گا اور یہ ظاہر کروں گا کہ شہزادہ ارغون تیری نشاندہی اور راہنمائی میں برآمد کر لیا گیا ہے۔ جب یہ سارا کھیل اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا تو تجھ کو چھوڑ دیا جائے گا۔“

اس کے بعد ولی عہد نے پانچ سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیا اور گوئیے کی راہنمائی میں شہزادہ ارغون کو قید خانے سے آزاد کرالیا۔

شہزادہ ارغون نے ولی عہد بھائی کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ یہاں کہاں؟ مجھے یہاں کس نے قید کیا تھا؟“

ولی عہد نکودار نے شہزادے کو تسلی دی، بولا۔

”شہزادے! تم مت گھبرانا۔ سازشی سارے کے سارے پکڑے گئے ہیں۔“

اس کے بعد اس نے پوری کہانی سنا دی اور کہا۔

”شہزادے! تم یقین کرو تمہاری گمشدگی اور سازشیوں کا پتا لگانے میں مجھے بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ اگر یہ شخص گوئیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا ساتھ نہ دیتا تو ہم مشکل ہی سے تم تک پہنچتے۔“

گوئیے نے ولی عہد کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورا۔ ”اور میرا انعام..... مجھے یہیں چھوڑ دیا جائے۔“

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”نہیں، تمہیں یہاں نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

ولی عہد، شہزادہ ارغون اور گوئیے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے دوبارہ ابا قہ خان کے دربار میں پہنچ گیا۔ ولی عہد نے گوئیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! میں اس گوئیے کی نشاندہی پر شہزادہ ارغون کو برآمد کرنے میں

کامیاب ہو گیا۔“
 ابا قہ خان نے طیش میں کہا۔ ”تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم مجھ کو موم سمجھتے ہو؟ میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں ہر ایک کو اس کے کیے کی عبرت ناک سزا دوں گا۔“
 گویا چیخا۔ ”لیکن حضور والا! مجھ کو چھوڑ کر، کیونکہ ولی عہد بہادر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں.....“

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ ولی عہد کے اشارے پر اس کے آدی گویے کو کھینچ کر باہر لے گئے۔
 گویے کی عدم موجودگی میں ولی عہد نے ابا قہ خان کو سمجھایا۔ ”میں نے گویے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ سچ سچ اس سازش کی بابت بتا دے گا تو میں اسے معاف کر دوں گا۔“
 ابا قہ خان نے کہا۔ ”لیکن میں اسے معاف نہیں کروں گا۔“

ولی عہد نے کہا۔ ”اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی معاف نہ کرتا۔“
 گویا باہر نکل کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”ولی عہد نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، چھوڑ دینے کا لالچ دے کر مجھ سے جھوٹ بلوایا گیا اور اب مجھے میرے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔“

اس کی اس چیخ پکار کو اس نام نہاد سازش کے سرغنہ الفوخان کے بھائی بایدو نے بھی سنا۔ بایدو نہایت ہوشیار اور سمجھ دار جوان تھا۔ ہلاکو خان کا بیٹا طر قانی خان اپنے بیٹے بایدو پر بہت ناز کرتا تھا۔ بایدو بھاگ کر گویے کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔ ”گویے! سچ سچ بتا یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا اس سازش میں میرا بے وقوف بھائی الفوخا شامل ہے؟“

گویے نے جواب دیا۔ ”جھوٹ۔ سراسر جھوٹ ہے۔ مجھ سے ولی عہد نے جھوٹ بلوایا ہے۔“

لیکن اسی وقت ولی عہد کو دار کے ایک حمایتی نے گویے کو قتل کر دیا۔ بایدو نے اس شخص کو گریبان سے پکڑ لیا، بولا۔ ”ظالم! یہ تو نے کیا کر دیا۔ مجھ کو تو اس سے چند راز اگلوانے تھے۔“

گویے کے قاتل نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور جواب دیا۔ ”محترم ایل خان نے اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔“

بایدو نے اس کو پھر بھی نہیں چھوڑا اور اس کے گریبان کو جھٹکے دیتا رہا۔ اسی دوران ولی عہد بھی وہاں پہنچ گیا اور گویے کو مقتول دیکھ کر پوچھا۔ ”اس کو کس نے قتل کر دیا؟“
 بایدو نے گویے کے قاتل کو نیچے گرا دیا، بولا۔ ”اس

نے..... تیرے اس حمایتی نے قتل کیا ہے اسے اور میں اس وقت قتل کیا ہے جب یہ تیری سازش کا بھانڈا پھوڑنے والا تھا۔“
 ولی عہد نے اپنی نکوار نیام سے نکال لی، بولا۔ ”بایدو! اس کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے بھی قتل کر دوں گا۔ میرا خیال ہے اپنے بھائی الفوکی سازش میں تو بھی شریک ہے۔“
 بایدو نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

ولی عہد نے بھی سچ کر جواب دیا۔ ”یہ سچ ہے۔“
 بایدو نے کہا۔ ”ہم سب شہزادہ ارغون کے حمایتی ہیں اور تو شہزادہ ارغون سے حسد کرتا ہے۔ اسی حسد نے تجھے ارغون کے حمایتیوں کا دشمن بنا دیا ہے۔“

ولی عہد نے بایدو کو نرمی سے سمجھایا۔ ”بایدو! پاگل نہ بنو۔ تیرے چچا ابا قہ خان نے سازشیں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تیری حمایت خود تجھے بھی موت سے قریب نہ کر دے۔“

موقع شناس بایدو نرم پڑ گیا۔ ”اگر چچا ابا قہ خان نے ان بے گناہ مجرموں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے تو میں خاموش ہو جاؤں گا لیکن چچا ابا قہ خان کو اصل واقعات کا علم نہیں ہے شاید۔“

ولی عہد نے طنز کیا۔ ”اگر پدر محترم کو صحیح واقعات کا علم نہیں ہے تو، تو انہیں صحیح واقعات بتا دے جا کر۔ ایک لائق حکمران، ایک مثالی فاتح تیری نظر میں غافل اور لاعلم ہے۔“
 بایدو، ولی عہد کے الزامات سے خوفزدہ تھا، بولا۔ ”ولی عہد بہادر! چچا ابا قہ خان کو غافل اور لاعلم تم نے کہا ہے، میں نے نہیں کہا۔“

اسی وقت شامان، الفو اور قسطنق نویان رسیوں میں جکڑے ہوئے سامنے سے گزرے۔ بایدو تھملا گیا، بولا۔ ”اپنے وفادار ساتھیوں کو ہلاک کر دینا بہت بڑا ظلم ہے۔“

اب اس کو شہزادہ ارغون کی تلاش تھی۔ قیدیوں کے پیچھے وہ بھی نمودار ہوا۔ وہ شہزادہ ارغون کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا، بولا۔ ”شہزادے! یہ ان تینوں کو کہاں لیے جا رہے ہیں؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”ان سب نے میرے اور حکومت کے خلاف سازش کی اور اب اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔“

بایدو نے بڑے کرب سے کہا۔ ”شہزادے! یہ جھوٹ ہے، یہ بے گناہ ہیں۔ انہوں نے تیرے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ یہ سازش کسی اور ہی کی ہے۔ انہیں بچالے شہزادے! یہ بے گناہ ہیں۔“

ہیں کہ میرے سارے حمایتی ہلاک کر دیے جائیں؟“
ابا قہ خان خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا، بولا۔
”اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ولی عہد کدو دار نے آخر اتنی
بڑی سازش کی کیوں؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”نکودار میرا بھائی
ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ میں جملہ مغل افواج کا سپاہ سالار بنا
دیا جاؤں، وہ مجھ کو اپنے اس پہلے مرحلے میں ہی میرے
اچھے اور مخلص دوستوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔“

ابا قہ خان نے اپنا سر اور ٹھوڑی، دونوں ہی اپنی
ہتھیلیوں پر ٹکا دیے اور پوچھا۔ ”کیا تم دونوں سچی باتیں کر
رہے ہو؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”میں بالکل سچ کہہ
رہا ہوں باوا جان! آپ میری باتوں پر یقین کیوں نہیں
کرتے؟ کیا ہم پیدا کنی جھوٹے اور اجڑے ہیں۔ عاقبت نا
اندیش۔“

ابا قہ خان نے تالی بجا کر خدمت گاروں کو طلب
کرایا، اس نے انہیں حکم دیا۔ ”تم لوگ میرا ایک پروانہ
لے کر فوراً ان تینوں مجرموں کے پاس پہنچ جاؤ ورنہ تین بے
گناہ انسان خواہ مخواہ قبروں میں دفن کر دیے جائیں گے۔“

انہیں ابا قہ خان نے تینوں کا فرمان رہائی دیا اور اسی
وقت وہ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

تینوں کی قبریں کھودی جا چکی تھیں، انہیں قبروں کے
پاس کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں یہاں بھی بیٹھی کہہ رہے
تھے۔ ”لوگو! ہم بے گناہ ہیں، ہم پر تہمت لگائی گئی ہے، ہم
پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔“

ولی عہد کدو دار انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اس نے
جواب دیا۔ ”گو تیار کیا، اس نے تم تینوں کو شریک جرم قرار
دیا تھا.....“

اسی دوران ولی عہد کدو دار نے اپنے پیچھے گھوڑوں کے
سر پٹ دوڑنے کی آوازیں سنیں۔ اس نے پچھیں تیس
سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا اور حکم دیا۔ ”تینوں کو
قبروں میں گرا دیا جائے۔“

تینوں کے ہاتھ ان کی پشتوں پر باندھ دیے گئے۔
ولی عہد کدو دار کے حکم پر انہیں قبروں میں گرا دیا گیا لیکن اسی
وقت شہزادہ ارغون کے آدمیوں نے قبروں کو اپنے گھیرے
میں لے لیا۔ شہزادہ ارغون چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ”دوستو!
محترم اہل خانہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔“

شہزادہ ارغون نے نفرت سے منہ بنایا، بولا۔
”انہوں نے مجھے ایک ایسی کوشٹری میں بند کر دیا تھا جس میں
ہوا کا بھی گزر نہ تھا، اب انہیں بھی قبروں میں زندہ دفن کر دیا
جائے گا۔“

بایدو نے اصرار کیا۔ ”شہزادے! میری بات سمجھنے کی
کوشش کر۔ میں تیرے چچا کا بیٹا بھی ہوں اور تیرا دوست بھی۔
میں تیرا برا نہیں چاہتا۔ میں تجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔“
شہزادے نے پوچھا۔ ”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

بایدو نے گویے کی حق گوئی اور موت کا چشم دید واقعہ
سنا کے بیان کیا۔ ”یہ جھوٹی سازش ہے، یہ سب بے گناہ
ہیں۔ میں تیرے ساتھ چچا ابا قہ خان کے پاس چلتا ہوں اور
ساری باتیں خود کر لوں گا۔“

ولی عہد کدو دار ان دونوں کی باتیں غور سے سن رہا اور
جب اس نے یہ دیکھا کہ دونوں میں اتحاد ہونے ہی والا ہے
تو درمیان میں مداخلت کر دی، بولا۔ ”شہزادے ارغون! تو
میرا بھائی ہے اور بایدو چچا کا بیٹا ہے اور چچا کے بیٹے
کا مطلب ہوتا ہے دشمن۔ یہ تیرا، میرا اور ہم سب کا دشمن
ہے، اس کی باتوں میں نہ آ۔“

بایدو نے شہزادے ارغون کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو
بھگاتا ہوا ولی عہد سے دور لے گیا اور وہاں شہزادے کو کچھ
اس طرح سمجھایا کہ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور
قید کیے جانے سے پہلے کے وہ واقعات بھی یاد آ گئے جب
وہ نشے میں مدہوش سا ہوا جا رہا تھا کہ کسی آواز نے خدمت
گاروں کو حکم دیا تھا کہ شہزادے کو کسی کوشٹری میں قید کر دیا
جائے۔ وہ آواز شہزادہ کدو دار کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی۔

ولی عہد بھاگا بھاگا تینوں مجرموں کے پیچھے پہنچا۔ اس
کی یہ کوشش تھی کہ تینوں کو جلد از جلد قبروں میں زندہ دفن کر
دیا جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جتنی بھی جلدی
ممکن ہو، تینوں کے لیے قبریں کھود کر تیار کر لی جائیں۔

دوسری طرف شہزادہ ارغون اور بایدو، ابا قہ خان کو
سمجھا رہے تھے اور شہزادہ ارغون تینوں مجرموں کی سفارش
بڑے جذباتی انداز اور لہجے میں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
”باوا جان! اگر وہ میرے دشمن بھی ہیں تب بھی میں انہیں
معاف کرتا ہوں۔ اپنے جد اعلیٰ چنگیز خان کے نام پر ان
تینوں کو بچا لیجیے۔“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”لیکن میں اپنے حکم کو کس
طرح منسوخ کر دوں؟“

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس میں خوش

ولی عہد نے جھنجلا کر کہا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے۔ قبروں کو مٹی سے پاٹ دو۔“

لیکن شہزادہ ارغون کے ساتھیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے تینوں کو قبروں کے اندر سے نکال لیا اور ان کے پشت پر بندھے ہاتھ کھول دیے۔ بایدو نے اپنے بھائی الغو خان سے پوچھا۔ ”بھائی الغو! تیرے چوٹ تو نہیں آئی؟“

الغو کی ناک زخمی ہو گئی تھی۔ قبر میں وہ اوندھے منہ گرا تھا جس سے ناک میں ایک نیکیلا پتھر مٹس گیا تھا۔ بایدو نے اپنے بھائی کی ناک کا خون اپنی آستین سے پونچھ کر حکم دیا۔ ”جاس کو پانی سے دھو ڈال، ٹھیک ہو جائے گا۔“

ولی عہد نگودار سینہ تان کر شہزادہ ارغون اور بایدو کے پاس جا کھڑا ہوا، بولا۔ ”میں پدر محترم کا وہ فرمان دیکھنا چاہتا ہوں جس نے ان کے پہلے فرمان کو منسوخ کر دیا۔“

شہزادہ ارغون نے اباقہ خان کا فرمان ولی عہد کو دکھا دیا۔

ولی عہد نے شہزادہ ارغون سے پوچھا۔ ”مگر یہ تو خود اپنے مجرموں کو معافی دلانے کیوں آگیا؟“

شہزادے ارغون نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”کیونکہ میں انہی مجرموں سے اپنے دشمنوں کے ہٹانے کا کام لوں گا۔“ ولی عہد نے حیرت سے کہا۔ ”میں تیری باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔“

شہزادے ارغون نے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے ولی عہد کی باتوں کا مطلب خوب سمجھ لیا ہے۔“

ولی عہد نے زور دے کر کہا۔ ”لیکن یہ تینوں تیرے دشمن ہیں ارغون۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”صرف دشمن ہی نہیں، پیارے دشمن ہیں۔ میں نے ان کی دشمنی اور دوستی کو سمجھ لیا ہے۔“

ولی عہد کا چہرہ اتر گیا، وہ بہت اداس ہو چکا تھا، بولا۔ ”ارغون! ایک نہ ایک دن تو بہت پیچھتائے گا۔“

بایدو ابھی تک اپنے بھائی الغو کی ناک ہی درست کر رہا تھا۔

ولی عہد نے کہا۔ ”میں باوا جان سے خوب خوب جھگڑوں گا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ ایک فرمان دیتے ہیں اور دوسرے فرمان سے اسے منسوخ کر دیتے ہیں۔ یہ تو خاصی مضحکہ خیز بات ہو گئی۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”اور میں بھی یہ باور کراتا ہوں کہ اب ہم بے وقوف نہیں بن سکتے۔“

بایدو نے دور سے پوچھا۔ ”کون بے وقوف بن رہا ہے؟“

شہزادہ ارغون اور بایدو خان جب اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس جا رہے تھے تو ان کی چالوں سے ایک قسم کی تازگی اور رخ مندی کا احساس ہوتا تھا اور ولی عہد نگودار اور اس کے ساتھیوں کی چالوں سے تھکاوٹ اور شکست خوردگی کا احساس ہوتا تھا یہ سب اپنے باپ اباقہ خان کی خدمت میں جا رہے تھے۔

باقہ خان انہیں راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ شمس الدین جوینی بھی تھا۔ اباقہ خان اپنے اہل بلی گھوڑے پر سوار اپنے بیٹوں کی چٹقلش کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کو یہ خوف تھا کہ کہیں اس کے فرمان رہائی سے پہلے ہی تینوں کو زندہ دفن نہ کر دیا جائے لیکن جب اس نے سب کو صحیح سلامت دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کو ولی عہد پر غصہ تھا کہ اس نے ایسی سازش کیوں کی؟

شہزادہ ارغون اور بایدو نے اباقہ خان کو آتے دیکھا تو دونوں بڑی گرم جوشی سے آگے بڑھے اور اباقہ خان کی رکاب پکڑ لی۔ بھتیجا الغو شرمندہ تھا، اس نے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ ولی عہد نگودار کو اپنی ناک کی پر جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے اباقہ خان سے شکایت کی۔ ”باوا جان! یہ تینوں سازش تھے، آپ نے انہیں معاف کیوں کر دیا؟“

باقہ خان نے جواب دیا۔ ”محل چل، وہاں تفصیلی بات کروں گا۔“

الغو نے خلاف توقع اپنی زبان کھولی۔ ”ولی عہد بہادر! آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے، میں نے کوئی سازش نہیں کی اور نہ ہی کسی سازش میں شریک رہا ہوں۔ میں ایک نکما انسان ہوں، ست اور کابل انسان۔ دوسروں کے دسترخوان سے اپنا پیٹ بھرنے والا، ایک پست حوصلہ انسان۔ سازش تو وہ لوگ کرتے ہیں جن میں حوصلہ ہوتا ہے اور جو کچھ بننا چاہتے ہیں۔“

باقہ خان نے الغو کو ملامت کی۔ ”تو میرا بھتیجا ہے اور افسوس کہ تو نکما ہے اگر تو نکما نہ ہوتا تو شاید تجھے اتنی آسانی سے کسی سازش میں ملوث نہ کیا جاسکتا۔“

شمس الدین جوینی نے سب کو مفاہمانہ مشورہ دیا۔ ”شہزادوں کو اتفاق سے رہنا چاہیے۔ اگر گھر میں پھوٹ پڑ گئی تو دشمن سے مقابلہ کس طرح ہوگا؟“

شہزادہ وزیر سے ناخوش تھا، اس کا خیال تھا کہ اس سازش کے پس پردہ جوینی ہی کی ذات ہے۔ اس نے

”اور ولی عہد نکودار! تم پر واجب ہے کہ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کا خاص خیال رکھو۔ سازش کس نے کی اور کس کے خلاف کی، اس کو بھلا دو اور نئے سرے سے اتحاد اور یگانگت کا پیمانہ باندھو۔“

شہزادہ ارغون کھڑا ہو گیا۔ ”باوا جان! اگر شکایت نہ سمجھی جائے تو میں اپنے دل کی خلش آپ پر ظاہر کر دوں۔“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”تم سب کو جو کچھ کہنا سنا ہو، اس وقت کہہ سن لو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ میری آنکھیں بند ہوں اور حکومت کا شیرازہ ہی بکھر جائے۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”میں نے ہرات کی جنگ میں چغتائیوں کو شکست دی اور ترمہ شیریں کو سونجا حق سے چھین لایا۔ میرا خیال تھا کہ میری ان خدمات کے صلے میں مجھے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار بنا دیا جائے گا لیکن مجھے اس سے محروم رکھا گیا۔“

ابا قہ خان نے اعلان کیا۔ ”میں نے تجھے آج سے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کیا۔“

شہزادہ ارغون اپنے باپ ابا قہ خان کی طرف بڑھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بولا۔ ”میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنے بھائی نکودار کا وفادار رہوں گا۔“

الغوا خان بھی سب سے پہلے شہزادہ ارغون کی طرف بڑھا اور اس کو مبارکباد پیش کی۔ ابا قہ خان مسکرایا اور کہا۔ ”الغوا! تو شاید اس طرح ارغون کے دسترخوان پر اپنی جگہ بنا رہا ہے۔“

بایدو خان نے اپنے بھائی کو ملاحت کی۔ ”بھائی الغوا! تم مجھے ہر جگہ شرمندہ کراتے ہو۔ تم کوار سنہال کر میدان میں کیوں نہیں نکلتے۔ ہمارا رزق کوار سے وابستہ ہے، اب نکمہ پن چھوڑو اور ہتھیاروں سے لیس ہو جاؤ۔“

ابا قہ خان بہادر قتلق نویان سے مخاطب ہوا، بولا۔ ”قتلق نویان! میں نے تجھ پر ہمیشہ ہی فخر کیا ہے۔ تو وعدہ کر کہ تو ہمیشہ نکودار کا وفادار رہے گا۔“

قتلق نویان نے کمر سے بندھی ہوئی پٹی کھول کر شہزادہ نکودار کی طرف بڑھا دی، بولا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ یہ پٹی اپنے ہاتھ سے میری کمر سے باندھ دیجیے تاکہ میں ان ہاتھوں کا ہمیشہ وفادار رہوں۔“

ولی عہد نکودار نے پٹی اپنے ہاتھ سے قتلق نویان کی کمر سے باندھ دی۔ قتلق نویان ولی عہد کے روبرو دوڑانو بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ادب و احترام سے بوسہ دیا، بولا۔ ”ان ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لیے میں اپنی

پیشانی پر تل ڈال کر وزیر کو دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔ ”وزیر محترم! آپ خاموش رہیں کیونکہ اس نفاق اور نا اتفاقی میں آپ ہی کی ذات کا فرما ہے۔“

ابا قہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھور کر دیکھا۔ ”ارغون! جوینی ایک مخلص انسان ہے۔ اس پر کسی قسم کا الزام لگا کر خود کو میری نظروں سے نہ گرا۔ تم لوگ جوینی کی فراست سے کام لے کر کارآمد بن سکتے ہو نہ کہ اس کو دشمن بنا کر نقصان اٹھاؤ۔“

شمس الدین جوینی نے نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شہزادے کو میری طرف سے کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے جو دور ہو جائے گی اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں۔ شہزادہ ارغون کو میری بابت کم از کم یہ تو سوچنا ہی چاہیے کہ میرا عروج، میرا اقبال، میرا مقام جو کچھ بھی ہے اس حکومت کے بقا اور استحکام سے وابستہ ہے۔“

ابا قہ خان نے ان سب کو اپنے خاص ہال نما کمرے میں لے جا کر حکم دیا کہ اس کے تیسرے بیٹے کیکا تو خان کو حاضر کیا جائے۔

جب کیکا تو خان بھی آ گیا تو ابا قہ خان نے ان سب کو سمجھایا۔ ”دیکھو، جب چنگیز خان نے جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل کو متحد اور متفق کر دیا تھا تو اس نے دنیا کو فتح کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک ہم میں اتحاد برقرار رہا، دنیا ہم سے مرعوب اور لرزدہ بر اندام رہی لیکن پھر ہم میں نفاق اور نا اتفاقی نے گھر کر لیا اور ہم آپس ہی میں برسر پیکار ہو گئے تو ہمارا رعب بھی کم ہو گیا اور مصر کے مملوک ہمارے مقابلے پر آ گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے مشہور جنرل ققط بوغا کو شکست ہو گئی ہے اور حقیقی بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے، یہ ساری ادبار کی نشانیاں ہیں۔“

ابا قہ خان بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا اور ولی عہد نکودار کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کر دیا، پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ یہ تمہارا کون ہے؟“

شہزادہ ارغون اور کیکا تو خان نے جواب دیا۔ ”ہمارا بڑا بھائی اور ولی عہد سلطنت۔“

ان کے بعد الغوا اور بایدو نے جواب دیا۔ ”شہزادہ، ولی عہد شہزادہ ہمارا چچا زاد بھائی۔“

ابا قہ خان نے کہا۔ ”تم سب کا یہ فرض ہے کہ اس کا احترام کرو۔ اس کا حکم مانو اور کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے آپس میں نا اتفاقی پیدا ہو۔“ اور ولی عہد نکودار سے کہا۔

جان تک واؤ پر لگا دوں گا۔“
اب ابا قہ خان شامان سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں شامان! اب تو بتا کہ ولی عہد نکودار کیسا حکمران ثابت ہوگا اور اس سلطنت کے استحکام اور زوال کا کیا حال رہے گا؟“
شامان نے اپنی آنکھیں بند کر کے گردن کو جھٹکا اور ہاتھوں کو ہوا میں بے معنی حرکت دیتا رہا، پھر آنکھیں کھول کر بولا۔ ”ابھی ابھی مجھے پراسرار روحوں نے جو کچھ بتایا ہے اس کو صاف صاف بتا دوں گا تو آپ اور شہزادگان اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔“

نکودار کے سب سے چھوٹے بھائی کینا تو خان نے کہا۔ ”نہیں، ہم سب توجہ اور حوصلے سے نہیں گے۔ تجھ کو جو کچھ نظر آیا ہے، اسے صاف صاف بتا دے۔“
شامان نے کہا۔ ”چونکہ مجھ پر ایک الزام لگ چکا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ سچی بات کہہ کر قتل ہو جاؤں۔“

ابا قہ خان نے وعدہ کیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کسی بھی بات پر تجھے کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔“
شامان نے نہایت احتیاط سے بولنا شروع کر دیا۔

”پراسرار روحوں نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا ہے کہ بھائیوں کے ایک دوسرے سے دل صاف نہیں ہیں، یہ آپس میں جھگڑیں گے، دو بھائی اپنے باپ دادا کے مسلک ترک کر دیں گے لیکن حکومت کو استحکام حاصل ہوگا۔“

ابا قہ خان جھنجھلا کر بولا۔ ”اچھا، اب بند کر اپنی بکواس، اگر میں نے جاں بخشی نہ کی ہوتی تو تجھے اس منحوس پیش گوئی پر قتل کر دیتا۔“

شمس الدین جوینی سب کی باتیں سن رہا تھا اور خاموش تھا۔ ابا قہ خان نے اس سے پوچھا۔ ”شمس الدین! تو کیوں خاموش ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟“
وزیر نے جواب دیا۔ ”میں شامان کی باتوں پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان دنوں، مہینوں اور سالوں کا حال کس طرح بتا سکتا ہے جبکہ اسے چند ساعتوں بعد پیش آنے والے واقعات کا بھی علم حاصل نہیں۔“

ابا قہ خان نے شامان کو اسی وقت نکال باہر کیا اور یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی۔ ”آپس میں محبت کرو اور کہینے اور بغض کو اپنے دلوں سے نکال دو، ورنہ بچھتاؤ گے۔ میرا کیا ہے آج ہوں بکل نہیں ہوں۔“

جب محفل برخاست ہوئی تو بظاہر شہزادوں کے چہرے بشاش تھے اور وہ خوش خوش جارہے تھے مگر باید و اور الفو کے چہرے فکر و تردید کی غمازی کر رہے تھے۔ ان دونوں

نے باہر نکل کر ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر شہزادہ ارغون کا انتظار کیا، ولی عہد نکودار نے انہیں کھڑے دیکھا تو آگے بڑھ گیا۔ شمس الدین جوینی نے ان دونوں کی پابست ولی عہد نکودار کو سمجھایا۔ ”ولی عہد بہادر! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں کے دلوں میں کھوٹ ہے، یہ دونوں کسی بھی وقت آپ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔“

ولی عہد نکودار نے جواب دیا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں ان سے ہوشیار رہوں گا۔“
نکودار کے سب سے چھوٹے بھائی کینا تو خان نے کہا۔ ”میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ چچا طر قائی کے بیٹوں کے دلوں میں حکومت کا سودا سمایا ہوا ہے بس وہ وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔“

شمس الدین جوینی نے اس کی تائید تو نہیں کی لیکن دل سے اس کا قائل ہو گیا۔
کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ باید و نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔“
اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد باید و اور الفو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟“
ارغون نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں ایسا تو کرادیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔“
ارغون نے کہا۔ ”ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔“
سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ باید و نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔“
اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد باید و اور الفو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟“
ارغون نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں ایسا تو کرادیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔“
ارغون نے کہا۔ ”ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ باید و نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔“
اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد باید و اور الفو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟“
ارغون نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں ایسا تو کرادیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔“
ارغون نے کہا۔ ”ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ باید و نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔“
اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد باید و اور الفو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟“
ارغون نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں ایسا تو کرادیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔“
ارغون نے کہا۔ ”ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ باید و نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔“
اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد باید و اور الفو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟“
ارغون نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ ”پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں ایسا تو کرادیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔“
ارغون نے کہا۔ ”ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

میری دعا ہے کہ خدا تجھ کو برائی کو برائی سمجھنے کی حد سے نکال کر
برا کہنے اور برائی کو روکنے کی حدود میں داخل فرمادے۔“
نکو دار شیخ کے پاس سے اٹھا تو بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ
جیسے تیسے محل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام
ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ شاہی محلات کا سلسلہ دور تک چلا گیا
تھا۔ انہی محلات میں بایدوا اور الفو کے محل بھی تھے۔ بایدوا کا
خاندان محرابی دروازوں والے محل میں رہتا تھا۔ محرابی شکل کا
پھانک ہر وقت بند رہتا تھا۔ اس پھانک میں ایک چھوٹا سا
دروازہ بھی تھا۔ بایدوا اور اس کے خاندان والے آمد و رفت
کے لیے اسی چھوٹے دروازے کو استعمال کرتے تھے۔
پھانک کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے درختوں کا ایک گھٹا
سلسلہ تھا۔ اس حصے میں بایدوا خان کے خاندان کے بچے ہر
وقت کھیل کود میں مشغول رہتے اور اسی حصے میں وہ تلوار
بازی کی مشقیں بھی کیا کرتے تھے۔ یہاں پھولوں کی
روشیں بھی تھیں، کئی قسموں کے گلاب اور جوہی، چنبیلی کے
پودوں کی بہتات تھی۔

جب ولی عہد نکودار اس کے سامنے سے گزرا تو
اچانک الفو اس کے سامنے آگیا اور بولا۔ ”ولی عہد بہادر؟
کیا آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں گے؟“

نکو دار نے پوچھا۔ ”کیوں؟ کوئی خاص بات؟“
الفو نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں میں جو غلط فہمیاں
پیدا ہو گئی ہیں، میں انہیں دور کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

نکو دار نے کہا۔ ”لیکن میرے دل میں تو کوئی غلط فہمی نہیں۔“
الفو نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”نکو دار ولی عہد
بہادر! آپ ٹھہرے ایل خان کے بیٹے، میں ایک معمولی
آدمی ہوں لیکن خدا نے مجھے عقل بہت زیادہ دے دی ہے،
آپ چاہیں تو میں آپ کو مفت مشورے دے سکتا ہوں۔
ان پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا۔“

ولی عہد نکودار کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آیا، بولا۔
”اچھا چلو میں کچھ دیر تو تمہارے پاس بیٹھ ہی سکتا ہوں۔“
الفو، نکودار کو گلابوں کی روشوں میں لے گیا اور وہاں
سبزے پر بیٹھ کر باتیں کرتے لگا۔

الفو نے کہا۔ ”ولی عہد بہادر! میں اپنے نکلے پن سے
عاجز آچکا ہوں، میں کسی حکمران کا مشیر بننا چاہتا ہوں، آپ
چاہیں تو مجھے اپنا مشیر بنالیں۔ میں بہت کارآمد انسان ہوں
لیکن دوسروں کے لیے، اپنے لیے نہیں۔“

نکو دار نے پوچھا۔ ”اس وقت تجھے کون سی بات کرنا ہے؟“
الفو نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا

قدم اٹھائے گا۔“
ارغون نے جوش میں جواب دیا۔ ”اگر وہ ایسا کرے گا تو
سخت تلخی کرے گا کیونکہ جملہ افواج تو میرے قبضے میں ہیں۔“
سعد اللہ یہودی بہت بے چین اور اضطرابی حالت
میں تھا، بولا۔ ”مگر ایک بات کا بطور خاص خیال رکھیے گا۔
آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہو انتہائی صبر اور تحمل سے کیجیے گا۔ دشمنی
کسی سے بھی نہیں، دوستی سبھی سے، بظاہر آپ کا یہی نصب
العین ہونا چاہیے مگر اندر سے دوست کسی کے بھی نہیں، دشمن
سب کے، پرکار بند رہنا ہوگا۔ آپ کی زبان کچھ کہے گی اور
دل کچھ اور کرے گا۔ آپ بظاہر سب پر اعتماد کریں گے
لیکن یہ باطن کسی پر اعتماد نہیں کریں گے۔“
شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کی عقل و فراست کا
بے حد قائل تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں تیرے مشوروں پر عمل
کر رہا ہوں گا اور جب میں برسرِ اقتدار آ جاؤں گا تو تجھ کو اپنا
وزیر بنالوں گا۔“

☆☆☆

ولی عہد نکودار شیخ سعدی کی خدمت میں کئی گھنٹے بیٹھا
رہا۔ اس فقیر منش شخص کی ذات بڑی پرکشش تھی۔ یہاں دور
دور سے لوگ آتے تھے اور علم و دانش کی حیرت انگیز داستانیں اور
حکایتیں گرہ میں باندھ کر لے جاتے تھے۔ شیخ سعدی نے
نکو دار کو سمجھایا کہ تیرا باپ کب تک اسلام سے بچتا رہے گا۔
مہذب دنیا پر غیر مہذب لوگ کب تک حکومت کریں گے؟
ولی عہد نکودار نے عرض کیا۔ ”شیخ! میں اپنے باپ
سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اور خود تو نے کیا طے کیا ہے؟“
نکو دار نے جواب دیا۔ ”جب تک میرا باپ زندہ
ہے میں اس کا تابع ہوں۔ جب وہ نہیں ہوگا تب میں خود
کوئی فیصلہ کر لوں گا۔“

شیخ اس کو دیر تک نصیحتیں کرتے رہے، انہوں نے
کہا۔ ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں جو بویا جائے گا
آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔“

نکو دار خوفزدہ ہو گیا، بولا۔ ”شیخ! میں اپنے آبائی دین
سے مطمئن نہیں ہوں لیکن باپ کی موجودگی میں اپنا آبائی
دین بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں برائی کو برائی ہی سمجھتا ہوں اور
اگر برائی کو اپنی زبان سے برا کہہ نہیں سکتا تو دل میں اس کو
برا ضرور سمجھتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اسلام میں اس کا بھی
ثواب ہے۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”بھیک اس کا بھی ثواب ہے اور

ہوں کہ بایدو خان اور میں، یعنی ہم دونوں بھائی آپ کے دوست ہیں۔“

نکودار نے چڑ کر کہا۔ ”میں کب یہ کہتا ہوں کہ تم دونوں میرے دشمن ہو۔“

الغو نے کہا۔ ”مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نکما ہوں، کوئی کام نہیں کرتا۔ میں ان طعنوں سے تنگ آچکا ہوں اور اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی کام کروں، میں بنیادی طور پر سپاہی نہیں ہوں، مشیر یا تاجر ہوں۔ عنقریب میں ہندوستان جانے والا ہوں۔ وہاں سے میں کاریگر اور مزدور لاؤں گا پھر ان کاریگروں اور مزدوروں سے اس طرح کام لوں گا کہ جو کچھ وہ کمائیں گے، اس کا نصف مجھے دے دیا کریں گے۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”الغو شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ہندوستانی اپنی سرزمین نہیں چھوڑتے۔ ان کا یہاں تک لانا یا تو کسی قانع کا کام ہے یا پھر کسی شاطر کا کام اور اتفاق کی بات کہ تم ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہو۔“

الغو نے مایوسی سے کہا۔ ”میرا یہ منصوبہ ناقص ہے، چلو اس کو بھی چھوڑو۔ میں گھوڑوں کی تجارت شروع کر دوں؟“

نکودار نے پوچھا۔ ”گھوڑوں کی تجارت کے لیے آپ کے پاس دولت کتنی ہے؟“

الغو نے جواب دیا۔ ”اس میں دولت کا کیا کام؟ حکومتوں سے پیشگی رقوم لے کر یہ کام کروں گا۔“

نکودار ہنسنے لگا۔ ”حکومتیں تم پر اعتبار ہی کیوں کریں گی؟“

الغو نے اکڑ کر جواب دیا۔ ”اگر وہ مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتیں، تو میں ان پر اعتبار کیوں کروں، چلو یہ کام بھی چھوڑا۔ اب میں طبابت کروں گا۔“

نکودار نے ہنس کر کہا۔ ”یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔ یہ علم پڑھے لکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور تم ذرا بھی پڑھے لکھے نہیں۔“

الغو نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے ایک کام ہے میرے ذہن میں، بشرطیکہ تم اسے کر بھی سکو۔“

الغو نے پوچھا۔ ”کون سا کام؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”میدان جنگ کے مقتولوں کے لباس اور ہتھیار اتار اتار کر ان کا ذخیرہ کرو اور پھر اسے بیچ ڈالو۔ اس میں دولت کی بھی ضرورت نہیں اور کام بھی نہایت آسان ہے۔“

الغو کی خوشی سے باجیس کھل گئیں، بولا۔ ”بہت خوب، بہت خوب۔“ لیکن پھر فوراً ہی سر پڑ گیا، بولا۔ ”لیکن ولی عہد بہادر! یہ کام تو بہت خطرناک ہے۔ عین حالت جنگ میں مرنے والوں کے جسم سے کپڑے اور ہتھیار اتارنا کیا خطرناک بات نہیں؟ کوئی مجھے قتل بھی کر سکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی نیم مردہ سپاہی میرے پی پیٹ میں اپنا خنجر اتار دے۔“

نکودار کو ہنسی آرہی تھی مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھا، بولا۔ ”ہے تو یہ بھی خطرناک کام۔ چلو کوئی اور کام سوچیں گے۔“

درختوں کے جھنڈ میں سے بایدو خان اچانک نمودار ہوا، اس نے نکودار کو الغو سے باتیں کرتے دیکھا تو جھکے تیوروں سے پوچھا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ یہاں کیسے؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”میں اپنے محل جارہا تھا کہ بھائی الغو نے مجھے بلالیا اور کاروباری باتیں کرنے لگے۔“

بایدو نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ویسے میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا، چلو اچھا ہوا جو یہاں ملاقات ہوگئی۔“

نکودار نے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”کیا تمہیں بھی اسی قسم کی باتیں کرنا ہیں جیسی بھائی الغو نے کیں۔“

بایدو نے تنک کر جواب دیا۔ ”ولی عہد بہادر! میں کوئی بے سرو پا انسان نہیں ہوں۔ الغو کا میں بھائی ضرور ہوں لیکن الغو جیسا ہرگز نہیں۔ میں بہت دنوں سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے وہ سازش کی کیوں تھی؟“

نکودار نے کہا۔ ”سازش کس نے کس کے خلاف کی تھی، میں خود بھی یہ جاننا چاہتا ہوں اور اس کا صحیح جواب مقتول گویے نے دیا بھی تھا لیکن افسوس کہ باوا جان نے درگزر کیا حالانکہ میں خود درگزر کا قائل نہیں ہوں۔“

بایدو نے سختی سے کہا۔ ”وہ سازش آپ کی تیار کردہ تھی اور آپ نے گویے کو لالچ اور دھمکی دے کر اقراری گواہ بنالیا تھا پھر اس کو قتل بھی کرایا۔ اگر وہ گویا زندہ رہتا تو اصل سازشیوں کے چہروں سے نقابیں اتر چکی ہوتیں۔“

نکودار مشتعل ہو گیا۔ ”بایدو! زیادہ باتیں نہ کرو، ہمیں تمہارے ارادوں کا علم ہو چکا ہے۔ دراصل تم لوگ حکومت کے خواب دیکھ رہے ہو۔“

بایدو اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ بھی آپ کا الزام ہے ولی عہد بہادر! ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے قبائلی اور خاندانی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔“

نکودار زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا ہار نکل گیا۔

فروری 2017ء

سپنس ڈائجسٹ

بیماری کو مرگ کا آزار سمجھ رہے تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھے ہوئے تھے۔ اباقہ خان ان سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے سبھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”حالانکہ تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم سب کو متحد اور متفق دیکھنا چاہتا ہوں مگر تم سب نفاق اور نا اتفاقی کے شکار ہو، آخر ایسا کیوں ہے؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”پدر بزرگوار! اتحاد اور اتفاق کے لیے خیالات اور آراء کا اتفاق بھی ضروری ہے جبکہ میں شہزادگان میں سے بعض کو اسلام کی طرف مائل دیکھ رہا ہوں۔ کیا منگول عساکر کسی مسلمان حکمران کا اقتدار گوارا کر لیں گے؟“

اباقہ خان نے پوچھا۔ ”تیرا اشارہ کس کی طرف ہے؟“ شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔“

ولی عہد نکودار کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وزیر نے اس کے پاؤں کا انگوٹھا دبا کے روک دیا۔

اباقہ خان نے سختی سے پوچھا۔ ”میں اس کا نام تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اگر میں یہاں اس کا نام لے لوں گا تو نفاق اور اختلاف کی خلیج میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔“

اباقہ خان نے اصرار کیا۔ ”اس کا نام تو تجھے بتانا ہی پڑے گا۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”تب پھر میں اس کا نام تخلیہ میں بتا دوں گا۔“

اباقہ خان نے اس موضوع کو یہیں پر ختم کر دیا اور شہزادہ ارغون کو حکم دیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اس سے ملاقات کرے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو اباقہ خان نے ولی عہد نکودار کو مخاطب کیا اور ترجمانی نظروں سے گھورتے ہوئے بے رخی سے کہا۔ ”نکودار! تجھ کو کچھ معلوم ہے کہ ارغون کا اشارہ کس طرف تھا؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔“

اباقہ خان نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ارغون نے جو کچھ کہا درست ہے۔“

نکودار نے بے توجہی سے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے، درست ہو۔“

نکودار بھاگا بھاگا وزیر شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لا کر مشورہ طلب کیا۔ ”وزیر محترم! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ کو یہ ساری باتیں باید و سے نہیں کرنی تھیں۔ محل سے کام لیجیے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“

نکودار نے مشورہ پوچھا۔ ”کیا میں اس واقعے کو پدر بزرگوار کے علم میں لے آؤں؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ نکودار کو سخت غصہ تھا کہ اس کی کوئی بات مانی ہی نہیں، پھر بھی خاموش تھا۔

☆☆☆

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو ہر بار یہی نصیحت کی کہ وہ محل سے کام لیتا رہے۔ اس طرح ہر کام آسان ہو جائے گا اور شہزادہ ارغون بھی حالاتِ حاضرہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری طرف ولی عہد نکودار، شہزادہ ارغون سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ شمس الدین جوینی کے مشوروں کی روشنی میں اپنا ہر قدم اٹھا رہا تھا۔ نکودار کو بار بار یہ خبر مل رہی تھی کہ باید و اور الفو شہزادہ ارغون سے مسلسل ملاقاتیں کر رہے ہیں اور سعد اللہ یہودی کی پر اسرار حرکات بھی علم میں آرہی تھیں۔ یہ یہودی اپنا زیادہ تر وقت شہزادہ ارغون کے پاس گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ باید و کے پاس بھی دیکھا گیا تھا۔

اباقہ خان اپنے بیٹوں کی کشمکش کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس اندرونی اور محلاتی خلفشار کے علاوہ برقی خاندان اور چغتائی خاندان سے بھی برسرِ پیکار تھا۔ وہ جنگ سے بچنا چاہتا تھا لیکن جنگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اسی دوران وہ بیمار پڑ گیا۔ قابل ترین اطبا کی ایک جماعت اس کے علاج معالجے پر مامور ہوئی۔ اباقہ خان اپنی بیماری کی خبر چھپاتا رہا۔ وزیر شمس الدین جوینی، شہزادگان اور باید و اور الفو کے علاوہ بیماری کا کسی کو علم نہیں تھا۔

سعد اللہ یہودی شہزادہ ارغون کو تاکید کر رہا تھا کہ وہ اپنے باپ اباقہ خان کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گزارے۔

شمس الدین جوینی، ولی عہد نکودار کو سمجھا رہا تھا کہ انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ، اباقہ خان کی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، معلوم نہیں یہ چراغ کب بجھ جائے۔ اس لیے انسان کو مستعد اور جو کس رہنا چاہیے۔ شہزادگان باپ کی

اباقد خان نے جھنجلا کر کہا۔ ”ارغون کا اشارہ تیری طرف تھا۔ دراصل وہ تیری شکایت کر رہا تھا۔“
 نکودار نے مشتعل ہوئے بغیر جواب دیا۔ ”ارغون کو معلوم نہیں کیوں غلط فہمی سی ہو گئی ہے۔“
 اباقد خان نے پوچھا۔ ”کیا تو اسلام کی طرف مائل نہیں ہے؟“

نکودار نے الٹا سوال کر دیا۔ ”اسلام کی طرف مائل ہونا کیا معنی؟ آپ نے شمس الدین جوینی کو اپنا وزیر بنالیا اور آپ سے پہلے دادا ہلاکو خان نے شمس الدین جوینی پر بے حد اعتماد کیا اور دادا کی ہدایت اور وصیت کے مطابق ہی آپ نے جوینی کو اپنا وزیر بنالیا۔ کیا اپنے اس عمل سے آپ دونوں مسلمان تصور کئے جائیں گے؟“

اباقد خان نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”نہیں تو، اس طرح ہم مسلمان کیوں تصور ہوں گے؟“
 نکودار نے کہا۔ ”شمس الدین جوینی کا احترام کرتا ہوں اور اپنے مشکل معاملات میں اس سے مشورے لیتا ہوں۔ بس اسی سے میری بابت یہ رائے قائم کر لی گئی کہ میں اسلام کی طرف مائل ہوں۔“

اباقد خان لا جواب ہو گیا۔ رات کو تھلیہ میں جب شہزادہ ارغون نے ولی عہد نکودار کا نام لے کر یہ شبہ ظاہر کیا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے تو اباقد خان نے اس الزام کو مسترد کر دیا اور شہزادہ ارغون اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ اس موقع پر اباقد خان نے کہا۔ ”اور ارغون! نکودار تجھ پر الزام لگا رہا تھا کہ تو یہودیت کی طرف مائل ہے کیونکہ تو مسجد اللہ یہودی پر بہت اعتماد کرتا ہے لیکن میں نے نکودار کے اس الزام کو اسی طرح مسترد کر دیا جس طرح تیرا الزام نکودار پر.....“

اباقد خان کے جوڑوں میں بڑی تکلیف تھی۔ اس نے باتیں کرتے کرتے اپنا داہنا ہاتھ اوپر جو اٹھایا تو درد کی ٹیس سے اس کی آہ نکل گئی۔ اس نے کراہتے ہوئے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ ”بیٹے ارغون! جس طرح بہت سارے ریشے آپس میں پیوست وہم رشتہ ہو کر مضبوط رستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح خاندانی اور نسلی اتفاق انسان کو چنگیز خان، خاقان اور ہلاکو خان بنا دیتا ہے۔ ارغون! اپنے بھائیوں سے بدظن نہ ہو، ان پر اعتبار کر اور طاقت کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جا۔“

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، ترمہ شیریں اچانک آگئی۔ کافوری شمعوں کی تیز روشنی میں شہزادہ ارغون اور ترمہ شیریں کی نظریں متصادم ہوئیں۔ اباقد خان نے

شہزادے کو حکم دیا۔ ”اب تو جاسکتا ہے۔“
 لیکن شہزادہ رکا رہا۔ اس نے ترمہ شیریں کے چہرے پر ہلاکی تازگی اور کشش محسوس کی، جیسے ترمہ شیریں پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

اباقد خان نے سختی سے کہا۔ ”ارغون! اب تو جاسکتا ہے۔“
 لیکن شہزادہ ارغون پھر بھی بیٹھا رہا، اس نے کہا۔ ”میں آپ کی صحت کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند ہوں باوا جان..... آپ فرمائیں تو اصفہان اور بغداد سے مزید طیب بلا لیے جائیں۔“

ترمہ شیریں کو بھی شہزادہ ارغون کی حکم عدولی گراں گزر رہی تھی، اس نے شہزادے کا نام لیے بغیر کہا۔ ”ایل خان کا حکم واجب العمل ہے۔ اس کو نہ ماننا گستاخی ہے بلکہ جرم بھی۔ اگر ایل خان کا حکم نہ مانا گیا تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

اباقد خان کو غصہ آ گیا۔ وہ مشتعل ہو کر اٹھا تو اس کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا، پھر بھی اس نے شہزادے کو ڈانٹا۔ ”ارغون! تو نے میرا حکم نہیں سنا! اب تو چلا جا یہاں سے۔“
 شہزادہ ارغون چلے جانے پر مجبور ہو گیا تو اس نے چلتے چلتے کہا۔ ”باوا جان! میں جاتا ہوں لیکن یہ خاتون ہم دونوں میں اختلاف کا سبب خواہ مخواہ بن رہی ہیں۔ افسوس کہ انہوں نے میری اماں کا حق غصب کر لیا۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا، ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

شہزادہ چلا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس کی شکایت کی۔ ”ایل خان! آپ کا یہ بیٹا مہذب نہیں ہے۔ اس کی باتوں میں سرکشی پائی جاتی ہے اور یہ ہم میں سے کسی کا وفادار نہیں ہے۔“
 اباقد خان درد اور غصے سے کرا رہا تھا، بولا۔ ”ترمہ شیریں! میں خود کو بد قسمت سمجھتا ہوں، میں چاہتا ہوں میری اولاد تھوڑے اور مل جل کر حکومت کرے لیکن اس کا مزاج نفاق اور انتشار پر مائل ہے۔“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”ولی عہد نکودار آپ کی جانشینی کا سچا مستحق ہے، بقیہ میری سمجھ میں نہیں آئے۔“
 اباقد خان بہت افسردہ تھا، بولا۔ ”نکودار بھی زیادہ سمجھدار نہیں ہے۔ اس کی اپنی رائے نہیں ہوتی، وہ کسی عقلمند پر تکیہ کرنا چاہتا ہے جبکہ میرے آباؤ اجداد سنتے سب کی تھے مگر کرتے وہ تھے جس پر ان کا دل گواہی دیتا تھا۔ میرا ولی عہد ایک ایسا شخص بن سکتا ہے جو اپنی عقل سے فیصلے کر سکتا ہو، جس کی اپنی رائے ہو اور جو مصلحت اندیشی کا شکار نہ ہو جاتا ہو۔“

عقل مندی

ایک بس جاری تھی جس کی چمت کے اوپر بیٹھے آدمی نے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی کو آواز دی۔
 ”شمشادا! ایک نیچے بیٹھے ہوئے شخص نے سر نکالا تو اوپر والے نے اس کے سر پر جوتا دے مارا چنانچہ اس نے پھر سر اندر کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر والے نے پھر آواز لگائی۔ ”شمشادا!“
 نیچے والے نے پھر سر نکالا تو اوپر والے نے پھر جوتا سر پر دے مارا۔ چنانچہ اس نے اپنا سر اندر کر لیا۔
 یہ منظر دیکھ کر برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارا نام شمشاد ہے؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں اس کو بے وقوف بنارہا ہوں۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بھل ہزارہ

ترمہ شیریں باتیں کرتے کرتے اداس ہو گئی۔ اس نے بات چیت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔

ابا قہ خان نے پوچھا۔ ”تو کیا سوچنے لگی ترمہ شیریں! تو خاموش کیوں ہو گئی؟“

ترمہ شیریں نے پڑمردہ لہجے میں جواب دیا۔
 ”محترم ایل خان! میرا عروج اور اقبال آپ کی زندگی اور ذات سے وابستہ ہے۔ آپ بیمار ہیں تو میں پریشان ہوں۔ اگر خدا نخواستہ آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا، تو میں کہاں جاؤں گی..... میرا کیا حشر ہوگا؟“

ابا قہ خان نے اسے تسلی دی۔ ”ترمہ شیریں! تو بلاوجہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہے، اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ میرے بعد منگول قانون کے مطابق تو میرے کسی بیٹے کے حوالے کر دی جائے گی تو تیرا خیال غلط ہوگا۔ ولی عہد نودار ذہنی طور پر اسلام کی طرف مائل ہے اس لیے وہ تیرا احترام کرے گا اور تجھ کو اپنی ماں کی طرح سمجھے گا۔ نودار کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا بھائی تجھ پر اپنا حق نہیں جتا سکے گا۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”محترم ایل خان! آپ کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گی، کہیں اور چلی جاؤں گی۔“

ابا قہ خان اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”تو نے کیا کہا؟ میرے بعد تو یہاں نہیں رہے گی، کہیں اور چلی جائے گی اور کہاں چلی جائے گی؟ کس کے پاس چلی جائے گی؟ کیا چغتائی شہزادے سونجاق کے پاس چلی جائے گی؟ کیا وہ ابھی تک تیرے دل میں موجود ہے؟“

ترمہ شیریں نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”نہیں محترم ایل خان! ایسا نہیں ہوگا، میں شہزادہ سونجاق کے پاس کیوں جاؤں گی۔“

ابا قہ خان نے کہا۔ ”ترمہ شیریں! مرنے سے پہلے میں تیری بابت یہ فیصلہ کر کے جاؤں گا کہ تو میرے بعد بھی اسی محل میں رہے گی۔ تو اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکے گی۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”تب پھر ایل خان! آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اگر آپ کے بعد بھی اسی محل میں رہی تو پھر مجھے شہزادہ ارغون سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔ اس کا دل ابھی تک میری طرف سے صاف نہیں ہے۔“

ابا قہ خان درد کی شدت سے پھر لیٹ گیا۔ وہ تڑپنے لگا، اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ”اگر شہزادہ ارغون نے تجھ کو اپنی بیوی بھی بنالیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر میرے باپ ہلاکو خان کی بیوی بھی تو پہلے اس کی ماں تھی۔ میری ماں

دوقوز پہلے میرے دادا تو لوئی کی بیوی تھی، پھر جب میرا دادا مر گیا تو میرے باپ ہلاکو خان نے اسے اپنی بیوی بنالیا۔ منگول قانون جب ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔“

ترمہ شیریں حیرت سے ابا قہ خان کی صورت دیکھے جاری تھی۔ ”لیکن میں..... مجھے اس رشتے سے گمن آتی ہے۔“ ابا قہ خان نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”اچھا اب تو چپ ہو جا۔“

ابا قہ خان خود بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھا اور رک رک کر تین بارتالی بچائی۔ جواب میں کئی خدمت گار خواتین اندر داخل ہوئیں اور حکم کا انتظار کرنے لگیں۔

ابا قہ خان نے انہیں حکم دیا کہ اس کے پورے جسم پر تیل کی مالش کی جائے۔ یہ تیل حکیموں نے نہایت قیمتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا تھا اور اس کی مالش سے اسے کسی قدر افاقہ حاصل ہو جاتا تھا۔

خدمت گار خواتین نے نہایت توجہ اور محنت سے تیل کی مالش شروع کر دی، ابا قہ خان درد سے کرا رہا تھا۔ وہ کبھی چپ ہو جاتا، کبھی اونٹھے منہ لیٹ جاتا، کبھی واہنی

کروٹ پڑ جاتا اور کبھی بائیں کروٹ۔

☆☆☆

دو ماہ دس دن تک وہ بستر مرگ پر پڑا موت سے لڑتا رہا۔ پھر دواؤں نے اپنا اثر دکھایا اور وہ ٹھیک ہونے لگا۔

شہزادہ ارغون اپنے یہودی مشیر سعد اللہ سے مشورے کر کے نہایت اہم منصوبے بنا چکا تھا مگر جب ابا قہ خان صحت یاب ہو گیا تو اس کو بڑی مایوس ہوئی۔

شمس الدین جوینی بہت خوش تھا کیونکہ ابا قہ خان کی علالت کے دوران حالات جو رخ اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ فکرمند ہو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، ابا قہ خان کے طفیل اور مرضی سے تھا۔ ولی عہد نکودار بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ اس بیماری سے جانبر نہیں ہو سکے گا مگر جب وہ ٹھیک ہو گیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

ابا قہ خان کو غسل کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اہل خانہ خصوصی نے غسل کے لیے بہت ساری دواؤں پر مشتمل ایک نسخہ تیار کیا۔ ان ادویات کو پانی سے بھری ہوئی دیگوں میں ڈال دیا گیا اور پھر چلوں میں آگ جلادی گئی۔ یہ دوا گئی کافی دیر تک پانی میں ابلتی اور جوش کھاتی رہیں۔ اسی دوران ابا قہ خان کو غسل کے لیے تیار رکھا گیا۔ کئی حسین و جمیل عورتوں نے ابا قہ خان کو اپنے ہاتھوں سے نہلایا، کمزوری کی وجہ سے ہوا سے تکلیف پہنچا رہی تھی۔

دوسری طرف وزیر شمس الدین جوینی نے صحت یابی کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کیا تھا۔ شاہی عمارتوں کو خوب سجادیا گیا تھا اور ان کی دیواروں کو ہندوؤں کی دیوالی کی طرح چراغاں سے جگمگادیا گیا تھا۔ محل کے باہر میدان میں زریں خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔

اس خیمے میں کئی ہزار آدمی دعوت کے مزے لوٹ سکتے تھے۔ اس خیمے میں خشک میوے، پھل، گوشت کی بڑی بڑی قافیوں، شراب اور گھوڑی کا دودھ وافر مقدار میں رکھ دیا گیا تھا۔ جب امراء اور سرداروں کو جشن صحت یابی سے لطف اندوز ہونے کی اجازت مل گئی تو وہ کھانے پینے پر ٹوٹ پڑے۔

محل کے اندر شہزادگان اور شاہی خاندان کے دوسرے لوگوں کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں خواتین اور مرد یکجا تھے۔ ان میں ولی عہد نکودار، شہزادہ ارغون اور شہزادہ کیکا تو خان بھی تھے اور باید اور الفوج بھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ خود ابا قہ خان ایک چھوٹے مگر اونچے تخت پر بیٹھا خوش و خرم مرد اور خواتین کا نظارہ کر رہا

تھا۔ انہی میں ترمہ شیریں بھی شامل تھی۔ شہزادہ ارغون کی نظریں ترمہ شیریں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ترمہ شیریں شہزادہ ارغون سے دور چلی گئی۔ ایک جھاڑی میں جہاں مہندی اور لیمو کے درختوں کی کثرت تھی، ترمہ شیریں دو خواتین کے ساتھ اس جھاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ شہزادہ ارغون ترمہ شیریں کو جھاڑی میں چھپتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرتا ہوا جھاڑی تک جا پہنچا۔ یہاں ترمہ شیریں اپنی سہیلی کی کسی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھی۔ وہ اس ہنسی پر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر مہندی اور لیمو کے درختوں کو ٹکٹا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے درختوں کی شاخیں ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

ترمہ شیریں اور اس کی سہیلیاں گھبرا گئیں لیکن اپنے سامنے شہزادے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ ترمہ شیریں نے منہ بنایا۔ شہزادہ ارغون نے انہیں مخاطب کیا۔ ”ترمہ شیریں کے سوا ہر عورت جاسکتی ہے۔ دراصل میں ترمہ شیریں کی وجہ سے یہاں آ گیا ہوں۔“

دل نہ چاہنے کے باوجود عورتیں وہاں سے جانے لگیں۔ ان کے ساتھ ترمہ شیریں بھی چلی مگر شہزادے نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ ”ترمہ شیریں! تم کہاں چلیں؟“ ترمہ شیریں نے ٹھٹھک کر کہا۔ ”ارغون! میرا راستہ چھوڑ دو، میری راہ سے ہٹ جاؤ۔“

شہزادے نے کہا۔ ”مگر کیوں؟ میں تم سے ملنے آیا ہوں، میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

شہزادے نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، تم مجھ سے بات نہ کرو، میری باتیں سن تو سکتی ہو۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے۔“ ترمہ شیریں نے دھمکی دی۔ ”اپنی ان جساتوں کا انجام بھی معلوم ہے تمہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”کیسی جساتیں؟ اور کیا انجام، میں سردست اس رشتے کا احترام کروں گا جو ہمارے درمیان حائل ہے کیونکہ میرا باپ ابھی زندہ ہے۔“

عورتیں جا چکی تھیں، شہزادے نے ترمہ شیریں کے شانوں کو زور سے دبایا۔ ”بیٹھ جاؤ ترمہ شیریں..... کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤ، میری خاطر، میری خوشی کے لیے۔“

ترمہ شیریں نے اسے دھکا دے کر اپنی راہ سے گرا دینا چاہا مگر طاقتور شہزادہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ شہزادے کو ہنسی آ گئی بولا۔ ”خوب! ایک بار اور سہی، میں

شہزادہ اس اچانک اقدام سے ہٹا بکا رہ گیا۔ وہ بھی جھاڑی سے نکلا۔ جھاڑی سے باہر کا منظر ہی عجیب تھا۔ وہاں بایدو، الغو اور نکودار اور حند خواہن چپ چاپ کھڑے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ شہزادے نے ان سب کو دیکھا اور کوئی پروا کیے بغیر جانے لگا۔ ترمہ شیریں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ولی عہد نکودار نے نفرت سے منہ بنایا اور شہزادے کو سمجھایا۔ ”ارغون! ترمہ شیریں تیری ماں ہے۔“ شہزادے نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”اگر ماں ہے تو میں کیا کروں؟“

نکودار نے کہا۔ ”وہ تیری ماں ہے، تو اس کا احترام کرو۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں اس کا احترام کر رہا ہوں اور اس وقت تک احترام کرتا رہوں گا جب تک وہ میری ماں ہے۔“

بایدو نے شہزادے کی حمایت کی۔ ”بیشک یہ احترام اسی وقت تک واجب بھی ہے۔“

نکودار نے کہا۔ ”اب ہم لوگ قراقرم میں نہیں رہتے، اب ہم جن اقوام اور مذاہب کے درمیان رہتے ہیں، ان کے ہاں یہ رشتہ جائز نہیں ہے۔“

بایدو نے پوچھا۔ ”ولی عہد بہادر! کیا ہم اپنے قانون چھوڑ دیں گے؟ کیا ہم اپنے آبائی قوانین کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے قوانین پر قربان کر دیں گے؟ کیا مسلمانوں اور عیسائیوں نے ہمارے قوانین اختیار کر لیے ہیں؟ جب انہوں نے ہمارے قوانین نہیں اختیار کیے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ان کے قوانین اختیار کریں۔“

نکودار نے بایدو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بایدو! تم ہم دونوں بھائیوں کے معاملات میں نہ بولو تو بڑی اچھی بات ہے۔“

بایدو برہم ہو گیا۔ ”یہ کیسی بات ہے کہ میں کسی کے معاملے میں بول ہی نہیں سکتا۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”بایدو شہزادے! تم میرے معاملات میں دخل نہ دو۔ یہ آخری موقع دے رہا ہوں تجھ کو۔“ بایدو نے کہا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ بھی منگول قوانین میں بے جا دخل اندازی نہ کریں۔“

الغو ان کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا، بولا۔ ”بھائیو! آپس میں جھگڑو نہیں، اگر پسند کرو تو میں تمہیں گراں قدر مشورے دے سکتا ہوں۔ میرے پاس منصوبوں اور تجویزوں کی کوئی کمی نہیں۔“

نکودار نے الغو کو ڈانٹ دیا۔ ”چپ رہ کلمے نو جوان!

ان باتوں کا برا نہیں مانتا۔“ ترمہ شیریں عاجز آ کر بیٹھ گئی۔ ”بولو تم مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟“

شہزادہ ارغون نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ترمہ شیریں! میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”میں نے یہ کب اور کس سے کہا کہ تم برے آدمی ہو۔“

شہزادہ اس کی آنکھوں میں جھانکے جا رہا تھا۔ ”تم نے کہا تو کسی سے بھی نہیں لیکن تمہارا طرز عمل تو یہی بتاتا ہے۔“

ترمہ شیریں نے منہ پھیر لیا۔ ”یہ تم میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہو؟ میں تمہارے باپ کی بیوی ہوں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں ترمہ شیریں۔ یہ سوچ سوچ کر میں خوش ہوتا رہتا ہوں کہ میں یا میرا باپ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہوتے تو بڑی اذیت اور پریشانی کی بات ہوتی۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”یہ یہاں اسلام کا ذکر کیسے آ گیا۔ اگر تم دونوں مسلمان ہوتے تو انسان ہوتے۔“

شہزادے نے کہا۔ ”ایسی بات نہ کہو ترمہ شیریں! اگر میں مسلمان ہوتا تو میں کسی طرح بھی تمہیں حاصل نہیں کر سکتا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم منگول ہیں اور منگول قانون ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنے باپ کی بیویوں کو اس کے بعد اپنی بیوی بنالیں۔“

ترمہ شیریں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”جھی جھی۔ بڑا جاہلانہ قانون ہے، مجھے تو سوچ سوچ کر کمن آتی ہے۔“

شہزادے نے اپنا ہاتھ ترمہ شیریں کے بالوں پر رکھ دیا۔ ”ترمہ! میں حد سے تجاوز نہیں کروں گا، بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں جب تب دیکھ لیا کروں، تم سے باتیں کر لیا کروں، اس کے سوا کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میرے بالوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لو اور یہاں سے نکل کر کسی کھلی جگہ بیٹھ کر باتیں کرو۔ تمہارا باپ اباقہ خان ایک مغضوب الغضب انسان ہے، وہ ناراض ہو سکتا ہے۔“

شہزادے نے کہا۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن وہاں ہم دونوں بہتوں کی نظر میں آ جائیں گے اور اس بات کا بھی ڈر ہے کہ نیم مسلمان نکودار ہم سے جھگڑ پڑے جبکہ باوا جان نے شہزادگان کو اتحاد اور اتفاق کا درس دیا ہے۔“

ترمہ شیریں تیزی سے اٹھی اور جھاڑی سے باہر نکل گئی، بولی۔ ”لیکن میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔“

قسمت انسان ہوں کہ مسلمان نہیں ہوں اور منگول قوانین ہمیں یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی کو اپنی محبوبہ بنالیں۔“

ابا قہ خان نے سرد آہ بھری۔ ”ترمہ شیریں! ارغون صحیح کہتا ہے۔ اس کو یہ حق منگول قانون نے دیا ہے، اسے چھینا نہیں جاسکتا۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”لیکن میں خود کو اس پر آمادہ کس طرح کروں، مجھے تو سوچ کر ہی مہن آتی ہے۔“

ابا قہ خان بہت اداس تھا، وہ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”ترمہ شیریں! میری صحت یا بی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ آج ہر کوئی خوش ہے لیکن یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں صحت یاب نہیں ہوا۔ میں اس وقت بھی بیمار ہوں، میری طبیعت بگڑی ہے۔“

ترمہ شیریں گھبرا گئی، بولی۔ ”کیا طبیعوں کو بلوایا جائے؟“ ابا قہ خان ٹپکتے لگا۔ وہ بہت پریشان اور گھبرا یا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، وہ کہہ رہا تھا۔ ”ترمہ شیریں! میں اپنی سلطنت کو انتشار سے بچانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میری موت آنا ہی چاہتی ہے تو چند دن ٹھہر کر آجائے۔ اس غسل صحت کے جشن میں لوگوں کو جیسے ہی معلوم ہوگا کہ میں صحت مند نہیں ہوں، بدستور بیمار ہوں تو وہ سازشیں شروع کر دیں گے۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”لیکن طبیعوں کو بلائے بغیر طبیعت کی خرابی دور بھی تو نہیں ہوگی۔“ ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”میں اسی لیے ٹپل رہا ہوں کہ شاید طبیعت سنبھل جائے۔ اگر نہیں سنبھلے گی تو مجبوراً طبیعوں کو بلوالوں گا۔“

وہ ٹپکتے ٹپکتے بستر پر گر گیا اور ترمہ شیریں کو حکم دیا۔ ”میری خدمت کے لیے صرف دو خدمت گار خواتین میرے پاس موجود رہیں اور نکودار اور شمس الدین جوینی کو حاضر کیا جائے۔“

ترمہ شیریں نے گھبراہٹ میں ان احکامات پر عمل کرنا چاہا تو ابا قہ خان نے اسے روک دیا۔ ”جو حکم دینا ہے میں خود دوں گا تو میرے بستر پر ہی بیٹھ جا۔“ اس کے بعد تالی بجا کے خدمت گار خواتین کو اندر بلایا اور ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا۔ ”وزیر شمس الدین جوینی اور ولی عہد نکودار کو حاضر کیا جائے۔“ دو خدمت گار خواتین کو حکم دیا۔ ”تم دونوں یہیں میرے پاس موجود رہو۔“

جب خدمت گار خاتون شمس الدین جوینی اور ولی عہد

آئندہ میں تیری دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔“

الغونے جواب دیا۔ ”میں دخل کب دے رہا ہوں؟ میں تو مشورہ دے رہا ہوں۔ میرا مشورہ آپ دونوں کو یہ ہے کہ جو اسلام سے متاثر ہے، وہ اسلامی قوانین پر چلے اور جو منگول قوانین کا احترام کرتا ہے، وہ منگول قوانین کا احترام کرے۔“

شہزادہ ارغون ہنسنے لگا، اس نے تالی بجائی۔ ”زندہ باد الغومیرے بھائی زندہ باد..... کیا اچھا مشورہ دیا ہے تو نے۔“

الغونے خوشی سے پھولا نہ سایا، بولا۔ ”پھر بھی لوگ مجھے نکلا اور کابل کہتے ہیں۔ میرے مشوروں سے دوسرے تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں خود نہیں اٹھا سکتا۔“

ولی عہد نے شہزادہ ارغون سے کہا۔ ”تم تو یہیں روکو، بقیہ لوگ جاسکتے ہیں۔“

شہزادہ ارغون قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ”جب سب لوگ جاسکتے ہیں تو میں بھی جاسکتا ہوں۔“

یہ کہتا ہوا وہ باید و اور الغو کے ساتھ چلا گیا۔ ولی عہد نکودار انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ ترمہ شیریں کو تلاش کر کے ملا، بولا۔ ”مادر محترم! آپ نے ارغون کو مایوس کر دیا، بہت اچھا کیا۔ بہر حال کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے لیکن میں ضرور دوں گا۔“

ترمہ شیریں نے سرکوشی میں کہا۔ ”نکودار! تم چاہو تو میری ایک مدد کر سکتے ہو۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”جب میں اس محل میں تنہا رہ جاؤں تو تم مجھے کسی طرح یہاں سے نکلوا دینا۔“

نکودار نے کہا۔ ”وقت آنے دو، جو مناسب ہوگا، اس پر عمل کروں گا۔“

ابا قہ خان کو ترمہ شیریں کی تلاش تھی، کئی خدمت گار خواتین اسے تلاش کرتی ہوئی نکودار کے پاس پہنچ گئیں اور اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

ابا قہ خان نے ترش لہجے میں کہا۔ ”تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تمہیں بڑی دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔“

ترمہ شیریں نے بھی تلخ لہجہ اختیار کیا، بولی۔ ”ایل خان! آپ کے شہزادے ارغون نے مجھے آج پھر پکڑ لیا تھا۔ میں کہتی ہوں اس کا کوئی حل نکالے ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ میں خود کو اس رشتے پر مائل نہیں کر سکتی۔“

ابا قہ خان نے تردد سے پوچھا۔ ”وہ کیا کہتا تھا؟“

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ”وہ کہتا تھا میں خوش

سے کہا۔ ”نکودار! ترمہ شیریں کا خاص خیال رکھنا۔ یہ ارغون سے بہت خوفزدہ ہے۔“

ترمہ شیریں رونے لگی، بولی۔ ”اس وقت آپ میری فکر نہ کیجیے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب کرے۔“

ابا قہ خان کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”خدا مجھے صحت یاب کرے ترمہ شیریں! افسوس کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں کوئی دوسرا وہ نہیں دیکھ سکتا۔ خان اعظم اور اس کی اولاد میں آسانی درپچوں سے نکل کر میری طرف آ رہی ہیں، وہ سب مجھے بلارہی ہیں۔“

نکودار نے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ”آپ ٹھیک ہو جائیں گے باوا جان!“

ابا قہ خان نے اسے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش تھا۔ نکودار کو اس کی خاموشی نے چونکا دیا۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھیں جو دیکھیں تو وہ تقریباً بند تھیں اور اس کی سانس بہت سست چل رہی تھی۔ ابا قہ خان بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد دو طبیب اور وزیر شمس الدین جوینی بھی آ گئے۔ ابا قہ خان اس وقت بے ہوش تھا، دونوں طبیب اس کو نہایت توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں ابا قہ خان کی نبضیں نہیں مل رہی تھیں۔ ایک طبیب نے نکودار سے پوچھا۔ ”ولی عہد کون ہے؟ آپ یا کوئی اور؟“

نکودار نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کی اس بات کا مطلب؟“

طیب نے جواب دیا۔ ”میری بات کا مطلب یہ ہے کہ ولی عہد کو بیمار خان کے قریب رہنا چاہیے کیونکہ پتا نہیں کس وقت وصیتوں اور ہدایتوں کی ضرورت پیش آجائے۔“

شمس الدین جوینی نے طیب سے پوچھا۔ ”کیا مرض نے مہلک شکل اختیار کر لی ہے؟“

طیب نے جواب دیا۔ ”ایسا لگتا ہے جگر نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔“

دونوں طبیبوں نے چند دوا میں دیں، بلانے کی اور مالش کی۔ جب دونوں طبیب واپس جانے لگے تو ولی عہد نکودار نے پہلی بار ایل خان کالب و لہجہ اختیار کیا اور دونوں طبیبوں سے کہا۔ ”تم دونوں ابھی نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک بیمار خان ہوش میں نہیں آ جاتا اور یا پھر اس وقت تمہیں چھوڑا جائے گا جب بے ہوش خان قید ہستی سے نجات حاصل کر لے گا۔“

طیبوں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ ”ولی عہد بہادر! ہم

نکودار کو بلانے کے لیے جانے ہی والی تھی تو ابا قہ خان نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ”میں تجھ کو کیسا نظر آ رہا ہوں؟“

خدمت گار خاتون نے جواب دیا۔ ”نصیب دشمنان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ابا قہ خان گرجا۔ ”میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔

خبردار جو باہر میری بابت یہ کہا گیا کہ میں بیمار ہو گیا ہوں۔“

خدمت گار خاتون نے گردن جھکالی، کہا۔ ”آپ بالکل ٹھیک ہیں خان محترم! آپ کو بیمار کون کہے گا؟“

ابا قہ خان نے اسے باہر جانے کی اجازت دے دی اور دونوں خدمت گار خواتین کو پاس بلا کر حکم دیا۔ ”میرے جسم پر ادویات کا روغن ملا جائے۔“

دونوں خواتین تیل کی مالش کرنے لگیں۔

ترمہ شیریں محسوس کر رہی تھی کہ ابا قہ خان کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں لیکن ابا قہ خان انہیں جبراً کھولے ہوئے تھا۔

ولی عہد نکودار اور شمس الدین جوینی کو ابا قہ خان کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ وزیر اس کے سینے پر جھک گیا۔ ”یہ آپ کو کیا ہو گیا خان محترم؟“

نکودار دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کے چہرے کے پاس منہ لے جا کر بولا۔ ”آج تو آپ بالکل صحت مند تھے۔ پھر یہ آپ کو کیا ہو گیا؟“

ابا قہ خان نے رگ رگ کر جواب دیا۔ ”میری

طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ جشن صحت یابی جس طرح برپا ہے

اس کو اسی طرح برقرار رکھا جائے۔ جو لوگ میری بابت

پوچھیں انہیں بتایا جائے کہ اطبا کے مشورے پر میں آرام کر رہا ہوں۔“

وزیر شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا طبیبوں کو بلوایا جائے؟“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”طیبوں کی بھیڑ بھاڑ کو

نہیں، صرف دو طبیبوں کو بلوایا جائے۔“

وزیر شمس الدین طبیبوں کو بلانے خود چلا گیا۔ ابا قہ

خان نے زندگی میں شاید پہلی بار حکم دینے کے بجائے استدعا

کی۔ ”جوینی! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد میرے پاس آ جاؤ،

خدا کے لیے۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے اور مجھے باتیں بہت

زیادہ کرنا ہیں۔“

ولی عہد نکودار نے پوچھا۔ ”کسی اور کو بھی بلوانا پسند

فرمائیں گے یا نہیں؟“

ابا قہ خان نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”کسی کو بھی

نہیں۔“ پھر اس نے ترمہ شیریں کی طرف دیکھا اور نکودار

قسم کھانے کو تیار ہیں، خان کی بیماری یا موت راز میں رکھی جائے گی۔“

نگودار نے جواب دیا۔ ”میں تم دونوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا، میرا فیصلہ اٹل ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔“

شمس الدین جوینی خاموش کھڑا بے ہوش ابا قہ خان کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابا قہ خان نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وزیر بے ساختہ بول اٹھا۔ ”محترم خان کو ہوش آ گیا۔“

دونوں طبیب فوراً خان کے پاس آ گئے۔ نگودار نے ہوش میں آئے ہوئے ابا قہ خان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، ہونٹ ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ دونوں طبیب ابا قہ خان پر جھک گئے اور نگودار کی شکایت کی۔ ”محترم ایل خان! آپ ہوش میں آ گئے؟ براہ کرم ولی عہد بہادر کو حکم دیجیے کہ وہ ہمیں جانے دے، انہوں نے ہمیں بلاوجہ روک رکھا ہے۔“

شمس الدین جوینی نے دونوں کو منع کیا۔ ”طبیب صاحبان! کیا آپ دونوں کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے؟“ ابا قہ خان نے نگودار کو اشارے سے قریب بلایا، جب وہ اپنے باپ کے داہنی طرف جا کھڑا ہوا تو ابا قہ خان نے ہاتھ کے اشارے سے نگودار کو اپنے منہ کے قریب بلایا۔ وہ نگودار کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نگودار نے اپنا ایک کان ابا قہ خان کے منہ سے ملا دیا، بولا۔ ”آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

ابا قہ خان میں اچانک طاقت عود کر آئی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”نگودار! اگر میں اچھا ہو گیا تو دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کا فیصلہ میں خود کروں گا لیکن اگر میں مر جاؤں تو تم دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کر دینا تاکہ یہ لوگ میری موت کی خبر باہر عام نہ کر سکیں۔“

دونوں طبیب خوشامدیں کرنے لگے۔ ”خان محترم! ہم سے آپ قسم لے لیں، ہم کل کی خبریں باہر نہیں پہنچائیں گے۔“ ابا قہ خان نگودار سے مخاطب تھا۔ ”نگودار! میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔“ پھر وہ غمزہ تر مہ شیریں کو دیکھنے لگا اور نگودار کو ہدایت کی۔ ”تر مہ شیریں کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ میرے بعد اس پر کسی بھی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔“

نگودار رونے لگا۔ ”اب آپ کا کیا حال ہے؟“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”یہ میرا آخری وقت

ہے۔ سعد اللہ یہودی سے ہوشیار رہنا اور تمام بھائی آپس میں متحد رہیں۔“

نگودار نے جواب دیا۔ ”میں زندگی بھر آپ کے حکم کا پابند رہوں گا۔“

شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ ”خان محترم! میرے لیے کیا حکم ہے؟“

ابا قہ خان نے جواب دیا۔ ”جوینی! تم بدستور وزیر رہو گے۔ میرے بعد نگودار کے وزیر بنو گے۔ ویسے نگودار خود مختار ہوگا جس کو چاہے وزیر بنا دے۔“

نگودار نے وزیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ”میں پدر بزرگوار کی خواہشات کا زندگی بھر احترام کروں گا۔“ ابا قہ خان نے آہستہ سے کہا۔ ”شہزادہ ارغون کو بلاؤ۔“ نگودار باپ کی بات ٹال گیا، کہہ دیا۔ ”میں نے آدمی بھیج دیا ہے جیسے ہی آئے گا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔“

تر مہ شیریں نے ابا قہ خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ابا قہ تر مہ شیریں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی نظر دھندلا چکی تھی، اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ ”میرے بعد مصر کے مملوک حکمران کو سزا ضرور دینا قحط یوغا کے قاتل کو۔۔۔۔۔“

وہ بات پوری نہیں کر سکا، اس کا سر ڈھلک گیا۔ ابا قہ خان مر گیا۔ ہلا کو خان کا جانشین اچانک مر چکا تھا۔ نگودار نے اس ہال کو جہاں ابا قہ خان کی لاش رکھی تھی، لوبیان اور عنبر کی خوشبو سے مہکا دیا۔

شمس الدین جوینی نے نگودار سے پوچھا۔ ”شہزادے! اب ان دونوں خدمت گار خواتین اور طبیبوں کا کیا ہے؟“

نگودار نے جواب دیا۔ ”میں اپنے باپ کی وصیتوں پر عمل کر کے رہوں گا۔“ پھر اچانک تر مہ شیریں سے رجوع ہو گیا، بولا۔ ”مادر محترم! میرا بھائی ارغون منگول عسا کر کا سپاہ سالار ہے اور آپ کا عاشق بھی۔ ابھی میرے باپ ابا قہ خان کی موت کا کسی کو بھی علم نہیں، کچھ دیر بعد یہ خبر محل سرا میں عام ہو جائے گی اور ارغون اس خبر کے بعد جو پہلا قدم اٹھائے گا، وہ آپ کو اپنے قبضے و اختیار میں لانے سے متعلق ہوگا۔ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اب آپ جہاں بھی جانا چاہیں، چلی جائیں۔“

تر مہ شیریں بہت پریشان تھی، بولی۔ ”میں کہاں جاؤں؟ میں کتنی ہی تیز بھاگوں گی پھر بھی خان کی حدود

<http://paksociety.com>



برف قریب کے پہاڑوں سے منگوائی گئی تھی۔

نکودار نے دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کرادیا۔ گوکہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا مگر مرے ہوئے باپ کی خواہش ہی یہی تھی، وہ مجبور تھا۔

شہزادہ ارغون نے ابا قہ خان کی قبر تیار کرائی۔ قبر کے لیے ایک بہت بڑا تختہ خانہ تیار کرایا گیا اور ابا قہ خان کی خدمت کے لیے خوب صورت لڑکیوں کو فراہم کیا گیا۔ ان لڑکیوں کو زیورات سے آراستہ کر دیا گیا۔

قریب دو دور سے آنے والے محل میں اتر رہے تھے۔ انہی میں سے شہزادہ سونجاق بھی شامل تھا۔ اس کو ابا قہ خان کی بیماری اور موت کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے ایمان اور حکم پر ابا قہ خان کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا تھا لیکن محل میں داخل ہوتے ہی جیسے ہی اس کو ابا قہ خان کی موت کی خبر ملی، وہ ہکا بکارہ گیا۔

شہزادہ ارغون کو سونجاق کی آمد گراں گزری لیکن نکودار نے اس کو خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہا۔

وزیر شمس الدین جوینی آنے والوں کے قیام و طعام کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شہزادہ سونجاق کو سنبھایا۔ ”شہزادے! آپ کو یہاں نہیں آنا تھا۔“

شہزادہ سونجاق نے پوچھا۔ ”کیوں؟ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہ گیا۔“

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ”شہزادے سونجاق! اگر آپ نے اپنی سابقہ غلطی کو غلطی ہی نہیں جانا تو آپ سے کچھ کہنا سننا فضول ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا تھا، وہ درست نہیں تھا۔ اگر اس وقت ابا قہ خان ہم میں موجود ہوتا اور آپ آئے ہوئے ہوتے تو ابا قہ خان آپ کو بھی معاف نہ کرتا کیونکہ وہ آپ سے بے حد ناراض تھا۔“

شہزادہ سونجاق نے ہنس کر کہا۔ ”رشتے داریوں میں ایسی غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں مگر میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ اس خاندان کو چاہیے کہ یہ بھی سب کچھ بھلا دے۔“

شمس الدین جوینی سونجاق کی جرأت و ہمت کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا، بولا۔ ”شہزادہ سونجاق! یہ بتائیے اگر یہاں آپ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو؟“

سونجاق نے جواب دیا۔ ”ایسا نہیں ہوگا وزیر محترم!“ ابا قہ خان کی لاش کو نہایت اہتمام اور شان سے اس کی خانہ نما قبر کے پاس لے جایا گیا۔ قبر کے پاس اس کی

سلطنت سے باہر نہیں جاسکوں گی۔ ولی عہد بہادر آپ میری مدد کریں۔“

نکودار نے شمس الدین جوینی کو ایک فرماں روا کی طرح حکم دیا۔ ”ترمہ شیریں کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں انہیں کہیں بھجواؤں گا۔“

شمس الدین جوینی ہراساں ہو رہا تھا، بولا۔ ”خان محترم! اگر ارغون نے میرے گھر کی تلاشی لی اور وہاں سے ترمہ شیریں کو برآمد کر لیا تو میں کیا جواب دوں گا؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”آپ اس کی پروا نہ کریں۔ شہزادہ ارغون آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لے سکتا۔“

شمس الدین جوینی نکودار کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ وہ چادر میں لپیٹی منہ چھپائے ترمہ شیریں کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے گھر لے گیا اور اس کو ایک تہ خانے میں چھپا دیا۔ چھپاتے وقت ترمہ شیریں سے کہا۔ ”محترم خاتون! یہ چند روزہ تکلیف تو آپ کو بھیلنا ہی ہوگی، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆☆☆

ابا قہ خان کی موت کی خبر محل سرا میں پھیل گئی۔ ہر طرف سے رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔ شہزادہ ارغون بھاگا بھاگا آیا اور نکودار سے شکایت کی کہ اگر تم چاہتے تو باپ کی نازک حالت کی اطلاع مجھے دے دیجے لیکن تم نے اسے مصلحتاً چھپائے رکھا۔

نکودار نے جواب دیا۔ ”نہیں ارغون! ایسی بات نہیں تھی۔ میں نے طبیبوں کی مدد سے بڑی کوشش کی کہ باوا جان کو بچالوں لیکن پھر بے بس ہو گیا۔“

شہزادہ ارغون محل میں داخل ہو گیا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا۔ جب وہ نہیں ملی تو اس نے نکودار سے پوچھا۔ ”یہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی؟ کہیں نظر نہیں آتی۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”ارغون! میں خود بہت پریشان ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ کون کہاں ہے۔“

شہزادہ ارغون نکودار کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

قرب و جوار کے امراء اور سرداروں کو ابا قہ خان کی موت کی خبریں خفیہ طور پر روانہ کر دی گئیں اور ان کی آمد کا انتظار کیا جانے لگا۔ عام طور پر یہ خبر مشہور کر دی گئی تھی کہ ابا قہ خان صحت مند ہو چکا ہے اور وہ سیر سپاٹے کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے چپ چاپ بغداد چلا گیا ہے۔

ابا قہ خان کی لاش کو برف کی سلوں میں رکھ لیا گیا۔ یہ

میت رکھ دی گئی اور جملہ شریک جنازہ اور حاضرین کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے خان کا آخری دیدار کر سکتے ہیں۔ آخری دیدار کے لیے ہجوم ٹوٹ پڑا۔ عورتیں اور لڑکیاں اپنے حکمران کی شکل دیکھتے اور بین کرتے یا روتے ہوئے آگے بڑھ جاتیں۔

اباقت خان کی لاش کو قبر میں اتار دیا گیا۔ اب ان آراستہ و پیراستہ لڑکیوں کو طلب کیا گیا جنہیں مردہ خان کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ لڑکیاں زور و شور سے رو رہی تھیں مگر انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر چپ کرایا جا رہا تھا۔

نکودار کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو مردہ خان کے ساتھ دفن نہ کیا جائے۔“

لیکن شمس الدین جوینی نے اس سے اختلاف کیا، کہا۔ ”ایسی غلطی نہ کیجیے گا، پورا خاندان آپ کا دشمن ہو جائے گا۔“

نکودار نے کہا۔ ”یہ جہالت ہے، اب ہم لوگ متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ جہالت کی رسمیں ترک کر دینی چاہئیں۔“

وزیر نے جواب دیا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کا خاندان اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گا اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ ارغون اٹھا جائے گا۔“

عورتوں اور لڑکیوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ نکودار نے بے بسی سے کہا۔ ”مجھ سے ان کی چیخ و پکار نہیں سنی جاتی۔“

وزیر نے جواب دیا۔ ”آپ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیجیے یا پھر یہاں سے ٹل جائیے۔“

نکودار نے کہا۔ ”لیکن میرے لیے یہ دونوں ہی باتیں ناممکن ہیں۔ میں ولی عہد ہوں اور یہ ساری رسوم میری موجودگی ہی میں انجام دی جائیں گی۔“

وزیر اپنی رائے پر قائم رہا۔ ”تب پھر آپ ان رسوم کو ادا ہونے دیجئے۔“

لیکن نکودار کو کسی پہلو قرار نہیں آ رہا تھا، اس نے شہزادہ ارغون کو مردہ خان کی قبر کے سرہانے کھڑے دیکھا۔ یہ بھاگ کر وہاں گیا اور شہزادہ ارغون کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا، بولا۔ ”ارغون! کیا تجھے یاد ہے کہ ہم دونوں نے پدر بزرگوار کی زندگی میں باہمی اتحاد و اتفاق کا وعدہ کیا تھا؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس وعدے کو نبھاؤں۔“

نکودار نے کہا۔ ”اب میں پدر بزرگوار کا جانشین ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اپنی قوم کو کوئی بھی حکم دے سکتا

ہوں اور قوم اس کی اطاعت اور تعمیل کی پابند ہوگی۔“

ارغون نکودار کی شکل دیکھ رہا تھا، پوچھا۔ ”اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”یہ خوب صورت لڑکیاں جنہیں لباس اور زیورات سے آراستہ کر کے پدر بزرگوار کی قبر میں اتار دیا جائے گا، میرے خیال میں یہ ہماری ہمدردیوں اور ہمارے رحم کی مستحق ہیں۔ انہیں زندہ رہنا چاہیے۔ انہیں قبر میں دفن نہ کیا جائے۔“

ارغون نے سر سے پاؤں تک اپنے ولی عہد بھائی کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

نکودار نے پوچھا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے، بالکل صاف صاف اور واضح ہے۔ کیا تم میری بات سن نہیں سکے؟“

ارغون نے کہا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں، ان ساری لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے جو قبر میں پدر بزرگوار کی خدمت کے لیے دفن کی جا رہی ہیں۔“

نکودار ارغون کی کوتاہ عقلی سے پریشان ہو رہا تھا۔ ”میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں ارغون..... کیا تم بھی اس پر یقین رکھتے ہو کہ یہ لڑکیاں دوسری دنیا میں والد کی خدمت کریں گی؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”اس میں یقین یا شک و شبہ کی کیا بات ہے۔ میں اپنی قوم کی طرح اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔“

نکودار کو ارغون کی باتیں اور زیادہ حیرت زدہ کر رہی تھیں۔ پھر پوچھا۔ ”یعنی تم اس پر یقین رکھتے ہو؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں۔ ہم انہیں کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ آپ کو منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔“

نکودار نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو ارغون! اب ہم تمدن اختیار کر چکے ہیں۔ متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ متمدن لوگ ہماری ان رسموں پر ہنستے ہیں ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمیں ان رسموں کو ترک کر دینا چاہیے۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”ناممکن، ہم ان رسموں کو ترک نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں اور ہمارے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کے عہد سے چلی آرہی ہیں، ہم انہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔“

نکودار نے کہا۔ ”ارغون! تم میرا ساتھ دو، میں اس رسم کو آج ہی سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔“

ارغون نے انکار کر دیا۔ ”میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

نکودار نے کہا۔ ”ارغون! تم میرا ساتھ دو، میں اس رسم کو آج ہی سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔“

ارغون نے انکار کر دیا۔ ”میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

نکودار نے کہا۔ ”اب میں پدر بزرگوار کا جانشین ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اپنی قوم کو کوئی بھی حکم دے سکتا

نگودار نے اصرار کیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچو، غور کرو، اس کے بعد انکار یا اقرار کرو۔“
 ارغون نے جواب دیا۔ ”میں اس پر غور کرنا ہی نہیں چاہتا۔“
 نگودار نے افسوس کیا۔ ”میری خواہش تو یہی تھی کہ اس بڑے اور غیر معمولی کام میں تمہیں بھی شریک کر لوں مگر افسوس کہ تم اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے۔ بہر حال میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس رسم کو آج ہی سے اڑا دوں۔“
 ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں اس کی مخالفت کروں گا، آپ ایسا نہ کریں۔“

نگودار نے کہا۔ ”میں ایسا کر کے رہوں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے ایسا کرنے سے کون روکتا ہے۔“
 ارغون نے نہایت محل سے کہا۔ ”بھائی نگودار! آپ یہ نہ کریں قوم آپ کی یہ بات نہیں مانے گی۔“
 نگودار نے جواب دیا۔ ”قوم یہ بات ضرور مانے گی اور میں اس سے منہ کر رہوں گا۔“

ارغون یہ کہہ کر الگ ہو گیا۔ ”آپ کی مرضی..... آپ جو چاہیں کریں، میں کیا کر سکتا ہوں۔“
 نگودار ابھی کوئی اعلان کر نہیں سکا تھا کہ وزیر شمس الدین جوینی نے اس سے پوچھا۔ ”یہ شہزادہ ارغون سے آپ کی کیا باتیں ہو رہی تھیں؟“
 نگودار نے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے یہ مشورہ لیا کہ کیوں نہ میں ان جاہلانہ رسوم کو ختم کر دوں، ارغون نے اس کی مخالفت کی، شدید مخالفت لیکن میں آج ہی اس وحشیانہ رسم کے خاتمے کا اعلان کیے دیتا ہوں۔“
 شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا۔ ”ارغون نے آپ کو صحیح مشورہ دیا ہے۔ آپ اپنے سارے کام جلد بازی کی نذر کر دیتے ہیں۔“

لیکن نگودار نے جوینی کی بات نہیں مانی۔ ”جوینی! اب میں ایل خان ہوں اور میں یہ سب پروا ہی کر دینا چاہتا ہوں کہ میں خود ہی فیصلے کر سکتا ہوں۔ سب کو چونکا دینے والے فیصلے۔“

شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا۔ ”میں آپ کو مشورہ تو دے سکتا ہوں مگر ان پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ اعتدال میں خیر ہے آپ جو بھی فیصلہ کریں خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے مابعد اثرات پر غور کر کے۔“

شہزادہ ارغون نگودار کو تلاش کرتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ تشریف لے چلیں تاکہ آخری رسوم اپنے انجام کو پہنچیں۔“

نگودار، شہزادہ ارغون اور شمس الدین جوینی ابا قہ خان کی قبر کے پاس پہنچے تو وہاں قبر میں اتاری جانے والی لڑکیوں نے کہرام برپا کر رکھا تھا۔

سعد اللہ یہودی مسکراتا ہوا نگودار کی طرف بڑھا اور مبارکباد پیش کی۔ ”ولی عہد بہادر! آپ ایل خان ہو جائیں گے آپ کو میری طرف سے یہ بلند مقام مبارک ہو خدا آپ کو اس مقام کا اہل ثابت کرے۔“

نگودار نے سعد اللہ یہودی کا شکریہ بھی نہیں ادا کیا۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خاندان، امراء اور سرداروں کو مخاطب کیا۔ ”اہل خاندان اور معزز سردارو! ہم سب بھی قراقرم کے خاقان کے تابع ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی خاقان مرتا تھا تو ہم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوتے، نئے خاقان کے انتخاب کے لیے منعقد ہونے والی توریلتا کی میں شرکت کرنے قراقرم پہنچ جاتے لیکن ادھر دو پشتوں سے ایسا نہیں ہو رہا۔ میرا دادا ہلا کو خان فوت ہوا تو اس کی جگہ میرے باپ ابا قہ خان نے سنبھال لی۔ اب میرے باپ کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ میں سنبھال رہا ہوں۔ قراقرم کی رسمیں ختم ہو رہی ہیں جو باقی ہیں، وہ بھی جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گی۔ پہلے ہمیں شہری تمدن کا کوئی علم نہ تھا۔ اب ہم متمدن ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیب یافتہ قومیں ہماری جاہلانہ رسوم پر ہنستی ہیں، ہمارا مذاق اڑاتی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بعض جاہلانہ رسمیں اڑا دوں۔ چنانچہ آج تو میرے باپ ابا قہ خان کی قبر میں منگول رسم و رواج کے مطابق کنواری لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جائے گا مگر آئندہ یہ رسم اڑادی جائے گی اور میں اپنے لیے اس رسم کو منسوخ کرتا ہوں۔ آئندہ کسی بھی حکمران کی قبر میں کنواری جوان لڑکیاں نہیں دفن کی جائیں گی۔“

کچھ دیر اس اعلان کے بعد سناٹا طاری رہا مگر پھر... چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون سے سرگوشی میں کہا۔ ”شہزادے! نگودار سے غلطی ہو گئی، اب آپ اپنی قوم کو اعتماد میں لے سکتے ہیں۔“

ان دونوں سے ذرا دور ایک سردار نے دوسرے سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب ہماری شناخت ہی ختم ہو جائے گی۔“

دوسرے نے جواب دیا۔ ”شاید اب ہم منگول نہیں رہے، آہستہ آہستہ ہم اپنی جملہ روایات سے محروم کر دیے جائیں گے۔“

کسی تیسرے نے اپنی رائے پیش کی۔ ”یہی وجہ ہے کہ اب ہم بزدل ہوتے جا رہے ہیں اور ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، اس سے محروم ہو جائیں گے۔“
ایک سردار نے دخل دیا اور یہ آواز بلند کہا۔ ”ولی عہد بہادر! یہ موقع اس اعلان کا نہیں تھا۔“

شہزادہ ارغون چپ چاپ آگے بڑھا اور حکم دیا۔
”لڑکیوں کو قبر میں اتار کر آخری رسم ادا کر دی جائے۔“
منگولوں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور اس نے نوجوان لڑکیوں کو زبردستی قبر میں اتار دیا اور قبر کا منہ بڑی تیزی سے بند کر دیا گیا۔ لڑکیوں کی چیخ پکار کی آوازیں قبر کا منہ بند ہونے تک آتی رہیں جو آخر میں بند ہو گئیں۔

آخر میں ابا قہ خان کے گھوڑے کو ذبح کر دیا گیا اور اس کے خون سے ابا قہ خان کی قبر پر چھڑکاؤ کیا گیا۔
اس جھوم میں شہزادہ ارغون نے سونجاق کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور سونجاق کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”جیسے یہاں نہیں آنا تھا۔“
سونجاق نے جواب دیا۔ ”ارغون! اس وقت میں تیرا مہمان ہوں اور تیرے باپ کی آخری رسوم میں شرکت کرنے چلا آیا ہوں۔“

شہزادہ ارغون سونجاق کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر وہ اپنے مہمان کو کس طرح ذلیل کر سکتا تھا، کہا۔ ”مگر اب تیرا کام ختم ہو گیا اور تجھ کو یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔“
سونجاق نے کہا۔ ”اگر نکودار بھی مجھے یہی حکم دے گا تو میں فوراً چلا جاؤں گا۔“

شہزادہ ارغون بہت جربز ہو رہا تھا، اس کے ساتھ سعد اللہ یہودی بھی تھا، اس نے شہزادے کو سمجھایا۔
”شہزادے! آپ غلط میں ویسی ہی غلطی کر رہے ہیں جیسی ولی عہد بہادر کر چکے ہیں۔“

شہزادہ ارغون جیسے ہوش میں آ گیا، بولا۔ ”پیشک تو میرا مہمان ہے، جب تک تو رہنا چاہے، رہ مگر خبردار جو یہاں ترمہ شیریں کا ذکر کیا۔“

سونجاق نے برا سامنہ بنایا اور کہا۔ ”میرے پاس تیری ان فضول اور بے سرو پا باتوں کا کوئی جواب نہیں، اب میں چلتا ہوں۔“

وہ شہزادہ ارغون کو حیران کر کے چلا گیا۔
سعد اللہ یہودی نے شہزادے کو سمجھایا۔
”شہزادے! جذباتی نہ بنیے کیونکہ مشتعل ہو جانے والا ایک جذباتی انسان ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”میں نے ترمہ شیریں کی خاطر سونجاق سے جنگ کی ہے چنانچہ جب بھی میں اس کی شکل دیکھوں گا، آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں کیا کروں، مجبور ہوں۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”اشتعال کی حدت صحیح غور و فکر اور قوت فیصلہ کو جلا دیتی ہے۔ دنیا کے بیشتر بڑے لوگ اپنی اسی خامی کی وجہ سے ناکام رہے ہیں۔“

اب شہزادہ ارغون کو ترمہ شیریں کی یاد ستا رہی تھی وہ اسے جلد از جلد اپنے قبضے میں لانا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سعد اللہ یہودی سے مشورہ کیا۔ ”آپ مجھے مشورہ دیں کہ ترمہ شیریں کو میں کس طرح اپنے قبضے میں لاؤں؟“
سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”ترمہ شیریں پر پہلا حق نکودار کا ہے، اگر وہ اس سے دستبردار ہو جائے تو پھر آپ کا حق ہو جاتا ہے۔“

شہزادہ ارغون کو سونجاق کی طرف سے فکر تھی، کہا۔
”سعد اللہ! یہ سونجاق کی آمد خالی از علت نہیں ہے۔ کہیں اس کی آمد کسی سازش کا نتیجہ نہ ہو۔“

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”شہزادے! آپ کے سامنے ایک بڑا مقصد ہے، آپ اپنے اس مقصد کو ترمہ شیریں پر قربان نہ کر دیجیے۔“
شہزادہ خاموش ہو گیا مگر ترمہ شیریں کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

☆☆☆

ولی عہد نکودار ابا قہ خان کی جگہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ شمس الدین جوینی کو وزارت کے منصب پر برقرار رکھا گیا۔
شہزادہ ارغون کی جملہ عساکر کی سیاہ سالاری بحال رہی۔ ارغون شاہی محل میں گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا مگر اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ خدمت گار خواتین نے بس اتنی نشاندہی کر دی کہ انہوں نے ترمہ شیریں کو آخری بار ابا قہ خان کی میت کے قریب دیکھا تھا۔

بالکل مایوس ہونے کے بعد اس نے نکودار سے ترمہ شیریں کی بابت معلوم کیا، نکودار نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔
شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”میں ترمہ شیریں کو تلاش کر لوں گا۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی مگر اس سے پہلے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

نکودار نے کہا۔ ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“
ارغون نے کہا۔ ”جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ باپ کی موت کے بعد منگول قانون بنوں کو یہ حق دیتا ہے کہ

اس کی بیویوں کو اپنی بیوی بنالیں۔“

نگودار نے ناگواری سے کہا۔ ”ہاں منگول قانون ہمیں یہ حق دیتا ہے۔“

ارغون نے پوچھا۔ ”پھر آپ نے اپنے لیے کس کس کو پسند کر لیا ہے؟“

نگودار نے جواب دیا۔ ”کسی کو بھی نہیں۔“

ارغون نے کہا۔ ”پھر اگر میں ترمہ شیریں کو اپنی بیوی بنالوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

نگودار کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”ارغون! جیسا کہ میں نے اپنے باپ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب میں بہت ساری جاہلانہ رسوم کو منسوخ کرنے والا ہوں، ان میں مرنے والوں کی بیواؤں کی رسم سرفہرست ہے۔“

ارغون نے اختلاف کیا۔ وہ پُر زور لہجے میں بولا۔ ”لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے۔ ہماری قوم اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گی۔“

نگودار اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”مگر میں وہی کروں گا جو میری قوم کے لیے مفید ہوگا۔“

ارغون نے باغیانہ روش اختیار کی۔ ”میں خود آپ کی اس تبدیلی کو نہیں مانوں گا۔“

نگودار نے صاف صاف اعلان کر دیا۔ ”اور ایک بات اور سن لو۔ مسلمانوں کا طاقتور تمدن اور مذہب ہمیں مسخر

کرتا جا رہا ہے، ہماری قوم کے لوگ ان کے لباس اور کھانے، کھانے لگے ہیں، ان کی زبان بولنے لگے ہیں۔

اسلام کا ایک ضابطہ اخلاق ہے، ایک نظام زندگی ہے۔ منگولوں سے ارفع و اعلیٰ۔ ہم جلد یا بدیر اسلام کے ہاتھوں

مسخر ہو جائیں گے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جو کل ہونے والا ہے، اسے آج ہی ہو جانا چاہیے۔ اگر ہمیں یہاں

حکومت کرنا ہے تو ہمیں ان جیسا بن جانا چاہیے۔“ پھر نہایت مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔ ”پہل میں خود گر رہا ہوں اور

کل میں یہ اعلان کر دوں گا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے، اب میں مسلمان ہوں اور میرا اسلامی نام احمد خان

ہے، نگودار احمد خان۔“

ارغون اس اعلان سے تڑپ گیا، بولا۔ ”یہ آپ نے دوسری غلطی کر دی۔ قوم آپ کے اس فیصلے کو نہیں مانے گی۔“

نگودار احمد خان نے جواب دیا۔ ”نہ مانے مگر میں خود مطمئن ہوں کہ میں نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے۔“

ارغون نے پوچھا۔ ”آپ اپنے اس فیصلے سے قوم کو

لاجواب

خلیفہ ہارون الرشید بہت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا۔

”کیا آپ کبھی کسی بات پر لاجواب بھی ہوئے ہیں؟“

تو انہوں نے فرمایا کہ ”ہاں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ میں لاجواب ہو گیا۔“

(1) ایک عورت کا جوان بیٹا مر گیا اور وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں اور غم نہ کریں۔ اس عورت نے کہا کہ میں اس بیٹے کی موت پر کیوں نہ آنسو بہاؤں جس کے بدلے خلیفہ ہارون الرشید میرا بیٹا بن گیا۔

(2) مصر میں کسی شخص نے حضرت موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔ میں نے اسے بلوا کر کہا کہ

حضرت موسیٰ کے پاس تو اللہ پاک کے عطا کردہ معجزات تھے۔ اگر تم موسیٰ ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ وہ شخص بولا کہ موسیٰ نے معجزہ اس وقت دکھایا تھا جب فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ تو خدائی کا دعویٰ کر، میں معجزہ دکھا دوں گا۔

(3) لوگ ایک گورنر کی غفلت اور کاہلی کی شکایت لے کر آئے تو میں نے کہا کہ وہ شخص تو بہت نیک، شریف اور ایماندار آدمی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ پھر آپ اپنی جگہ اسے خلیفہ بنادیں تاکہ سب خلق خدا کو اس کا فائدہ ہو۔

(بحوالہ۔ کتاب الاذکیا ابن جوزی)

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک چین شریف

غلطی

”وہ بد صورت عورت کون ہے جوٹی وی کے پاس کھڑی ہے؟“

”وہ میری بیوی ہے۔“

”اوہ، معاف کیجیے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

”نہیں جناب! غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

کب مطلع کریں گے؟“

نکودار احمد خان نے جواب دیا۔ ”کل، کل صبح اور اس وقت میں اپنی قوم کے سامنے اسلام پیش کروں گا۔ میرا خیال ہے میری قوم اس فیصلے سے اتفاق کرے گی اور بہت زیادہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔“

ارغون نے اچانک نرم روش اختیار کی، بولا۔ ”اگر میری قوم نے آپ کے فیصلے سے اتفاق کیا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔“

نکودار نے ارغون کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ارغون میرے بھائی! پہل ہم ہی کو کرنا ہوگی۔ میرے ساتھ تم بھی مسلمان ہو جاؤ تاکہ ہماری قوم ہماری تقلید میں مسلمان ہو جائے۔“

ارغون نے انکار کر دیا۔ ”نہیں، میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

نکودار بے چینی سے ٹپٹنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر تھے، بولا۔ ”بہر حال کل ہی سکی، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کر لوں گا۔“

ارغون بڑے بھائی کے پاس سے بہت فکر مند اور ادا اس نکلا۔ اس نے محل کی خدمت گار خواتین سے ایک بار پھر ترمہ شیریں کی بابت کئی سوال کیے مگر ان کے جوابوں سے ترمہ شیریں کا کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ آج نکودار نے جو انکشاف کیا تھا اس نے ارغون کے دل و دماغ میں ایک انقلاب، ایک ہیجان سا برپا کر رکھا تھا۔ وہ محل سے نکل کر سیدہ سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لے آیا، اس نے پوچھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ سعد اللہ یہودی بہت خوش تھا، بولا۔ ”شہزادے! اب منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ نکودار نے ایک اور غلطی کر دی۔“

ارغون اور سعد اللہ یہودی آپس میں دیر تک صلاح مشورے کرتے رہے۔ ان دونوں کے چہروں پر تازگی پیدا ہو چکی تھی۔

دوسری طرف نکودار تشویش اور تذبذب لیے شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”وزیر محترم! میں نے اپنے اسلام کے لیے کل کا دن طے کیا ہے۔ میں اب زیادہ وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔“

شمس الدین جوینی نے کہا۔ ”شہزادے! آپ نے اس اعلان میں بھی غلط سے کام لیا ہے، خدا ہم پر رحم فرمائے۔“ نکودار نے ادھر ادھر دیکھ کر اعلان کیا۔ ”میں مسلمان

ہو چکا ہوں وزیر محترم!“

شمس الدین جوینی معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا، اس کو نکودار کے قبول اسلام سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ فکر مند ہو گیا تھا۔

نکودار نے پوچھا۔ ”آپ کیا سوچنے لگے وزیر محترم!“

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اسلام آپ کو اس آئے گا یا نہیں۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”آپ اس طرح نہ سوچیں وزیر محترم۔ اسلام نہ صرف مجھے بلکہ میری پوری قوم کو اس آئے گا، میں جانتا ہوں۔“

شمس الدین جوینی نے کہا۔ ”اب میں بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے اگر آپ مجھ کو سبکدوش کر دیں تو میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا۔“

نکودار اپنے فیصلے پر سختی سے قائم تھا۔ ”کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے مگر میں اسلام کو ترک نہیں کروں گا۔“

شمس الدین جوینی نے بہ آواز بلند آمین کہہ کر نکودار کو کسی حد تک خوش کر دیا۔ نکودار کو معلوم تھا کہ اس نے جو خبر شہزادہ ارغون کو دی ہے اس کو بہت جلد ایک ایک فرد کی زبان پر ہونا چاہیے۔ وہ رات کو اپنے محل میں ہر شخص سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات ابا قہ خان کی اس بیوی سے ہوئی جو ابا قہ خان سے بڑی مگر حسین تھی۔ اس نے نکودار کو روک لیا اور سختی سے پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے تو مسلمان ہو گیا ہے؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”ہاں اب میں نکودار احمد خان ہوں۔“

عورت نے ہنس کر کہا۔ ”اور تو نے ہی ابا قہ خان کی قبر میں لڑکیوں کو بھیجنے سے منع کیا تھا؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے ہی اس جاہلانہ رسم کی منسوخی کا اعلان کیا تھا۔“

عورت نے کہا۔ ”سیدھی سادی حکومت کر، یہ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ اپنے باپ دادا کی رسموں کو ختم کرنے والا ایک دن خود بھی ختم ہو سکتا ہے۔“

نکودار نے سختی سے کہا۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں، میں اصلاح کر کے رہوں گا۔“

وہ آگے بڑھ گیا، آگے ایک منگول بڑی بوڑھی نے روک لیا۔ پوچھا۔ ”اب تو خان بن گیا ہے، تیرا تو یہ فرض تھا کہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتا مگر تو نے غیروں کی

راہ اختیار کی، جادوئی نیلا آسمان تجھ پر رحم کرے۔“
نگودار نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا۔ خدمت گار اور پہرے دار اس کو دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ یہیں ایک جگہ شہزادہ سونجاق مل گیا، اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”محترم ایل خان! اچھا ہوا جو آپ خود یہاں تشریف لے آئے، ورنہ صبح میں خود حاضری دیتا۔“

نگودار نے پوچھا۔ ”کیوں، کوئی خاص بات؟“
سونجاق نے جواب دیا۔ ”پورے محل میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“
نگودار نے کہا۔ ”یہ افواہ نہیں حقیقت ہے، میں نے واقعی اسلام قبول کر لیا ہے۔“
سونجاق نے نگودار کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ ”کیا سچ؟“

نگودار نے جواب دیا۔ ”ہاں سچ۔ میں متمدن قوموں کے سامنے خود کو کمتر سمجھنے لگا تھا۔“
سونجاق نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکا، یوں۔ ”بہر حال ان تبدیلیوں کو یہاں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور یہاں کوئی شخص ایسا ضرور ہے جو انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔“
نگودار نے کہا۔ ”میں اس شخص کو پہچانتا ہوں، اب کوئی اور بات کرو۔“

سونجاق نے جواب دیا۔ ”میں تو آپ لوگوں کا مہمان ہوں، آج ہوں، کل چلا جاؤں گا مگر یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، آپ کو ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔“

نگودار نے موضوع ہی بدل دیا۔ ”اور شہزادے! تم نے ترمہ شیریں کی بابت کچھ نہیں پوچھا۔“

سونجاق نے جواب دیا۔ ”ترمہ شیریں کی بابت میں کیا پوچھوں وہ یہاں ہے ہی نہیں، وہ چلی کہاں گئی؟“
نگودار نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے مگر میں بتاؤں گا نہیں۔“

سونجاق نے پوچھا۔ ”کیا اس کو بیوی بنانے کا ارادہ ہے؟“
نگودار ناراض ہو گیا۔ ”جب میں مسلمان ہو چکا ہوں تو پھر میں اپنی ماں سے شادی کس طرح کروں گا؟“

سونجاق نے خوش ہو کر نگودار کو گلے لگالیا۔ ”تو بہت عظیم ہے، نگودار! تو شاندار انسان ہے۔“

نگودار نے سونجاق کو الگ کیا اور آہستہ سے کہا۔

”جب تم واپس جانا تو ترمہ شیریں کو اپنے ساتھ لیتے جانا۔“
سونجاق ایک دم اتنی بڑی خبر سن کر اپنے آپ میں نہیں رہا۔ زور سے بے اختیار پوچھا۔ ”ترمہ شیریں ہے کہاں؟“
نگودار نے کہا۔ ”آہستہ آہستہ۔ ذرا پیچی آواز میں بولو، وہ جہاں کہیں بھی ہے تمہیں مل جائے گی۔“
سونجاق نے رادھر رادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن شہزادہ ارغون ایسا ہونے کب دے گا؟“

نگودار نے سختی سے کہا۔ ”مگر میں یہ بھی نہیں ہونے دوں گا کہ میری ماں میرے بھائی کی بیوی بنے۔“

سونجاق نے نگودار کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر کہا۔ ”بھائی نگودار! آپ خطرے میں ہیں۔ اگر میں بھی ابھی آپ کے کام آسکا تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں آپ کا پابند ہو گیا ہوں جب کہیں گے، چلا جاؤں گا۔“

نگودار نے آہستہ سے کہا۔ ”قدرے صبر کر صبر۔ پہلے میں محل اور اس کے باسیوں کا جائزہ تولے لوں۔“

نگودار آگے بڑھ گیا۔ وہ محل میں کئی گھنٹے رہا اور ہر جگہ روک کر ہر شخص نے اس سے ایک ہی سوال کیا۔ ”کیا وہ مسلمان ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی دعوت دے گا؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے آباؤ اجداد کو کیوں چھوڑ دیا اور اس طرح وہ چاہتا کیا ہے؟“

ان سارے سوالات کے جواب اس کے پاس تھے لیکن وہ خان تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی کی بات کا جواب دے یا نہ دے چنانچہ اس نے زیادہ تر سوالات کے جواب دیے ہی نہیں۔

محل کا سب سے آخری شخص ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ جب اس نے نگودار کو دیکھا تو تھملا گیا۔ کئی بار اس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اس سے سیدھی طرح بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ نگودار نے اس کی اضطرابی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگالیا تھا کہ بوڑھا چوکیدار اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے چنانچہ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ ”کیوں بڑے صاحب! آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی زبان کھولوں۔“

نگودار نے اس کو یہ آسانی اجازت دے دی۔

بڑے میاں نے کہا۔ ”میں نے آپ کی بابت ایک خبر سنی ہے اور دل ہی دل میں دعایں مانگ رہا ہوں کہ خدا کرے وہ خبر غلط ہو۔“

نکودار نے بات کو الجھانا پسند نہیں کیا، صاف صاف کہہ دیا۔ ”حضرت! میں بھگتہ مسلمان ہو چکا ہوں۔“
بڑے میاں نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مگر ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ خدا آپ کو جملہ آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے۔“

نکودار نے ایک بار پھر زور سے کہا۔ ”آمین۔“
نکودار احمد خان نے محل کی فضا سے یہ اندازہ تو لگالیا تھا کہ اس کے خلاف ورغلا نے اور بے سرو پا باتیں پھیلانے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔ یہ کام کون کر رہا ہے، وہ خوب جانتا تھا۔ اس نے محل میں رکنا فضول جانا اور وہ ابا قہ خان کے خاص محل میں چلا گیا۔ اب یہ محل نکودار کے تصرف میں تھا۔ یہاں سے آدنی بھیج کر اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو طلب کیا کیونکہ اب نازک لمحات میں جوینی سے مشورہ ضروری ہو گیا تھا۔

شمس الدین جوینی جہاں رہتا تھا، وہ جگہ محل سے دور تھی اور محل اور جوینی کی رہائش گاہ کے درمیان چھاؤنی حائل تھی۔ شمس الدین جوینی اپنے گھوڑے پر سوار محل جا رہا تھا۔ جب وہ چھاؤنی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے چھاؤنی میں شہزادہ ارغون اور سعد اللہ بیہودی کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ شمس الدین جوینی کے گھوڑے کی آہٹ نے ان دونوں کو جوینی کی طرف متوجہ کر دیا۔ شہزادہ ارغون نے جوینی کو دیکھا اور سعد اللہ بیہودی سے کچھ کہا پھر دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کا رخ جوینی کی طرف کر دیا۔ جوینی نے ان دونوں کو اپنی طرف آتے جو دیکھا تو گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں وزیر کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔
شہزادہ ارغون نے کھسپائے ہوئے لہجے میں کہا۔
”وزیر محترم! غالباً آپ خان نکودار خان کے پاس جا رہے ہوں گے۔“

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے محل میں اسی وقت طلب فرمایا گیا ہے۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”اچھا ہوا جو آپ یہاں مل گئے ورنہ ہم دونوں آپ کو مبارکباد دینے کے لیے آنے والے تھے۔“

جوینی نے پوچھا۔ ”کس بات کی مبارکباد؟“
شہزادے نے جواب دیا۔ ”نکودار نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب وہ نکودار احمد خان بن چکا ہے۔“

سپینس ڈائجسٹ

جوینی نے کہا۔ ”اگر یہ درست ہے تو نکودار کی یہ دوسری بڑی غلطی ہے۔ ایک صحیح کام غلط وقت پر کیا گیا۔“
سعد اللہ بیہودی اور شہزادہ ارغون ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

شہزادے نے کہا۔ ”اس وقت آپ نکودار کے پاس جا رہے ہیں شاید۔“

جوینی جھوٹ نہیں بول سکا۔ ”میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں محل جا رہا ہوں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”آپ نکودار احمد خان سے کہہ دیجیے گا کہ اس کا یہ فیصلہ غلط ہے۔ قوم اس کی اس غلطی کو نظر انداز نہیں کرے گی۔“

جوینی نے شہزادے کو یاد دلایا۔ ”شہزادے! جس کو تم نکودار احمد خان کہہ رہے ہو، اب وہ ہم سب کا خان ہے، ابا قہ خان کا جانشین، ایل خان۔ آپ اس کی عزت کریں تاکہ دوسرے بھی عزت کریں۔“

شہزادہ ہنسنے لگا۔ ”عزت تو انسان خود کراتا ہے، میں صرف نکودار کی عزت تو کر سکتا ہوں مگر احمد خان کی نہیں۔“

جوینی نے اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی مگر شہزادہ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا، بولا۔ ”ہاں، مجھے ایک اور بات بھی یاد آگئی۔ احمد خان سے کہہ دینا کہ ترمہ شیریں کا کہیں پتا نہیں چل رہا، ہمیں اس کا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ ترمہ شیریں جب مل جائے تو یا تو خود نکودار اسے اپنی بیوی بنالے ورنہ اسے میرے حوالے کر دے کیونکہ میں اپنے آباؤ اجداد کی رسمیں نہیں بدل سکتا۔“

جوینی نے شہزادے کی اس آخری بات کا جواب نہیں دیا، گھوڑے کو آڑا تر چھا کاٹ کر نکال لے گیا۔

نکودار اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جوینی نے دیکھا نکودار بڑی بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہل رہا ہے۔ جوینی کی آہٹ نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا، وہ مسکرانے لگا، بولا۔ ”وزیر محترم! میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔“

جوینی نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کے بلاوے کے ساتھ ہی روانگی اختیار کر لی تھی۔“

نکودار نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”وزیر محترم! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے؟“

جوینی نے جواب دیا۔ ”کام تو آپ نے صحیح کیا ہے مگر غلط وقت پر کیا ہے، صحیح کام غلط وقت پر۔“

نکودار نے برہمی اختیار کی۔ ”آپ مسلمان ہو کر

پاس ترمہ شیریں کو تلاش کریں گے۔“
نکودار نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے، آخر میں کروں کیا؟ اس سے کس طرح نمٹوں؟“
جونی نے کسی شکست خوردہ کی طرح بولنا شروع کیا۔
”افسوس کہ میں بازی جیت کر بھی ہارتا جا رہا ہوں، تجویز یا منصوبہ بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس پر عمل پیرا ہونا۔ سعد اللہ یہودی کامیاب ہے اور میں ناکام۔ میرا خیال ہے اب مجھ کو وزارت عظمیٰ کا منصب چھوڑ دینا چاہیے۔“
نکودار کے ہوش و حواس اڑ گئے، تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔
”خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے گا، میں تمہارے جاؤں گا۔“
جونی نے جواب دیا۔ ”میں بالکل مجبور اور بے

دست و پا ہوتا جا رہا ہوں۔“
وہ دونوں دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور دونوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا حل کیا نکالا جائے۔ آخر جونی ہی نے شہزادے نکودار کو مشورہ دیا۔
”شہزادے! اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو دوں، اگر آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر کوئی آپ کو آپ کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکے گا۔“
نکودار نے اصرار کیا۔ ”تب پھر وہ ترکیب جلد از جلد بتا دیجیے۔“

جونی نے مشورہ دیا۔ ”شہزادے! آپ بالکل غیر جذباتی ہو جائیں اور محل سرا اور اپنے لواحقین میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دیں، اس تبلیغ کا ایک نہ ایک دن اثر ظاہر ہو کر رہے گا اور جب آپ کی قوم کے لوگ مسلمان ہو جائیں گے تو گویا آپ طاقتور ہو جائیں گے۔“
نکودار نے جواب دیا۔ ”یہ ترکیب میرے ذہن میں بھی تھی لیکن یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہے۔ بہر حال میں کوشش ضرور کروں گا۔“

جونی کافی دیر نکودار کے پاس خلوت میں رہ کر باہر نکلا تو منگولوں نے اسے مشتہ انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”اس مسلمان نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتا تو ہمارے مزے ہی مزے تھے۔“

یہاں بایدو خان اور النوخان بھی موجود تھے۔ النوخان نے وزیر کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے جو دیکھے تو فکر میں پڑ گیا۔

جونی اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر بایدو خان نے اس کو آواز دی اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

میرے اسلام پر ملامت کر رہے ہیں، کیا میں دوبارہ اپنے آبائی دین میں واپس چلا جاؤں؟ کیا اسلام کو چھوڑ دوں؟“
جونی نے جواب دیا۔ ”نہیں، میری یہ مشاہیر گز نہیں، آپ کی قوم آہستہ آہستہ تو زیر ہو سکتی ہے مگر ایک دم ایک ہی مرتبہ میں اچانک اس کو نہیں بدلا جاسکتا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی قوم آپ سے ناراض ہوتی جا رہی ہے۔“
نکودار جوانی کے نشے میں تھا، ترنگ میں بولا۔ ”میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ میں ایک ایک کو صبح کر دوں گا اور اگر ارغون یہ سمجھتا ہے کہ وہ منگول عسا کر کا سپاہ سالار اعلیٰ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اس کے سارے منصوبے پلک جھپکتے میں خاک میں مل جائیں گے۔“

جونی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، انہیں آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”نکودار! جذباتی نہ بنیے، اب بھی کچھ نہیں گیا، سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن خدا کے لیے اپنی جذباتیت کو قابو میں رکھیے۔“

نکودار نے اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کی، بولا۔ ”وہ مجھ سے براہ راست یا بالواسطہ یہی پوچھتا رہتا ہے کہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی۔ اس کو تلاش کرایا جائے کیونکہ شہزادہ ارغون اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

جونی نے جواب دیا۔ ”شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کے ہاتھوں میں تماشانا ہوا ہے۔“
نکودار نے کہا۔ ”مگر میں بھی کوئی معمولی یا عام آدمی نہیں ہوں، میں ان سب کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔“

جونی نے جواب دیا۔ ”شہزادے! اب آپ حکمران ہیں..... لیکن جملہ عسا کر شہزادہ ارغون کے قبضے میں ہیں اور خالی حکمران کچھ بھی نہیں ہوتا۔“

نکودار نے کہا۔ ”اور میں ارغون کو اس کے منصب سے ہٹا کر کچھ تو خان کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا سکتا ہوں۔“
”اس وقت آپ کچھ نہ کریں، اگر آپ نے عجلت میں ایسا کیا تو تیسری خطرناک ترین غلطی کریں گے۔“

نکودار نے جونی کو قالین پر بٹھا دیا، بولا۔ ”وزیر محترم! میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ ترمہ شیریں کو چھپا کر رکھیں، میں اس کو سونجاق کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کا سونجاق سے بہتر امیدوار نہیں مل سکتا۔“

جونی سوچنے لگا، اس تجویز کے مفید اور مضر پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ ”بہتر ہے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں، جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ جب سونجاق جائے گا تو شہزادہ ارغون کے آدمی اس کی تلاشی لیں گے اور اس کے

”وزیر محترم! آج کئی دن سے نئے ایل خان سے ملاقات نہیں ہو رہی ہے، نصیب دشمنان وہ بیمار تو نہیں؟“
جونی نے جواب دیا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ہیں اور عنقریب وہ عوامی رابطہ قائم کریں گے۔ اس وقت شاید آپ سے بھی ملاقات ہو جائے۔“

اس بار الفو خان نے زبان سنبھالی اور جونی سے کہا۔ ”مشکل تو یہ ہے کہ جب خاندان والوں پر وقت پڑا ہے تو اس کا اپنی زبان سے اقرار بھی کر لیں لیکن وہ سب تو راشی اور بے غیرت ہیں۔“

جونی نے ہنس کر جواب دیا۔ ”افسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی آپ جیسی عقل نہیں ہے، ورنہ سارے مسائل چشم زدن میں حل ہو جاتے۔“

بایدو نے اپنے بھائی کو ڈانٹا۔ ”میں اسی لیے تجھ کو اپنے ساتھ نہیں لا رہا تھا۔“ پھر جونی سے کہا۔ ”وزیر محترم! آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانے گا۔ ورنہ میں اس وقت نئے ایل خان کے پاس چند پیشکشیں لے کر آیا ہوں۔“
جونی نے پوچھا۔ ”کس قسم کی پیشکشیں؟“

بایدو خان نے جواب دیا۔ ”ان دنوں ایک جاہ پرست اور مطلبی انسان نے نکودار بھائی کے خلاف ایک مہم چلا رکھی ہے۔ میں اپنی قوم اور اپنے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان سے میں یہ آسانی نہٹ سکتا ہوں۔“

جونی نے کہا۔ ”شہزادے بایدو خان! میں بہت سی باتوں سے واقف نہیں اور ادھر معلوم نہیں کیوں نکودار بھی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہا۔ آپ اگر چاہیں تو مل جل کر اپنا کام نکال سکتے ہیں۔“

بایدو خان نے کہا۔ ”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں شہزادہ ارغون کے خلاف۔ اگر مجھ پر اعتبار کیا جائے تو۔“
جونی اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ڈوبتے کو تھکے کا سہارا کے مصداق اس سے بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ”بایدو خان! آپ اگر چاہیں تو واقعی نکودار کی مدد کر سکتے ہیں، میں آپ سے بات کرنے پر مجبور ہوں۔“

بایدو نے کہا۔ ”میں نکودار کے پاس جا رہا ہوں اور اس کو پیشکش کروں گا، اگر وہ راضی ہو گیا تو میں اس کے لیے کام شروع کر دوں گا۔“

جونی اپنی راہ چلا گیا اور بایدو نکودار کے پاس۔ بایدو خان نکودار کے پاس چند بری خبریں لایا تھا لیکن نکودار کو بایدو پر اعتبار نہیں تھا اس لیے اس نے ملاقات سے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کیخدا تو خان کو طلب کر لیا۔ اس موقع

پر شہزادہ سونجاق بھی ان دونوں کے پاس تھا۔ سونجاق نے نکودار کو مشورہ دیا کہ اس معاملے میں جونی کو نظر انداز نہ کریں اور اپنے ہر قسم کے مشوروں میں اس کو شریک رکھیں۔ لیکن نکودار کو اس رائے کی اصابت سے انکار تھا، جواب دیا۔ ”میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ شمس الدین جونی میرے ہر اقدام کی مخالفت کرنے لگا ہے، میں نے خان کی قبر میں زندہ دفن کی جانے والی لڑکیوں والی رسم ختم کرنا چاہی تو جونی نے کہا یہ میری بدترین غلطی ہے پھر جب میں نے اسلام قبول کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری دوسری بدترین غلطی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ یہ صحیح کام کا غلط وقت تھا، پھر تم ہی بتاؤ میں اس سے کیا مشورہ کروں اور اس کا مشورہ کہاں تک صائب ہو سکتا ہے؟“

کیخدا تو خان نے جونی کی تائید کی۔ ”بھائی نکودار! اس نے آپ کے اقدام کو غلط نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ صحیح کام جو غلط وقت پر کیا گیا۔ آپ جونی کو چھوڑ کر تیارہ جائیں گے۔“
سونجاق نے بھی کیخدا تو خان کی تائید کی۔ ”آپ نے شہزادہ ارغون کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا کے سخت غلطی کی ہے۔ آپ پہلے اس غلطی کا ازالہ فرمائیں اس کے بعد کچھ اور کریں۔“

کیخدا تو خان نے کہا۔ ”اور آپ جو کچھ بھی کریں جونی سے مشورہ کر کے کریں، اس کو الگ نہ رکھیں۔“
نکودار نے جواب دیا۔ ”جب پھر میں اس کو بلواتا ہوں، آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر لیں۔“
سونجاق نے کہا۔ ”اب تو کام جاری رہنا چاہیے، یہ آرام کا وقت نہیں ہے۔“

کیخدا تو خان نے ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا کہ وہ جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو وزیر جونی کو حاضر کیا جائے۔ خدمت گار خاتون اسی وقت چلی گئی۔

جونی کی آمد سے پہلے بایدو خان کا بھی ذکر چھڑا۔ نکودار نے کہا۔ ”بایدو بھی آیا تھا غالباً اس کے ساتھ اس کا بھائی الفو بھی تھا۔ مگر چونکہ میں اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں، اس لیے اس سے ملاقات نہیں کی اور یوں ہی چلتا کر دیا۔“

سونجاق نے کہا۔ ”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس سے اس کے شوق کی آگ اور بھڑکے گی اور پھر یہی شوق آتش انتقام میں بدل جائے گا۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”شوق کیسا؟ کس قسم کا شوق؟“
سونجاق نے جواب دیا۔ ”نئے ایل خان سے ملنے کا شوق۔“
نکودار خاموش ہو گیا، اس پر انجمنوں اور پریشانیوں کی

جونی نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی آپ نے بایدو خان کے سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ آپ اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو دیں گے، ان مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں گے اور اگر ایسا کریں گے تو یہ آپ کی تیسری بڑی غلطی ہوگی۔“

نکودار نے کھتا تو خان اور سونجاق کی طرف دیکھا۔ ”میں کیا کہتا تھا، جونی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ میری غلطیاں پکڑنے لگا ہے۔“

جونی نے جواب دیا۔ ”اگر آپ ایسا سمجھنے لگے ہیں تو یہ میری بد قسمتی ہے ورنہ میں ہمیشہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا رہا ہوں۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”اگر میں اعلیٰ مناصب مسلمانوں کو دوں گا تو کیا غلط کام کروں گا؟“

جونی کو جوش آ گیا۔ ”شہزادے! عہدے اور مناصب اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ملتے ہیں یا تعصب کی بنیاد پر، اگر اس کی بنیاد تعصب پر ہوتی تو آپ کے دادا اور والد مجھے وزارت کا منصب نہ دیتے کیونکہ میں مسلمان ہوں اور آپ کے دادا اور والد مسلمان نہیں تھے۔ جب آپ کے اس تعصب سے مستحقین کی حق تلفی ہوگی تو اس سے بے چینی بڑھے گی اور جب بے چینی بڑھے گی تو حکومت کمزور ہونے لگے گی۔“

بایدو خان، جونی کی باتوں سے سب سے زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے جونی سے کہا۔ ”وزیر محترم! آپ بیشک بلا کے ذہین انسان ہیں، خوب۔“

شہزادہ سونجاق نے کہا۔ ”جونی! اگر آپ پسند کریں تو چغتائی خاندان آپ کو وزارت کا منصب پیش کر سکتا ہے۔“

کھتا تو خان نے کہا۔ ”نہیں شہزادہ سونجاق! یہ ہماری آبرو ہیں، ہم انہیں کس طرح جدا کریں گے۔“

جونی نے بایدو سے پوچھا۔ ”ہاں تو بایدو خان! آپ شہزادہ نکودار کی کس طرح مدد کریں گے؟“

بایدو نے کہا۔ ”آپ جس طرح چاہیں گے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”بایدو خان! آخر تو نے کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔“

بایدو اپنے دل کی بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، بولا۔ ”میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں پھر کسی وقت کہہ دوں گا لیکن اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ خود کو برسرِ اقتدار رکھنا

یلغار تھی، کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”پھر کیا بایدو کو بلوالینا چاہیے؟“

سونجاق نے جواب دیا۔ ”ضرور بلوائیے، اس کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ وہ آپ کے لیے مفلس ہے یا دھوکے باز۔ باتیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔“

نکودار نے بایدو خان کو بھی طلب کر لیا۔

کافی دیر بعد بایدو اور الغو تو پہلے آگئے مگر جونی کو آنے میں دیر لگی لیکن جونی نے آتے ہی حیرت سے پوچھا۔ ”شہزادے! ابھی تو میں گیا تھا یہاں سے پھر یہ دوبارہ طلبی کیوں؟“

نکودار نے اپنے بھائی کھتا تو خان اور سونجاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چند اہم قدم اٹھانا چاہتا ہوں لیکن آپ کے مشورے اور تائید کے بعد۔ اسی لیے میں نے آپ کو دوبارہ طلب کیا ہے۔“

جونی نے نکودار کی بات سنی ان سنی کر دی، بولا۔ ”بایدو خان نے کچھ بتایا؟ پہلے میں یہ جانتا چاہتا ہوں۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”بایدو خان تو ابھی آئے ہیں، ابھی ان سے بات نہیں ہوئی۔“

جونی نے بایدو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”لیکن جناب، آپ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں، جب میں یہاں سے جا رہا تھا تو آپ یہاں داخل ہو رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

بایدو نے جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت مجھے شرفِ باریابی حاصل نہیں ہوا تھا اور میں واپس چلا گیا تھا۔“

جونی نے کہا۔ ”بہت خوب! اس وقت آپ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپ چند بڑی اور اہم خبریں.....“

لیکن بایدو نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”اس سے زیادہ بری خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم نکودار کی اصلاح قبول نہیں کر رہی اور وہ یہ جانتا چاہتی ہے کہ کیا نکودار احمد خان اب اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو عطا فرمائیں گے؟“

نکودار نے جلدی جلدی جواب دیا۔ ”ہاں، میں اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو تفویض کر دوں گا لیکن ان مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے۔“

جونی دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس نے نکودار سے پوچھا۔ ”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”مشورے کرنے کے لیے۔“

جونی نے کہا۔ ”پھر آپ فیصلے نہ سنائیں پہلے مشورہ کریں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔“

نکودار نے کہا۔ ”لیکن میں نے ابھی تک تو کوئی اپنا

چاہتے ہیں تو عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ کسی اور کو بنانا ہوگا، کسی ایسے شخص کو جو آپ کا وفادار ہو، جس کی وفاداری اٹل ہو۔“
نکودار اس تجویز پر اچھل پڑا، بولا۔ ”یہی تجویز تو میں نے سوچی تھی۔ خوب خوب۔“

لیکن جوینی نے اس کی بھی مخالفت کی، بولا۔
”شہزادے نکودار! میں کہتا ہوں آپ ایسا سوچیں بھی نہیں، آپ یہ غلطی نہیں کریں گے۔ خود ابا قہ خان نے شہزادہ ارغون کو سپاہ سالار بنایا تھا۔ ہم ارغون کو کس طرح اس کے منصب سے ہٹا سکتے ہیں۔“

کیا تو خان نے پوچھا۔ ”پھر ہم اس آگ کو کس طرح بجھائیں جو اندر ہی اندر نہیں سلگ رہی ہے۔ اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ اوپر نمودار ہونے والا دھواں کہاں سے نکل رہا ہے۔“
جوینی نے جواب دیا۔ ”آپ سب یکجا ہو جائیں جب تک دور دور رہیں گے، اختلافات بڑھتے رہیں گے۔ آپ دونوں شہزادہ ارغون سے اس کے محل میں جا کر ملاقات کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ آپ سے برگشتہ کیوں ہے؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”اگر اس طرح یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو میں شہزادہ ارغون سے مل لوں گا۔“
لیکن بایدو نے سردمہری سے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ اس طرح معاملہ نہیں بنے گا اور شہزادہ ارغون اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا کہ شاید شہزادہ نکودار کمزور پڑ رہے ہیں۔“

جوینی نے کہا۔ ”اگر شہزادہ ارغون یہ سمجھے گا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ اٹلے سیدھے اقدام سے اختلافات کی تلخ کو اور زیادہ بڑھا دیا جائے۔“

بایدو خان نے پوچھا۔ ”وہ ترمہ شیریں کا کیا چکر ہے؟“
نکودار نے جواب دیا۔ ”ترمہ شیریں کا کوئی چکر نہیں۔ والد کی موت کے بعد سے وہ غائب ہے جب وہ مل جائے گی تو اس کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر دیا جائے گا۔“

بایدو نے کہا۔ ”لیکن مشہور تو یہ ہے کہ اس کو آپ ہی لوگوں نے نہیں چھپا دیا ہے۔“

کیا تو خان نے کہا۔ ”اس کو ہم کیوں چھپائیں گے؟ یہ ہم پر الزام ہے۔“

بایدو نے کہا۔ ”یہ الزام نہیں حقیقت معلوم ہوتی ہے چونکہ نکودار نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ منگولوں کی جاہلانہ رسوم کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔“

جوینی نے کہا۔ ”اس وقت ترمہ شیریں کا ذکر کیوں

آگیا سچ میں؟“

شہزادہ سونجاق نے بایدو پر طنز کیا۔ ”شہزادہ بایدو خان کو ترمہ شیریں سے دلچسپی ہو گئی ہے اس لیے اس کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔“

بایدو خان سونجاق کی طرف مڑ گیا۔ ”شہزادہ سونجاق! کم از کم آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ نے ترمہ شیریں کو اغوا کر لیا تھا اور شاید اب بھی آپ اسی کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔“

جوینی نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”صاحبان! آپ سب ایک ہی خانوادے کے چراغ ہیں میرا خیال ہے، اب یہ فضول باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ گھر کی باتیں گھر ہی میں رہنا چاہئیں، انہیں باہر نہیں نکھٹانا چاہیے۔“
لیکن بایدو بہت غصے میں تھا، بولا۔ ”جناب دالا! جب تک شہزادہ سونجاق ہم میں موجود ہے شہزادہ ارغون سے مفاہمت نہیں ہو سکتی کیونکہ ارغون شہزادہ سونجاق کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ میں اس سلسلے میں شہزادہ ارغون سے کافی باتیں کر چکا ہوں۔“

شہزادہ سونجاق نے چڑ کر جواب دیا۔ ”بایدو خان! تم دو غلے ہو، تم شہزادہ ارغون سے بھی ملتے ہو اور شہزادہ نکودار سے بھی۔ غالباً تم دونوں ہی جگہ اپنی خدمات پیش کرتے رہے ہو اور جب شہزادہ ارغون نے گھاس نہیں ڈالی تو تم یہاں آ گئے۔“

بایدو خان غصے میں کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہروں گا، یہاں میری بے عزتی کی گئی ہے۔“
جوینی نے ان سب کو لعنت ملامت کی۔ ”ہم سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ اپنے اختلافات دور کر کے بھائی بھائی بن جائیں مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔“

بایدو خان نے کہا۔ ”میں جارہا ہوں۔“
جوینی نے کہا۔ ”لیکن بایدو خان! آپ دوبارہ پھر ملیں گے۔ نکودار آپ کا انتظار کرے گا۔“

لیکن بایدو خان نے کوئی جواب نہیں دیا، چلا گیا۔ جوینی نے شہزادہ سونجاق سے کہا۔ ”شہزادے! آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ کو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“

شہزادہ سونجاق نے کہا۔ ”میں بھی اس گھرانے کا ایک فرد ہوں۔“

جوینی نے کہا۔ ”یہ غلط ہے، تم چغتائی ہو اور یہ سب

تو لوئی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خاموش رہیں۔“

شہزادہ نکودار نے سوچنا کو آگے دکھائی اور اشاروں ہی اشاروں میں معلوم نہیں کیا کہا کہ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اب یہاں نکودار اور کینا تو خان کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جونی نے کہا۔ ”اب جبکہ آپ دونوں کے سوا یہاں کوئی بھی نہیں، میں چند کام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

نکودار اور کینا تو خان جونی کی باتیں بڑے اٹھماک سے سننے لگے۔ جونی نے ان دونوں کو سمجھانا شروع کیا۔ ”میں آپ دونوں میں مثالی اتحاد دیکھ رہا ہوں اس لیے میری نمک خواری کا یہ فرض ہے کہ آپ دونوں کو جو مشورے بھی دوں، وہ مخلصانہ اور میری نیک نیتی پر مبنی ہوں۔“

کینا تو خان نے کہا۔ ”جناب والا! میں بھائی نکودار کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا۔“

نکودار نے کہا۔ ”اور اسی لیے تو میں کینا تو خان کو اپنے جملہ عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ بنانا چاہتا ہوں۔“

جونی نے کہا۔ ”شہزادے! آپ جو چاہیں کریں لیکن قدم اٹھانے سے پہلے اس کا چرچہ نہ کریں۔ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ کہا تھا کہ اب آپ حکومت کے خاص خاص کلیدی عہدے مسلمان منگولوں کو دیں گے، آپ نے جو کچھ کہا درست کہا تھا۔ آپ کو یہی کرنا بھی ہے مگر جس جگہ، جن افراد کے سامنے اور جس وقت کہنا یہ سب غلط تھا۔“

نکودار نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ ”تو گویا میں غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہا ہوں۔“

جونی نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک ہے، کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جب بایدو کو اس کے شایان شان اعزاز نہیں ملا تو وہ آپ کے خلاف باتیں کرنے لگا۔ آپ بایدو خان کے دل کی باتیں جاننے کے لیے اس سے تھیلے میں ایک بار اور ملیں گے۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”وزیر محترم! اب میں آپ کے مشوروں کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اٹھاؤں گا۔“

جونی نے دونوں کو سمجھایا۔ ”اب کوئی نیا ہنگامہ نہیں ہوگا۔ شہزادہ نکودار اور کینا تو خان اپنے بھائی ارغون کے پاس جائیں گے اور اس سے صلح صفائی کر لیں گے۔ آپ ارغون سے کہیں گے کہ وہ تمام رسوم جو آبائی چلی آرہی ہیں، برقرار رہیں گی اور آپ نے اسلام ذاتی طور پر قبول کیا ہے اور حکومت کے جملہ عہدے اور مناصب اہلیتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔“

نکودار نے کہا۔ ”میں آج رات ہی ارغون سے ملوں گا۔“

جونی نے مزید سمجھایا۔ ”اور جب آپ یہ دیکھیں کہ شہزادہ ارغون مطمئن ہو گیا ہے تو آپ اس کو اپنی راہ سے نہایت ہوشیاری سے ہٹا دیں گے، اس کو گرفتار کر کے کینا تو خان کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا دیجیے۔“

جونی کی عاقلانہ باتیں دونوں کو سمجھ میں بخوبی آ رہی تھیں۔

کینا تو خان فرط عقیدت سے بولا۔ ”میرے باپ دادا کتنے عقلمند اور مردم شناس تھے کہ انہوں نے آپ کو وزارت عظمیٰ کا منصب عطا فرمایا۔“

نکودار نے کہا۔ ”جب تک جونی جیسا عاقل و فرزاندہ ہمیں میسر ہے کوئی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

☆☆☆

رات بہت اندھیری تھی، شہزادہ ارغون کا محل ذرا فاصلے پر تھا۔ منگولوں کے محلات شامی نصف دائرے میں بنے ہوئے تھے، نکودار کا محل تقریباً بیچ میں تھا اور شہزادہ ارغون کا محل بائیں طرف کے کنارے، بالکل آخری محل۔ شہزادہ نکودار نے ارغون کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھانا چاہتے ہیں۔ شہزادہ ارغون نے جواب میں کہلا دیا تھا۔ ”یہ میری خوش قسمتی ہے اور میں اس پر فخر کروں گا۔“

جونی نے شام کو نکودار اور کینا تو خان سے ملاقات کی اور انہیں خوب اچھی طرح سمجھایا۔ ”دیکھیے، وہاں مشتعل نہ ہو جائیے گا۔ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھیے گا اور بات بہت ہوشیاری سے کیجیے گا۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”وزیر محترم! اللہ نے چاہا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

جونی نے کہا۔ ”میں بات چیت کی تفصیلات جاننے کے لیے یہیں موجود رہوں یا اپنے گھر چلا جاؤں؟“

نکودار نے پوچھا۔ ”آپ کی اپنی کیا رائے ہے اس بارے میں؟“

جونی نے جواب دیا۔ ”میں گھر چلا جاؤں گا کیونکہ سعد اللہ یہودی بہت چالاک ہے ممکن ہے، میری محل میں موجودگی کا علم شہزادہ ارغون کو بھی ہو جائے۔“

جونی اپنے گھر چلا گیا اور شہزادہ نکودار اور کینا تو خان شہزادہ ارغون کے پاس چلے گئے۔ رات کی تاریکی میں مشتعل بردار دونوں شہزادوں کے آگے پیچھے مشعلیں لیے چل رہے تھے۔ درمیان میں گھنے درختوں کا باغ تھا۔ دونوں اس باغ کو عبور کر کے ارغون کے محل کے سامنے پہنچے تو انہیں دور ہی سے محل کی کھڑکیوں سے اندر کی روشنیاں

دکھائی دینے لگیں۔ شہزادہ ارغون ان دونوں کا دیر سے انتظار کر رہا تھا۔

جب بھائیوں کا آنا سامنا ہوا تو وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ نکودار نے ارغون کی پیٹھ تھپتھپائی اس کا سر ارغون کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔

نکودار نے کہا۔ ”بھائیوں کو دور دور نہیں رہنا چاہیے، ورنہ حاسد سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔“

کیٹھا تو خان نے کہا۔ ”میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ میرا ایک بھائی ایل خان ہے اور دوسرا سپاہ سالار اعلیٰ۔“

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”میں بھی اپنے بھائی ایل خان پر ناز کرتا ہوں۔“

نکودار کی نظر اچانک بایدو خان پر پڑ گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”بایدو خان تم یہاں کہاں؟“

بایدو خان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں شرارت پائی جاتی تھی۔ بولا۔ ”آخر میں بھی تو آپ سب کا بھائی ہوں تا یا ز ادیا بچا ز ادیا ہی سہی، بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔“

کیٹھا تو خان بھی بایدو کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ شہزادہ ارغون نکودار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا۔ ”آئیے ہم سب اندر چلیں، وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

وہ محل کے اندر چلے گئے۔ یہاں نئے ایل خان اور اس کے چھوٹے بھائی کی آمد کی خوشی میں ضیافت کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے تو ہم سب ضروری باتیں کر لیں اس کے بعد کھانا کھائیں۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

بایدو کسی اور سے مصروف گفتگو تھا۔ نکودار نے شہزادے سے پوچھا۔ ”یہ بایدو یہاں کیا لینے آ گیا؟ اس کو کس نے بلالیا؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اپنی مرضی سے چلا آیا۔ یہ مجھے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا، میں نے اسے منع کر دیا۔“

نکودار نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اور بھی کچھ کہہ رہا تھا یا بس اتنا ہی؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”اور یہ کیا کہے گا؟ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

نکودار نے کہا۔ ”مجھے بایدو ذرا بھی پسند نہیں، کیا ہماری گفتگو اس کے سامنے ہوگی؟“

شہزادے ارغون نے جواب دیا۔ ”یہ ضروری تو نہیں۔۔۔ اگر آپ اس کی موجودگی کو نا پسند فرماتے ہیں تو

اسے کسی بہانے چلتا کر دیتا ہوں۔“

نکودار نے کہا۔ ”میں یہی چاہتا ہوں۔“

دوسری طرف بایدو کیٹھا تو خان سے کہہ رہا تھا۔ ”میں نے اپنی اور آپ لوگوں کی ملاقات کا ذکر نہیں کیا۔ براہ کرم آپ لوگ بھی چپ رہیے گا۔“

کیٹھا تو خان نے جواب دیا۔ ”میں یا بھائی نکودار کیوں ذکر کرنے لگے؟“

بایدو خان نے نکودار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی نکودار اگر چاہتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی اور میں وہ حل پیش کرتا کہ بس مزہ ہی آ جاتا لیکن وہ میری بات سننے پر آمادہ ہی نہ ہوئے۔“

کیٹھا تو خان نے کہا۔ ”تم دوبارہ مل لینا بھائی نکودار سے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھ دینا۔ اگر وہ مفید اور کارآمد لگی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تم سے فائدہ نہ اٹھائیں۔“

بایدو خان باتیں تو کیٹھا تو خان سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان نکودار اور شہزادہ ارغون کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ کیٹھا تو خان خطرے کی بوسوگھہ کر فوراً ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ”یعنی کمال ہے آپ دونوں مجھے دور بٹھا کے اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔“

نکودار نے خاصا نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا، بولا۔ ”کیٹھا تو خان! میں ارغون سے کہہ رہا تھا کہ میں نے نادانی اور ناتجربہ کاری میں جن اصلاحات کا اعلان کر دیا تھا، اب اس پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ شاہی مناصب اور عہدے مذہب و ملت کی تفریق اور امتیاز کے بغیر صرف اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے لوگوں کو دیے جائیں گے۔“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا، ورنہ یہاں کی صورت حال بگڑتی جا رہی تھی۔ میری قوم کے لوگ ان اصلاحات اور تہذیبوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔“

نکودار نے کن انکھیوں سے بایدو خان کی طرف دیکھا اور شہزادہ ارغون سے کہا۔ ”شہزادہ بایدو خان کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟“

شہزادہ ارغون نے اس اشارے کا مطلب سمجھ لیا، بولا۔ ”وہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وزیر شمس الدین جوینی کو بھی یہاں بلوایا جائے۔“

نکودار نے اپنے دل و دماغ میں ہنگامہ محسوس کیا،

بولی۔ ”لیکن میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے، یہاں دیر جوینی کا کیا کام؟“

لیکن شہزادہ ارغون نہیں مانا اور اس نے بایدو خان کو جوینی کے پاس بھیج دیا۔

نکودار نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”بھائی ارغون! ہم دونوں کا باپ اور ماں ایک ہیں۔“

کیخا تو خان بیچ میں بول پڑا۔ ”اور میں۔ مجھے کیوں الگ کر دیا؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”تو بھی ہم دونوں کا حقیقی بھائی ہے۔ ہم تینوں کی ماں بھی ایک ہے اور باپ بھی ایک۔“

نکودار نے کہا۔ ”یہ فضول باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، اس وقت تو وہ باتیں ہونی چاہئیں جن کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

کیخا تو خان نے نکودار کی طرف سے بولنا شروع کر دیا۔ ”بھائی نکودار کو معلوم نہیں کیوں غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم بھائیوں میں ایسا نہیں رہا اور ہم تینوں حاسدوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔“

شہزادہ ارغون نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔

کیخا تو خان کہتا رہا۔ ”مجھے یاد ہے میرے باپ نے جھاڑو کی مثال دے کر اتحاد اور اتفاق کی افادیت پر روشنی ڈالی تھی۔“

نکودار نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”بات مختصر ہونی چاہیے، اس وقت میں تمہیں یہ یقین دلانے آیا ہوں کہ اب میں کوئی بھی قدم تمہارے مشورے اور اجازت کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا اور تم بھی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم کوئی ایسا دیا کام نہیں کرو گے اور حاسدوں کی باتیں سن کر انہیں میرے علم میں لاؤ گے کیونکہ اسی طرح ہم دونوں اپنے اتحاد اور حکومت کو برقرار رکھ سکیں گے۔“

شہزادہ ارغون اپنے بھائیوں کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا اس کے بعد پوچھا۔ ”میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی باتوں میں جن حاسدوں اور سازشیوں کا ذکر کیا ہے، آخر وہ ہیں کون؟ میرے آس پاس تو ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے۔ آپ دونوں کے پاس موجود ہوتو بات الگ ہے اور پھر ہمارا اتحاد و اتفاق ختم ہی کب ہوا ہے؟ وہ باقی ہے، موجود ہے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جو قدم اٹھاؤں گا آپ کی رضا اور اجازت سے اٹھاؤں گا۔ آپ بڑے ہیں اور خدا نے آپ کو اہل خانہ بنا دیا ہے، میں اس کا

ہمیشہ احترام کروں گا۔“

دونوں بھائی شہزادہ ارغون کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔ نکودار نے پوچھا۔ ”تو یہ سچ ہے کہ تمہیں کسی نے بھی ہمارے خلاف نہیں بھڑکایا؟“

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ”میں اس کی قسم کھا سکتا ہوں۔“

نکودار حیرت سے کیخا تو خان کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر شہزادہ ارغون سے کہا۔ ”تب پھر اب بات ہی کون سی رہ گئی؟ بس یہی بات کرتا تھی۔“

کیخا تو خان بالکل خاموش تھا، وہ ان دونوں سے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بایدو خان شمس الدین جوینی کو لے کر آ گیا تو شہزادہ نکودار نے جوینی سے کہا۔ ”جوینی، محترم وزیر! میں حیران ہوں کہ آخر میں اتنے دنوں سے غلط فہمیوں میں کیوں مبتلا ہوں، یہاں تو کوئی بات ہی نہیں۔“

کیخا تو خان نے بایدو خان سے کہا۔ ”ہم نے آپ دونوں کی وجہ سے کھانا نہیں شروع کیا۔“

جوینی کو نکودار کی بات سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے، اس نے بات بتائی۔ ”میں نے تو ہمیشہ یہی کہا کہ آپ تینوں بھائی ہیں، کسی اور کو آپ کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔“

اس کے بعد کھانے کا دور چلا اور سب کھانے پر پل پڑے۔

☆☆☆

بایدو خان، نکودار سے ایک بار پھر ملا اور بالکل تجھے میں ملا۔ اس نے بایدو خان سے پوچھا۔ ”ہاں اب بتا تو مجھے کون سا مشورہ دینے والا تھا؟“

بایدو خان نے کہا۔ ”نکودار! آپ ہم سب کے لیے محترم اور قابل تعظیم ہیں، آپ شہزادہ ارغون کی باتوں میں نہ آئیں اور اس کو معزول کر کے کسی اور کو سپاہ سالار اعلیٰ بنادیں۔“

نکودار نے پوچھا۔ ”کسی اور کو، کون؟ کوئی نام ہے تیرے ذہن میں؟“

بایدو خان نے جواب دیا۔ ”وہ میں خود ہوں، اگر آپ مجھے سپاہ سالار اعلیٰ بنادیں گے تو میں ہمیشہ آپ کا وقار رہوں گا اور آپ پر کسی سمت سے بھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔“

نکودار نے چونک کر بایدو خان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ”لیکن ارغون سے میرا جھگڑا ہی کیا ہے۔ اس سے کوئی اختلاف بھی نہیں پھر میں اس کو معزول کیوں کروں؟“

لیکن بایدو خان اپنی رائے پر ڈٹا ہوا تھا، بولا۔

لیکن میں بھی کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔ کل رات کو ارغون میرا مہمان ہوگا۔ میں اس کی دعوت کر رہا ہوں، اس کے ساتھ بد بخت سعد اللہ بیہودی بھی آئے گا۔ میں اسی وقت انہیں گرفتار کر کے تجھے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کر دوں گا۔ تو اس منصب کے لیے تیار رہ۔“

دوسرے دن ترمہ شیریں کو مراغہ کے باہر شہزادہ سونجاق کے حوالے کر دیا گیا وہ اسے لے کر تیزی سے خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔

نکودار نے اپنے سپاہ سالار اعلیٰ کی ضیافت کا شاندار اہتمام کیا تھا۔ محل کے پیچھے میدان میں دیکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان کے چولہوں سے دھواں سہ پہر ہی سے اٹھنے لگا تھا۔ نکودار نے محل کی چھت سے اس اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا تو پھولے نہ سہایا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو اس دھوئیں کی طرح رات شہزادہ ارغون تو بھی فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔“

شام ہو گئی۔ کینا تو خان ابھی تک نکودار کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ نکودار کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ اسی وقت شہزادہ کینا تو خان کو اس کے سامنے پیش کرے۔

مغرب سے ذرا پہلے نکودار نماز کے لیے وضو کر رہا تھا۔ اس حال میں ایک خدمت گار نے نکودار کو مطلع کیا۔ ”خان محترم! خبر ملی ہے کہ شہزادہ ارغون تشریف لا رہے ہیں۔“ نکودار مسکرایا، بولا۔ ”میں مغرب کی نماز ادا کر لوں..... تو ارغون کو میرے کمرے میں بٹھا دے۔“ خدمت گار نے کہا۔ ”ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“ نکودار نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ ان سب کو ہال نما کمرے میں بٹھایا جائے۔“

نکودار وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگا، اسی دوران میں خدمت گار چلا آیا۔ ”حضور والا! شہزادہ ارغون کے ساتھ دو چار نہیں کئی ہزار آدمی ہیں اور ان کی نیت اچھی نہیں لگتی۔“ لیکن اب نکودار کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، وہ رکوع سے سجدے میں چلا گیا۔

خدمت گار برابر اعلان کر رہا تھا۔ ”حضور والا! وہ بغیر اجازت کے محل میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔“

نکودار خاموش تھا، نماز پڑھنے میں مشغول۔ خدمت گار بہت زیادہ فکر مند تھا کہ آخر یہ نکودار خاموش کیوں ہے؟ اس کے بعد خدمت گار کی آواز سنائی نہیں دی، ایسا لگا جیسے

”شہزادہ نکودار آپ تاریکی میں ہیں۔ شہزادہ ارغون پر آپ کا اعتماد آپ کی زندگی کی بدترین غلطی ہوگی۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”میں اس بدترین غلطی کو قبول کرتا ہوں لیکن میں اس کو معزول نہیں کروں گا۔“

اس کے بعد اس نے تالی بجا کے خدمت گاروں کو طلب کیا اور بایدو خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس کی سازش حکومت اور شاہی خاندان کے لیے سخت خطرہ بن گئی ہے۔“

بایدو خان اس غیر متوقع حکم سے گھبرا گیا، بولا۔ ”نکودار! تم مجھے قید کر سکتے ہو لیکن میری باتوں کی سچائی کو بدل نہیں سکتے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے تم ارغون پر اعتبار نہیں کر سکتے۔“

نکودار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نہ تو تجھ پر اعتبار کرتا ہوں، نہ اپنے بھائی ارغون پر..... میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے۔“ اس کے بعد نکودار نے بہ آواز بلند کہا۔ ”اب آپ لوگ بھی باہر آ جائیں۔“

بایدو خان نے دیکھا، اس حکم کے بعد پردے کے پیچھے سے شمس الدین جوینی، شہزادہ کینا تو خان اور سونجاق مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ نکودار نے ان تینوں سے کہا۔ ”آپ لوگوں کا خیال درست تھا۔ یہ ساری سازشیں اسی ایک شخص کی تھیں۔“

جوینی نے یہاں بھی حکمت عملی سے کام لیا، نکودار کو مشورہ دیا کہ..... حالات پر قابو پاتے ہی بایدو خان کو پہلی فرصت میں قتل کر دیجیے گا کیونکہ میں نے اس سے زیادہ ناقابل اعتبار آدمی نہیں دیکھا۔

نکودار نے سونجاق سے کہا۔ ”اور سونجاق! تم کل ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں ترمہ شیریں آگے مل جائے گی۔“ سونجاق نے پوچھا۔ ”لیکن وہ کہاں ملے گی مجھے؟“ نکودار نے جواب دیا۔ ”مراغہ کے باہر، تمہیں تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ تمہیں تلاش کر کے ترمہ شیریں کو پہنچا دیں گے۔“

شمس الدین نے اجازت چاہی۔ ”اچھا شہزادے، میں تو چلا اب۔ جب آپ مجھے طلب فرمائیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔“

شمس الدین جوینی اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں صرف دو بھائی رہ گئے تھے۔ شہزادہ نکودار اور کینا تو خان۔ نکودار نے کہا۔ ”ارغون ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے، اس نے حاسدوں اور سازشیوں کے دھوکے سے انکار کر دیا۔“

کسی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔
تین رکعت فرض ادا کرنے کے بعد جب اس نے مڑ
کر دیکھا تو شہزادہ ارغون اور سعد اللہ یہودی اس کے پیچھے
کھڑے اس کو گھور رہے تھے۔

نکودار نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”کوئی بات نہیں،
ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ جس طرح آسمان پر ایک
سورج ہے، اسی طرح اس محل میں ایک ہی حکمران رہے گا۔“
نکودار نے کچھ کچھ یہودی کا مطلب سمجھ لیا تھا، پھر بھی
تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ”میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“
سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب صاف
ہے۔ ہم تجھے معزول اور شہزادے ارغون کو اپنا خان بناتے ہیں۔“
نکودار نے کہا۔ ”لیکن تجھ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟“
جواب میں شہزادہ ارغون نے میان سے تلوار نکال کر
نکودار کی گردن پر وار کیا۔ ”یہ حق اس نے، اس تلوار نے
ہمیں دیا ہے۔“

تلوار نہتے نکودار کا سر اڑاتی دوسری طرف نکل گئی۔
نکودار کا سر الگ جاگرا اور جسم فرش پر تڑپنے لگا۔ نکودار کا
خون بہہ بہہ کر سعد اللہ یہودی کے جوتے تر کرنے لگا۔
نکودار کے قتل کے بعد شہزادہ ارغون کے آدمی محل
کے اندر اور باہر یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے۔ ”وہ خان
جس نے اپنا مذہب ترک کر دیا تھا اور جو ہمارے آباؤ اجداد
کی رسوم مناد بنا چاہتا تھا، قتل کر دیا گیا ہے اور قوم ایک بہت
بڑے فتنے سے نجات پاگئی۔ اب شہزادہ ارغون ہمارا خان
ہے، ایل خان اور دیکھو خبردار جو کسی نے شہزادہ ارغون کے
خلاف کچھ کہا یا زبان کھولی۔ نیلا جاودانی آسمان ہمارے
موجودہ ایل خان کو صدیوں قائم اور برقرار رکھے۔“

شہزادہ ارغون نے محل کے چتے چتے میں ترمہ شیریں کو
سلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔ اس کے بعد اس نے شہزادہ سونجا کو
ڈھونڈا مگر وہ بھی نہیں ملا۔ دونوں طرف سے مایوس ہونے کے
بعد اس نے ان دونوں کی سلاش کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اس نے کینا تو خان سے کچھ نہیں کہا کیونکہ کینا تو خان
اپنے آبائی دین پر قائم تھا۔ اس نے کینا تو خان سے کہا۔
”شہزادے! نکودار میرا بھی بھائی تھا مگر گم کردہ راہ بھائی۔ میں

نے اس کو قتل کر کے ہزاروں لاکھوں منگولوں کی خواہش پوری
کر دی اور ان ہزاروں لاکھوں میں تو خود بھی شامل ہے۔“
بایدو خان کو آزاد کر دیا گیا۔ اس نے بایدو خان سے
معذرت کی۔ ”بایدو خان! تیرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اس
پر نادم اور شرمسار ہوں۔ بہر حال اب ایسا نہیں ہوگا۔“
شمس الدین جوینی کو اس انقلاب کی خبر مل چکی تھی اور
یہ جو کچھ ہوا تھا، وہ جوینی کے لیے خلافت تو قیام نہیں تھا لیکن وہ
مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔ جوینی کو معلوم تھا کہ اسلام منگول
شہزادوں کے دل و دماغ میں جگہ بنا چکا ہے، ایک نکودار کی
موت اسلام کے اس اثر و نفوذ کو نہیں روک سکے گی جوینی
شہزادوں کے دلوں میں رچ بس چکا تھا۔

شہزادہ ارغون نے جوینی کو طلب کیا۔ اس وقت بایدو
خان بھی ارغون کے پاس موجود تھا۔ شہزادہ ارغون نے کہا۔
”جوینی! میں تیری عزت کرتا ہوں کیونکہ تیرا کردار بے داغ
رہا ہے۔ تو نے مسلمان ہونے کے باوجود نکودار کے ہر اس
اقدام کی مذمت کی جو اسلام کی تائید میں تھا۔ میرے دادا
اور باپ بھی تیری بڑی عزت کرتے تھے۔ اگر تو چاہے تو
دربار میں آتا جاتا رہ، ورنہ گوشہ نشینی کی صورت میں تیرا
مشاہرہ تجھے پہنچتا رہے گا۔“

بایدو خان نے بھی جوینی کی بڑی تعریف کی۔ جوینی
نے شہزادہ ارغون سے درخواست کی کہ اب وہ آرام کرنا
چاہتا ہے، اس لیے کوئی خدمت قبول کرنے کو تیار
نہیں۔ شہزادہ ارغون نے اسے سبکدوش کر دیا۔

اب شہزادہ ارغون کے سامنے ایک عظیم الشان
منصوبہ تھا۔ اپنے باپ اباقد خان کی سرحدوں کو وسعت
دینے کا منصوبہ۔ مصر کے مملوک خاندان کی گوشمالی کرنا۔
برقائی اور چغتائی خانوادوں کو مزہ چکھانا اور منگولوں میں
پھیلنے ہوئے اسلامی اثرات کو سختی سے روک دینا۔ شام کے
بعدرات اور رات کے بعد طلوع ہونے والی صبح پر پہرے
بٹھا دینا۔ ارتقاء کی طرف بڑھتے ہوئے وقت کے دھارے
کا رخ موڑ کر اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کی طرف لے
جانا، یہ وہ عظیم مقاصد تھے جنہیں شہزادہ ارغون حاصل کرنا
چاہتا تھا مگر...

۔ من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ماخذات

تاریخ تمدن اسلام، جہ جی زیدان، الفہرست، ابن ندیم، طبقات ناصری، منہاج سراج الفخوری،

ابن طباطبایا، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ الخلفاء، مولانا جلال الدین سیوطی

فروری 2017ء

60

سپنس ڈائجسٹ

Downloaded From
Paksociety.com

باتدبیر

طاہر جاوید معمل

ازل سے ہوتا چلا آیا ہے کسی ایک کا تجربہ، کسی دوسرے کے لیے عبرت کا سبب بن جاتا ہے مگر افسوس... ایسا صرف چند لمحات کے لیے اور احساس کی حد تک ہوتا ہے اور پھر ہم دنیا کے جھمیلوں میں گم ہو جاتے مگر... یہ وقت کہیں گم نہیں ہوتا ہمیشہ روپ بدل کر پھر سے پرانے تجربات دہرانے آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا... دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے جب خود منہ کے بل گرتے ہیں تو دوسروں کے لیے ایسے ہی عبرت کا سبب بن جاتے ہیں جیسے ان کے لیے ان سے پہلے کے تجربات لیکن... صرف چند لمحات کے لیے۔

چاندنی راتوں میں ایک غیر متوقع انجام اور.....

عبرت کی روداد

بن گیا ہے۔“ شہلا نے موٹی شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

”اور مٹی کا بُت چونکہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے، چلتا پھرتا ہے نہ کوئی مشکل کام کرتا ہے اس لیے اس کے ٹوٹنے کا

”چاندنی رات کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کو رومانس کی طرف لاؤ۔“ ذیشان نے شہلا کو تقریباً جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ وہ بالکل مٹی کا بُت



فروری 2017ء

61

سپینس ڈائجسٹ

امکان ہی باقی نہیں رہتا۔“

یہ مکالمہ دو پرانے پریمیوں ذیشان اور شہلا کے درمیان ہو رہا تھا۔ یہ وہی عالی شان کوٹھی تھی جہاں ڈیڑھ برس پہلے بائیس سالہ شہلا اٹھتر سالہ میاں انوار کی دلہن بن کر آئی تھی۔ یہ وہی پرانا کھیل تھا جو ان گنت مرتبہ دہرایا جا چکا ہے اور دہرایا جاتا رہے گا..... قریب المرگ دولت مند بوڑھے سے جوان خوب صورت لڑکی کی شادی۔ بوڑھے کی موت اور جوان لڑکی کے کروڑ پتی ہو جانا۔ نہ کے نہایت قوی امکانات۔ اس کھیل میں شہلا کے ساتھ اس کا محبوب ڈاکٹر ذیشان بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر ذیشان ایک عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا اور آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ آج کل اس نے میاں انوار کی کوٹھی کے پچھواڑے ہی ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ یوں وہ شہلا سے دور ہو کر بھی اس کے قریب تھا اور اس کے ایک پرانے کلاس فیلو کی حیثیت سے میاں انوار کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے جب شہلا اور میاں انوار کی شادی ہوئی تو میاں انوار کے دو عدد باقی پاس ہو چکے تھے۔ دل کی حالت اچھی نہیں تھی۔ غالب امید یہی تھی کہ تیسرے باقی پاس کی نوبت نہیں آئے گی اور جناب چار چھ مہینے کے اندر ہی لڑھک جائیں گے لیکن پھر تیسرا باقی پاس بھی ہو گیا تھا۔ اس باقی پاس کے بعد میاں انوار ایک دم بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ ہر قسم کی بد پرہیزی یکسر ختم کر ڈالی تھی اور اس بد پرہیزی میں غالباً ”شہلا“ بھی شامل تھی۔ وہ اس کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ دیتے تھے۔

شہلا اور ذیشان کی دلی خواہش تو یہی تھی کہ بڑے میاں اب جلد از جلد اپنا بستر بوریا گول کریں لیکن وہ دونوں اس حوالے سے کوئی بھی غیر قانونی کام کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

تیسرے باقی پاس کے بعد میاں انوار کی صحت جیسے سنبھل سی گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے بے اعتدالیوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ذیشان کو یاد تھا..... شہلا اور میاں انوار کی شادی کو آٹھ ماہ گزرے تھے جب شہلا اور ذیشان کے درمیان پہلا سنجیدہ مکالمہ اسی کوٹھی میں اور اسی لان میں ہوا تھا۔ ذیشان نے کہا تھا۔ ”بڑھے کے لیے مشکلیں آسان کرو۔ تم خود تو سبزی خور ہو لیکن وہ تو نہیں۔ جناب بہت مرغن سے مرغن کھانے کھاتے رہے ہیں۔ میں ان کی ساری ہسٹری بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہیں چنگا

چوکھا کھلا دتا کہ بہتری کی صورت نکلے۔“

شہلا نے کہا تھا۔ ”توبہ کرو ذیشان! اب تو وہ چکنائی اور نمک وغیرہ کے پاس سے بھی نہیں گزرتا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور پھونک پھونک کر کھاتا پیتا ہے۔“

پھر ایک موقع پر ذیشان نے مشورہ دیا تھا۔ ”ہر وقت اس کے سامنے بھیگی مٹی بنی نہ رہا کرو۔ کچھ کلاسیکل قسم کی ”سینشن“ دو اس کو۔ تم عورتوں کے پاس روٹھنا اور آنسو بہانا بہت بڑے ہتھیار ہیں۔ گھر میں کوئی جنگ شگ شروع کرو۔ ایسے انکے ہوئے مریضوں کے لیے ذہنی تناؤ بڑا مشکل کشا ثابت ہوتا ہے۔“

”لیکن وہ تو اس طرف آتا ہی نہیں۔ کئی دفعہ غصے میں پھٹ بھی پڑتی ہوں مگر چپ سا دھم رہتا ہے۔ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ لگتا ہے جو کچھ ہمیں پتا ہے، اسے بھی پتا ہے۔“

کوئی چھ ماہ پہلے عید کے موقع پر شہلا نے ذیشان کے مشورے سے اپنے بڑھے کو ٹینشن دینے کی زبردست کوشش کی تھی۔ میاں انوار کا ایک دیرینہ ملازم تھا، نام تو اس کا کچھ اور تھا مگر پتا نہیں کیسے ”بنگالی“ پڑ گیا تھا۔ دبلا پتلا سا شریف انٹنس نو جوان تھا۔ ڈرائیوری کر لیتا تھا اور کچن سنبھالنے والی صفیہ کا ہاتھ بھی پٹا لیتا تھا۔ میاں انوار اس پر بے حد بھروسہ کرتے تھے۔ اسے وہ ساری دوائیں ازبر تھیں جو دن میں کئی بار میاں انوار نے لینا ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ ان کی بیشتر ضروریات کا دھیان رکھتا تھا۔ وہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ عید کے موقع پر شہلا نے اسے کمرے سے لاہور سے گاؤں بھجوا دیا اور اس سے کہا کہ وہ مالک کو خود ہی آگاہ کر دے گی۔ گاؤں میں بنگالی کو چار پانچ روز تو لگ ہی جاتا تھے۔ شہلا نے میاں انوار کو آگاہ تو کیا لیکن اس طرح کہ ان کی تسلی ہونے کے بجائے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ان دنوں موبائل فون وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ میاں انوار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ کسی طرح بنگالی سے رابطہ کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عید اور عید کے بعد دو تین روز ٹرپ کر گزارے۔ ایک دن اسپتال بھی جانا پڑا۔ امید پیدا ہو گئی کہ شاید دیکھیں وغیرہ پک جائیں گی۔ ان کے دو ناخلف بیٹے اپنے بال بچوں سمیت ”سینشن“ میں رہتے تھے۔ انہیں بھی فون کھڑکا دیے گئے لیکن باباجی تھے ڈھیٹ ہڈی کے۔ لوٹ پوٹ کر چند گھنٹے میں پھر سنبھل گئے۔

اور اب..... شادی کو قریباً ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ میاں انوار، اندر اپنے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ شہلا اور ذیشان وسیع لان میں بیٹھے مکالمہ کر رہے تھے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

فرما رہے تھے۔ ذیشان، شہلا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً وہ بھی خود کو آنکھوں میں دیکھ کر حیران ہوئی ہوگی۔ اس کی Look کم از کم ستر فیصد بہتر ہوئی تھی۔ ذیشان کا اپنا دل دھڑکنے شروع ہو گیا۔

وہ اپنے ساتھ ایک میڈیکل میگزین لایا تھا۔ اس کے ایک آرٹیکل میں دل کے مریضوں پر ذہنی وجہ بانی تناؤ کے اثرات بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ ذیشان نے آرٹیکل جگہ جگہ سے پڑھا۔ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو سو بیٹی! یہ وہی بات لکھی ہے جو میں تم سے اکثر کہتا ہوں۔ دل کے مریضوں میں..... خاص طور پر زیادہ بڑی عمر کے مریضوں میں مرد وزن کی قربت اور جذباتی فشار اکثر سنگین نتائج کا سبب بنتے ہیں۔“

اس سے آگے آرٹیکل میں بہت سی مثالیں تھیں اور کچھ سچے واقعات بھی درج تھے جن میں ذمے داروں کو فوری موت یا بدترین امیپروک کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

شہلا، ذیشان کا رخ نظر سمجھ رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ آج پوری سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنے طویل لیکچر کے اختتام پر ذیشان نے اس سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں، ان دو تین راتوں سے بھر پور فائدہ اٹھاؤ، اس طرح سستی ساوٹری بن کر پھرتی رہو گی تو کچھ نہیں بنے گا۔ گھر میں بولڈ لباس پہنو..... اور رات کو تو تمہارا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ بڑھا نظر ہی نہ ہٹا سکے..... یہ دیکھو، اس طرح کی ڈریسنگ ہونی چاہیے گھر میں۔“

اس نے میگزین کے چار پانچ صفحات پلٹے۔ اسکن لوشن کے ایک اشتہار میں ایک پری پیکر تقریباً آدھ میٹر کپڑا زیب تن کیے کھڑی تھی۔

ذیشان بولا۔ ”جہاں تک مجھے پتا ہے تمہارے وارڈروب..... میں اس سے ملتے جلتے تین چار ڈریس تو ضرور ہوں گے۔“

”اس سے بھی چھوٹے ہیں۔“ وہ ذرا شوخی سے مسکرائی۔

”تو کرونا استعمال۔“

”اس کی رحلت کے بعد استعمال میں آئیں گے۔“ وہ معنی خیز انداز میں ذیشان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”لیکن رحلت کا ہی تو مسئلہ ہے۔“ وہ بولا۔

وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہا اسے ٹچ کرے، لیکن وہ کھلے سبزہ زار میں بیٹھے تھے اور دونوں ملازمین بھی آس پاس ہی کہیں تھے۔ اتنے میں

بات ہو رہی تھی، چاندنی رات کی اور اس کے سحر کی۔ ذیشان نے شہلا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں پھر کہتا ہوں کہ راتوں کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے۔ جیسے تہوار سے پہلے کی رات..... بارش کی رات..... چاندنی رات اور جہاں تک مجھے پتا ہے تمہارا بڑھا تو چاندنی راتوں کا بہت رسیا ہے۔ ان کی شیخوپورہ والی فیکٹری کا منیجر فیاض میرا دوست ہے۔ وہ مجھے بڑھے کی عیاشیوں کی داستانیں سنایا کرتا ہے۔ دس پندرہ سال پہلے شیخوپورہ والے ریٹ ہاؤس میں ان لوگوں کی جو محفلیں جمتی تھیں وہ عموماً چاندنی راتوں میں ہوتی تھیں۔ بڑھا چاندنی میں بیٹھ کر پیتا تھا اور پورا چکور بن جاتا تھا۔ وہاں جو میوزک پلے ہوا کرتا تھا اس میں اس طرح کے گانے بنتے تھے، اب کی بار پونم میں..... تو جو آئے گی ملنے..... ہم نے یہ سوچ رکھا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو ذیشان؟“ شہلا نے ذرا الجھ کر اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلا کر پوچھا۔

”آج چاند کی تیرھویں ہے، کل چودھویں ہوگی اور پرسوں پندرھویں۔ ان راتوں سے فائدہ اٹھاؤ جان من۔ بڑھے کو راہ راست پر لاؤ۔“

”وہ کیسے؟“

”جی چاہتا ہے ایک پیارا سا جھانپڑ دوں تمہارے منہ پر۔ لیکن سامنے صفیہ اور بنگالی کچن میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ میرے جگر کے ٹوٹے! پہلے اپنے اس حلیے کو ٹھیک کرو۔ لگتا ہے کہ جوان لڑکی نہیں ہے، اسی بڑھے کی ہم عمر یا اس سے تھوڑی چھوٹی اس کی شریک حیات ہے۔ بالوں کا بیڑا غرق فرمایا ہوا ہے تم نے۔ عمر رسیدہ خواتین کی طرح شال چٹائی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ مہینوں سے بیوٹی پارلر کی شکل نہیں دیکھی تم نے..... اور لباس..... بس سبحان اللہ..... اس حلیے میں تو تم اٹھارہ سال کے لڑکے کو متوجہ نہیں کر سکتی ہو، اسی سال کے بوڑھے کو کیا کرو گی۔“

”تو کیا کروں؟“

”دیکھو، ابھی صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ رات ہونے میں کوئی بارہ گھنٹے باقی ہیں۔ سب سے پہلے پارلر کا چکر لگاؤ۔ میں ذرا کلیٹنگ سے ہواؤں۔ پھر آکر تمہیں بتاؤں گا۔“

ذیشان کے اصرار پر شہلا پارلر جانے کو تیار ہو گئی۔

تین بجے کے لگ بھگ ان کی ملاقات دوبارہ ہو گئی۔

میاں انوار دوپہر کے پرہیزی کھانے کے بعد پھر لہا قیلول

ہو گئے۔

”ویل ڈن..... ویل ڈن..... گڈ نائٹ۔“ ذیشان نے زیر لب کہا۔

پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ آج رات کافی سنسنی خیز رہے گی۔ آسمان صاف تھا۔ پوری راتوں کا چاند طلوع ہو گیا۔ مدھر ہوا، چاندنی اور ایک دلکش رات۔ آخری بار قریباً بارہ بجے ذیشان نے فون پر شہلا سے رابطہ کیا۔ اس نے دبے الفاظ میں بتایا کہ آج وہ عرصے بعد شوہر کو تھوڑی سی ”شراب“ پلانے میں کامیاب ہوئی ہے..... اب وہ ایک رومانٹک انگلش فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

”بہت اچھی جارہی ہو، میں تو کہتا ہوں، آج کچھ کر دکھاؤ۔“

”پتا نہیں۔“ وہ جیسے ٹھنک کر غیر یقینی انداز میں بولی۔
”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ”چاندنی“ بڑھے پر ہمیشہ سے خاص اثر کرتی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا دو..... اچھا میوزک لگاؤ..... ماحول بناؤ۔“

”اچھا، وہ شاید ادھر ہی آرہا ہے۔“ شہلا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ تقریباً ساری رات ہی ذیشان نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ پوری رات کا چاند اپنے جلوے دکھاتا رہا۔ پتا نہیں کیوں، اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کوئی اچھی خبر ملے گی۔ اس کی سماعت ہر گھڑی فون کی کھنٹی پر لگی ہوئی تھی۔

بہر حال وہ رات گزر گئی، کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ صبح نو بجے کے قریب ذیشان نے شہلا کو فون کیا۔ شہلا نے بتایا کہ رات فلم دیکھنے کے دوران ”اولڈ مین“ کی طبیعت ذرا بگڑ گئی تھی۔ بنگالی نے ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق رات والی میڈیسن کی ڈوز میں تھوڑا سا اضافہ کیا۔ شاید اسی اضافے کی وجہ سے اولڈ مین جلدی ہو گیا۔ دوا دینے کی ڈتے داری میاں انوار نے مکمل طور پر ملازم بنگالی کو ہی سونپ دیکھی تھی۔

☆☆☆

اگلی رات چودھویں کی تھی۔ آسمان آج بھی شفاف تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ رات آٹھ بجے کے قریب شہلا نے فون پر ذیشان کو خوشخبری سنائی۔ ”اولڈ مین کا موڈ آج اچھا ہے۔ شام ہی سے میوزک سن رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، آج اپنے حسن کی ساری بجلیاں کڑکا دو اس کے سر پر۔ جانے نہ پائے۔“

چھریرے جسم والا بنگالی کچ مج دکھائی دے گیا۔ ان دونوں کے پاس آکر اس نے سلام کیا اور بولا۔ ”میڈم! رات کے کھانے میں کیا ہوگا؟“

”شلیم، ٹینڈے یا حلوا کدو وغیرہ پکالو۔“ ذیشان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اپنی میڈم اور سب گھر والوں کے معدوں پر ظلم ڈھا رہے ہو۔ کچھ اچھا پکاؤ، خود کھاؤ اور اپنے صاحب کو بھی کھلانے کی کوشش کرو۔ کچھ بروسٹڈ، کچھ باربی کیو وغیرہ وغیرہ۔“

بنگالی آج کچن کے حوالے سے میڈم کے بجائے ذیشان سے ہدایات لے کر واپس چلا گیا۔ جب وہ لان سے نکل کر کچن میں اوجھل ہو گیا تو ذیشان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”رومان انگیزی میں میوزک کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ تمہارے بڑھے کو عشقیہ غزلیں اور انگلش کے تھریٹنگ سونگ، جوانی سے بہت پسند رہے ہیں۔ شیخوپورہ والے ریٹ ہاؤس میں جو محفلیں جما کرتی تھیں وہاں بھی موسیقی کا بہت عمل دخل ہوتا تھا۔“

وہ دیر تک شہلا کو مختلف ہدایات دیتا رہا۔ عموماً طراز یوں پر بات کرتا رہا۔ بڑے میاں کے پاس آکر دور جانا اور دور جا کر پھر پاس آنا، اسے جذباتی سلاطیم کا شکار کرنا۔ وہ شہلا کو قائل کرتا رہا کہ وہ اگلے ایک دو دن میں گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دے ہی ڈالے۔

☆☆☆

شام سے پہلے ہی ذیشان اپنے قلیٹ پر واپس آ گیا۔ بلڈنگ کی ایک بالکونی سے اسے میاں انوار احمد کی وسیع و عریض کوٹھی دکھائی دیتی تھی اور وسیع لان کا تھوڑا سا حصہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ اوائل ستمبر کے خوشگوار دن تھے۔ شام کو ذیشان نے دیکھا کہ میاں انوار قیلو لے سے جاگ گیا تھا اور شہلا کے ساتھ لان میں موجود تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شہلا اس کی ہدایات پر واقعی عمل کر رہی ہے۔ اسے لان میں شہلا کی جھلک نظر آئی۔ وہ نہایت چست شارٹ اور باریک سی بی شرٹ پہنے پھولوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے پھر وہ اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور سین نظر آیا۔ وہ بوڑھے انوار کے ساتھ چہلمیں کر رہی تھی۔ اس نے میاں انوار پر پانی کے پائپ سے پھوار پھینکی تھی۔ وہ ہانپتا ہوا لگ رہا تھا اور اپنے ”جھل تھلے“ جسم کے ساتھ شہلا کے ہاتھ سے پائپ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں ہو رہی تھی اور کھٹکھٹا کر ہنس رہی تھی۔ پھر وہ دونوں ذیشان کی نظروں سے اوجھل

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپنا بیج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرِ پیکار رہنے میں بستے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

فروری 2017ء سے

کے صفحات پر

ملاحظہ کریں

سرگزشت

ماہنامہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

برآمدے میں سلیپنگ گاؤں پہنچے کھڑے تھے، بے حد پریشان نظر آ رہے تھے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

اس نے مڑ کر پڑوسی سیٹھ فضل کی طرف دیکھا..... وہ کہہ رہے تھے۔ ”اللہ کرم کرے۔ کافی زیادہ سیزھیوں سے گری ہیں بے چاری۔“

”گری ہیں؟ کون گری ہیں؟“ ذیشان حیرت کے شدید ریلے میں تھا۔

”مسز انوار گری ہیں بھائی! تم کیا سمجھ رہے تھے؟“ سیٹھ فضل نے حیران ہو کر کہا..... سب لوگ برآمدے کی طرف گئے۔ سیٹھ فضل نے میاں انوار سے پوچھا۔ ”کچھ پتا چلا بھائی جی؟“

”نہیں..... میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔ وہ پہنچ رہے ہیں۔“ میاں انوار نے کہا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر ذیشان پر ایک حیرت ناک اور لرزہ خیز انکشاف ہوا۔ بنگالی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنی نوجوان مالکن پر بحرمانہ حملے کی سنگین کوشش کی تھی۔ ہاتھ پائی کے دوران میں شہلا سیزھیوں سے گری تھی اور سر پر شدید چوٹیں لگنے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔

قریباً دو گھنٹے بعد شہلا اسپتال میں دم توڑ گئی۔ بنگالی کی تلاش میں پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ سب ششدر تھے۔ پانچ چھ سال میاں انوار کے پاس کام کرنے والا نہایت قابل اعتماد ملازم یہ کیا کر گزرا؟ وہ تو کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔ ہر وقت نگاہیں جھکائے رکھتا تھا۔ شرافت اس کے چہرے سے نکلتی تھی۔

وہ سب حیران تھے..... وہ جانتے نہیں تھے کہ شہلا نے اپنے بوڑھے شوہر کو شکار کرنے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس نے کسی اور کو بھی شوہر والا کر دیا تھا۔

ہاں..... حسن کی شوخیاں اور حشر سامانیاں سب مردوں کو ایک ہی طرح سے متاثر کرتی ہیں۔ چاندنی راتیں بھی سب کے جذبات ایک ہی طرح سے بھڑکاتی ہیں۔ موسیقی، شراب اور کباب بھی ہر ایک کے لیے ایک جیسی دیوانگی لاتے ہیں..... ریشمی راتوں کے سنائے میں جب حسن اکساتا ہے تو کسی بھی جھکی جھکی نظر والے بنگالی کے دل میں بھی طوفان برپا ہو سکتا ہے۔ ہاں..... کوئی بھی گمراہی کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔

وہ دلکش انداز میں ہنسی بکھینک کر رہی ہوں۔“

”کیا یقین رکھا ہے؟“

شہلا نے تفصیل بتائی۔ ذیشان مطمئن ہوا۔ ذیشان نے اسے ایک مشروب کا برانڈ بتایا جو میاں انوار کچھ عرصہ پہلے تک بڑے شوق سے پیا کرتا تھا۔ ”میرے خیال سے سوئی! یہ مشروب بھی بڑھے کے پرانے باروم میں موجود ہوگا..... ڈھونڈ لو، نہ ملے تو پھر کسی سے بھی کام چلانے کی کوشش کرنا لیکن پہلے ڈھونڈ لو۔“

”اچھا، میں بنگالی سے کہتی ہوں۔“

پونم کی رات تھی۔ چاند جو بن پر تھا۔ موسم کی چادوگری اس سے سوا تھی۔ ذیشان اپنے فلیٹ کی بالکونی میں ٹہل رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا، کوئی اچھی خبر آئے گی..... کوئی بڑی خبر آئے گی۔ بارہ بجے..... ایک بجہ اور پھر دو۔ وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ اسے لیٹے چندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایسویٹس کے سائرن کی ”دلکش“ آواز سنائی دی۔

اس کے دل نے پکار کر کہا۔ یہ آواز میاں انوار کی کوشی سے آرہی ہے۔ وہ ننگے پاؤں لپک کر بالکونی میں پہنچا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے دیکھا، ایسویٹس میاں انوار کی کوشی میں ہی تھی..... وہ تیزی سے ریورس ہوئی اور پھر مین گیٹ کی طرف دوڑی۔

بڑھے کو ایک آگیا تھا..... شاید آخری ایک..... اس نے شہلا کو فون کیا لیکن وہ اٹینڈ نہیں کر سکی۔ ذیشان نے تیزی سے لباس تبدیل کیا اور سیزھیاں اتر کر میاں انوار کی رہائش گاہ کی طرف لپکا۔ دو تین چوکیدار اور پڑوس کے لوگ مین گیٹ پر ہی موجود تھے۔

ذیشان نے میاں انوار کے پڑوسی سیٹھ فضل سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے جی؟“

”اسپتال لے کر گئے ہیں، بے ہوشی کی حالت میں۔“ سیٹھ فضل نے جواب دیا۔

”زیادہ سیریس تو نہیں؟“

”حالت تو نازک ہے۔“ دوسرے پڑوسی نے جواب دیا۔

”لیکن ایکدم سے؟..... یقین نہیں آ رہا۔“ ذیشان منمنایا۔

سیٹھ فضل نے کہا۔ ”لگتا تو یہی ہے کہ سر پر زیادہ چوٹ آئی ہے۔“

اس وقت ذیشان نے دیکھا کہ میاں انوار کوشی کے



ممنوع عادت

راحیل انجم

انسان کی بعض عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہزاروں میں بھی اس کی شناخت کرا دیتی ہیں، جیسے کہ یہاں... اس کی کچھ ایسی ہی انفرادی عادتوں کی وجہ سے قانون کو بھی آسانی ہو گئی کہ مجرم لاکھ ہوشیاری دکھائے، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر بیٹھتا ہے... سو وہ بھی کر بیٹھی۔

ایک انتہائی پیچیدہ کیس کی الجھنوں کا دلچسپ اور مختصر قصہ

کرنٹ بلٹزر نے پولیس افسر بنگر اور اس کے ساتھی ہینس کی طرف دیکھا اور بولا۔
 ”یہ میری بیوی کی لاش نہیں ہے۔“
 بنگر نے محسوس کیا کہ کرنٹ کتنا پریشان ہے اور کچھ کہہ نہیں پا رہا ہے۔ وہ فوراً اس کی مدد کو بڑھا اور بولا۔ ”تو پھر یہ آپ کی دوست اور محبوبہ کی لاش ہوگی۔“
 کرنٹ نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ”آپ کا خیال درست ہے۔“
 پولیس افسر نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا۔ ”خوب جناب! یہ عورت آپ کے گھر کے سامنے اور آپ کی کار میں گل کی گئی

سپینس ڈائجسٹ 67 فروری 2017ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قتل کا کیس ہے؟“
 قتل کا نام سننے ہی کرٹ کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا۔ چند لمحوں خاموش رہ کر وہ بولا۔ ”آپ کو کیسے معلوم کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ تو محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔“
 بنگر نے تیز لہجے میں اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جناب! یہ ایک عام حادثہ نہیں ہے۔ گوکار اور لاش دونوں جل چکے ہیں لیکن شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دانستہ کیا گیا ہے۔ کوئی آتش گیر مادہ کار میں رکھا گیا تھا جس کا سلسلہ بیٹری سے جوڑ دیا گیا تھا۔ جو فی کار اشارت کی گئی، وہ پھٹ گیا اور کار میں آگ بھڑک اٹھی۔ اب آپ یہ بتائیے کہ رات کو آپ نے کار گیراج میں کھڑی کی تھی؟“
 ”نہیں! کار تمام رات اسی جگہ کھڑی رہی ہے جہاں حادثہ پیش آیا ہے۔“

کرٹ بٹزر، یہ کہہ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا اور جھانک کر باہر دیکھنے لگا جہاں جلی ہوئی کار کا سیاہ ڈھانچا اب بھی موجود تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”جس کسی نے بھی آتش گیر مادہ میری کار میں رکھا ہوگا، اس کا مقصد مجھے ہلاک کرنا ہوگا۔ اسے تو امید بھی نہ ہوگی کہ مجھ سے پہلے بریجیٹ کا راسٹارٹ کرے گی۔“
 ”تو متوہلہ کا نام بریجیٹ تھا؟“

”جی ہاں!“ کرٹ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”بریجیٹ ہنگل۔ عمر 28 سال تھی۔ وہ وین کی رہنے والی تھی اور ایک ادارے میں مترجم کا کام کرتی تھی۔ وہ تین مہینے قبل ہی یہاں آئی تھی۔ اس لیے یہاں اس کا کوئی عزیز وغیرہ بھی نہیں ہے۔“

پولیس افسر نے کرٹ کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”خوب! تو کیا آپ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟“
 کرٹ نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! میں اپنی بیوی سے طلاق نہیں لینا چاہتا۔ میری بیوی بہت دولت مند ہے اور اس کی دولت کی بدولت میں نے اپنی زندگی بنائی ہے۔ کئی بار مالی پریشانیوں سے اسی نے نجات دلائی ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور چند لمحوں سکوت کے بعد بولا۔

”اور اب تو ہم نے اپنی زندگی کو نئے انداز سے بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے اپنی تمام املاک فروخت کرنا شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ یہ مکان بھی جس میں... آپ اس وقت موجود ہیں۔ مع اثاثہ فروخت کر کے ہم دونوں دنیا کی سیاحت کرنے نکل کھڑے ہوں گے۔ پھر اس سیاحت کے دوران ہمیں جو شہر سب سے اچھا لگے گا، وہیں

ہمیشہ کے لیے اقامت اختیار کر لیں گے۔“
 بنگر یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ”ہمیشہ کے لیے؟ کیا مطلب؟ کیا آپ لوگوں کا ارادہ گوشہ نشینی اختیار کرنے کا ہے؟“
 کرٹ کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ ہم کام کر کر کے تھک گئے ہیں۔ اتنا کمالیا ہے کہ اب زندگی بھر کے لیے کافی ہے جبکہ ہماری اولاد ابھی نہیں ہے تو کیوں نہ آرام سے وقت گزارا جائے۔“

”تو اس وقت آپ کی بیوی کہاں ہیں؟“
 ”وہ کل رات ہوائی جہاز سے پیرس چلی گئی۔ وہ وہاں سے جنوبی فرانس جائے گی اور اپنی ایک سہیلی سے ملے گی۔ آٹھ روز بعد میں اس سے پیرس کے ہوائی اڈے اور لی پر جا ملوں گا اور پھر ہم سیاحت کا پروگرام بنائیں گے۔“ کرٹ نے ایک نگاہ بنگر کو دیکھا اور بولا۔ ”یہ آٹھ روز میں بریجیٹ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ آج ہمارا پروگرام شہر سے باہر جانے کا تھا۔“

اس بار ہینس نے دخل اندازی کی تھی۔ ”تو بریجیٹ نے رات یہاں بسر کی تھی؟“
 کرٹ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ یہیں تھی۔ جب میری بیوی روانہ ہو گئی تو میں نے بریجیٹ کو ساتھ لیا اور گھر آ گیا۔“

”تو آج صبح وہ کہاں جا رہی تھی اور آپ نے اپنی گاڑی اسے کیوں دی تھی؟“

کرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا اندازہ تو آپ خود بھی لگا سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی مرد کے ساتھ کہیں جانے سے پہلے کیا کرتی ہے۔ وہ بال بنوانے، ہیز ڈریسر کے ہاں جا رہی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے دھیرے بولا۔ ”میں یہیں کھڑکی میں کھڑا تھا، تب ہی وہ ناگوار واقعہ پیش آیا۔ بریجیٹ واقعی بے پناہ حسین لڑکی تھی۔“ اس نے آنکھیں کھول کر جیب سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر پولیس افسر کو دکھائی۔

پولیس افسر نے تصویر کو بغور دیکھا۔ پھر پرس کرٹ کو واپس کر دیا اور پوچھنے لگا۔ ”آپ کو بریجیٹ کا پتا تو معلوم ہوگا؟“
 کرٹ نے اس کا پتا بتا دیا۔ تب بنگر نے اس سے کہا۔ ”اچھا جناب! برائے مہربانی شہر کی حدود میں رہے گا تاکہ اگر آپ کی ضرورت پڑے تو ہم آپ سے مل سکیں۔“
 وہ دونوں باہر نکل کر جلی ہوئی کار کے پاس رک گئے۔ لاش کی باقیات کو لے جایا جا چکا تھا۔ جو کار جل چکی

تھی، وہ بیوک کا نیا ماڈل تھی۔ ہمیں بے ساختہ بول پڑا۔
 ”وہ کتنی خوب صورت اور قیمتی کار تھی۔“ بنگر خاموش رہا،
 ہمیں نے پھر کہا۔ ”لیکن کرٹ نے بھی بڑی ہمت کا ثبوت
 دیا ہے کہ اتنی قیمتی کار قربان کر دی۔“
 ”کیا مطلب؟“ بنگر نے پوچھا۔

”میرے خیال میں کیس بہت سیدھا سادہ ہے۔
 کرٹ اب دنیا کی سیاحت اور باقی ماندہ زندگی آرام
 و آسائش سے بسر کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب
 بریجیٹ کا وجود اسے بار..... نظر آتا ہوگا۔ ادھر وہ بیوی کی
 دولت کا محتاج بھی ہے لہذا اس نے بیچاری محبوبہ کو قربان کر
 دیا اور اس سے نجات حاصل کر لی۔“

بنگر نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کچھ توقف کے بعد
 کہنے لگا۔ ”ہمیں! تم ایسا کرو کہ کرٹ کے بتائے ہوئے
 سچے پر جا کر بریجیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔
 میں یہاں پڑوس میں معلوم کرتا ہوں۔“

دو پہر کو جب دونوں کچا ہوئے تو بنگر نے کہا۔ ”کرٹ
 کی بیوی گبریل واقعی کل رات پیرس گئی ہے مگر کرٹ نے تو کہا
 تھا کہ وہ واپسی میں بریجیٹ کو لیتا آیا تھا اور پڑوسیوں کا کہنا
 ہے کہ رات کو جب وہ کار سے اتر اٹھا تو اکیلا تھا۔“

ہمیں کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ممکن ہے وہ گھر
 آنے کے بعد دوبارہ سگریٹ وغیرہ لینے نکلا ہو اور اس وقت
 اسے پڑوسیوں نے دیکھا ہو، بہر حال میں نے جو تحقیق کی
 ہے، اس سے پتا چلا ہے کہ بریجیٹ کی ایک دوست
 گرڈاکورنر اس کے پاس ایک ہفتے کے لیے آکر ٹھہری تھی۔
 اب وہ وین میں ہے۔ میں اس کا پتہ لے آیا ہوں۔“

اگلے روز بنگر وین سے لوٹا تو ہمیں گود دیکھتے ہی بولا۔
 ”ہر عورت کی ایک نہ ایک سبکی ضرور ہونا چاہیے
 کیونکہ عورتیں، عورتوں سے کوئی بات نہیں چھپاتیں اور انہیں
 سب معلوم بھی رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بریجیٹ کو
 یقین تھا کہ کرٹ جلد ہی اس سے شادی کر لے گا۔ بریجیٹ
 نے اپنا بیہوش بھی کر رکھا تھا۔ اس کی موت کے نتیجے میں کرٹ
 کو ایک لاکھ مارک ملنا تھے۔“

پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔
 ”آج رات میں اسپانیا جا رہا ہوں۔ وہاں ساحل پر
 کرٹ کا ایک عالی شان مکان ہے۔“

بنگر ہوائی جہاز سے مالا گا گیا جو اسپانیا میں واقع ہے
 اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے کستال کے ساحلی مقام پر
 پہنچا۔ کرٹ والا واقعی بے حد شاندار بنا ہوا تھا۔ بنگر نے کھنٹی

بجائی تو ایک لاغر اندام اور سرخ بالوں والی عورت باہر نکلی
 اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
 پولیس افسر نے ہیٹ اتار کر اسے تعظیم دی اور بولا۔
 ”معاف کیجیے گا۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ آپ ہی
 مرزگیر مل کرٹ ہیں؟“

سرخ بالوں والی عورت نے تصدیق کے طور پر
 سر ہلایا اور بولی۔ ”جی ہاں! فرمائیے کیا کام ہے؟“
 بنگر نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”میں آپ
 سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں مگر چونکہ آپ اس وقت گھر
 میں تنہا ہیں اس لیے میں اندر نہیں آؤں گا۔ اگر آپ کو
 اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ کسی ہوٹل میں چلیں تاکہ آرام
 سے بات ہو سکے۔“

یہ کہہ کر بنگر نے گیراج کی طرف نگاہ ڈالی جہاں
 ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔

سرخ بالوں والی عورت اس کی نظروں کا مطلب سمجھ
 گئی اور بولی۔

”میرا خیال ہے، آپ گاڑی نہیں لائے ہیں۔ آپ
 یہیں ٹھہریے، میں اپنی گاڑی لے کر آتی ہوں۔“

چند لمحے بعد وہ گیراج سے گاڑی نکال لائی اور بولی۔
 ”اب آپ ازراہ کرم سوالات شروع کر دیں۔ مجھے
 بے چینی ہو رہی ہے۔“

بنگر دروازہ کھول کر عورت کے برابر میں بیٹھ گیا اور
 بولا۔ ”آپ گاڑی باہر نکالیں، میں ابھی بتاتا ہوں۔“

عورت نے چابی گھمائی۔ پیر سینڈل سے نکال کر
 ایکسپریٹر پر رکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

بنگر مسکرا کر بولا۔ ”محترمہ! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ
 برہنہ پیر گاڑی چلانا ممنوع ہے کیونکہ اس میں حادثے کا
 خطرہ ہوتا ہے۔“

”پتا نہیں۔“ عورت نے بے نیازی سے جواب
 دیا۔ ”میں تو سالہا سال سے کار اسی طرح چلاتی آرہی
 ہوں۔ آج تک کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔“

”جی ہاں! مجھے آپ کی دوست گرڈاکورنر نے یہی بتایا
 تھا کہ آپ گاڑی چلاتے وقت جوتا اتار دیتی ہیں۔ اسی سے
 میں نے پہچانا کہ آپ گبریل نہیں بلکہ بریجیٹ ہیں۔ جو
 عورت گاڑی میں جل کر مر گئی تھی، وہ گبریل تھی کیونکہ گاڑی
 اشارت کرتے وقت اس کے پیر میں جو سینڈل تھے، وہ جل
 کر اس کے پیر سے چپک گئے تھے۔“



Downloaded From Paksociety.com

شیش محل

قسط: 18

اسماء تادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رپ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا قیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملوث سطر سطر رنگ بدلتی دار و ارات قلبی کی عکاسی دلچسپ داستان

فروری 2017ء

70

سپینس ڈائجسٹ



یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جو لیت ایک مقامی صیائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کوئی گھٹا نہیں ہے۔ مذہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے قانع ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شامی بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جو لیت کی طرف جمکنا اور طبقاتی فرق کی وجہ سے محل کرانہ نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں ولد دار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولد دار آغا کا گھر گیس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لیت اپنے اخبار کی طرف سے ولد دار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولد دار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جو لیت مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پینامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جو لیت کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جو لیت کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شامی کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جو لیت گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زمین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی مینی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جو لیت عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جو لیت اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش قاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ قاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جو لیت کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جو لیت اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولد دار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جیسے جلوس میں باندھی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کھٹکس کے اس مرسے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جو لیت کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زمین نے اس کے لیے ایک مندر لگی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جو لیت مندر لگی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، میرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زمین اور ایک انجینیئر مرد کی جوانی کی ہے۔ جو زمین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنر کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جو زمین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر قاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بد سلوکی کرنے پر قاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہ ان کی ملاقات سینٹ بھائیہ سے ہو جاتی ہے۔ سینٹ بھائیہ دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق قاروق کو آپ دھوا کی تھپیلی کے لیے شلہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سینٹ بھائیہ کی رہائش گاہ پر بطور سہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائیہ کی بیٹی سلا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ سلا اور قاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زاوی چاند بانو جو قاروق سے محبت کرتی ہے اور قاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا۔ سلا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ سلا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسٹنٹ کر دیتی ہے جس میں زمر دہائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن قاروق کا حساب پتلا کرنے کے لیے ولیم کو اغوا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ قاروق بھی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور قاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک پنچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جو لیت اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدر آباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ قاروق جو لیت کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر مصلوبات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسٹنٹ کے ذمے دار کنیش کو دیکھ لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان دھیمکا مشقی میں کنیش جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ قاروق سلا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ قاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیگم کا بیٹا اختر جو لیت کو پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جو لیت کے شور مچانے پر وہ بکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جو لیت انکشاف کرتی ہے کہ وہ جو زمین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آدھک موقوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بیویوں کے حملے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور حویلی میں تا حال صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر ربن قاروق کی تلاش کرتے کرتے اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اغوا میں بھائیہ بیٹھی کی بیٹی سلا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سلا قاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ ربن قاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ قاروق کی خواہش پر انویم اگر وال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ ادھر اختر جو لیت کی عزت کے درپے ہو کر دوبارہ اس پر حملہ کرتا ہے۔ تاہم عالیہ کی مداخلت اور اس کے حملے میں وہ اپنی جان سے جاتا ہے۔ ربن قاروق کو بندرگاہ دیکھنے جاتا ہے۔ وہاں اس کے تانگے کو دشمن گھیر لیتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائے

فروری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

فاروق نے اپنی مرضی سے لندن جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ وہاں جا کر ولد ار آغا کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن بحری جہاز میں قدم رکھتے ہی اس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی اور وہ یوں بے چین ہونے لگا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ کر بری طرح بھیج رہا ہو۔ اپنی یہ کیفیت خود اس کے لیے بھی ناقابل فہم تھی۔ وہ تو ہر حال میں آغا کو اس کے انجام تک پہنچا کر جو لیٹ کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن کچھ تھا جو اس کے قدموں میں زنجیر ڈال رہا تھا، کوئی آواز تھی جو اسے پکار کر پلٹ جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر حیران و پریشان وہ سب کے درمیان ایسے چل رہا تھا جیسے اسے زبردستی اپنے قدموں کو گھسیٹنا پڑ رہا ہو اور دم تھا کہ سینے میں گھٹنا جاتا تھا۔ اس کیفیت سے تو وہ تب بھی نہیں گزرا تھا جب اس نے اپنے خون کے رشتوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر حویلی سے قدم باہر نکالے تھے۔ اپنی اندرونی محنت سے گھبرا کر اس نے اکبر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔

”تم ان لوگوں کے ساتھ کیمین میں جاؤ۔ میں ذرا عرشے پر جا رہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے فاروق بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اکبر نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا اور چونک کر پوچھنے لگا۔ اڈے پر اتنے عرصے کے قیام کے باعث اسے فاروق کے ساتھ ہونے والے حادثے کا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ صحت یاب ہو جانے کے باوجود فاروق کو ابھی توجہ کی ضرورت ہے۔ سر کی نازک چوٹ کا معاملہ ایسا تھا کہ ڈاکٹروں نے معمولی سی طبیعت کی خرابی کو بھی نظر انداز نہ کرنے کی ہدایت دے رکھی تھی۔

”طبیعت ٹھیک ہے، بس ذرا کھلی ہوا میں سانس لینے کو دل چاہ رہا ہے۔“ فاروق نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ بجا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟“ اکبر نے دریافت کیا۔

”نہیں یار! تم سیٹھ صاحب کی فیملی کے ساتھ جاؤ۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔ ششکلا اور اس کے والدین نے اس بات کو محسوس کیا تو رک گئے اور پیچھے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ فاروق نے اکبر کی توجہ ان کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اسے ان کے ساتھ جانے کو کہا تو وہ مجبوراً آگے بڑھ گیا۔ خود فاروق نے عرشے کا رخ کیا۔ وہاں اور بھی کئی افراد موجود تھے لیکن اسے لوگوں سے کوئی غرض نہیں

تھی۔ وہ سب کو نظر انداز کر کے ایک تنہا گوشے کی طرف بڑھ گیا اور ریٹنگ سے کہنیاں لگا کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھوں کے سامنے جھاگ اڑاتا سمندر کا پانی تھا اور سر پر بے کراں دستوں کا مالک نیلا آسمان۔ نیلے آسمان کے پیش منظر میں صبح دم رزق کی تلاش میں نکلنے والے پرندے پرواز کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسے بمبئی کی اس صبح کو الوداع کہہ کر اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا لیکن جانے کیوں اچانک دل جانے سے انکاری ہو گیا تھا۔ دل کی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر وہ خود پر جبر کیے سفر شروع ہونے کا منتظر تھا۔ ابھی جہاز کی روانگی میں وقت تھا اور مسافروں کے اپنے سامان سمیت سوار ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔

”لائٹر یا ماچس ہوگی آپ کے پاس؟ جلدی میں میرا لائٹر جانے کہاں رہ گیا ہے اور مجھے اس سے سگریٹ کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔“ وہ اپنی ذات کی تنہائی میں گم تھا کہ قریب سے ابھرنے والی اس آواز پر چونک کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ چالیس سے اوپر کا آدمی تھا جس نے صبح کے وقت بھی پورا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

”مجھے زندہ صاف کہتے ہیں۔ میں ڈیلی انڈیا کا ایڈیٹر ہوں۔“ فاروق متوجہ ہوا تو وہ آدمی خود ہی اس سے اپنا تعارف کروانے لگا۔ فاروق کو اس وقت کسی کے تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی سے بات چیت کا خواہش مند تھا لیکن ڈیلی انڈیا کے حوالے نے اسے چونکا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جو لیٹ اسی اخبار میں ملازمت کرتی تھی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی زندہ صاف صاحب! آپ کا نیوز پیپر تو میں بہت پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اس نیوز پیپر میں آپ نے کچھ بہت ہی اچھے سلسلے شروع کر رکھے ہیں۔ خاص طور پر وہ جو سیاستدانوں کے فیملی انٹرویوز کا سلسلہ تھا وہ تو مجھے بہت ہی پسند تھا لیکن پھر آپ نے اس سلسلے کو بند کر دیا۔“ وہ جانتا تھا کہ اخبارات کے مدیران بڑے باخبر اور بارسوخ لوگ ہوتے ہیں اس لیے اس نے خاص ڈھب پر گفتگو کا آغاز کیا۔

”اس سلسلے کو بہت سے لوگوں نے پسند کیا تھا لیکن آج کل ہندوستان کے حالات آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کتنی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ سیاستدانوں کے پاس انٹرویو دینے کی فرصت ہی نہیں ہے اور فیملی انٹرویو کے لیے ٹائم لینا تو بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ بہت سے سیاستدانوں نے تو اپنی فیملی کو ہندوستان سے باہر بھیج دیا ہے کہ کہیں وہ نشانے پر نہ آ جائیں، اسی لیے ہم اپنے ریڈرز کی پسندیدگی کے

باوجود اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکے۔ ”زندہ ہوا کے ہاتھ میں اب بھی وہ سگریٹ تھا جسے سلگانے کے لیے وہ فاروق سے لائٹر یا ماچس کا طلب گار ہوا تھا لیکن اپنے اخبار کی تعریف پر اس کا ذہن سگریٹ کی طرف سے ہٹ گیا تھا اور وہ پوری دلچسپی سے اس سے گفتگو کر رہا تھا۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ حالات کی وجہ سے بہت کچھ متاثر ہو رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم جیسے ریڈرز ایک اچھے سلسلے سے محروم ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک انٹرویو دلدار آغا اور ان کی بیگم کا بھی شائع ہوا تھا۔ وہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔ آغا صاحب مسلمان ہوتے ہوئے جس طرح ہندوستان کی تقسیم کے خلاف کام کر رہے ہیں اور مسلسل کانگریس کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔“ اس نے بہت سلیقے سے دلدار آغا کا ذکر چھیڑا۔

”جانے دیجیے صاحب! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، اور دکھانے کے اور۔ دلدار آغا سے اچھے تو وہ مسلم لگی سیاست دان۔۔۔ ہیں جو کھل کر ہندوستان کے بنوارے کی بات کرتے آرہے ہیں۔ آغا صاحب کہنے کو سارا ٹائم کانگریس کے ساتھی بنے رہے لیکن جب انہیں دکھائی دینے لگا کہ بنوارا ہونے کو ہے تو پہلے انگلیٹنڈ سدھار گئے اور اب سنا ہے وہاں سے کراچی روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا جا رہا ہے نئے بننے والے ملک میں کراچی انویسٹرز کے لیے بہترین شہر ہوگا۔ ”زندہ ہوا“ نے جو انکشاف کیا وہ فاروق کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ تو یہ سن کر ہی نشیٹا گیا تھا کہ وہ جس شخص کی جستجو میں اتنے طویل سفر پر نکل رہا ہے وہ تو اب لندن میں موجود ہی نہیں ہے۔

”تو کیا پاکستان سچ بچ بن جائے گا؟“ اپنی بوکلاہٹ میں اسے اور کچھ بھائی نہ دیا تو زندہ ہوا سے یہی پوچھ بیٹھا۔

”نیوز پیپر پڑھنے والے آدمی ہو کر آپ یہ سوال کر رہے ہیں۔ اب تو یہ سامنے ہی کی بات ہے کہ مسلمان اپنی سازش میں پھسل (کامیاب) ہو گئے ہیں۔ آپ اس شپ پر دیکھ نہیں رہے کہ کتنے انگریز سوار ہیں۔ مدت تک ہندوستان پر راج کرنے کے بعد اب یہ سب اپنے ویش واپس لوٹ رہے ہیں۔ ”زندہ ہوا“ نے اسے جواب دیا لیکن وہ تو شاید اس کے جواب کو توجہ سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ جب دلدار آغا لندن میں نہیں ہے تو وہ اس جہاز پر کیوں سوار ہے۔ اس کے تو سفر کی وجہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔

”آپ کس وجہ سے چار میں پڑ گئے؟“ زندہ ہوا نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جہاز پر اپنی موجودگی کا جواز ختم ہو جانے پر اسے ایک پل بھی یہاں اپنی موجودگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دل جو پہلے ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا، اب بالکل ہی وحشت زدہ ہو گیا تھا اور وہ بے چین تھا کہ کسی طرح یہاں سے نجات ملے۔

”فاروق بھیا۔“ یہ صدا شاید پہلے بھی اس نے سنی تھی لیکن متوجہ تب ہوا جب کسی نے اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر اسے پکارا۔ پکارنے والی شکل اس کی سانس ذرا سی پھولی ہوئی تھی۔

”کہاں گم ہیں آپ۔ اکبر نے بتایا کہ آپ عرشے پر ہیں اس لیے میں بھی یہاں چلی آئی لیکن لگتا ہے آپ نیچے جا رہے ہیں۔“

”ہاں میں جا رہا ہوں۔ تم ابھی کسی کو کچھ مت بتانا۔“ فاروق نے اس سے کہا تو وہ ہونٹ سی اس کی صورت دیکھنے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے فاروق کی بات سمجھ نہیں آئی ہے۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ اس نے سر اسیم سے لہجے میں پوچھا۔ اس بار فاروق نے خود پر قابو پایا اور بولا۔

”میری بات غور سے سنو شکشا! میں جس وجہ سے انگلیٹنڈ جا رہا تھا وہ وجہ باقی نہیں رہی ہے اس لیے اب میں بھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن تم یہ بات ابھی کسی کو نہیں بتانا، خاص طور پر اکبر کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں وہ تم لوگوں کے ساتھ انگلیٹنڈ چلا جائے اور وہاں سیشنل ہو جائے۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے اور اڈے کی زندگی کو میں اس کے لیے مناسب نہیں سمجھتا۔ وہ پڑھ لکھ کر کوئی اچھی نوکری کرے اور اپنا گھر بسائے، اس کے لیے یہی ٹھیک رہے گا۔ تم اور تمہاری فیملی اس سلسلے میں اس کی ہیلپ کر سکتے ہیں۔ ذہ بہت وفادار اور جاثار لڑکا ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنا تمہارے لیے بوجھ نہیں بنے گا۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں فاروق بھیا! آپ نے کہہ دیا کہ اکبر کو اپنے ساتھ رکھنا ہے تو بس ہم رکھیں گے چاہے وہ جیسا بھی ہو لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کیوں واپس جا رہے ہیں؟“ بمبئی آپ کے لیے بہت خطرناک ہو چکا ہے۔ چاچا جی نے کہا تھا کہ بمبئی میں آپ کی جان کو خطرہ ہے اس لیے وہ آپ کو لندن بھیجنا چاہتے ہیں۔“ شکشا اس کا فیصلہ سن کر رو پائی ہو گئی تھی اور اپنے طور پر اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ بحث کا وقت نہیں ہے شکستہ! تم بس میری بات پر عمل کرو۔ آدمی کی زندگی باقی ہو تو وہ خطروں میں گھر کر بھی جیتا رہتا ہے۔ ویسے بھی میں بمبئی میں زیادہ رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے اب کہیں اور جانا ہے۔“ فاروق نے جلدی جلدی شکستہ کو سمجھایا اور اس کی نم ہوئی آنکھوں سے نظر چرا کر چل پڑا۔ جہاز چھوڑ کر اس کے قدموں نے دوبارہ زمین کو چھوا تو یہ سوال سامنے تھا کہ اب کہاں جائے۔ شکستہ کی کوٹھی پر تالا پڑ چکا تھا اور اڑے جانا یوں مناسب نہ ہوتا کہ ربن نے سختی سے اسے وہاں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ اس کے لیے اب یہی مناسب ہوتا کہ وہ کہیں اور اپنا ٹھکانا کرتا اور ربن کو خاموشی سے اپنی بمبئی میں موجودگی کی اطلاع بھجوا دیتا۔ بمبئی سے کراچی جانا عام حالات میں اتنا مشکل نہیں تھا لیکن آج کل کے حالات میں شاید دشواری پیش آتی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ آج کل مسلمان تیزی سے ان علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں جن کے پاکستان میں شامل ہونے کا قوی امکان ہے۔ وہ کچھ ایسی جلد بازی میں جہاز سے اتر اٹھا کہ اپنا سامان تک ساتھ نہیں لے سکا تھا۔ اس کی کل متاع بس اس کی جیب میں پڑا چاقو اور چری بٹوا تھا جس میں ربن کی مہربانی سے ٹھیک ٹھاک رقم موجود تھی۔ رقم جیب میں ہو تو آدمی کے بہت سے مسائل آپ ہی آپ حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کسی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے کر گزارہ کر سکتا تھا بس تھوڑا سا پولیس کی طرف سے دھڑکا تھا کہ پولیس والے ہوٹلوں اور مسافر خانوں پر خاص نظر رکھتے ہیں لیکن اس مسئلے کا بھی اس نے حل نکال لیا۔ بندرگاہ پر گھومتے لوڈرز میں سے ایک کم عمر لوڈر کا انتخاب کر کے اس سے بات کی تو اس چلتا پرزہ لڑکے نے فوراً اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے ایک قریبی ہوٹل کے بیرے کی مدد سے اس کے لیے اس طرح کمرے کا انتظام کیا کہ وہ ہوٹل کے پچھلے دروازے سے ایک کمرے میں مقیم ہو گیا اور کاؤنٹر کلرک سے ملاقات تک نہیں کرنی پڑی۔ بیرے نے خود ہی ہوٹل کے رجسٹر میں اس کے فرضی کوائف درج کروا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کروادی۔ ظاہر ہے اس خدمت کے لیے اسے اضافی رقم خرچ کرنی پڑی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے بیرے کی ناشتالانے کی پیشکش کو رد کر دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچ بچار کرنے لگا کہ ربن تک کس ذریعے سے پیغام پہنچائے۔ پہلا نام چاند بانو کے ملازم کا ذہن میں آیا لیکن فوراً ہی رد بھی ہو گیا۔ چاند بانو کا ٹھکانا پولیس اور دشمنوں، دونوں کی نظر میں تھا۔ وہ وہاں

جاتا تو آسانی سے دھریا جاتا۔ وکیل اشوک بچن کے بارے میں بھی سب جانتے تھے کہ وہ ربن کے لیے کام کرتا ہے اس لیے امکان تھا کہ اس کی بھی نگرانی کی جارہی ہو۔ یہی حال نانا کے پاڑے کا تھا۔ نانا اور ربن کی دوستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اس لیے پولیس کی یقیناً اس پر بھی نظر ہوگی۔ ماضی کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت اس لیے بھی کہ معاملہ بھائیہ سیٹھ کی بیٹی کی ہلاکت کا تھا۔ بھائیہ جیسے طاقتور آدمی کے لیے پولیس والوں کی کارکردگی اپنے عروج پر ہونے کا پورا امکان تھا۔ ربن نے اسے اپنے ٹھکانوں تک سے دور رکھا تھا تو یہ سب یونہی تو نہیں تھا۔ وہ کوئی غلطی کر کے ربن کی اب تک کی احتیاط کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ پیغام رسانی کے لیے مختلف راہوں کو سوچتے ہوئے اچانک ہی اس کے ذہن میں کیتھرائن کا نام آیا۔ کیتھی کسی کی نظر میں نہیں تھی اور وہ اس پر پورا اعتماد بھی کر سکتا تھا۔

اس کا خیال آتے ہی اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف سات بجے تھے۔ اسے علم تھا کہ اسپتال میں نرسوں کی ڈیوٹی آٹھ بجے تبدیل ہوتی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیتھرائن کی آج کل کون سی ڈیوٹی چل رہی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے آٹھ بجے سے کچھ پہلے اس کی رہائش گاہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اسپتال سے خشک اس قیام گاہ تک وہ ایک ٹیکسی کی مدد سے آٹھ بجنے سے پندرہ منٹ پہلے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر وارڈن سے دریافت کرنے پر اسے علم ہوا کہ کیتھی کی نائٹ ڈیوٹی تھی یعنی اسے ملاقات کے لیے اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ ایک اخبار کے مطالعے میں مصروف انتظار گاہ میں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ سوا آٹھ بجے نائٹ ڈیوٹی آف کر کے واپس آنے والی نرسوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھکی ماندی نرسیں ایک دوسرے سے ہلکی ہلکی گفتگو کرتے ہوئے جلدی جلدی اپنے رہائشی کمروں کی طرف جارہی تھیں تاکہ لباس تبدیل کر کے آرام کر سکیں۔ فاروق کی توجہ اب اخبار کے بجائے آنے والی نرسوں کی طرف تھی۔ ان نرسوں میں اسے ابھی تک کیتھی نظر نہیں آئی تھی۔ آہستہ آہستہ نرسوں کی آمد کا سلسلہ رک گیا لیکن کیتھی وہاں نہیں آئی۔ مضطرب سے فاروق کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا اور اس نے ایک بار پھر وارڈن سے رجوع کیا۔

”وہ تو ہمیشہ ناٹم پر آتی جاتی ہے، تم رکو! میں اس کی کسی کو لیک سے بتا کر نی ہوں۔ شاید اس کی ڈبل ڈیوٹی لگ

گئی ہو۔“ دارڈن نے اس سے کہا اور نکل بھاگ رہا تھا۔ کام کرنے والی ایک آیا کو بلایا۔ آیا اس کے حکم پر تھوڑی دیر میں ایک تازک سی لڑکی کو بلا کر لے آئی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی تھی اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ عالم مجبوری میں اس بلا دے پر وہاں آئی ہے۔

”سوزی! تم کو کیتھرائن کا کچھ پتا ہے۔ اس کا گیسٹ آیا بیٹھا ہے اور اسے پوچھتا ہے۔ آج اس کا ڈیل ڈیوٹی تو نہیں لگ گیا؟“ دارڈن نے لڑکی سے دریافت کیا۔

”نومیزم! ڈیوٹی تو نہیں لگا لیکن کیتھی خود ہاسپٹل میں رک گئی ہے۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا پیشنت بہت زخمی حالت میں لایا گیا ہے اور وہ اس کی وجہ سے رک گئی ہے۔ بے چاری اس پیشنت کے لیے بہت رورہی تھی۔“ سوزی نامی نرس نے جو اطلاع دی وہ فاروق کے لیے چونکا دینے والی تھی۔ کیتھی نے اسے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ کیتھی کا کوئی ایسا قریبی عزیز یا رشتہ دار نہیں ہے جس سے اس کی جذباتی وابستگی ہوالیتہ اڈے والوں سے وہ مختصر عرصے میں بہت قریب ہو گئی تھی اور ان کو اپنا سمجھنے لگی تھی۔ مریض کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ شدید زخمی حالت میں لایا گیا ہے، اس سے بھی یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ اڈے ہی کا کوئی آدمی ہوگا۔ اڈے کے آدمیوں میں سے بھی کیتھی کا خود اس کے علاوہ گولو اور ربن سے ایسا واسطہ رہا تھا کہ وہ ان کے لیے آنسو بہاتی۔ گولو لڑنے جھگڑنے والا بندہ نہیں تھا کہ زخمی ہوتا تو کیا پھر ربن..... سوچ کی تان یہاں آکر ٹوٹی تو سینے میں اس کا دل بری طرح دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یہ دل پہلے ہی بڑا بے چین اور مضطرب تھا۔

”کیا آپ اس پیشنت کا نام جانتی ہیں؟“ اپنی کیفیت کے زیر اثر اس نے ذرا تیز لہجے میں نرس سوزی سے دریافت کیا۔

”نام تو نہیں معلوم.....“ سوزی کا انداز کچھ سوچنے والا ہو گیا۔ ”ہاں..... یاد آیا۔ کیتھی اسے دادا، دادا بول کر پکارتی تھی۔“ اب فاروق کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے قدموں کو روک پاتا۔ ہر خوف اور احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔

☆☆☆

جولیت چلے پیر کی بلی کی طرح ساری حویلی میں چکراتی پھر رہی تھی۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو اس کے دل میں اس حویلی اور حویلی والوں کے لیے معاندانہ جذبات

تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اس کی ماں کے ارمالوں کا قتل ہوا تھا، جہاں وہ محبت کے نام پر لوٹی گئی تھی اور جہاں سے عزت کے ٹھیکے داروں نے اسے دو کوڑی کا کر کے نکال دیا تھا لیکن اب اس کے لیے اس حویلی کی حیثیت تبدیل ہو گئی تھی۔ حویلی والوں کا سازشی رویہ اپنی جگہ لیکن اسد اللہ کے غلوں پر یقین آنے کے بعد اس کے جذبات میں خاطر خواہ تبدیلی آئی تھی۔ اب اس کے لیے یہ حویلی وہ خاص جگہ تھی جہاں کے چپے چپے پر اسے اپنے ماں باپ کی محبت کے گل مہکتے نظر آتے تھے۔ وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی کہ دو چاہنے والے اس حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان کس طرح اپنی محبت کے پودے کو پروان چڑھاتے رہے تھے۔ ان دو چاہنے والوں کی بے قراری، بے تابی اور بے بسی کی گواہ تھی یہ حویلی۔ خود اس نے اس حویلی میں کچھ ناخوشگوار واقعات کا سامنا کیا تھا لیکن بحیثیت باپ اسد اللہ نے اسے جو محبت، عزت اور اہمیت دی تھی وہ ہر برے رویے کا دوا بن گئی تھی۔

جوزفین اور جوزف کے بعد وہ بالکل تہی دامن رہ گئی تھی، اسد اللہ نے اپنی محبت اور شفقت سے اس کے دامن کو ایک بار پھر پھولوں سے بھر دیا لیکن اس کے لیے زندگی کو پھولوں کی بیج بننا قبول ہی کہاں تھا جب ہی تو یہ انہونی ہو گئی کہ فاروق اس حویلی کے کم شدہ بیٹے محب اللہ کی صورت اس کے سامنے آ گیا۔ حمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اسد اللہ کو فاروق کی حقیقت سے آگاہ کر دیا اور اس بیج کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ اسد اللہ بچھڑے ہوئے بیٹے کو واپس حویلی لانے کے لیے بمبئی کی طرف عازم سفر ہو چکے تھے۔ بمبئی میں جن دنوں وہ تباہی سے دوچار ہوئی، فاروق اپنی بیماری کے باعث اڈے پر نہیں تھا لیکن یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ اس کی بربادی کی داستان اس تک پہنچ گئی ہوگی۔ وہ اسد اللہ کے ساتھ محب اللہ کی حیثیت سے حویلی واپس آتا تو اپنے ساتھ اس کی بربادی کی داستان بھی لے کر آتا۔ وہ اس داستان کا اس حویلی میں دہرایا جانا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے اسد اللہ کی واپسی سے قبل ہی یہاں سے روانہ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا اس حویلی سے جانا طے تھا پھر بھی اس فیصلے پر اس کی روح سک اٹھی تھی اور وہ ادھر سے ادھر چکراتی ہوئی یوں حویلی کے ایک ایک گوشے کو اپنی نگاہوں میں بسا رہی تھی کہ اسے یقین تھا، اب کبھی اسے ان درود یوار کو دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ ادھر ادھر ٹہلتی ہوئی وہ پائیں باغ میں پہنچی تو وہاں آصف خان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”زبے نصیب۔ آج آپ کا دیدار ہو گیا، اس اتفاق کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا آپ کی نظرِ کرم۔“ اسے سامنے پا کر وہ شوخ ہوا۔

”اس اتفاق کو آپ محض اتفاق ہی سمجھیں تو اچھا ہے۔“ جولیٹ نے اس کی پُرشوق نگاہوں سے بے نیازی برکتے ہوئے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

”آپ کا حکم ہے تو ایسا ہی سمجھ لیتے ہیں لیکن اس اتفاق سے فائدہ اٹھا کر آپ سے سوال کرنے کا حق تو ہے مجھے۔“ آصف خان اس کی سنجیدگی کو زیادہ خاطر میں نہیں لایا۔

”کیسا سوال؟“ جولیٹ نے ایک بار پھر بے نیازی برتی۔

”کیا آپ میرے سوال سے ناواقف ہیں؟“

آصف خان ذرا سا تھکا ہوا۔

”جس سوال سے میں واقف ہوں، وہ آپ نے بزرگوں کے سامنے رکھا تھا اور وہی آپ کو اس کا جواب دیں گے۔“ لیکن میں نے تو سنا ہے کہ میرے سوال کا جواب آپ کی مرضی سے مشروط ہے۔“ اس نے جولیٹ کو اپنی باخبری سے آگاہ کیا۔

”میری مرضی کی خبر بھی میرے بزرگ ہی آپ کو دیں گے۔“ جولیٹ ایک بار پھر اسے طرح دے گئی۔

”یعنی میرے نصیب میں ابھی مزید انتظار لکھا ہے۔“ آصف خان نے سر آدھ بھری۔

”بس تھوڑا انتظار اور باقی ہے۔ جلد آپ کو جواب مل جائے گا۔“ جولیٹ کی سنجیدگی برقرار رہی اور وہ یہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔ آصف خان کے خلوص پر اسے یقین تھا لیکن کیا کرتی کہ اس کے نصیب میں اس پُر خلوص آدمی کا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا۔

”شریف گھرانوں کی لڑکیاں شادی سے قبل اپنے ہونے والے خاوند سے خفیہ ملاقاتیں نہیں کیا کرتیں۔ پر آپ کو اس بات کی کیا خبر۔ آپ کی ایسے ماحول میں تربیت ہی نہیں ہوئی۔“ وہ آصف خان میں ابھی ہر طرف سے۔۔۔

بے خبر حویلی کے زنان خانے میں داخل ہوئی تھی کہ کاٹ دار لہجے میں کیے گئے اس طنز نے اس کے قدموں کو ٹھنکا دیا۔

اس نے چونک کر بولنے والی ہستی کو دیکھا۔ وہ عشرت جہاں تھیں جو حسب معمول اس کے لیے اپنی آنکھوں میں نفرت و حقارت کے جذبات لیے کھڑی تھیں۔ اس نے بڑی بے پروائی سے ان کی طرف دیکھا اور لہجے میں بے نیازی سمو کر بولی۔

”معاف کیجیے۔ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”جس سوال سے میں واقف ہوں، وہ آپ نے بزرگوں کے سامنے رکھا تھا اور وہی آپ کو اس کا جواب دیں گے۔“ لیکن میں نے تو سنا ہے کہ میرے سوال کا جواب آپ کی مرضی سے مشروط ہے۔“ اس نے جولیٹ کو اپنی باخبری سے آگاہ کیا۔

”میری مرضی کی خبر بھی میرے بزرگ ہی آپ کو دیں گے۔“ جولیٹ ایک بار پھر اسے طرح دے گئی۔

”یعنی میرے نصیب میں ابھی مزید انتظار لکھا ہے۔“ آصف خان نے سر آدھ بھری۔

”بس تھوڑا انتظار اور باقی ہے۔ جلد آپ کو جواب مل جائے گا۔“ جولیٹ کی سنجیدگی برقرار رہی اور وہ یہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔ آصف خان کے خلوص پر اسے یقین تھا لیکن کیا کرتی کہ اس کے نصیب میں اس پُر خلوص آدمی کا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا۔

”آصف خان سے آپ کا رشتہ طے پا چکا ہے، یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ اسد اللہ نے تو اپنی ماضی کی محبت نبھانے کے لیے ایسی سرگرمی دکھائی کہ انہیں حویلی میں ہونے والی دودو اموات کا بھی خیال نہیں آیا۔ اپنی محبوبہ کی اولاد کے لیے خوشیوں کا انتظام کرتے ہوئے انہیں یہ احساس تک نہیں ہوا کہ ان کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کے دل دکھوں سے چور چور ہیں اور ایسے میں خوشی کے شادیاں بجا کر وہ ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا انتظام کر رہے ہیں۔“ عشرت جہاں کے لہجے میں دکھ اور حسد کی آمیزش تھی۔ اسد اللہ کو نہ پاسکے کا دکھ کبھی ان کے دل سے نہیں نکلا تھا اور زبان موقع بے موقع اس کا اظہار کسی نہ کسی صورت کر جاتی تھی۔ اب بھی وہ بھائی کی موت کے بہانے اپنے ہی دکھوں پر لوح کناں محسوس ہوئیں۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی صرف میرے سامنے آصف خان کی خواہش رکھی گئی ہے جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے رشتہ طے پا جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آج پہلی بار جولیٹ کو عشرت جہاں پر غصہ آنے کے بجائے ترس محسوس ہوا۔ اسد اللہ تھے ہی اتنے شاندار کہ عشرت جہاں کا ان کے عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ساری زندگی نارسائی کی آگ میں جلتی اتنی تلخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کی زبان سے کوئی میٹھی بات نکلتی ہی نہیں تھی اور جولیٹ تو جوزفین کی بیٹی تھی جس سے ان کا رقابت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کو پوری نفرت سے نبھاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود جوزفین کے حصے میں بھی تو جدائی ہی آئی تھی۔

”اب تم جیسی کل کی لڑکی ہمیں بنائے گی۔ تمہاری مرضی تو سب ہی کو نظر آرہی ہے۔ آصف خان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے ہی تو جاری نہیں ہے اور پھر وہ اسد اللہ کے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اسد اللہ کسی صورت اسے انکار نہیں کر سکتے۔“ ان پر جولیٹ کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

”میرے انکار کی صورت میں اس رشتے سے انکار ہو سکتا ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”بالکل نہیں۔ اس حویلی میں لڑکیوں کو ایسے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔“

”جب اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے تو حویلی والے اپنی مرضی کے اصول کیسے بنا سکتے ہیں؟“ جولیٹ کو ان سے بحث کرنے میں لطف آرہا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی صرف میرے سامنے آصف خان کی خواہش رکھی گئی ہے جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے رشتہ طے پا جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آج پہلی بار جولیٹ کو عشرت جہاں پر غصہ آنے کے بجائے ترس محسوس ہوا۔ اسد اللہ تھے ہی اتنے شاندار کہ عشرت جہاں کا ان کے عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ساری زندگی نارسائی کی آگ میں جلتی اتنی تلخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کی زبان سے کوئی میٹھی بات نکلتی ہی نہیں تھی اور جولیٹ تو جوزفین کی بیٹی تھی جس سے ان کا رقابت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کو پوری نفرت سے نبھاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود جوزفین کے حصے میں بھی تو جدائی ہی آئی تھی۔

”اب تم جیسی کل کی لڑکی ہمیں بنائے گی۔ تمہاری مرضی تو سب ہی کو نظر آرہی ہے۔ آصف خان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے ہی تو جاری نہیں ہے اور پھر وہ اسد اللہ کے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اسد اللہ کسی صورت اسے انکار نہیں کر سکتے۔“ ان پر جولیٹ کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

”میرے انکار کی صورت میں اس رشتے سے انکار ہو سکتا ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”بالکل نہیں۔ اس حویلی میں لڑکیوں کو ایسے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔“

”جب اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے تو حویلی والے اپنی مرضی کے اصول کیسے بنا سکتے ہیں؟“ جولیٹ کو ان سے بحث کرنے میں لطف آرہا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی صرف میرے سامنے آصف خان کی خواہش رکھی گئی ہے جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے رشتہ طے پا جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آج پہلی بار جولیٹ کو عشرت جہاں پر غصہ آنے کے بجائے ترس محسوس ہوا۔ اسد اللہ تھے ہی اتنے شاندار کہ عشرت جہاں کا ان کے عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ساری زندگی نارسائی کی آگ میں جلتی اتنی تلخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کی زبان سے کوئی میٹھی بات نکلتی ہی نہیں تھی اور جولیٹ تو جوزفین کی بیٹی تھی جس سے ان کا رقابت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کو پوری نفرت سے نبھاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود جوزفین کے حصے میں بھی تو جدائی ہی آئی تھی۔

”اب تم جیسی کل کی لڑکی ہمیں بنائے گی۔ تمہاری مرضی تو سب ہی کو نظر آرہی ہے۔ آصف خان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے ہی تو جاری نہیں ہے اور پھر وہ اسد اللہ کے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اسد اللہ کسی صورت اسے انکار نہیں کر سکتے۔“ ان پر جولیٹ کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

”میرے انکار کی صورت میں اس رشتے سے انکار ہو سکتا ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”بالکل نہیں۔ اس حویلی میں لڑکیوں کو ایسے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔“

”جب اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے تو حویلی والے اپنی مرضی کے اصول کیسے بنا سکتے ہیں؟“ جولیٹ کو ان سے بحث کرنے میں لطف آرہا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی صرف میرے سامنے آصف خان کی خواہش رکھی گئی ہے جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے رشتہ طے پا جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آج پہلی بار جولیٹ کو عشرت جہاں پر غصہ آنے کے بجائے ترس محسوس ہوا۔ اسد اللہ تھے ہی اتنے شاندار کہ عشرت جہاں کا ان کے عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ساری زندگی نارسائی کی آگ میں جلتی اتنی تلخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کی زبان سے کوئی میٹھی بات نکلتی ہی نہیں تھی اور جولیٹ تو جوزفین کی بیٹی تھی جس سے ان کا رقابت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کو پوری نفرت سے نبھاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود جوزفین کے حصے میں بھی تو جدائی ہی آئی تھی۔

”اب تم جیسی کل کی لڑکی ہمیں بنائے گی۔ تمہاری مرضی تو سب ہی کو نظر آرہی ہے۔ آصف خان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے ہی تو جاری نہیں ہے اور پھر وہ اسد اللہ کے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اسد اللہ کسی صورت اسے انکار نہیں کر سکتے۔“ ان پر جولیٹ کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

”میرے انکار کی صورت میں اس رشتے سے انکار ہو سکتا ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”بالکل نہیں۔ اس حویلی میں لڑکیوں کو ایسے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔“

نے عالیہ کو گلے سے لگالیا۔ اس کے بعد وہ بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتی رہی۔ کافی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو سروری کو بلاوا بھیج کر بلالیا۔

”حکم کیجیے۔“ سروری اگرچہ حویلی میں اتکا بیگم کی جگہ سنبھال چکی تھی اور اس کا وہاں خاصا رعب و دبدبہ تھا لیکن جولیٹ کے روبرو وہ ہمیشہ نگاہ جھکا کر ہی کھڑی ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ احساسِ جرم آج تک زندہ تھا جو جوزفین کے خلاف ہونے والی سازش میں حصے دار بننے پر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

”کیا تم میرے ہر حکم کی تعمیل کر سکتی ہو؟“ جولیٹ نے اسے چھیدنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمیں حکم کی تعمیل کے سوا کچھ سکھایا ہی نہیں گیا۔“ سروری کا جواب واضح تھا۔ شاید وہ بتا رہی تھی کہ وہ جس جرم کی شریک رہی اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا اور وہ محض حکم کی بجا آوری پر مجبور تھی۔

”اچھی بات ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں آج رات اس طرح حویلی سے باہر جانا چاہتی ہوں کہ کسی کو کانوں کان میرے یہاں سے جانے کی خبر نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ انتظام کر سکتی ہو۔“ اسے معلوم تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح آزادانہ اس حویلی سے کہیں نہیں جاسکتی۔ اب وہ قدم باہر رکھے گی تو اسے اپنے باہر جانے کا مقصد اور منزل دونوں کے بارے میں بتانا ہوگا اور وہ یہ دونوں باتیں نہیں بتا سکتی تھی اس لیے یہ راہ سوچتی تھی۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ سروری بوکھلاسی گئی۔

”میرے خیال میں تم سمجھ تو اچھی طرح مٹی ہو لیکن عمل کرنے سے گھبرا رہی ہو۔“ جولیٹ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”مجھ پر رحم کریں بی بی! مالک مجھے کتوں کے آگے ڈلوادیں گے۔“ سروری رونے والی ہو گئی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم کہہ سکتی ہو کہ تم نے صرف حکم کی تعمیل کی تھی جیسے اس سے پہلے بھی کرتی رہی ہو۔ بے فکر رہو کہ جس شخص نے تمہیں اپنا دل اجاڑنے میں حصہ دار بننے پر سزا نہیں دی وہ اب بھی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں ان کے نام ایک خط لکھ کر جاؤں گی جو تمہاری مجبوری کا ثبوت بن جائے گا۔“ جولیٹ نے اسے تسلی دی اور پھر کچھ اس طرح سے سروری کو مجبور کیا کہ وہ خاموشی سے اسے حویلی سے نکالنے پر راضی

”تم کیا جانو اسلام کے بارے میں؟“ عشرت جہاں کی حیرت دیدنی تھی۔

”بندہ کوشش کرے تو بہت کچھ جان ہی جاتا ہے۔ میں نے ان چند دنوں میں اسلام کا اتنا مطالعہ کیا ہے کہ بہت سے پیداہنی مسلمان بھی اتنا کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔“ اس نے انہیں جواب دیا اور انہیں حیرت میں مبتلا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئی۔ حویلی سے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے وہ ایک ایک کر کے حویلی کے مکینوں سے غیر محسوس طور پر الوداعی ملاقاتیں کر رہی تھی۔ زیادہ تر سے تو اس کا تعلق سرسری سا تھا، ہاں حبیب اللہ کی بیوی اور بیٹی سے اس نے کچھ طویل ملاقات کی۔ سب سے آخر میں وہ عالیہ کے کمرے میں آئی۔

”کہاں تھیں آپ۔ آج اپنی صورت ہی نہیں دکھائی۔“ انہوں نے اسے دیکھتے ہی محبت سے شکوہ کیا۔

”بس ایسے ہی حویلی میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ آپ کو کوئی کام تھا تو پیغام بھیج کر بلا لیتیں۔“ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”کام تو کچھ نہیں تھا بس آپ نظر نہیں آئیں تو دل بے چین سا ہو گیا تھا۔“ عالیہ نے سادگی سے کہا تو وہ ان کی صورت دیکھنے لگی اور خود بخود ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

”یہ کیا بھی؟“ عالیہ نے حیرت سے اس کی پلکوں پر جے شفاف قطروں کو اپنی انگلی کی پور پر چٹتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت اچھی ہیں۔ سب سے زیادہ اس حویلی میں مجھے آپ نے ہی سپورٹ کیا اور اس رات کا احسان تو میں بھول ہی نہیں سکتی جب آپ نے اپنے سہاگ کی قربانی دے کر میری عزت کی حفاظت کی۔“ جولیٹ نے محبت پاش نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہم نے آپ پر کیا احسان کیا؟ ہم تو خود اپنی جان پر چڑھے قبر خنہ اتارتے پھر رہے ہیں اور سوچتے ہیں کہ شاید آپ کے ساتھ کی گئی نیکی ہی روزِ حشر ہمیں جوزفین کے سامنے سرخرو کر جائے۔ ہم نے بڑا ظلم کیا تھا ان پر۔ اپنے اس جرم کو ہم زندگی میں کبھی بھی نہیں بھول پائے۔“ عالیہ آج بھی احساسِ جرم میں مبتلا تھیں کہ ان کی نیک فطرت نے انہیں کبھی اپنی وہ غلطی بھلانے ہی نہیں دی تھی۔

”جو کچھ ہوا، اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ زیادتی کرنے والے ہر فرد کو چاہے اسے اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہو یا نہیں، میں نے معاف کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ نام نے بھی معاف کر دیا ہوگا۔“ اس

ہوگئی۔ زنان خانے میں رات کو جلدی سونے کا رواج تھا چنانچہ رات کے ابتدائی حصے میں ہی جب تقریباً بیگمات مجھ خواب تھیں، جو لیٹ نے سروری کی مدد سے حویلی کی دلیز پار کر لی اور ایک تانگے میں سوار برقعے میں لپٹی ان مجھتوں سے فرار ہوگئی جن سے جدائی پر خود اس کا اپنا دل کٹ کر آنسوؤں کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ربن کے دیکھتے ہی دیکھتے تانگے کے آگے رکی گاڑی اور دونوں ٹیکسیوں کے دروازے کھلے اور اس میں سے لوگ اترنا شروع ہوئے۔ اترنے والوں میں سے کئی چہرے اس کے لیے شناسا تھے۔ مجو دادا، فیکا، ڈی ایس پی رانھور، مجو کے اڈے سے غائب ہو جانے والے اس کے دو تین مرگوں کے علاوہ کچھ اجنبی صورتیں بھی اس کے سامنے تھیں۔ سوائے مجو کے ان سب کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار موجود تھا۔ مجو سے ہونے والے مقابلے میں اس کے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کاٹ کر خود ربن نے ہی اسے ہمیشہ کے لیے ہتھیار اٹھانے سے معذور کر دیا تھا لیکن اس کے خالی ہاتھ ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کے سارے چیلے اور ہمدرد تو ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ڈی ایس پی رانھور کے ہاتھ میں ریوالور تھا، فیکے نے کم لیبائی والی کمواراٹھارکھی تھی، باقیوں کے ہاتھوں میں چاقو اور ڈنڈے نظر آ رہے تھے۔

”تو تانگے سے اتر کر بھاگ جا۔ یہ اپن کا لہوا ہے، سالے تجھ کو نہیں روکیں گے۔“ اس نے آہستہ آواز میں تانگے والے کو ہدایت دی اور خود بے خوفی سے نیچے اترنے کے بعد یوں سینہ تان کر کھڑا ہوا کہ اس کا رخ مجو دادا کی طرف تھا۔

”نکل آیا رے تو اپنے بل سے؟“ مجو کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے حقارت سے پوچھا۔

”تیرے کو اپنے واسطے بے قرار دیکھا تو سوچا تجھے اپنے درشن کروا ہی دوں۔“ مجو نے دوبارہ اسے جواب دیا۔ وہ پوری نفری کے ساتھ تمہاربن کو گھیرے کھڑا تھا۔ اس کے حوصلے کو تو بلند ہونا ہی تھا۔

”سانپ بل میں چھپ کر بیٹھا رہے تب ہی اس کی خیر رہتی ہے۔ بل سے نکلے تو مارا جاتا ہے۔“ ربن نے حقارت سے اسے دیکھا۔

”اس سانپ کا زہر تمہارے جسم میں اترے گا تو جانو گے آج کس کے مارے جانے کا دن ہے۔“ مجو بھی اونچی اڑان اڑ رہا تھا۔

”ابا سٹر ڈ! یہ ڈائیلاگ بازی بند کرو اور اصل کام کرو۔ زیادہ سے نہیں ہے۔ اپن نے بھائیہ سیٹھ سے پراس کیا ہے کہ اس کی بیٹی کے خونیوں کا انت جلدی ہوگا۔ اس کو اس کے انت تک پہنچا کر تم اپنا بدلہ لو اور مجھے میرا پراس پورا کرنے دو۔“

ڈی ایس پی رانھور نے بیزاری سے مجو کو ٹوکا اور اس کا یہ ٹوکنا جیسے مجو کے ساتھیوں کے لیے اشارہ ثابت ہوا۔ وہ سب ایک ساتھ ربن پر ٹوٹ پڑے۔

”تو اپنی بات ماننا تو اب بھی بمبئی پر راج کر سکتا تھا۔ اپنی ماننے سے انکار کر کے تو نے خود موت کو آواز دی ہے۔“

ڈی ایس پی رانھور نے اس منظر کو دیکھا اور بڑبڑایا۔ وہ انا پرست آدمی تھا جو ربن کو اپنے دام میں لانے میں ناکام ہونے کے بعد اس کے خلاف ہو گیا تھا اور اب ربن کو اس کے انکار کی سزا دینے کے انتظام کے ساتھ آیا تھا۔ قانونی کارروائی کی صورت ربن اپنا بچاؤ کرنے میں متنی مہارت رکھتا ہے، یہ اس کے علم میں تھا اس لیے اس نے ربن پر یہ اوچھا دار کیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ مسلسل اس تاک میں رہے تھے کہ اڈے سے دور ربن تنہا مل جائے تو اسے چھاپ لیں اور اب انہیں یہ موقع مل گیا تھا۔ وہ درجن بھر سے زیادہ افراد ایک ساتھ ربن پر حملہ آور ہوئے تھے، ایسے میں ربن کا چاقو بھلا کیسے جیب میں پڑا رہتا۔ چاقو باہر آیا اور اپنے کمالات دکھانے لگا۔ پہلا چرکافیکے کے بازو پر لگا۔ وہ جو اپنی چھوٹی سی تلواریں شاید ربن کا سر قلم کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا، ایک دھاڑ کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ ربن کو اس کا انجام دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ اس پر حملہ آور ہونے والے کوئی ایک دو افراد نہیں تھے۔ ان درجن بھر حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے وہ پھر کی کی طرح گول گول گھومتا چلا گیا۔ گول گھومتے ہوئے اس نے اپنے چاقو والے ہاتھ کو قوس کی شکل میں پھیلا رکھا تھا۔ حملہ آوروں میں سے کئی اس کے کھلے چاقو کا نشانہ بنے لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کسی کا داؤ نہ چلتا۔ ان میں سے کسی کے چاقو نے کام دکھایا اور بائیں شانے سے نیچے پیٹھ پر گھاؤ ڈال دیا۔ زخم گہرا تھا، فوراً ہی خون پھوٹ پڑا اور تیزی سے ربن کی قمیص کو بھگو نے لگا۔ اسے اپنے زخم کو دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ بے درپے حملہ آور ہوتے دشمنوں پر جوابی وار کرنے لگا۔ اس کے چاقو کا پھل چمک چمک کر حملہ آوروں کے مزاج پوچھتا رہا لیکن وہ بھی آج پیچھے ہٹنے کا ارادہ لے کر نہیں آئے تھے۔ گھائل ہو کر بھی اس پر حملے کرتے رہے۔ ان حملوں کے نتیجے میں ربن کے بدن پر لگنے

والے زخموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔
 ”تو نے بیچ چوراہے پر مجھے جوتے لگوائے تھے۔
 آج میں بیچ چوراہے پر تیرا قیمہ بناؤں گا۔“ حملہ آوروں
 میں فیکا سب سے زیادہ پُر جوش تھا اور زک اٹھانے کے
 باوجود بڑھ چڑھ کر اس پر حملے کر رہا تھا۔
 ”تجھ جیسوں کو اپنی چنگی میں مسل کر رکھ دیتا ہے۔ ان
 درجن بھر بھاڑے کے ٹٹوؤں کے بغیر آتا تو اپنی تیری جی
 داری کو مانتے۔“ رہن نے اس کے تلووار والے ہاتھ کو کلائی
 سے تھام کر موڑا اور نہایت پھرتی سے خنجر کی نوک سے اس کی
 گردن پر چرکا لگایا۔ اس کا یہ وار فیکے کے لیے جان لیوا بھی
 ہو سکتا تھا لیکن کسی نے یکدم اسے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔
 وہ بہت مضبوط تھا لیکن تھا تو بہر حال گوشت پوست کا انسان
 ہی، جس کی کوئی نہ کوئی انتہا ہوتی ہے۔ زخموں سے چور خون
 میں لت پت اتنے بہت سے لوگوں سے لڑتا وہ نڈھال
 ہونے لگا تھا۔ اپنی اس کمزوری نے اس کے اندر طیش کی
 شدید لہر دوڑائی اور اس نے حملہ آوروں میں سے ایک کے
 ہاتھ سے مضبوط لکڑی کا پتلا سالبا ڈنڈا جھپٹ لیا۔ ڈنڈا ہاتھ
 میں آتے ہی اس نے اسے اس کمال اور مہارت سے گھمانا
 شروع کیا کہ اسے گھیر لینے والے چوٹ کھا کر پٹ پٹ

کھینچوں کی طرح گرنے لگے۔ گرنے والوں کی چیخوں اور
 مغلقات کی آوازیں بہت بلند تھیں پھر وہ پھاڑ کھانے والا
 دھماکا سب پر سبقت لے گیا۔ دھماکے کے فوراً بعد ہی رہن
 کے جسم نے ایک زوردار جھٹکا کھایا اور اس نے اپنی چھاتی پر
 بننے والے سوراخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈی
 ایس پی راضیہ پر ڈالی۔ اس کے ریوالور کی نال سے اٹھتا
 دھواں وہ اپنی دھندلائی نظر کے باوجود دیکھ سکتا تھا۔ راضیہ
 اور مجود داد دور کھڑے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے اور شاید راضیہ
 نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس ہمالیہ سے شخص کو تسخیر کرنا اتنا
 آسان نہیں ہے، اس لیے اس نے اوچھاپن دکھاتے ہوئے
 اس تنہا آدمی کے سینے میں گولی داغ دی تھی جو بڑی بے
 جگری سے اتنے لوگوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گولی کا زخم ایسا
 نہیں ہوتا کہ اسے سہ کر آدمی اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکے
 اور رہن کے بدن سے تو پہلے ہی کافی مقدار میں خون بہہ چکا
 تھا۔ راضیہ کی اچھی حرکت پر اس نے حقارت سے زمین پر
 تھوکا اور پھر کسی شہتیر کی طرح گرتا چلا گیا۔ گرے ہوئے شیر
 کو دیکھ کر سارے گیدڑوں کے حوصلے دوبارہ بلند ہو گئے۔
 سب سے پہلے فیکا اس کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ کو
 اپنے جوتے کے نیچے اس زور سے دبایا کہ ہڈیاں

قارئین اور ایجنٹ حضرات

کے لیے

اہم اعلان

جنوری 2017ء کے شماروں سے ادارے کے رسائل ہر ماہ مندرجہ ذیل ترتیب سے تاریخ وار دستیاب ہوں گے

- سپنس ڈائجسٹ : 15 تاریخ
- ماہنامہ سرگزشت : 20 تاریخ
- جاسوسی ڈائجسٹ : 26 تاریخ
- ماہنامہ پاکیزہ : 30 تاریخ

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز..... کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروری 2017ء

81

سپنس ڈائجسٹ

کڑکڑا گئیں۔
 ”ایک انگلی مت چھوڑنا فیکے اس کے ہاتھوں میں۔
 اپنے کو اپنے دونوں انگوٹھوں کے بدلے میں اس کی پوری
 دس کی دس انگلیاں چاہیے ہیں۔“ مجھ نے اپنے چیلے کو جوش
 دلایا تو اس نے ایک وحشیانہ نعرہ لگا کر اپنی تلوار بلند کی اور
 پوری قوت سے ربن کے ہاتھ پر وار کیا۔ ایک ہی وار میں
 پانچوں انگلیاں کٹ کر گر گئیں۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں
 گننے سے قبل ہی ربن کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے
 اور ہمیشہ بیدار رہنے والا دماغ تیزی سے اندھیرے میں
 ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

بہمئی میں اس صبح نمودار ہونے والے سورج نے یہ
 خونی منظر دیکھا تو غضب ناک ہو کر قہر برسانے لگا۔ کامیابی
 کے نشے میں چور وحشیوں نے ربن کو مردہ جان کر قہقہے بلند
 کیے اور پرجوش نعرے لگاتے ہوئے اپنی سوار یوں پر سوار
 ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کمزور ساتانگے والا جو ربن کی
 ہدایت پر تانگے سے اتر کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا،
 ایک آڑ میں کھڑا یہ وحشت بھرا کھیل دیکھ رہا تھا۔ ایک تو
 فطری تجسس تھا جس نے اسے یہاں سے دور نہیں جانے دیا
 تھا، دوسرے اسے اپنے تانگے کی فکر تھی جس کی آمدنی سے
 اس کے کنبے کی روٹی روزی وابستہ تھی۔ وہ ہر تھر کا نتیجہ
 کچھ دیکھتا رہا۔ ربن کی بے جگری اور مقابل ٹولے کی بے
 ضمیری دونوں ہی اس کے حواس پر اثر انداز ہوئے اور سب
 کے جانے کے بعد وہ ڈرتا جھکتا ربن کے قریب پہنچا۔ اسے
 چھونے پر پہلے لمحے تو اسے بھی یہی لگا کہ یہ شخص اپنی جان
 سے گزر چکا ہے لیکن پھر اسے خون آلود کپڑوں کے نیچے
 دھڑکنوں کا سراغ مل گیا۔ یہ پرانے پھندوں میں پڑنے کا
 دور نہیں تھا پھر بھی جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے ربن کے نیم
 مردہ وجود کو بڑے جتنوں سے تانگے میں ڈالا اور اسپتال کی
 طرف روانہ ہو گیا۔ اسپتال میں پوری داستان سنانے کے
 بجائے اس نے صرف یہ بتایا کہ اسے یہ شخص راستے میں اس
 حال میں پڑا نظر آیا تھا اور وہ انسانی ہمدردی کے ناتے اسے
 اسپتال لے آیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بھی انسانی ہمدردی میں
 ہی اس شخص کو طبی امداد دینے کی کوشش شروع کر دی جس کے
 جسم میں سوائے جان کے شاید کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

”بس اب تم جاؤ۔“ تانگے نے جولیٹ کو اسٹیشن پر
 پہنچایا تو اس نے نیچے اترتے ہوئے کوچوان سے کہا۔
 ”نکو بی بی! میں ایسے کیسے جاسکتا ہوں۔ سروری آیا

بولے تھے آپ کو اکیلے نہیں چھوڑنا ہے اور جب تک آپ
 ریل گاڑی میں سوار نہیں ہو جاتے، آپ کے ساتھ ہی رہنا
 ہے۔ حالات بہت خراب ہیں بی بی! آپ اکیلے ریلوے
 اسٹیشن پر رہے تو یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوئیں گا۔“
 کوچوان چھلانگ لگا کر نیچے اتر اور اس کے سامنے کھڑے
 ہو کر تقریر جھاڑی۔ اس کی بات جولیٹ کے دل کو لگی۔ واقعی
 موجودہ حالات میں کسی عورت کا تنہا گھر سے نکلنا مناسب
 نہیں تھا اور رات کے وقت تو یہ عام دنوں میں بھی معیوب ہی
 سمجھا جاتا۔

”ٹھیک ہے بابا! تم آ جاؤ میرے ساتھ لیکن ہو سکتا ہے
 بہت دیر تک انتظار کرنا پڑے۔ مجھے ابھی نکلٹ بھی لینا ہے۔
 معلوم نہیں میری منزل پر جانے والی ٹرین کا کیا وقت ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں بی بی! ساری رات بھی رکتا پڑا تو
 میرے کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو حفاظت سے گاڑی میں
 بٹھا کر راج واپس گھر لوٹوں گا۔“ ادھیڑ عمر تانگے والے نے
 اسے جواب دیا۔ جولیٹ اس بار خاموش رہی اور وہ دونوں
 آگے پیچھے چل پڑے۔

جولیٹ نے مسلمان عورتوں کی طرح برقع پہن رکھا
 تھا اور چہرے پر نقاب بھی ڈالا ہوا تھا تا کہ کسی شناسا سے
 اتفاقاً سامنا ہونے کی صورت میں پہچانی نہ جاسکے۔ وہ بہت
 دھمی دل کے ساتھ مجبوراً یہاں سے جا رہی تھی۔ دکھ اونچا
 خاندان اور اونچی حویلی چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا۔ دکھ اسد
 اللہ کی محبتوں کو چھوڑ کر جانے کا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس
 بات کا تھا کہ اسد اللہ بہمئی سے واپس پلٹنے پر اسے نہ پا کر
 کتنے دھمی ہوں گے۔ وہ تو حویلی کے لیے خوشیاں لانے بہمئی
 گئے تھے، واپسی میں خود ان کا دامن خالی ہو چکا ہوگا یہ انہیں
 کہاں پتا تھا۔ حویلی میں واحد جولیٹ تھی جسے ان کے بہمئی
 جانے کی اصل وجہ معلوم تھی۔ وہ احتیاطاً کسی کو کچھ بتا کر نہیں
 گئے تھے کہ اگر خدا نخواستہ اپنے مقصد میں ناکام لوٹے تو
 بندھنے والی امیدیں ٹوٹ جائیں گی۔ دوسروں کی امیدوں
 اور امنگوں کا اتنا خیال رکھنے والے اسد اللہ کو یہ امید کہاں
 ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی ان کے ساتھ ایسا کر گزرے گی لیکن
 بیٹی بھی مجبور تھی۔ وہ باپ کو اپنا داغ دار دامن نہیں دکھا سکتی
 تھی اور اسے داغ لگانے والے سے بھی بدلہ لینا تھا۔ اسی
 لیے اس نے حویلی سے نکل کر واپس بہمئی جانے کے بجائے
 سیدھا پنجاب کے اس علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تھا جہاں
 دلدار آغا کی رہائش تھی۔

اس نے حویلی سے روانگی سے قبل ایک معذرتی خط لکھ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

فارغ کرنے کا ارادہ کیا اور پلٹ کر اس سے بولی۔
 ”اب تم واپس جاؤ بابا۔ اب میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔ یہ میرے بھائیوں جیسے ہیں، میرا اچھی طرح خیال رکھیں گے۔“

”ٹھیک ہے بی بی! جیسی آپ کی مرضی۔“ کوچوان بولا اور سلام کر کے واپس پلٹنے لگا۔ جولیت نے اسے روک کر اپنے پرس سے کچھ رقم نکال کر اسے تھمائی جسے اس نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد قبول کیا اور دعا میں دیتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

”تم نے اپنے ساتھ بڑا جیازتی (زیادتی) کیا سسر! ایسے غیروں کی طرح بمبئی سے نکل گیا۔ ادھر آنے کا تھا تو اپنے سے بولتا، اپن خود تم کو ادھر لے کر آتا۔“ کوچوان کے جاتے ہی جانی نے جولیت سے شکوہ کیا۔

”جو میرے ساتھ ہوا تم اچھی طرح جانتے ہو برادر۔ میں اپنے مجرم کو انجام تک پہنچائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر تم کو میری اتنی ہی فکر ہے تو چلو میرے ساتھ چلو۔ جب میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے اپنے دادا کے پاس بھی لے جاتا۔“ جولیت جذباتی کیفیت میں تو پہلے ہی جھٹلائی۔ غم آشنا کو سامنے پا کر مزید جذباتی ہو گئی۔

”اکیلا اپن تمہارے واسطے وری (پریشان) نہیں ہے، پر اپن تم کو سسر بولا ہے تو اپن نبھا کر دکھائے گا۔ چلو جدھر چلنے کا ہے۔ بائے گاڈ! اگر تم اپنے کو اپنے مجرم کا نام بولا ہوتا تو ابھی تک اس کا دی اینڈ ہو چکا ہوتا۔ اپن سے بھی جازتی دادا تم سے اس کا پوچھا تھا پر ٹھیک ہے ابھی تم اپنے کو بولا ہے تو اپن تمہارے ساتھ چلے گا۔“ جانی بھی جذباتی ہو گیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدے تو ان کی تعداد دو تھی اور جانی بھی جولیت کا شریک سفر بن چکا تھا۔

☆☆☆

حویلی پر رات کا سکوت چھایا ہوا تھا۔ مالکان اور ملازمین دونوں ہی اپنے دن بھر کے معمولات سے فارغ ہو کر چین کی نیند سو رہے تھے۔ ملازمین میں واحد سروری ایسی تھی جو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ ملازمین میں اپنی افضل حیثیت کی وجہ سے وہ یوں بھی سب سے آخر میں سوتی تھی کہ ہر کام کا اختتام اپنی نگرانی میں کروائے کیونکہ کسی خرابی یا کمی بیشی کی صورت میں جواب بھی اسے ہی دینا ہوتا تھا۔ بہر حال آج اس کے تاخیر سے سونے کا سبب جولیت تھی۔ وہ جولیت جسے جوزفین کی بیٹی کی حیثیت سے جاننے

کر اسد اللہ کے خاص کمرے میں لکھائی کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ ان کی طرف سے ملنے والے خاندانی زیورات حویلی میں ہی چھوڑ کر آئی تھی البتہ جوزفین کالاکٹ اس نے ماں کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ حویلی سے صرف کپڑوں کے چند جوڑے اور ضرورت کی رقم لے کر چلی تھی۔ اسٹیشن پر اس وقت خاصار شہور ہا تھا۔ شاید کوئی ٹرین ابھی وہاں پہنچی تھی اور اس سے اترنے والے مسافر قلیوں سے اپنا سامان اٹھوائے سواری کے لیے کوشاں تھے۔ کچھ تنہا مسافر بھی تھے جو اپنا مختصر سامان خود ہی اٹھائے ہوئے تھے۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے ٹکٹ گھر کی طرف جاتی ہوئی جولیت ایسے ہی ایک مسافر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ بمبئی کے اس شناسا کو یہاں حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر دیکھے گی۔

”جانی برادر۔“ بے ساختہ ہی وہ اسے پکار بیٹھی۔
 ”جولی..... سسر! یہ تم ہے۔“ جانی شناسا آواز پر متوجہ ہوا لیکن ایک برقع پوش خاتون کو سامنے پا کر تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔

”یہ میں ہی ہوں برادر..... پر تم یہاں؟“ جولیت کی حیرت قائم تھی۔

”اپن تمہاری تلاش میں ہی آیا ہے سسر! ادھر سب تمہارے واسطے بہت پریشان تھا۔ دادا اور فاروق بھائی پتا نہیں کدھر کدھر تم کو تلاش کرتا رہا پھر پتا چلا تم ادھر حیدر آباد آیا ہے۔ ابھی دادا نے اپنے کو آؤر دیا کہ حیدر آباد جاؤ اور سب سے پہلے نواب سلیم اللہ کی حویلی پر جولیت کا پتا کرو تو اپن ادھر ہی جانے کا تھا، پر تم تو یہیں اسٹیشن پر ہی اپنے کو مل گیا سسر۔“ جانی کے لہجے میں سچی خوشی تھی لیکن جولیت پر تو حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ اپنے تئیں بہت خفیہ طور پر حیدر آباد آئی تھی لیکن وہ کمال کے لوگ تھے کہ انہوں نے یہ کھوج تک لگالی تھی کہ وہ حیدر آباد میں نواب سلیم اللہ کی حویلی میں موجود ہے۔

”دادا کو کیسے پتا چلا کہ میں کہاں ہوں؟“ وہ اپنی حیرت کو سوال بن کر لیوں پر آنے سے نہیں روک سکی۔

”پوری ڈیٹیل تو اپنے کو نہیں معلوم پر اتنا پتا ہے کہ نواب سلیم اللہ کی حویلی کا پتا فاروق بھائی نے دادا کو بولا تھا۔“

جانی نے اس کے سر پر ایک اور ہم پھاڑا۔ فاروق کیسے جانتا تھا کہ وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ہوگی اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا اور نہ ہی یہ موقع ایسا تھا کہ اس موضوع پر سوچ بچار کی جاسکتی۔ اس نے سب سے پہلے کوچوان کو

بلووں کی خبر سن آ رہی تھیں۔ حالات بے حد منحوس تھے اور پورا نظام درم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ جو خط وہ اپنے گھر والوں کے نام لکھ رہا ہے، وہ ان تک پہنچ بھی سکے گا۔ گولیوں اور انسانوں کی آوازوں سے حویلی پر بلوائیوں کے حملے کا اندازہ لگا کر اس نے پھرتی سے اپنی بندوق نکالی اور خود بھی باہر کی طرف دوڑا۔ وہ پٹھان تھا اور اس کا ہتھیار ہمیشہ اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ استعمال میں نہ ہونے کے باوجود باقاعدہ صفائی اور تیل وغیرہ دینے کی وجہ سے اس کی بندوق بہترین حالت میں تھی اور یہ طے تھا کہ جب تک اس کی بندوق نے ساتھ دیا، وہ کسی بلوائی کو حویلی میں ٹھنسنے نہیں دے گا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک نگران کی چوکی تک پہنچا۔ اس عرصے میں حویلی کے دیگر افراد بھی جاگ چکے تھے۔ اس نے حسیب اللہ کو بھی ہتھیار سمیت باہر نکلتے دیکھا۔ شکار کے شوق کے باعث حویلی کے تمام ہی مرد حضرات ہتھیاروں کا استعمال ابھی طرح جانتے تھے۔

”کون لوگ ہیں یہ؟ کیا بلوائی؟“ آصف خان نے نگران سے دریافت کیا۔

”وہی اچ ہیں سرکار۔ رگھو بد معاش کو ان کے بیچ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوں۔“ نگران نے اسے جواب دیا اور ایک فائر داغا۔ آصف خان کو بھی رگھو کے بارے میں سن گئی تھی۔ یہ نواب سلیم اللہ کے دوست کی حویلی میں کام کرنے والا وہی ملازم تھا جس کی جوان بیوی نواب صاحب کے دوست کے بیٹے شہزادہ کمال کی ہوس کی بھیجٹ چڑھ گئی تھی اور وہ انتقام کی خواہش میں بلوائیوں کے ایک منظم گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ رگھو اور اس کے گروہ نے نواب سلیم اللہ، ان کے دوست اور دوست کے بیٹے کو اس وقت نشانہ بنایا تھا جب وہ لوگ شکار کیلئے گئے ہوئے تھے۔ شہزادہ کمال کے علاوہ بے قصوروں کو بھی نشانہ بنانے کے باوجود جانے رگھو کے انتقام کی آگ نہیں بجھی تھی یا اس کے منہ کو خون لگ گیا تھا جو وہ اپنے ساتھیوں سمیت نواب صاحب کی حویلی پر چڑھ دوڑا تھا۔ نواب صاحب کی حویلی کی مضبوطی اور یہاں مسلح نگرانوں کی موجودگی یقیناً ان بلوائیوں کے علم میں تھی جو وہ مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور ان کی طرف سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور انہوں نے حویلی کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پھر انہیں لڑائی بھڑائی اور فتنے فساد کا تجربہ بھی زیادہ تھا سو مزاحمت کے باوجود ان کے حملے میں شدت زیادہ تھی۔ وہ فائرنگ کے علاوہ آگ کے گولے سے بھی حویلی کے اندر اچھا رہے

والوں میں وہ بھی شامل تھی اور جس کا جوزفین کے دل کی بربادی میں شریک افراد میں شمار ہوتا تھا، وہ برسوں پرانا قرض اتارنے کے لیے اسے آج جو لیٹ کا مطالبہ ماننا پڑا تھا لیکن اس کی مان کر بھی وہ پرسکون نہیں تھی۔ دل میں ہزار طرح کے اندیشے اور دوسو سے تھے بھی خیال آتا نہ جو لیٹ یہاں سے نکل کر آخر کہاں گئی ہوگی، کبھی اسد اللہ کی واپسی کے بعد ان کے سامنے جواب دہی کے خیال سے تھرا اٹھتی چنانچہ بستر پر لیٹنے کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے روٹی ہوئی تھی اور وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی بہ مشکل غنودگی میں گئی تھی کہ اس نے کچھ شور سنا۔ آوازیں مدھم اور دور سے آتی ہوئی تھیں لیکن صاف ظاہر تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھے بول اور ہنچ رہے ہیں۔ وہ ہڑبڑائی ہوئی اپنے بستر سے اٹھی اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ صورت حال جاننے کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازے کی کنڈی کھول ہی رہی تھی کہ فضا میں گولی چلنے کی آواز گونجی اور وہ دل تمام کر اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

حویلی کے نگرانوں کے پاس بندوق کی موجودگی کا اسے علم تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ کبھی ان نگرانوں کو بندوق چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور سروری اپنی پوری زندگی میں پہلی بار گولی چلنے کی آواز سن رہی تھی۔ سروری کے علاوہ دوسرا جاننے والا فرد آصف خان تھا۔ وہ حویلی کے مہمان خانے میں موجود تھا اور بہت دیر تک ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف رہا تھا۔ مطالعے کے بعد اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں سے نیند گوسوں دور تھی جہاں باپ اور اپنے لوگوں کی یاد نے بہت شدت سے دل پر یلغار کی تھی اور اس یاد نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ قلم تمام کراہیوں کے نام ایک طویل خط لکھے۔ اس خط میں اس نے اپنے دل کی ہر بات لکھ ڈالی تھی۔ جو لیٹ کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا تھا اور ساتھ ہی اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ وہ ہونے والی بہو کو منگنی پر چڑھانے کے لیے کیا کیا سوچا تیں اپنے ساتھ لا رہی ہے۔ بس ایسی ہی چھوٹی چھوٹی دل کی باتیں تھیں جنہوں نے خط کو پھیلا کر کئی صفحات پر محیط کر دیا تھا۔ وہ اس طویل خط کی آخری سطور لکھ رہا تھا جب اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ یہ واحد آواز نہیں تھی۔ اس ایک فائر کے بعد پے در پے کئی فائر ہوئے تھے۔ ساتھ ہی چیخنے، چلانے اور لالکارنے کی آوازیں بھی تھیں۔

”بلوائی۔“ آصف خان کے ذہن میں فوراً ہی یہ لفظ گونجا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آج کل مسلسل

شوروری 2017ء

بیوی اور بیٹی بیٹی سمیت حویلی کی دیگر خواتین کی فکر یوں خلط ملط ہوئی کہ اس کی روح بدن کو چھوڑ کر جاتے ہوئے تڑپ تڑپ گئی لیکن موت پر کہاں کسی کا اختیار ہے۔

آصف خان لندن کا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک قبائلی تھا جس کے لیے ہتھیار اور لڑائی بھڑائی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی وہ حبیب اللہ کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح ان بلوائیوں کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن بلوائی تعداد میں بہت زیادہ اور مختلف اقسام کے ہتھیاروں سے لیس تھے چنانچہ نقصان اٹھانے کے باوجود ان کا زور کم نہیں ہو رہا تھا۔ آصف خان کی بددوق کی گولیاں ختم ہوئیں تو اس نے ایک بلوائی کی کرپان چھین لی اور اسے بے تحاشا چلاتے ہوئے ان کے بدنوں کو چھیدنے لگا۔ وہ کرپان استعمال کرنے کے ہنر سے واقف نہیں تھا لیکن اپنے محسنوں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کا خیال اسے بے جگری سے لڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس حویلی نے اسے اس وقت پناہ دی تھی جب خود اس کے وطن کی زمین اس کے لیے تنگ پڑ گئی تھی پھر وہ آج وقت پڑنے پر حویلی والوں کے لیے اپنی جان کیسے نہیں لڑاتا لیکن وہ اکیلا کب تک لڑ سکتا تھا۔ بلوائیوں کے ہتھیاروں نے اس کے جسم پر اتنے گھاؤ لگائے کہ جسم چھلنی ہو کر رہ گیا۔ سب سے زیادہ نقصان اس گولی نے پہنچایا جو اس کے بائیں گردے میں لگی تھی۔ گولی کے اس زخم نے ہی باہمت آصف خان کو ڈھا دیا اور آخر کار وہ گر گیا۔ گرے ہوئے شیر کا شکار ان بھیڑیوں کے لیے کیا مشکل تھا۔ بالآخر اس آصف خان کی زندگی کی کہانی ختم ہو گئی جسے اس کے والدین نے جیتا رکھنے کے لیے ہی خود سے اتنی دور بھیجا تھا۔ موت اپنے وقت پر ہی آئی تھی لیکن فرق تھا تو یہ کہ وہ اپنے علاقے میں اپنوں کی دشمنی کی بھیٹ چڑھنے کے بجائے یہاں شہادت کا رتبہ پا گیا تھا۔

حویلی کے گھرانوں نے بھی حق نمک ادا کرتے ہوئے ایک ایک کر کے اپنی جان دے دی تھی۔ اب واحد صنفی اللہ تھے جو اپنی بددوق تھامے زنان خانے کی پہرے داری کر رہے تھے۔ زنان خانے میں اس وقت کھرام مچا ہوا تھا۔ بیبیاں اور ملازمائیں جو شور سن کر ایک ایک کر کے جاگ گئی تھیں، ایک بڑے کمرے میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ خوف نے ان سب کے چہروں سے خون نچوڑ لیا تھا وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ بلوائیوں کے بارے میں خبریں حویلی میں بھی پہنچتی رہی تھیں اور جملہ خواتین کو علم تھا کہ یہ بلوائی صرف جان و مال کے دشمن نہیں تھے، ان سے عزتیں بچانا بھی

تھے جو کسی بھی آگ پکڑنے والی چیز سے ٹکراتے تو اس میں آگ لگ جاتی۔ آگ کی وجہ سے دھواں بھی پیدا ہو رہا تھا جس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مزاحمت کرنے والے کھانس کھانس کر بے حال ہو رہے تھے اور ان کی مزاحمت کمزور پڑ رہی تھی جبکہ چالاک بلوائی پہلے ہی سے انتظام کر کے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ اور ناک کے گرد گیلے کپڑے لپیٹ لیے تھے۔ یہاں والوں کے پاس اس کی بھی مہلت نہیں تھی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں حویلی پر حملہ ہوگا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کی طرح یہاں والوں نے تو ہجرت کا بھی نہیں سوچا تھا۔ یہی خیال تھا کہ ہم ایک آزاد ریاست کے باسی ہیں جو آزادانہ ہی رہتے رہیں گے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاست کے پاکستان سے الحاق کے بارے میں پیش گوئیاں ضرور کی جا رہی تھیں جس میں ظاہر ہے تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا لیکن ان متعصب ہندوؤں کے پیٹ میں تو مروڑ اٹھ رہے تھے جو ریاست کے نوابین کی دولت پاکستان منتقل ہو جانے کے اندیشے سے بے حال ہوئے جا رہے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ یہ دولت کسی بھی طرح مسلمانوں اور پاکستان کے کام آسکے۔

نواب سلیم اللہ کی حویلی پر رات کے اس پہر حملے کا مقصد بھی ان کی دولت ہتھیانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی جانوں اور عزتوں سے کیلئے کاموں انہیں یونس میں مل جاتا۔ وہ مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور ان کی آنکھوں پر دولت اور نفرت کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اس لیے ان کے حملے کا جوش، غیظ اور غضب ہی الگ تھا۔ مزاحمت کے باوجود وہ حویلی کی بائیں جانب کی دیوار میں شکاف بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اس شکاف سے بلوائیوں کا ریلہ سا اندر گھس آیا۔ آصف خان اور حبیب اللہ کو خبر ہوئی تو دونوں بیک وقت اس طرف دوڑے۔ پریشانی اور افراتفری میں انہیں اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کے پاس گنتی کی چند گولیاں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اسلحہ تو محض شکار کے شوق میں جمع کیا گیا تھا، یہ گمان کب تھا کہ اس اسلحہ سے اپنے دفاع کی جنگ بھی لڑنا پڑے گی جو ہتھیاروں اور گولیوں کا ڈھیر جمع کر لیا جاتا۔ گولیاں ختم ہوئیں تو پہلے حبیب اللہ بلوائیوں کا نشانہ بنا۔ ایک بلوائی کی کرپان نے یوں اس کی گردن کو چھیدا کہ وہ اپنے منہ سے چیخ تک بلند نہ کر سکا۔ ہاں کھلی آنکھوں میں حسرت، وحشت ضرور جم کر رہ گئی۔ جوان عمری میں دنیا کو چھوڑ کر جانے کی کسک اور عزیز

کوئی آتشیں ہتھیار چلا اور گولی صنی اللہ کے بدن میں گھپ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے نیچے گر گئے۔ بلوائی ان کے گرے ہوئے بدن کو روندتے ہوئے اندر گھس کر زنان خانے کے مختلف حصوں میں گھستے چلے گئے۔ انہیں زمین پر اوندھے گرے صنی اللہ سے زیادہ اب ان بیبیوں سے دلچسپی تھی جن کے چہرے کبھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھے تھے پھر بھی ان کے حسن کا چرچا تھا۔ وہ حسن کے ساتھ ساتھ حسن کو دو آتشہ کرنے والے ان زبورات کے بھی خواہاں تھے جن کی بیش قیمتی اور خوب صورتی کو ہر دیکھنے والے کی زبان سراہتی تھی۔ زبورات تک رسائی میں وہ خاصی حد تک کامیاب ہو گئے لیکن حسن والیاں پچھلے محن میں بنے عین کنوئیں میں سا چکی تھیں۔ عورت کے نام پر وہاں صرف ندرت جہاں کا بوڑھا وجود بچا تھا۔ ان کے بوڑھے اور بیمار وجود میں اتنا دم ہی نہیں تھا کہ وہ بھاگ کر پچھلے محن تک جا پاتیں۔ کوشش البتہ انہوں نے ضرور کی تھی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر کمرے کی چوکھٹ پر ہی گر گئی تھیں۔ نفرت سے بھرے بلوائی اس بوڑھے وجود کو بھی شاید نہ چھوڑتے لیکن باہر سے آنے والی آوازوں نے انہیں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً حویلی پر بلوے کی خبر دربار تک پہنچ گئی تھی اور والی ریاست کے سپاہی اپنے وفادار دوست خاندان کی مدد کے لیے وہاں آ پہنچے تھے یہ اور بات کہ انہیں آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وحشت زدہ سا قاروق انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ نرس سوزی سے اسے یہی پتا چلا تھا کہ کیتھی کے عزیز کو وہاں رکھا گیا ہے۔ یہاں انتہائی حساس مریضوں کو رکھا جاتا تھا، اس لیے ملاقاتیوں اور عزیزوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ قاروق کو بھی روکنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ کہاں رک سکتا تھا۔ اس نے روکنے والے کو جھٹکے سے ایک طرف ہٹایا اور خود اندر داخل ہو گیا۔

”کون ہے تو بد معاش۔ میں ابھی سکیورٹی کو بلاتا ہوں۔“ وہ شخص اس کی حرکت پر زور سے چلایا لیکن قاروق نے پروا نہیں کی۔ اسی اثنا میں اندر موجود کیتھی شورو کی وجہ سے متوجہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے اندر آ جانے والے قاروق اور اس کے پیچھے موجود وارڈ بوائے کو دیکھا اور پھر وارڈ بوائے سے پوچھا۔

”انہیں آنے دو روہن۔ یہ میرے ریلیو ہیں۔“

مشکل تھا اور وہ عزت دار بیبیاں سب سے زیادہ اپنی آبرو کے لیے فکر مند تھیں۔ زنان خانے کا پہرا دیے صنی اللہ ایک جھروکے سے باہر جاری ہنگامے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ دفاع کرنے والے اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب بلوائی حویلی کی مرکزی عمارت میں گھسنے کو ہیں۔ جان و مال کی انہیں اتنی پروا نہیں تھی لیکن اپنی آبرو کو اپنے سامنے لٹا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جھروکے سے ہٹ کر اس کمرے میں آئے جہاں ساری خواتین ان کی صورت بکیتی تھیں۔ دفاع کرنے والوں کو شکست سے دو چار کرنے کے بعد بلوائیوں کا جوش و خروش مزید بڑھ گیا تھا اور وہ وحشیانہ نعرے لگاتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔ ان کا یہ عمل دلوں کو لرزاتا تھا۔ صنی اللہ کے چہرے پر بھی زلزلے کے آثار تھے انہوں نے خود پر اٹھی سوالیہ نظروں کو محسوس کیا اور گہمیر لہجے میں فقط اتنا بولے۔ ”کلمہ طیبہ پڑھ لیجیے۔“

ان کا یہ مختصر جملہ وہاں موجود خواتین کے لیے مکمل پیغام تھا۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اب ان کا دفاع ممکن نہیں رہا ہے اور انہیں وہی کرنا ہے جو آبرو مند بیبیاں اپنی آبرو بچانے کے لیے کرتی ہیں۔ وہ سب روتی کر لاتی کمرے سے باہر نکل کر پچھلے محن کی طرف دوڑتی چلی گئیں۔ صنی اللہ نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن یہ بھی نہیں کر سکے..... کہ ان کے کانوں نے زنان خانے کا مضبوط دروازہ توڑے جانے کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ تیزی سے اس جانب بڑھے۔ ان کے پاس گنتی کی چند گولیاں تھیں لیکن ان کی مدد سے وہ اتنی مہلت تو حاصل کر سکتے تھے کہ خواتین اپنی آبرو بچانے کا انتظام کر لیں۔ وہاں اتنا شور تھا کہ کسی آواز کے سنائی دینے کا کوئی امکان نہیں تھا پھر بھی وہ حملہ آوروں پر گولیاں برساتے اپنے کانوں میں وہ چھپا کے گونجتے محسوس کر رہے تھے جو ہر بی بی کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے پر پیدا ہوتا تھا۔ زنان خانے کے پچھلے محن میں بناوہ کنواں بہت گہرا تھا اور انہیں یقین تھا کہ اس میں حویلی کی عزت و آبرو اچھی طرح سا جائے گی۔ اپنی بندوق سے آخری گولی چلاتے ہوئے انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کے کمزور بازو حویلی کی آبرو لٹنے سے بچا چکے ہیں۔ ان کی طرف سے گولیاں چلنے کا سلسلہ ختم ہوا تو ٹوٹے ہوئے دروازے سے بلوائی بھڑامار کر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے بھی چند ایک کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار موجود تھے۔

پانی کی طرح پیسا بہانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بس ان کی زندگی چاہیے۔“ فاروق اس وقت بہت جذباتی کیفیت میں تھا۔ بستر پر پڑا ربن کا وجود اس کے دل کو بری طرح سمجھ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح ربن کو بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دے۔

”زندگی دینا اوپر والے کا کام ہے۔ ہم ڈاکٹر زبسن اپنی بہترین کوشش ہی کر سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اس کی بات کے جواب میں کہا اور پھر کیتھرائن کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولا۔

”پلیز سسٹر! آپ ان کا خیال رکھیں۔ میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ راولڈنگاؤں گا، اگر کوئی پرابلم ہو تو فوراً مجھے انفارم کیجیے گا۔“

”اوکے ڈاکٹر!“ کیتھرائن نے ڈاکٹر کو جواب دیا تو وہ فاروق کے شانے کو تھپتھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔

”دادا کو یہاں کون لایا تھا؟“ ڈاکٹر چلا گیا تو فاروق نے کیتھرائن سے دریافت کیا۔ اسپتال میں اڈے کے کسی بھی فرد کی غیر موجودگی کا بھی مطلب تھا کہ وہاں کسی کو اس حادثے کی خبر نہیں ہے اور ربن کو کہیں تنہائی میں گھیر کر مارا گیا ہے۔

”دینو تانگے والا لایا تھا۔ میرا اکثر اس کے تانگے میں آنا جانا رہا ہے اس لیے میں اسے جانتی ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ دادا کو اس نے راستے میں اس حال میں پڑا دیکھا تو ہمدردی میں اسپتال لے کر آ گیا۔ وہ یہاں زیادہ رکا بھی نہیں کہ پولیس کے چکر میں پڑنا پڑے گا۔“ کیتھرائن نے اسے بتایا۔

”تم نے اڈے پر اطلاع کیوں نہیں بھجوائی؟“ فاروق نے وہ سوال کیا جو مسلسل اس کے ذہن میں چھ رہا تھا۔ کیتھرائن ربن کا کتنا بھی خیال رکھتی، وہ اڈے کے لوگوں کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ ربن کے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کر پاتی۔ منطقی طور پر بھی اڈے والوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا کہ ربن کے سارے رشتے ناتے ان ہی لوگوں سے تھے اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔

”میں نے ایک آدمی ادھر بھجوایا تھا لیکن.....“ کیتھرائن خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا؟“ فاروق جس کی نظریں مسلسل ربن پر تکی ہوئی تھیں، چونک کر کیتھرائن کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے بیچے ہوئے آدمی نے بتایا ہے کہ اڈے پر صبح صبح پولیس کا ریڈ ہوا تھا۔ پولیس والے اڈے سے کئی

روبن نے منہ بنایا لیکن خاموش ہو گیا۔ ادھر فاروق ہر بات سے بے نیاز ربن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سفید بستر پر دراز ربن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے کی رنگت یوں زرد تھی جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہ ہو۔ دونوں ہاتھوں سمیت اس کا پورا جسم پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔ منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا اور رگوں میں خون اور گلوکوز منتقل کرنے والی سوئیاں پیوست تھیں۔ کیتھی کے علاوہ وہاں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا جو ربن کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک تھا کہ فاروق کے اندر داخل ہونے کے وقت ہونے والے ہنگامے کی طرف اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ فاروق کے لیے یہ سارا منظر ناقابل یقین تھا۔ ربن اور اس حالت میں اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا مل سکتا ہے، اس کے دل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں ربن کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دل و دماغ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ کیتھرائن نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور دلاسا دینے والے انداز میں اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”ان کی حالت اب کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟“ کیتھرائن کے ہاتھ کے دلا سے نے فاروق کے اندر اتنی ہمت پیدا کی کہ وہ ڈاکٹر سے کوئی سوال کر سکے۔

”بہت سیریس کنڈیشن ہے۔ بلڈ اتنی زیادہ مقدار میں بہہ چکا ہے کہ ناریلی ایسی کنڈیشن میں پیشینگی کی ڈھچھ ہو جاتی ہے لیکن یہ شخص حیرت انگیز طور پر زندہ رہا ہے۔ ہم بلڈ دے رہے ہیں لیکن صرف اس سے پرابلم سولو نہیں ہوگی۔ باڈی کے اندر گولی موجود ہے جسے آپریٹ کرنا ضروری ہے لیکن اس کنڈیشن میں آپریٹ کرنا بھی بہت ڈنجرس ہوگا۔ بات صرف بیرونی زخموں کی نہیں ہے۔ بہت شدید اندرونی چوٹیں بھی آئی ہیں۔ لیفٹ کنڈی اور اسٹیک متاثر ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ شخص حیرت انگیز طور پر زندہ ہے۔ ہاسپٹل کے کئی سینئر ڈاکٹرز نے اس کا چیک اپ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے سب سے سینئر ڈاکٹر پہنچنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ اس کیس کو ڈسکس کر کے فائنل ڈیجن لیا جائے گا کہ اب کیا کرنا ہے؟ آپ کی پرمیشن کی بھی ضرورت ہوگی۔ ویسے آپ پیشینگی کے کون ہیں؟“ ڈاکٹر نے اسے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل بتانے کے بعد آخر میں اس کی بابت پوچھا۔

”یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ آپ لوگ ان کے اچھے سے اچھے علاج کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں

سبسٹنس ڈائجسٹ

اس کی آنکھوں سے بہنے لگی تھی۔ آنسو اتنی روانی سے بہہ رہے تھے کہ کہیں ٹھہرے بغیر قطروں کی صورت ٹپ ٹپ ربن پر گرتے چلے گئے۔ فاروق کے آنسو ربن کے چہرے پر گرتے اور وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہتا بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ بند پتھوں میں دھیرے سے تحریک پیدا ہوا اور پلکیں کھلنے کے لیے لرزنے لگیں۔

”دادا..... اٹھو دادا! دیکھو میں آیا ہوں تمہارا فاروق۔“ پلکوں کی جنبش کو محسوس کر کے فاروق بے چینی سے اسے آواز دینے لگا۔ اس کی آواز نے مہینز کا کردار ادا کیا اور بند آنکھیں دھیرے دھیرے کھلتی چلی گئیں۔ نا طاقی ایسی تھی کہ پوری آنکھیں بھی نہ کھل پائیں اور وہ بس نیم وا آنکھوں سے فاروق کی شکل دیکھنے لگا۔ ان نیم وا آنکھوں میں بھی فاروق کے لیے ایک جہان محبت آباد تھا۔

”میں آ گیا ہوں دادا۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم دونوں مل کر دشمنوں کو اچھی طرح سبق سکھائیں گے۔“ فاروق نے اپنی آواز میں بشارت پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس ذرا سی مسکراہٹ کے لیے بھی اسے بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

”ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔“ کیترائن جو اس دوران پوری مستعدی سے ربن پر دھیان رکھے ہوئے تھی اور اس کا معائنہ کرتی جا رہی تھی، آہستہ سے بولی اور ڈاکٹر کو بلانے کے لیے باہر کی طرف دوڑی۔ فاروق نے بھی محسوس کیا کہ آکسیجن ماسک کے پیچھے ربن کے لبوں کی مسکراہٹ میں کرب ہے لیکن وہ کمال آدمی تھا کہ اب بھی اپنے منہ سے ایک آہ نہیں نکالتا تھا۔ اس کا تیزی سے پھولتا پچکتا سینہ گواہ تھا کہ اسے آکسیجن لگی ہونے کے باوجود سانس لینے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ فاروق کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر یوں بچھنے لے کہ کوئی اسے اس سے جھین کر نہ لے جاسکے لیکن وہ یہ بھی تو نہیں کر سکتا تھا کہ ربن کا زخم زخم وجود بہت احتیاط سے چھوئے جانے کا متقاضی تھا۔

”پلیز! آپ پیچھے ہٹیں۔“ کیترائن کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہونے والے ڈاکٹر میں سے ایک نے فاروق سے کہا تو وہ خود پر جبر کر کے پیچھے ہٹا کہ وہ لاکھ ربن سے محبت کرتا ہو مگر ڈاکٹر کا کام تو ڈاکٹر ہی کر سکتے تھے۔ دونوں ڈاکٹر پوری جاں فشانی سے اپنا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ کیترائن بھی مستعدی سے ان کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ ڈاکٹر زکیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ

افراد کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور کچھ فرار ہیں۔ اڈا خالی پڑا ہے اور پولیس نے باہر تالا لگا کر اپنا ایک سپاہی وہاں کھڑا کر دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ میرا بھیجا ہوا آدمی سیدھا ڈے پر نہیں پہنچا۔ وہ اڈے کا پتا معلوم کرنے کے لیے ایک دکان پر رکا تھا۔ دکان دار نے ہی اسے ساری کہانی سنائی۔“ ایک اور روح فرسا خبر فاروق کی منتظر تھی جسے سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے ان کے لیے حالات سخت چل رہے تھے لیکن یوں دیکھتے ہی دیکھتے سب اجڑ جائے گا، اس کا تو کوئی گمان ہی نہیں تھا۔ وہ جیسے سن سا ہو گیا اور یک ٹک ربن کی شکل دیکھنے لگا۔ کیسا جی دار اور شان والا آدمی تھا وہ۔ دشمنوں نے نہ جانے کس عیاری سے چال چل کر اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ پیچھے سے اس کی راجدھانی بھی اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ دشمن کون تھے یہ پوچھنے کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ اس قصے میں پولیس کی شمولیت سے ہی ظاہر تھا کہ یہ پولیس اور مجود دادا کا مشترکہ کارنامہ تھا۔ مجود دادا اور اس کے گروگوں کا پولیس کے ساتھ عرصے سے گٹھ جوڑ چل رہا تھا لیکن کمال یہ ہوا تھا کہ انہوں نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے انتہائی اقدامات کر ڈالے تھے جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”ظالموں نے دادا کے دونوں ہاتھوں کی ساری انگلیاں کاٹ ڈالی ہیں۔ انہیں دوسری زندگی ملی بھی تو وہ معذوری کی زندگی ہوگی۔“ کیترائن نے فاروق کو رقت آمیز لہجے میں بتایا تو وہ مزید چونک گیا اور اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ اس سب کے پیچھے مجود دادا کا ہاتھ ہے۔ ربن نے اسے ہمیشہ کے لیے چاقو پکڑنے سے محروم کر دیا تھا۔ جواب میں اس نے بھی یہی کر ڈالا تھا لیکن دونوں کے طرز عمل میں فرق تھا۔ ربن نے مجود دادا کو باقاعدہ لاکر اس کی مرضی سے بمبئی بھر کے داداؤں کی موجودگی میں اپنے زور بازو پر زور کیا تھا، اس کے مقابلے میں مجو نے باقاعدہ سازش کی تھی۔ فاروق نے کرب کے عالم میں بیٹوں میں جکڑے ربن کے ہاتھوں کو آہستہ سے چھوا۔ ان ہاتھوں کی انگلیوں میں کیسا ہنر چھپا ہوا تھا۔ چاقو ان ہاتھوں کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتا تھا لیکن اب وہ انگلیاں ہی نہیں رہی تھیں۔ اپنے مربی دشمن کی یہ حالت اس کے دل پر کیا گزار رہی تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ ممکن ہوتا تو وہ اپنے جسم کا ایک ایک عضو ربن کو دان کر کے اس کے بدن کے ٹوٹے ہوئے اعضا کی کمی دور کر دیتا، وہ اس کے بدن میں اپنی روح منتقل کر دیتا لیکن یہ سب ممکن ہی تو نہیں تھا اور بے بسی آنسو بن کر

دولت مند

ایک دولت مند شخص کسی ڈاکٹر کے یہاں بغرض علاج گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شخص سے کہا۔

”اس کرسی پر تشریف رکھیے۔“

دولت مند شخص کو شاید یہ توقع تھی کہ ڈاکٹر صاحب اسے دوسرے عام مریضوں کی نسبت زیادہ اہمیت دیں گے۔ وہ بلند آواز سے بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس شہر کا امیر ترین شخص ہوں۔“
ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو پھر آپ دو کرسیوں پر تشریف رکھیے۔“

بیچارہ چوہا

استاد شاگرد سے۔ ”دنیا کا سب سے طاقتور جانور کونسا ہے؟“

شاگرد۔ ”جناب..... چوہا۔“

استاد حیران ہو کر۔ ”وہ کیسے؟“

شاگرد۔ ”جناب! میرے ابو امی سے ڈرتے ہیں اور امی چوہے سے تھر تھر کانپتی ہیں۔“
مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

بھی تھی لیکن پولیس پر دادا کی شناخت ظاہر نہیں کی گئی۔ ایسا میرے کہنے پر ہوا اور ڈاکٹر پر کاش نے میرا ساتھ دیا۔ آپ کی بیماری کے دنوں میں ڈاکٹر پر کاش کی دادا سے اچھی دوستی ہو گئی تھی اس لیے وہ میری ریکویسٹ پر آؤٹ آف داوے جا کر فوراً دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اسٹاف کا ہر فرد تو دادا کے بارے میں ویسے بھی نہیں جانتا، کچھ زخموں کی وجہ سے بھی شناخت نہیں ہوئی۔ اب آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ منظر سے ہٹ جائیں۔ پولیس اپنی کارروائی کے لیے دوبارہ یہاں آئے گی، آپ سے ان کا سامنا نہ ہو تو ٹھیک رہے گا۔ لاوارث لاش میں پولیس بھی زیادہ دلچسپی نہیں لے گی اور ڈیڈ باڈی کو سرد خانے میں رکھوا دیا جائے گا۔“

”کیا مطلب؟ میرے ہوتے دادا کی لاش لاوارث کیسے ہو سکتی ہے؟“ فاروق بھڑکا۔

”پلیز ایزی۔ میں پولیس سے بچنے کے لیے آپ کو یہ ایڈوائز کر رہی ہوں۔ ڈیڈ باڈی آپ کو ہی ملے گی، یہ میرا آپ سے پراس ہے۔ بس ابھی آپ سامنے سے ہٹ

رہے ہیں، فاروق کو نہ تو سمجھ آ رہی تھی اور نہ ہی سمجھنے کا ہوش تھا۔ وہ تو بس سراپا دعا رب بن کی زندگی کی بھیک مانگنے میں مصروف تھا لیکن ہر دعا کہاں مستجاب ہوتی ہے۔ بعض اوقات دعائیں روزِ آخرت کے لیے اٹھا کر رکھ دی جاتی ہیں۔ فاروق کی بہت شدت سے مانگی گئی دعاؤں کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا گیا اور ڈاکٹر نے ربن کے بیڈ سے دور ہٹتے ہوئے اعلان کیا۔

”یہی از نومور۔“ یہ محض الفاظ نہیں تھے۔ فاروق پر تو آسمان ٹوٹ کر گرا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ اپنی جگہ بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ غم پر نفرت اور انتقام کی قوتیں غالب آ گئی تھیں اور وہ ربن کے بے جان وجود کو یک ٹک دیکھتے ہوئے خود سے وعدہ کر رہا تھا کہ اس کے قاتلوں کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں لینے دے گا۔

”ہم حیران تھے کہ اس شخص کو اب تک کس چیز نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ اب اندازہ ہوا کہ ان کا دم آپ میں اٹکا ہوا تھا۔ بہر حال ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم کوشش کے باوجود ان صاحب کی جان نہ بچا سکے۔“ ایک ڈاکٹر نے فاروق کے قریب آ کر اس سے انگریزی میں کہا لیکن فاروق اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے دونوں ڈاکٹر آگے پیچھے باہر نکل گئے۔ اب یہاں ان کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا لیکن دوسرا اسٹاف مستعد ہو گیا تھا۔ یہ اسپتال تھا اور یہاں اموات ایک معمول کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی اعتبار سے عملے کے افراد بھی ایک معمول ہی کی طرح غیر جذباتی انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ربن کی لاش کو سفید چادر میں لپیٹ دیا۔

”آپ میرے ساتھ باہر آئیں فاروق بھائی۔“ کیترائن جس کی اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، فاروق کا بازو تھام کر اسے باہر لے گئی۔ باہر اس نے فاروق کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے لیکن جو حالات نظر آرہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے آپ کو خود پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیک گراؤنڈ تو آپ ہی کو معلوم ہوگا ابھی زیادہ ڈنیل میں جانے کا نام بھی نہیں ہے۔ میں آپ کو بس یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ آپ کے لیے بھی خطرہ ہے۔ دادا کو جس حال میں ہسپتال لایا گیا تھا، وہ پولیس کیس بنتا ہے۔ پولیس یہاں آئی

جائیں اور مجھے اپنا پتا دے دیں۔ میں موقع دیکھ کر خود آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ کیتھرائن بہت رسائی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ فاروق کو اس کی بات سمجھ آنے لگی۔ واقعی اس کا آزاد رہنا بہت ضروری تھا۔ وہ آزاد رہتا تب ہی قاتلوں کو سزا دے سکتا تھا۔ اس نے کیتھرائن کو اس ہوٹل کا پتا بتایا جہاں وہ قیام پذیر تھا اور پوچھل دل اور پوچھل قدموں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اسد اللہ اپنے ایک وفادار ملازم کے ساتھ بمبئی پہنچے تھے۔ بمبئی میں ان کے چند احباب موجود تھے جن میں سے ڈی سوزانا می گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے تو ان کی بہت اچھی دوستی تھی اور بمبئی آمد کی صورت میں وہ ہمیشہ ڈی سوزا کے گھر ہی قیام کیا کرتے تھے۔ خود ڈی سوزا بھی کئی بار حیدر آباد آ کر ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکا تھا لیکن آج وہ اپنے اس اچھے دوست سے ملاقات کے بجائے اپنے پیارے بھتیجے کی تلاش میں بمبئی آئے تھے اور بے قراری کا یہ عالم تھا کہ وہ لمحوں میں اس تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس لیے اسٹیشن سے ٹیکسی میں سیدھے جولیٹ کے دیے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے جبکہ ان کا ملازم ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر موجود تھا۔ انہوں نے نوابین کے روایتی لباس کے بجائے پینٹ اور کوٹ والا انگریزی لباس زیب تن کر رکھا تھا تا کہ ان کی شخصیت زیادہ نمایاں نہ ہو۔ انگریزی لباس پہن کر گھومنے والے بمبئی میں بہترے لوگ تھے۔ انگریزوں کی ہندوستان سے روانگی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن وہ یہاں کی عوام پر وہ اثرات چھوڑ کر جا رہے تھے جو عوام خود بخود ہی حکمرانوں سے ایڈاپٹ کر لیتی ہے۔ حکمرانی کا اپنا ایک رعب و دبدبہ ہوتا ہے اور عوام کی اکثریت اس کے رعب میں آ کر دانستہ و نادانستہ حکمرانوں کے انداز و اطوار کی نقالی کرتی چلی جاتی ہے۔

ہندوستان کے اونچے طبقے نے خصوصاً انگریزوں کی تہذیب و تمدن کا بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا اور وہ انگریزی بولنے سے لے کر انگریزی لباس پہننے اور ان کے اطوار کا مظاہرہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اسد اللہ کو بھی اسی طبقے کے افراد میں سے تصور کیا جاسکتا تھا۔ ان کے بشرے سے البتہ خاندانی نجابت اور شان کا الگ ہی اظہار ہو رہا تھا اور ٹیکسی ڈرائیور بھی مودب سا ٹیکسی چلا رہا تھا۔ ملازم نے پہلے ہی اس سے بات کر لی تھی کہ اسے اس وقت تک ان کے

ساتھ رہنا ہوگا جب تک وہ چاہیں۔ بدلے میں اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دیا جائے گا۔ ایسا بار بار سواری کے انتظام سے بچنے کے لیے کیا گیا تھا۔ وہ اپنے دوست ڈی سوزا کو اطلاع دے کر آئے ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ گاڑی اور ڈرائیور کے ساتھ خود انہیں لینے کے لیے پہنچ جاتا لیکن اپنے نہایت نجی نوعیت کے دورے کی وجہ سے انہوں نے ڈی سوزا کو اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ان کے پاس جولیٹ کے اس گھر کی چابی موجود تھی جہاں وہ جوزفین اور جوزف کے سائے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ انہوں نے یہی طے کیا تھا کہ سیدھے اڈے پہنچنے کے بجائے جولیٹ کے گھر جائیں گے اور وہیں اڈے کے کرتا دھرتا ربن دادا سے ملاقات کریں گے۔ ملازم کو ان کے اس پروگرام کی خبر تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے کب اور کیا کرنا ہے۔ مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر ملازم نے اسد اللہ سے تھوڑی دیر ٹیکسی میں ہی تشریف رکھنے کی درخواست کی اور خود ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جولیٹ کے گھر کی طرف پیش قدمی کی۔ چابی اس کے پاس موجود تھی۔ تالا کھول کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ حسب توقع عرصے سے بند پڑے گھر میں گرد کی نہ نجی ہوئی تھی لیکن ہر شے سلیقے اور ترتیب سے رکھی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی مدد سے تیزی سے ایک کمرے کی جھاڑ پونچھ کر کے اسے اس لائق بنایا کہ اسد اللہ وہاں بیٹھ سکیں اور پھر انہیں یہاں لانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس مختصر دورانیے میں بھی علاقہ اسد اللہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ٹیکسی سے ذرا قاصطے پر کھڑے چند افراد قیمتی طور پر ان ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لیکن خود اسد اللہ سب سے بے نیاز پشت گاہ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہوئے تھے، اسی لیے کسی کی قریب آ کر بات کرنے کی بہت نہیں ہوئی تھی۔ ملازم سے البتہ للیٹا موسیٰ سمیت محلے کی ایک دو خواتین نے پکار کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں اور جولیٹ کے گھر میں کیا کر رہے ہیں لیکن ملازم نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اسد اللہ کے سر پر چھتری تان کر انہیں اس چھوٹے سے گھر کی طرف لے گیا تھا۔

آج دھوپ خاصی تیز تھی اور گرمی مزاج پوچھ رہی تھی، اسی لیے وہ اسد اللہ کو چھتری کے سائے میں مکان تک لے کر پہنچا تھا۔ منجانب آبادی والی تنگ سی گلی میں اب مزید متحسں چہروں کا اضافہ ہو چکا تھا اور ہر ایک جاننے کا خواہش مند تھا کہ جولیٹ کے گھر آنے والے لوگ کون

ہیں۔ وہ چابی سے تالا کھول کر گھر کے اندر آئے تھے اس لیے یہ طے تھا کہ مکان کی بچ جانے والی واحد مالکن کی رضامندی و اجازت سے یہاں آئے ہیں۔ اسد اللہ کی شاندار شخصیت کو دیکھتے ہوئے بھی وہ لوگ حیران تھے کہ آخر ایسی شان والے آدمی سے جولیٹ کا کیا تعلق ہے۔ اسد اللہ کو اندازہ تھا کہ ان کی یہاں آمد سے کھلی سی بچ گئی ہے اور اہل محلہ کو ان کے بارے میں جاننے کا جھجکاں ہے لیکن فی الحال ان کی توجہ لوگوں کی طرف نہیں تھی۔

یہاں آ کر خود ان کے جذبات میں ہلچل مچ گئی تھی۔ ایک طرف برسوں پہلے بچھڑنے والے بھتیجے سے ملنے کی بے قراری تھی تو دوسری طرف وہ اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہوتے ہی جوزفین کی خوشبو کے حصار میں گھر گئے تھے۔ وہ برسوں اس گھر میں رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھوں نے اس گھر کو جابجا سنوارا تھا۔ وہ بھلا اس گھر میں اس کی خوشبو کیسے محسوس نہیں کرتے۔ وہ تو اسے یہاں سے وہاں تک ہر جگہ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اس کے لباس کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ تک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جیسے اس گھر کے ایک ایک ذرے میں سمائی ہوئی تھی اور اسی لیے انہیں یہ چھوٹا سا گھر اپنی بڑی اور اونچی حویلی کے مقابلے میں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں ایک کم حیثیت لیکن مخلص شخص نے زندگی کے مشکل ترین وقت میں جوزفین کو پناہ دی تھی اور ساری زندگی اس کا دامن چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرتا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو ان کا جوزف سے رقابت کا تعلق بنا تھا لیکن وہ اپنے دل میں اس شخص کے لیے محبت اور ممنونیت محسوس کرتے تھے۔ وہ انہیں خود سے اونچے مرتبے پر محسوس ہوتا تھا کہ اس نے رسم محبت یوں نبھائی تھی کہ اپنی محبوب کی غلطی تک کو اپنا بنالیا تھا اور اسے کہیں رسوا نہیں ہونے دیا تھا۔ اگر وہ جوزفین کو نہ اپناتا تو وہ کیسے ذلت و بدنامی کے ساتھ جی پاتی اور کیسے وہ اپنی پیاری جولیٹ کو دیکھ پاتے۔ لہذا وہ اس گھر میں صرف جوزفین کو محسوس نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پیارے شخص کو بھی محسوس کر رہے تھے جس نے ان کی جوزفین اور جولیٹ کو زمانے کے مرد و گرم سے بچا کر اپنی محبت اور شفقت کی پناہ میں لے لیا تھا۔

”شریت نوش فرمائیے سرکار!“ وفادار ملازم انہیں کمرے میں آرام کرتا چھوڑ کر خود باورچی خانے میں جا گھسا تھا۔ ان کے سامان سفر میں خور و نوش کا بھی کافی سامان موجود تھا۔ گرمی کے پیش نظر ملازم نے اسٹیشن پر اترتے ہی

تھرماس میں برف بھر دالی تھی۔ اس لیے پہلی فرصت میں اسد اللہ کو صندل کا شریت بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسد اللہ کا اتنا وفادار اور قابل بھروسہ ملازم تھا کہ انہوں نے راستے میں ہی اسے اپنی یہاں آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ چنانچہ وہ قطعی حیران نہیں تھا کہ اسد اللہ نے ٹھہرنے کے لیے اپنے کسی دوست کے گھر یا اچھے ہوٹل کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں بھی ان کے آرام کا حتی الامکان خیال رکھ رہا تھا۔ اسد اللہ نے شریت نوش کیا۔ اس دوران اس نے غسل خانہ صاف کر کے ان کے لیے ایک ہلکا کرتہ پا جامہ اور تولیا و ہاپی لٹکا دیا۔ اسد اللہ نے ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائی تھی اور دلی بے قراری کے باوجود ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ طویل مسافت کے بعد غسل کیے بغیر کسی سے میل ملاقات کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ چھوٹے سے غسل خانے میں غسل کر کے باہر نکلے تو ملازم ان کا منتظر تھا۔

”محلے سے ایک آدمی آیا بیٹھا ہے سرکار! اسے محلے والوں نے بھیجے ہیں کہ ہم لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔“ ملازم نے انہیں کنگھا اور خوشبو وغیرہ پیش کرنے کے ساتھ اطلاع پہنچائی۔

”اچھی بات ہے۔ ان صاحب کو ہمارے پاس لے آؤ۔“ اسد اللہ نے اجازت دی۔ ربن دادا کے اڈے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خود انہیں بھی کسی ذریعے کی ضرورت تھی، اس لیے آنے والے ملاقاتی سے ملاقات کر لینا ہی مناسب تھا۔

”السلام علیکم۔“ سلام کی آواز پر وہ آنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سلام کا جواب دیتے ہوئے اخلاق سے اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔

”میرا نام غلام محمد ہے۔ اسی محلے کا رہائشی ہوں۔ محلے کے زیادہ تر افراد مجھے غلامو چاچا کہتے ہیں۔ جولیٹ جس کے مکان میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، مجھے غلامو چاچا ہی کہتی تھی۔ ہمارے اس محلے میں محلے داروں کو ان کی عمر وغیرہ کے اعتبار سے کسی نہ کسی رشتے سے مخاطب کیے جانے کا رواج ہے اور مختلف مذہب و رواج سے تعلق رکھنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو اپنا رشتے دار ہی تصور کرتے ہیں۔

جولیٹ بیٹی کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے مجھ سمیت تمام اہل محلہ پریشان تھے اور اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ہمارے پاس اس کے کسی عزیز یا رشتے دار کا اتنا پتا نہیں تھا اس لیے موثر طور پر تلاش نہیں کیا

لیے ممکن ہی نہ تھا کہ براہ راست کسی اڈے پر جا اترتے اور وہاں محب اللہ عرف فاروق کے بارے میں دریافت کرتے، اسی لیے یہ طریقہ کار اپنایا تھا۔

”جولیت بیٹی نے آپ کو رہن دادا کے بارے میں بالکل درست بتایا ہے۔ واقعی اس شخص نے مشکل وقت میں اہل محلہ سے زیادہ جولیت کا خیال رکھا تھا۔ صرف جولیت ہی کی بات نہیں ہے، اس محلے کے اور بھی لوگ اس کے احسان مند ہیں۔ کہنے کو وہ ایک اڈے کی چوکی پر بیٹھنے والا دادا ہے لیکن اس کے کردار و اخلاق کے سب قائل ہیں اور محلے میں کسی کو اس سے یا اس کے اڈے کے کسی مرد سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ اس سے ملاقات کرتے تو جان پاتے کہ اصل میں وہ کتنا شاندار انسان ہے لیکن افسوس کہ میں اس ملاقات کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں۔“ غلامو چاچا کے جواب نے اسد اللہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”کیوں؟“ بے ساختہ ہی ان کے ہونٹوں سے یک لفظی سوال پھسلا۔

”آج صبح سویرے ہی اڈے پر پولیس نے چھاپا مارا ہے اور اڈے کے زیادہ تر افراد کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ صرف چند لوگ جو اہل محلہ کے تعاون سے روپوش ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے، باقی بچے ہیں۔ ان افراد کی زبانی ہی ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ چھاپے کے وقت دادا اڈے پر موجود نہیں تھا۔ وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی تنہا کہیں چلا گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ کیوں اور کہاں گیا تھا، اس کی کسی کو خبر نہیں ہے لیکن اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فی الحال وہ اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ اڈے کو پولیس والوں نے بند کر کے باہر اپنا ایک سپاہی کھڑا کر دیا ہے۔ جس وقت آپ تشریف لائے، وہ سپاہی قریبی ہوٹل میں کھانا کھانے گیا ہوا تھا اس لیے آپ کی نظر میں نہیں آیا ہوگا، ورنہ وہ کوٹے والی عمارت ہی تو ہے اڈے کی۔“

غلامو چاچا کے جواب نے اسد اللہ کے دل کی دھڑکن بڑھا دی۔ متحدہ گرفتاریوں کی صورت میں امکان تھا کہ فاروق بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل ہو۔ فاروق یعنی محب اللہ۔ ان کے اعلیٰ نسب خاندان کا چشم و چراغ..... کیا ستم تھا کہ وہ بمبئی کے ایک اڈے پر اتنے برسوں سے زندگی گزار رہا تھا اور اب عین ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہو کر تھانے پہنچ چکا ہو۔ ان کی سات نسلوں میں بھی کسی کے ایسے حالات میں تھانے، کچہری کا منہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ان کا

جاسکا۔ آج آپ جس انداز سے یہاں تشریف لائے ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کا جولیت اور اس کے خاندان سے کوئی قریبی تعلق ہے اور ہم آپ سے اس کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ مجھے اہل محلہ نے اپنی نمائندگی کے لیے یہاں بھیجا ہے تاکہ میں آپ سے جولیت بیٹی کی خیر و عافیت معلوم کر کے سب کے لیے اطمینان حاصل کر سکوں۔“ غلامو چاچا یوں بھی بمبئی والوں سے ہٹ کر بہت قریب سے گفتگو کرتے تھے اور اس وقت تو ان کے مقابل اسد اللہ تھے اس لیے وہ اور بھی سنبھل کر غلطیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔

”جولیت کی زبانی ہم یہاں کے ماحول اور آپس کے خلوص سے واقف ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واقعی آپ لوگ ان کے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ یہ جولیت کی نادانی تھی کہ وہ آپ کو مطلع کیے بغیر ہمارے پاس آئیں۔ اصل میں وہ والدین کے علاوہ اپنے کسی عزیز یا رشتے دار سے واقف نہیں تھیں۔ ان پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ اس دنیا میں ان کے کچھ قریبی عزیز موجود ہیں تو وہ جذباتی ہوئیں اور عجلت میں ہم سے ملنے آئیں۔ بہر حال آپ اور دیگر اہل محلہ اطمینان رکھیے کہ وہ بالکل خیر و عافیت سے اور خوش و خرم ہیں، وہ یہاں آکر آپ سب لوگوں سے ملاقات کی خواہش مند تھیں لیکن آج کل ہندوستان کے جو حالات ہیں ان سے آپ بھی واقف ہی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ انہیں سفر پر اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوں۔ حالات کو تھوڑا سنبھلنے دیجیے پھر انشاء اللہ جولیت ضرور آپ سب سے ملاقات کے لیے تشریف لائیں گی۔“ اسد اللہ نے بچے تلے انداز میں غلامو چاچا کو ایک ساتھ ہی مکمل جواب دے ڈالا۔ اپنے جواب میں انہوں نے جولیت سے اپنے تعلق کی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ان کی بارعب شخصیت کے آگے غلامو چاچا کی ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ ان سے کوئی سوال کر سکیں۔ ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا پھر اسد اللہ ہی نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑا اور بولے۔

”جولیت کی زبانی ہمیں رہن دادا نامی ایک صاحب کا علم ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اہل محلہ کے علاوہ جوزف اور جوزفین کے انتقال کے بعد جس شخص نے ان کا بہت زیادہ خیال رکھا، وہ رہن دادا تھے۔ کیا ان صاحب سے ہماری ملاقات ممکن ہو سکے گی؟“ اسد اللہ بہت سلیقے سے اپنے اصل مدعا تک پہنچے۔ ان جیسی حیثیت کے شخص کے

انتظار بھی ایک امتحان تھا لیکن انہوں نے ساری زندگی امتحان ہی تو دیے تھے تو پھر ایک اور کمی۔

☆☆☆

ہوٹل کے کمرے میں بستر پر پڑے فاروق کا اندرون غم، غصے اور انتقام کی آگ سے تپ رہا تھا۔ ربن کا زخموں سے چور چور بدن اس کی نگاہوں سے ہٹا ہی نہیں تھا، بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ ربن نے اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں لیکن پھر بھی دل کو اس کے جانے کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بھلا ایسے کیسے جاسکتا تھا؟ وہ جو اتنا شاندار تھا، جس کی بہادری میں کوئی کلام نہیں تھا، جس کی پھرتی، مشاقی اور مہارت کی سب مثالیں دیتے تھے، جو وقت سے پہلے خطرے کو بھانپ لینے کی حس رکھتا تھا، جسے مخالف کو زیر کر لینے کا ہر ہنر آتا تھا، جو راہ چلتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا، جو دل اور دماغ دونوں پر حکمرانی کا گڑ جانتا تھا..... وہ موت کے ہاتھوں شکست سے دو چار ہوا تو بھلا کیسے ہوا تھا؟ ربن کے جانے نے اسے عجیب عالم خیر میں دھکیل رکھا تھا حالانکہ یہ فطرت کا طے شدہ اصول ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے اپنے مقررہ وقت پر لوٹ کر جانا ہی ہے لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا جانا ان کے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ربن بھی انہی نایاب لوگوں میں سے ایک تھا۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایسا قیمتی آدمی جس کے مرنے کی خبر اس کے پچھلوں کو ملتی تو آدھے بمبئی میں کہرام مچ جاتا، اس خاموشی سے چلا گیا تھا کہ سوائے فاروق کے کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے بھی کوئی ان دلچسپی ڈور باندھ کر ربن تک لے گئی تھی۔ یہ تعلق خاص ہی تھا جو قدرت نے خود اس کے ربن تک پہنچنے کا انتظام کر دیا تھا ورنہ وہ تو لندن کے لیے روانہ ہو چکا ہوتا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے خاص طور پر ربن کا زخم زخم وجود دکھایا گیا ہے اور اب اس پر قرض ہے کہ وہ ربن کے ہر زخم کا حساب لے۔

حساب اسے ہر حال میں لینا تھا لیکن پہلے وہ ربن کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے اسے کیتھرائن کی طرف سے سبزی دیکھائے جانے کا انتظار تھا۔ کیتھرائن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ربن کی لاش رازداری سے اس کے حوالے کرنے کا انتظام کر کے اسے اطلاع دے دے گی چنانچہ وہ کانٹوں پر لیٹا اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ غم نے اس کے جسم کو یوں نچوڑ لیا تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھنے کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ بستر پر لیٹے کتنی مدت

سب سے پیارا بھتیجا ایسی صورت حال سے دو چار ہو گیا تھا۔ رشتوں میں عدم توازن، اختیارات کے غلط استعمال اور اتنا پرستی نے مل کر یہ دن دکھایا تھا۔ اسد اللہ جو پہلے ہی اپنے دل پر بہت کچھ سہہ کر بیٹھے ہوئے تھے، پہلے دھچکے کے بعد خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے لہجے کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”ہم نے ربن دادا کے چہیتے ایک نوجوان فاروق کے بارے میں بھی سنا تھا۔ کیا گرفتار ہونے والوں میں وہ بھی شامل ہیں؟“

”نہیں۔ فاروق استاد گرفتار نہیں ہوا۔ اسے تو کچھ دنوں سے اڈے پر دیکھا ہی نہیں گیا۔ اصل میں وہ نوجوان اڈے کے دیگر لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسے ادھر ادھر بلا وجہ کبھی گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کبھی کبھار ہاتھ میں کتابیں لیے لائبریری آتا جاتا ہی دکھائی دیتا تھا۔ کسی حادثے میں زخمی ہو گیا تھا تو دادا نے ڈاکٹر کے مشورے پر اسے آرام کے لیے شملہ بھیج دیا تھا۔ کافی عرصہ وہ شملہ میں ہی رہا۔ واپس آنے کے بعد بھی کم کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ آج کل کہاں ہے، مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اڈے کے افراد کو علم ہو۔ جو لوگ گرفتار ہونے سے بچ گئے ہیں، ان میں سے ایک میرے گھر میں بھی موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سے آپ کی ملاقات کروا سکتا ہوں۔“ غلامو چاچا نے انہیں پیشکش کی۔ ان کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ فاروق تک پہنچنے کا اب یہی واحد راستہ نظر آ رہا تھا اس لیے انہیں ہامی بھرنا ہی تھی۔

”میں اس آدمی کو یہاں لے آتا ہوں۔ آپ اس سے ملاقات کر لیں پھر کھانا تناول کر لیجیے گا۔ میرے غریب خانے پر جو کچھ موجود ہے، آپ کے لیے حاضر کر دوں گا۔“ غلامو چاچا نے عاجزی سے کہا۔

”براہ مہربانی کھانے کا تکلف مت فرمائیے۔ کھانا ہم نے راستے میں ہی کھالیا تھا۔ ہمیں یہاں اپنے کچھ اہم کام نمٹانے ہیں، وہ نمٹالیں تو واپسی کا قصد کریں گے۔ آپ بس مذکورہ شخص سے ہماری ملاقات کروادیں، اسی کو ہم اپنی خاطر مدارت تصور کریں گے۔“ اسد اللہ کا انداز مہذب لیکن جتنی تھا۔ غلامو چاچا مزید اصرار کی جرأت بھی نہیں کر سکے اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے صرف اتنا بولے۔

”میں ابھی اسے حاضر کرتا ہوں، بس ذرا سا انتظار فرمائیے۔“ اسد اللہ جواب میں سر ہلا کر رہ گئے۔ ذرا سا

گزری اس کے پاس کوئی حساب نہیں تھا لیکن محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ صدیوں سے انتظار کی کیفیت میں ہے۔ خدا خدا کر کے یہ کڑا وقت گزرا اور دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز ابھری۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کیتھرائن کو ہونٹ پہنچ کر اسی بیرے سے ملنے کی ہدایت کی تھی جس نے اسے یہاں کمراد دلایا تھا۔ بیرے کو بھی اس نے کیتھرائن کی متوجہ آمد کے بارے میں آگاہ کر کے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی مہمان کی آمد کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں اسے قطعی ڈسٹرب نہ کیا جائے چنانچہ دستک کا ایک ہی مطلب تھا کہ کیتھرائن آچکی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کے خیال کی تائید بھی ہوگئی۔ کیتھرائن کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے اس نے پیچھے کھڑے بیرے کو کسی بھی قسم کے سوال جواب کا موقع دیے بغیر ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی دروازہ بند کر لیا۔ کیتھرائن کے ہاتھ میں نائیون کے تار سے بنی ہوئی ایک ڈھکن دار ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری میز پر رکھی اور خود بستر کے مقابل رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟ تم نے انتظام کیا؟ فاروق نے کھڑے کمرے ہی بے تابی سے پوچھا۔“

”آپ آرام سے بیٹھیں۔ میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔“ کیتھرائن نے نرمی سے کہتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بادل نا خواستہ اس کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا۔

”اب بتاؤ کیا بات ہے؟ تم نے دادا کو میرے حوالے کرنے کا انتظام کر لیا ہے نا؟“

”ریلیکس فاروق بھائی! میں بتا رہی ہوں۔ یہ اتنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے، اچھی بات یہ ہے کہ دادا کے کمرے میں ڈیوٹی دینے والے اسٹاف میں سے کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا ورنہ پولیس کو خبری کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ میں نے اس کام کے لیے ڈاکٹر پرکاش سے ریکویسٹ کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر پرکاش دادا کو بہت پسند کرتا تھا۔ اسے خود بھی دادا کی ڈھچک کا افسوس ہوا ہے اور وہ آپ کی پوزیشن سمجھتے ہوئے ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اس نے پراسس کیا ہے کہ وہ مردہ خانے کے کیئر ٹیکر کو آج رات لاش وہاں سے ٹرانسفر کرنے کا آرڈر دے دے گا لیکن لاش کو اسپتال سے لے جانے اور آگے کی ساری ذمہ داری آپ کی اپنی ہوگی۔ اب آپ سوچ لیں کہ آپ اس سلسلے میں کیا اور کیسے اریج کریں گے۔“

”جی ہاں، آج میں نے بہت بھاگ دوڑ کی ہے اور آپ کے لیے بہت سی کام کی باتیں جمع کر کے لائی ہوں لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ میں نے کل رات کے کھانے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا، اس لیے آتے ہوئے کھانا ساتھ لے کر آئی ہوں کہ آپ کے ساتھ مل کر کھالوں گی۔ آئی ایم شیور کہ آپ نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔“ وہ اٹھ کر میز پر رکھی اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹوکری کھول کر اس میں سے سامان نکالنے لگی۔

”تم کھا لو کھانا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ فاروق نے انکار کیا۔

”کھانا چھوڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو زندہ رہنا ہے اور دادا کے لیے کچھ کرنا ہے تو کھانا کھانا ہی پڑے گا۔“ کیتھرائن نے اپنے ہاتھوں کی حرکت روکے بغیر ایک جملے میں اس کے سامنے زمینی حقائق رکھ دیے تو وہ اس چھوٹی سی لڑکی کے سامنے مزید کچھ نہیں کہہ سکا۔ کھانا بہت سادہ تھا۔ ماش کی بھنی ہوئی دال، دہی کا رائیخا اور چپاتیاں۔ اس نے کھانا، کھانا شروع کیا تو پہلا لقمہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ کیتھرائن نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ اس نے مشکل سے پانی کے گھونٹ کے ساتھ نوالہ حلق سے نیچے اتارا۔ اس نے کڑوی روٹی کا ذکر سنا تھا اور آج اس حقیقت کو محسوس کر رہا تھا کہ کسی پیارے کے جانے کے بعد جو پہلا کھانا حلق سے نیچے اتارا جاتا ہے، وہ واقعی کتنا کڑوا لگتا ہے۔ وہ بہت کوشش کے باوجود بھی آدمی روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکا۔ کیتھرائن نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ حقیقتاً اس نے خود بھی بہت کم کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے تیزی سے برتن سمیٹ کر واپس ٹوکری میں رکھے اور فاروق کے سوال کے بغیر خود ہی اسے بتانے لگی۔

”شملہ میں اسٹے کے ٹائم میں میری گولو سے بہت باتیں ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے کچھ خبرز

فروری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ 94

پر سوار ہوتے ہوئے اس کا دل بہمنی کی زمین سے لپٹا جاتا تھا اور نگاہیں ہر سواپنے کسی پیارے کی صورت کو تلاشی تھیں۔ کتنی بار اسے لگا تھا کہ لوگوں کے ہجوم میں کہیں ربن بھی موجود ہے لیکن اس کی آنکھوں کو وہ دکھائی نہیں دیا تھا، ہاں دل نے اس کی موجودگی کے اشارے ضرور دیے تھے لیکن اس وقت وہ کہاں کچھ سمجھ سکا تھا۔ دل کی بے قراری، بے چینی اور اضطراب کو کوئی معنی دینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوا تھا اور جو معنی نکلے تھے، وہ تو اس کے دھیان میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ بھلا وہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ آج کا سورج ربن کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے طلوع ہوا ہے۔

”آپ میری بات سن رہے ہیں نا فاروق بھائی؟“ کیتھرائن نے اس کی تم صم کیفیت کو محسوس کیا تو باقاعدہ پکار کر اس سے پوچھا۔

”تم بولو کیتھی، میں سب سن رہا ہوں بلکہ تم یہ بتاؤ کہ کیا دینو، دادا پر حملہ کرنے والوں میں سے کسی کو پہچانتا تھا۔ وہ تانگے والا ہے اور ایسے لوگ اچھے برے بہت سے لوگوں سے واقف ہوتے ہیں۔“ فاروق نے اس سے ایک اہم سوال کیا جس پر کیتھرائن نے سرکواشات میں جنبش دی اور بولی۔

”دینو ان میں سے ایک ٹیکسی والے کو پہچانتا تھا۔ اس کا نام رمیش ہے۔ دینو کا کہنا تھا کہ رمیش کے بارے میں کبھی کچھ ایسا ویسا سننے کو نہیں ملا پر پتا نہیں کیوں وہ کچھ عجیب سا آدمی لگتا ہے۔ دینو نے دو نام اور بتائے ہیں۔ اس نے یہ نام دادا کی زبان سے سنے تھے۔ اس نے بتایا کہ پولیس آفیسر کو دادا نے راتھور کے نام سے پکارا تھا اور اس کے ساتھ جو کالا ساموٹا، ٹھکنا آدمی تھا اسے دادا مجھ بولتا تھا۔“ کیتھرائن اس کے لیے بڑی اہم اطلاعات ڈھونڈ کر لائی تھی۔ اسے اپنے جن دشمنوں پر شک تھا ان کے ناموں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ چند نام اور بھی سامنے آ گئے تھے اور یہ طے تھا کہ نیا پرانا کوئی بھی دشمن اب اس سے بچنے والا نہیں تھا۔ وہ لاکھ امن پسند، خون خرابے سے دور رہنے اور غنمو درگزر سے کام لینے والا آدمی تھا لیکن ربن دادا کا ایسا بہیمانہ قتل کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دادا کا خون معاف کر دیتا تو اس کی محبتوں کا قرض کیونکر ادا ہو پاتا۔ اس کے خیالات کا عکس اس کے چہرے پر بھی آرہا تھا اور کیتھرائن خوف زدہ نظروں سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کیا کرنے والے ہیں فاروق بھائی؟ کیا آپ ان لوگوں سے بدلہ لیں گے؟“ اس کا خوف سوال بن کر

کے نام بھی بتائے تھے۔ میرے کولیٹیا موسی کا نام یاد تھا۔ میں ہاسپٹل سے نکل کر موسی سے ملنے گئی تاکہ اس سے ساری سچویشن معلوم کروں۔ ادھر ان ایکس پیکٹڈ لی گولول گیا۔ بہت روتا تھا اور سب کو اس کی شہلی تمہیں اور دادا کو یاد کرتا تھا۔ میں نے سمجھا بجھا کر اسے چپ کر دیا اور راضی کیا کہ وہ ابھی موسی کے گھر پر ہی چھپا رہے۔ بعد میں، میں موقع دیکھ کر اسے فاروق بھائی سے ملوا دوں گی۔ موسی سے میری بات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اڈے کے تین چار لوگ اور ایسے ہیں جو مختلف گھروں میں چھپے ہوئے ہیں اور موقع دیکھ کر انہیں وہاں سے نکالا جاسکتا ہے لیکن پرابلم یہ ہے کہ وہ نکل کر کہاں جائیں گے اس لیے ابھی وہیں دیکھے ہوئے ہیں۔ گولول نے بتایا کہ آج کل دادا کی پولیس کے ساتھ ان بن چل رہی تھی، شاید اسی واسطے پولیس نے اڈے پر ریڈ کیا۔ دادا منہ اندھیرے اڈے سے نکل کر کدھر کو گیا تھا، اس کا گولول کو بھی نہیں معلوم تھا۔ میں ادھر سے نکل کر دینو تانگے والے کے پاس گئی۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا اور کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میرے بہت انسٹ کرنے پر اس نے بتایا کہ دادا کو اس نے بندرگاہ جانے والی روڈ سے اٹھایا تھا۔ انہوں نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ انہیں تین گاڑیوں نے گھیر لیا۔ ان میں سے دو ٹیکسیاں اور ایک پولیس کی گاڑی تھی۔ گھیرے جانے پر دادا نے دینو کو ادھر سے بھاگ جانے کو کہا لیکن دینو کا تانگا اور گھوڑا ادھر ہی تھا، تھوڑی اس کو جانکاری کی بھی لگن تھی اس لیے وہ زیادہ دور بھاگنے کے بجائے ایک جگہ چھپ کر سب دیکھتا رہا۔ اس نے بتایا کہ دادا اکیلا ہی درجن سے اوپر لوگوں سے بہت بریولی لڑا پر پولیس والے کی چلائی ہوئی گولی نے اسے ڈھا دیا۔ وہ گراتو پھر بزدلوں نے اسے چھاپ لیا اور بہت ظلم کیا۔ وہ شاید دادا کو مرا ہوا سمجھ کر چلے گئے تھے لیکن دینو نے چیک کیا تو اس کی سانس باقی تھی۔ اس نے ترس کھا کر اپنے تانگے میں اسے اسپتال پہنچا دیا۔“

کیتھرائن اسے تفصیلات سناتی جا رہی تھی اور اس کا ذہن ایک نکتے پر انک گیا تھا۔ ربن کو بندرگاہ والی روڈ سے دینو نے اٹھایا تھا۔ ربن اس وقت اس روڈ پر کیوں موجود تھا اس بات کو فاروق سمجھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً فاروق پر الوداعی نگاہ ڈالنے بندرگاہ پہنچا تھا۔ ملاقات یوں نہیں کی تھی کہ اسے اندیشہ ہوگا کہ کہیں اس کی وجہ سے فاروق نظروں میں نہ آجائے۔ ایسی محبت اور اتنی احتیاط ربن ہی کر سکتا تھا۔ فاروق کو بندرگاہ پر اپنی کیفیت بھی اچھی طرح یاد تھی۔ جہاز

ہونٹوں پر آگیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے فاروق نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا تو ایک ہل کے لیے وہ گڑبڑا گئی اور پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

”فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے، میں تو بس یہ کہہ سکتی ہوں کہ جو کرنا ہے دیکھ بھال کر کریں۔ مسلم کیونٹی کے لیے آج کل حالات پہلے ہی بہت سخت ہیں۔ مسلم آبادی پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ یہاں سے نکلنا چاہ رہے ہیں، انہیں نکلنے نہیں دیا جا رہا۔ پھر اڈے سے جانے پولیس کی کیا دشمنی ہو گئی ہے کہ یوں ایک دن میں انہوں نے سب الٹ ڈالا ہے۔ آپ بھی اڈے سے تعلق رکھتے ہیں، اگر آپ کے بارے میں پولیس کو خبر ہو گئی تو وہ لوگ آپ کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ کیتھرین بہت سمجھ دار لڑکی تھی اور فاروق کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے یہ نہیں بولی کہ انتقام کی راہ پر مت چلو لیکن اسے حالات کی نزاکت کا احساس ضرور دلا یا۔

”ڈونٹ وری کیتھی۔ میں خود بھی ان سب باتوں کو سمجھتا ہوں اور اندھا دھند کچھ نہیں کرنے والا۔ ابھی تو دیے بھی سب سے پہلے مجھے دادا کی تدفین کا انتظام کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی میں کچھ اور سوچوں گا۔“ فاروق نے اسے تسلی دی۔ اپنے رویتے سے وہ خود کو پُر سکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی بے تحاشا سرخ آنکھیں اس کے اندر دھکتے آتش فشاں کا عکس بنی ہوئی تھیں۔ اس آتش فشاں سے لاوا نکلتا تو کس کس کو جلا کر راکھ کرتا، ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

”کیا نام ہے آپ کا؟“ اسد اللہ نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے پوچھا۔

”وجے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ حالات بہت مخدوش تھے۔ اڈے پر پہلی بار اس طرح پولیس کا چھاپا پڑا تھا کہ پہلے سے تھانے سے کوئی خبر نہیں آئی تھی اور پولیس والے آنکھیں بالکل ماتھے پر رکھے وہاں پہنچے تھے۔ اڈے کی عمارت میں موجود افراد میں سے تو کم ہی کسی کو نکل بھاگنے کا موقع ملا تھا جو لوگ علاقے میں ادھر ادھر پہرہ دے رہے تھے، وہی نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پولیس سے براہ راست تصادم کی حکمت عملی سمجھی بھی اختیار نہیں کی گئی تھی اس لیے علاقے میں پولیس کی آمد کی خبر ہو جانے پر بھی پہرے

پر موجود لوگوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا اور حالات خراب ہوتے دیکھ کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ وجے اڈے کے قریب ہی موجود تھا اور ایک آڑ میں چھپ کر صورت حال کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ پولیس والے اڈے کے لوگوں سے بڑی بے دردی سے پیش آئے تھے۔ ان کی لاثمیاں اور بید بے دریغی برستے رہے تھے اور زبانیں فرائے سے گالیاں بک رہی تھیں۔ اڈے سے کئی لوگوں نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر پکڑے گئے۔ صرف چند ایک کے حصے میں ہی کامیابی آئی اور انہیں اہل محلہ نے اپنے گھروں کے دروازے کھول کر اپنی پناہ میں لے لیا۔

آڑ میں چھپے وجے کے پاس بھی کسی گھر میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ غلامو چاچا کے گھر کے قریب ہی چھپا ہوا تھا اس لیے ان کے کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔ چاچا نے اس سے کہا تھا کہ معاملہ ٹھنڈا ہونے تک وہ یہیں پڑا رہے۔ چارونا چارہ سے راضی ہونا پڑا اور اب چاچا ہی اس کے پاس یہ اطلاع لایا تھا کہ ایک نہایت معزز آدمی جو لیٹ کے قریبی عزیز کی حیثیت سے اس کے گھر میں آکر ٹھہرا ہے اور ربن دادا اور فاروق کو پوچھتا ہے۔ وہ دونوں تو موجود نہیں تھے اس لیے وہ آدمی اڈے کے کسی اور فرد سے ملنا چاہتا تھا۔ غلامو چاچا کی سفارش اور تجسس کی وجہ سے وہ اس ملاقاتی سے ملنے کے لیے راضی ہو گیا تھا اور منہ ایک چادر میں چھپائے غلامو چاچا کے ساتھ جو لیٹ کے گھر آ گیا تھا جہاں اسد اللہ اس کے منتظر تھے۔ ان کی شخصیت کی دلکشی اور وقار نے وجے کو بھی متاثر کیا لیکن ساتھ ہی وہ محتاط بھی تھا۔

”آپ کتنے عرصے سے ربن دادا کے ساتھ منسلک ہیں؟“ اسد اللہ نے اس سے دوسرا سوال کیا۔

”کیا ہیں؟“ وجے کی سمجھ میں لفظ ”منسلک“ نہیں آیا چنانچہ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ اس کے لیے تو اسد اللہ کے ”آپ جناب“ ہی ایک اجنبی چیز تھے اوپر سے ایسی مرصع اردو..... وہ تو شیشا ہی گیا۔

”ہمارا مطلب ہے کہ آپ کتنے عرصے سے دادا کے ساتھ رہ رہے ہیں؟“ اسد اللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بمبئی کے ایک غنڈے سے جن الفاظ میں گفتگو کر رہے ہیں، وہ اس کے لیے ناقابل فہم ہیں چنانچہ سادہ الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔

”جب سے ہوش سنبھالا ہے دادا کے تلووں میں ہی بڑے ہیں۔ تم کا بے کو پوچھتے ہو؟“ جواب دینے کے ساتھ

فروری 2017ء

96

سپینس ڈائجسٹ

وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی..... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرر بار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہر بار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیو پڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لٹی دل گداز داستان

بہت جلد

سینسٹریسٹ
ماہنامہ

کے صفحات پر ملا حظہ کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی وجہ نے ایک سوال بھی جڑ دیا۔

”اصل میں ہم فاروق کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں۔ آپ اتنے عرصے سے دادا کے ساتھ ہیں تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ فاروق کب اور کیسے اڈے پر پہنچے؟“ اسد اللہ نے بات آگے بڑھائی۔

”تم کا ہے کو پوچھتے ہو؟ تمہارا کیا سبب ہے فاروق بھائی سے؟“ وجہ نے اس بار بھی ان سوال کر ڈالا۔

”تعلق کی تلاش میں ہی تو یہاں تک آئے ہیں۔ جولینٹ نے ہمیں ان کے متعلق کچھ ایسی اطلاعات دی ہیں کہ ہمیں ان پر اپنے ایک بچھڑے ہوئے عزیز کا گمان ہوتا ہے۔ ہم اپنے اس گمان کی تصدیق کے لیے ہی یہاں تک آئے ہیں۔“ اسد اللہ کا لہجہ حسرت زدہ ہو گیا۔ ان کا انداز گفتگو وجہ کے لیے اب بھی اتنا سہل نہیں تھا لیکن اس نے مفہوم سمجھ لیا تھا اور اب غور سے اسد اللہ کو دیکھ رہا تھا۔ روشن چہرہ، واضح نقوش، اجلی ہوئی شفاف آنکھیں..... یہ سب اتنا اجنبی تو نہیں تھا۔ اسے اسد اللہ کے چہرے کے پیچھے سے فاروق کا چہرہ جھانکتا ہوا محسوس ہوا۔ چمکتی ہوئی فراخ روشن پیشانی جو فاروق کے کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق کی گواہی دیتی تھی، اس اجنبی مہمان سے کتنی مشابہ تھی۔

”آپ نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ وجہ نے ان کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسد اللہ نے اپنا سوال دہرایا۔

”بھئی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ سال پہلے دادا فاروق استاد کو اڈے پر لایا تھا۔ اس سے وہ ایک خاموش اور تھوڑا ڈرا سہا پندرہ سولہ سال کا لونڈا ہو گیا۔ دادا بولتا تھا اسے اس کے گھر واپس بھجوا دے گا پر فاروق استاد نے بھی زبان ہی نہیں کھولی کہ اس کے پچھلے کون ہیں بس پھر وہ ادھر اڈے پر ہی رہ گیا اور ہم سب نے اسے اپنا مان لیا۔ دادا کی تو جان ہے اس میں، بالکل سگے بیٹے کے مافق چاہتا ہے اسے۔“ وجہ جواب تک اختصار سے کام لے رہا تھا یکدم ہی کھل گیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات پر اسد اللہ کا دل پرجوش ہو کر دھڑکنے لگا۔ وقت اور فاروق کی عمر کا تعین ایسا تھا کہ خود بخود ہی اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ فاروق ہی اصل میں ان کا بچھڑا ہوا محب اللہ ہے۔

”کیا آپ اس تصویر کو دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں کہ یہ فاروق ہی ہے یا نہیں؟“ اسد اللہ نے قریب رکھے لفافے سے وہی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکال کر وجہ کے سامنے کی جس میں تیرہ چودہ سالہ فاروق کھیل کے لباس میں آنکھوں

میں چمک اور اعتماد لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وجہ نے تصویر ہاتھ میں لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور بے ساختہ ہی بولا۔

”بھئی تو ہے اپن کا فاروق استاد۔ اپنے کو اس کے لڑکپن کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ دادا جب اسے اڈے لایا تو وہ اس فوٹو سے سال دو سال ہی بڑا ہو گا۔“

”یہ فاروق نہیں۔ ہمارے خاندان کے چشم و چراغ، ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور محب اللہ ہیں۔ ہم ان کے حقیقی چچا ہیں اور انہی کی جستجو میں یہاں پہنچے ہیں۔ محب اللہ کے والدین اور دیگر اہل خانہ برسوں سے ان کے فراق میں تڑپ رہے ہیں۔ اللہ ہمیں بتائیے کہ محب اللہ کہاں ہیں؟ وہ برسوں پہلے ناراض ہو کر حویلی سے نکل گئے تھے، ہم انہیں منا کر واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ بہت برس گنوا دیے انہوں نے اپنی ضد میں۔ اب انہیں ہمارے ساتھ واپس اپنے اصل کی طرف جانا ہو گا۔ بتائیے کہاں ہیں محب اللہ؟“ اسد اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ وجہ کے روبرو انکشافات کرتے چلے گئے۔ ہونق سا وجہ پہلے تو اس شاندار شخص کو دیکھتا رہا جس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اٹھ آتی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ شخص اس سے کوئی جواب سننے کا منتظر ہے۔ اس کے پاس کوئی بہت خوش کن جواب نہیں تھا لیکن جواب تو دینا ہی تھا اس لیے پہلے ڈرا سا گلا کھٹکھٹا کر اچھر بولا۔

”فاروق استاد کو تو دادا نے لندن بھجوا دیا۔ اپنے کو زیادہ جانکاری نہیں پر اتنا پتا ہے کہ ادھر فاروق استاد کے لیے خطرہ تھا اس لیے دادا نے اسے لندن بھجوا دیا۔ وہ کب کیسے اور کس کے ساتھ گیا یہ سب باتیں دادا ہی جانتا ہے لیکن دادا خود گائب (غائب) ہے اور اپنے پر بڑا شخص سے پڑا ہے۔ آپ اوپر والے سے بنی کرو کہ یہ سے مل جائے تو اپن آپ کی کچھ مدد کر سکے گا۔“ فاروق کے محب اللہ ہونے کی تصدیق نے اسد اللہ کو جتنی خوشی بخشی تھی، وہ اس کی لندن روانگی کا سن کر ماند پڑ گئی۔ ساتھ ہی اس تشویش نے بھی گھیر لیا کہ جانے محب اللہ یہاں کن خطرناک کاموں میں ملوث رہا ہے کہ اسے جان بچا کر لندن بھاگنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ بہر حال سب باتوں پر یہ ایک تسلی بھاری تھی کہ ان کا محب اللہ زندہ ہے اور آدمی زندہ ہو تو ملنے کی امید بھی قائم رہتی ہے۔

”آپ ایسا کرو صاحب، ادھر اپن کو اپنا کوئی اتا پتا دے جاؤ۔ دادا سے مل کر اپنے کو جو بھی پتا لگے گا، اپن آپ کو اطلاع کر دیں گے یا اگر ابھی آپ ادھر ہی ہو تو تھوڑا انتظار

کر لیا لیکن تمہارا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ بمبئی آئے تھے تو سیدھے میرے گھر کیوں نہیں آئے؟“ ڈی سوزا نے ان سے شکوہ کیا لیکن وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس الجھن میں پڑ گئے کہ ڈی سوزا کو ان کے بمبئی آنے کی خبر کیسے ہو گئی۔ انہوں نے ڈی سوزا سے بھی یہ سوال کر ڈالا۔

”وہ.....“ ڈی سوزا تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔

”تمہارے بھائی جان معنی اللہ کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ تم بمبئی آئے ہوئے ہو۔“

”بھائی جان کا فون..... بھائی جان کا ٹیلی فون کیوں آیا؟“ وہ مزید حیران ہوئے اور دل کو بے چینی ہونے لگی کہ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا ہے ورنہ معنی اللہ بھی اس طرح انہیں فون نہیں کیا کرتے تھے۔

”تم آرام سے بیٹھ جاؤ اور کچھ کھانی لو پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“ ڈی سوزا نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ان کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں صوفے پر بٹھایا اور خود بھی ان کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ملازم چائے لا رہا ہوگا۔ تمہارے آنے کا سن کر میں نے پہلے ہی اسے چائے تیار کرنے کا کہہ دیا تھا۔“ اسد اللہ نے اس کی بات سن کر یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈی سوزا کی مہمان نوازی ایسی کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس کے انداز میں کوئی انوکھی بات تھی جو انہیں پریشان کر رہی تھی۔ چائے آئی تو اس کے ساتھ کئی لوازمات بھی موجود تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ڈی سوزا ابھدا اصرار انہیں کھلاتا پلاتا رہا۔ انہوں نے بھی اس کا دل رکھنے کے لیے تھوڑا بہت چکھ لیا۔ ان کا دل ویسے ہی عجیب سی کیفیت میں تھا۔ جوزفین کے گھر میں گزرے وقت نے ان کے زخموں کو ادھیڑ دیا تھا اس پر وہ محب اللہ سے ملاقات کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور اب ڈی سوزا کا اجنبی انداز انہیں بے چین کر رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔

”کیا بات ہے ڈی سوزا! آپ ہمیں پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟“ آخر کار انہوں نے براہ راست اس سے دریافت کر ڈالا۔ ان کے سوال پر ڈی سوزا لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا پھر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نہایت دل سوزی سے بولا۔

”آئی ایم سوری ٹو سے مائی فرینڈ! میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی نیوز نہیں ہے۔ میں تمہیں جو کچھ

کر لو۔ ادھر کے حالات ٹھیک ہوتے ہی آپ کو کوئی نہ کوئی خبر مل جائے گی۔“ وجے نے ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انہیں پیشکش کی۔ ایک تو اسد اللہ کی اپنی شخصیت پھر یہ انکشاف کہ وہ فاروق کے حقیقی چچا ہیں، وجے خود کو ان کا احترام کرنے پر مجبور پارہا تھا۔ عام حالات ہوتے تو وہ ابھی ربن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا اور اسد اللہ سے اس کی ملاقات کروا دیتا لیکن وہ خود یہاں پھنسا ہوا تھا، وہ بھلا ان کے لیے کیا کرتا۔

”ہم یہاں بمبئی میں اپنے ایک دوست کا پتا دے دیتے ہیں۔ کچھ دن ہم ان کے گھر قیام کریں گے۔ اس عرصے میں اگر آپ کی اپنے دادا سے ملاقات ہو جائے تو آپ ہمیں مطلع کر دیجیے گا۔ اگر ہم واپس بھی چلے گئے تو ہمارا دوست ہم سے رابطے کا انتظام کر دے گا۔“ اسد اللہ نے فی الفور وہاں سے اپنے دوست ڈی سوزا کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے وجے کو ہدایت دی۔

اس گھر میں آکر جہاں انہیں بہت اچھا لگا تھا، وہیں دل کو ایک بے قراری نے بھی گھیر لیا تھا۔ اس گھر کے چتے چتے سے جوزفین کی خوشبو آتی تھی اور یہاں کا سکون گواہی دیتا تھا کہ جوزفین نے بے شک یہاں من چاہی زندگی نہیں گزاری تھی لیکن یہاں اسے وہ سب ملا تھا جو اسد اللہ اپنی بڑی سی حویلی میں رہ کر بھی اسے نہ دے پائے تھے۔ یہ گھر جوزفین کی خوشبو ہی کا نہیں جوزف کی محبت، خلوص اور بے غرضی کا بھی امین تھا اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں رہ کر اس شخص کے معبد کدے میں دخل اندازی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ گھر جوزف کا تھا جہاں اس نے ساری زندگی جوزفین کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے گزاری تھی۔ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس گھر میں رہ کر جوزف کی روح کو بے چین کرتے چنانچہ انہوں نے ڈی سوزا کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وجے کے جاتے ہی انہوں نے اپنے ملازم شمس کو آواز دی اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ شمس تو تھا ہی حکم کا غلام۔ فوری طور پر جملہ سامان ٹیکسی میں منتقل کیا اور وہ لوگ ڈی سوزا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈی سوزا کے ملازم نے انہیں اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ اگلے ہی لمحے ڈی سوزا خود بھی وہاں پہنچ گیا اور بہت شدت سے انہیں پہنچ لیا۔ ہر ملاقات پر ڈی سوزا بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے گلے لگتا تھا لیکن آج اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسد اللہ کھٹک گئے۔

”کہاں تھے تم؟ میں نے سارے دوستوں سے پتا

بتانے جا رہا ہوں، تمہیں سننے کے لیے بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ بھائی جان کا فون آیا تھا، کیا انہوں نے کچھ کہا ہے؟“ ڈی سوزا کی تمہید نے اسد اللہ کی بے قراری کو بڑھا دیا۔

”بھائی جان صغی اللہ نے بہت بیڈ نیوز دی ہے۔“

ڈی سوزا نے اعتراف کیا۔

”کیسی نیوز؟“ اسد اللہ حق وق رہ گئے۔

”تمہیں معلوم ہے نا آج کل ہندوستان کے کیا حالات چل رہے ہیں۔ ہندوستان کا Division ہونے کو

ہے اور ہندو اور سکھ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح مسلمانوں کو اس جرم پر ڈسنے میں لگے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے رائٹس کے لیے آواز اٹھائی تو کیسے اٹھائی۔ مسلمان آبادیوں اور ہجرتی قافلوں پر ان کے بلوؤں کی خبر تمہیں بھی ہوگی۔ اس بار ان کی نفرت کی زد میں تمہارا خاندان اور حویلی آئی ہے۔ بھائی جان صغی اللہ بتا رہے تھے کہ رات کے

آخری پہر ہندو بلوائیوں نے حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ اور مسلح تھے۔ حویلی کے ملازمین اور مرد حضرات باوجود کوشش کے انہیں روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انسانی جانوں کے زیاں کے علاوہ بلوائیوں نے لوٹ مار بھی کی اور حویلی کو آگ بھی لگا دی۔ امداد آنے تک بہت زیادہ نقصان ہو گیا۔ بھائی جان صغی اللہ بتا رہے تھے

کہ وہ خود بھی بلوائیوں کے آتشیں اسلحے کی زد میں آ گئے تھے۔ مگر یہ خیر رہی ہے کہ گولی ان کے شانے پر لگی جس سے وہ چکرا کر گر گئے اور ان کی جان محفوظ رہی اب وہ نواب فراست بیگ کی حویلی میں پناہ گزیں ہیں اور تمہارے مشورے سے اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔“

ڈی سوزا نے اس المناک واقعے کی اطلاع محتاط الفاظ میں ان تک پہنچائی۔ صغی اللہ انہیں بتا چکے تھے کہ اس واقعے میں ان کے اوتھ بھی ندرت جہاں کے علاوہ حویلی کے جملہ افراد شہید ہو چکے ہیں لیکن وہ اسد اللہ کو یہ بات نہیں بتا سکا۔

اسد اللہ نے جتنی بات سنی تھی، اسے سن کر ہی منگ بیٹھے تھے۔ وہ جو اپنے خاندان کے لیے خوشیاں لینے بیٹھی آئے تھے، بھلا کیسے گمان کر سکتے تھے کہ ان کے پیچھے ان کے خاندان پر اتنی بڑی قیامت گزر جائے گی۔ ان کے خاندان کا حیدر آباد میں ایک نام، مقام اور مرتبہ تھا۔ لوگ ان کے خاندان کے افراد کو جھک کر سلام کرتے تھے اور اگر بیٹیاں کسی ضرورت کے تحت حویلی سے باہر نکلتی تھیں تو احتراماً ان کی

سواری کے راستے سے ہٹ جاتے تھے کہ پردہ دار بیٹیوں کو پریشان نہ ہونا پڑے اور ڈی سوزا انہیں بتا رہا تھا کہ بلوائی چادر و چادر یواری کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے زبردستی ان کی حویلی میں گھس گئے تھے اور وہاں کے درود یوار کو خاک و خون میں نہلادیا تھا۔ آخر کیسے ہوا تھا یہ سانحہ.....؟ کیسے کسی کی ہمت ہوئی تھی کہ ان کے خاندان کو نظر اٹھا کر دیکھتا۔ ان کا خاندان تو وہ خاندان تھا جہاں سے ہندو اور مسلمان بلا تخصیص اپنی حاجتیں پوری کرتے تھے۔ حویلی کے وسیع دسترخوان پر ہر مذہب، نسل اور ذات برادری کے لوگ اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ حاجت مندوں کو جھولیاں بھر بھر کر دینے والے بھلا کیسے سوچ سکتے تھے کہ جواب میں احسان فراموشی سے کام لیا جائے گا لیکن انہیں سوچنا چاہیے تھا۔ بدلتے ہوئے حالات اور ہوا کے رخ کو پہچاننا چاہیے تھا، خاص طور پر اس وقت جب نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان پر ہونے والے حملے میں زخمی ہونے کے بعد راجی ملک عدم ہوئے تھے۔ اس وقت اپنی سادہ لوحی میں ان لوگوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان کے خلاف ہونے والی انتقامی کارروائی میں اتفاقی طور پر زد میں آ گئے ہیں لیکن حقیقت تو اب کھل کر سامنے آرہی تھی۔ یہ صرف انتقام نہیں تھا۔ یہ وہ نفرت تھی جو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نہ جانے کتنے برسوں اور صدیوں سے پلٹی چلی آرہی تھی اور اب موقع دیکھ کر وہ اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔

”اسد اللہ..... تم ٹھیک تو ہو میرے دوست؟“ ڈی سوزا کی سنائی گئی خبر کے رد عمل میں انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا اور سوچوں کے گرداب میں گھرے بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ ڈی سوزا کو شک ہوا کہ وہ صدے سے سکتے میں تو نہیں چلے گئے ہیں، اس لیے انہیں آہستہ سے ہلاتے ہوئے پکارنے لگا۔

”ہم ٹھیک ہیں ڈی سوزا۔ تم بس ہم پر ایک احسان کرو۔ ہمارے واپس حیدر آباد جانے کا انتقام کر دو۔ مشکل کی ان گھڑیوں میں ہمارا بھائی جان کے شانہ بشانہ ہونا بہت ضروری ہے۔“ ڈی سوزا کی پکار پر انہوں نے خود کو مجتمع کرتے ہوئے یہ مشکل اس سے کہا۔

”فکر مت کرو میرے دوست۔ میں انتقام کر دیتا ہوں۔ تم اتنی دیر آرام کر لو۔“ ڈی سوزا نے ان سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ذرا دیر میں وہ ایک خواب گاہ کی تنہائی میں موجود تھے۔ آرام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اپنے پیاروں کا سوگ منانے کے لیے انہیں جو

تہائی درکار تھی، وہ میسر آگئی تھی۔ خاندان کے ایک ایک فرد کی صورت ان کے سامنے آ رہی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ ان کا سب کچھ تو حویلی میں تھا۔ عزیز ازجان لاڈلی بہن عالیہ جو جوزفین کو ان سے جدا کرنے کی سازش میں شریک ہونے کے باوجود بھی انہیں عزیز ہی رہی تھی، پیارا بھتیجا حبیب اللہ اور اس کی شوخ و چٹیل بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے جن کے دم سے حویلی میں رونق تھی۔ نمک خوار ملازمین، غاصب ہونے کے باوجود محترم پچھی ندرت جہاں اور ان کی بیٹی عشرت جہاں، اکلوتی بڑی بھابی اور سب سے بڑھ کر ان کی جوزفین کی نشانی جو لیٹ جسے انہوں نے ابھی تک دل بھر کر نہیں دیکھا تھا اور جس کے لیے ان کے دل میں جانے کتنے ارمان، کتنی آرزوئیں تھیں۔ ڈی سوزانے انہیں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی وہ پوچھنے کی ہمت کر سکے تھے کہ ان میں سے کون بچا تھا اور کون کون اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ چاہتے تو نواب فراست بیگ کی حویلی میں صفی اللہ سے رابطہ کر کے ان سے اس بارے میں پوچھ سکتے تھے لیکن انہوں نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ ابھی خود کو خوش گمانی اور امید کی کیفیت میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ اللہ سے ان سب کی سلامتی اور حفاظت کی دعا مانگنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ خود کو یہ دھوکا دینا چاہتے تھے کہ جب وہ حیدر آباد پہنچ کر نواب فراست بیگ کی حویلی میں داخل ہوں گے تو انہیں اپنے خاندان کے ہر فرد کی صورت دیکھنے کو مل جائے گی۔ ان کے پیارے انہیں زندہ سلامت مل جاتے تو درود پوار اور مال و زر لٹ جانے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ وہ ایک آس، ایک امید کے سہارے حیدر آباد تک کا سفر طے کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا لیکن آنسو تھے کہ سبل رواں کی طرح ان کی آنکھوں سے نکلتے ہی چلے جا رہے تھے اور وہ اس سبل رواں کے آگے بند باندھنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

”کیسے..... یہ میں ہوں فاروق۔“ اس نے نزدیک پہنچ کر اس کی الجھن دور کی تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اب اس نے خود بھی ذرا غور سے دیکھنے پر فاروق کو شناخت کر لیا تھا۔ شناخت ہو جانے کے بعد اس نے بہت تیزی سے باقی کارروائی پوری کر دئی اور منٹوں میں ربن کا سفید چادر میں لپٹا وجود فاروق کی دین میں منتقل کر دیا گیا۔ کیسٹھرائن خود بھی فاروق کے ساتھ والی نشست پر آ بیٹھی۔ اسے معلوم تھا کہ ان مشکل حالات میں فاروق بالکل تنہا ہے۔ غم میں تنہائی آدمی کو مزید توڑ دیتی ہے اور وہ اسے ٹوٹے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے اسے ڈھارس دینے کے لیے اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ فاروق نے واقعی اس کی موجودگی سے حوصلہ محسوس کیا تھا اور اب اس قبرستان کی طرف گامزن تھا جہاں وہ ربن کی قبر کی تیاری کے انتظامات پہلے ہی کروا چکا تھا۔ قبرستان سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ فاروق نے گاڑی کو مسجد کے دروازے کے سامنے روکا تو

پیساً سب کچھ نہیں ہوتا لیکن پیسے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ربن نے فاروق کے لندن میں قیام کے خیال سے روانگی سے قبل اسے بھاری رقم بھجووائی تھی۔ سفر میں چوری چکاری کے خدشات کے پیش نظر فاروق نے وہ رقم اپنے لباس میں ہی محفوظ کر لی تھی اور اب وہی رقم اس کے کام آ رہی تھی۔ اس رقم کے سہارے وہ ہوٹل میں کمرہ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اسے یہاں کمرہ دلانے والا میرا رقم کے عوض دل و جان سے اس کی ہر خدمت انجام دے رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے فاروق کو وہ جملہ سامان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



تک آیا تھا، وہ معاملے کو مشکوک بنا رہا تھا۔ بھلا جنازے بھی بوں خفیہ طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ فاروق نے ان کی اس گفتگو کو محسوس کر لیا اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔

”ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر بہت حق ہوتا ہے امام صاحب! میرے بھائی صاحب بہت تکلیف دہ حالات میں اس دنیا سے گئے ہیں۔ میں ان کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن میرا فرض بتا ہے کہ میں شرعی طریقے سے ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کا اہتمام کروں۔ مہربانی فرما کر آپ اس فرض کی ادائیگی میں میری مدد فرمائیں۔“ اس بار امام صاحب انکار نہیں کر سکے اور آہستہ سے بولے۔

”آپ میت کو مسجد کے اندر لے آئیں۔ ہم غسل کا انتظام کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ جو خاتون ہیں انہیں آپ میرے حجرے میں بھیج سکتے ہیں۔ وہاں میری بیوی موجود ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ فاروق بولا۔ پہلے اس نے کیتھرائن کو امام صاحب کے حجرے میں بھیجا پھر موذن کی مدد سے ربن کی میت کو مسجد کے محن میں لے گیا۔ موذن نے ہی غسل کے لیے پانی وغیرہ گرم کیا۔ کفن فاروق اپنے ساتھ لایا تھا جسے اس عرصے میں امام صاحب نے تیار کر دیا۔ فاروق ان کی مدد کرواتا رہا۔ غسل کے لیے ربن کی لاش کو لکڑی کے تختے پر لٹا کر چادر کھولی گئی تو اس کی حالت دیکھ کر امام صاحب اور موذن دنگ رہ گئے۔ فاروق پہلے ہی اس کی یہ حالت دیکھ چکا تھا لیکن دوبارہ دیکھنے پر اس کے دل کو نئے سرے سے دھچکا لگا۔

”یا اللہ! کون تھے وہ درندے جنہوں نے ایک انسان کو اس حال تک پہنچا دیا۔“ امام صاحب نے صدمے سے کہا۔ فاروق انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ انہوں نے بھی مزید کچھ نہیں کہا اور غسل دینے کا آغاز کر دیا۔ ربن کے دریدہ جسم کو غسل دیے جانے کے دوران فاروق ان لوگوں کی مدد کرواتا رہا اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے رہے۔ غیر ہونے کے باوجود امام صاحب اور موذن تک کے آنسو نکل آئے کہ انسانی جسم کی یہ حالت انہوں نے بھی کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ غسل کے بعد تکفین کا مرحلہ طے ہوا تو کیتھرائن کو بھی ربن کے آخری دیدار کے لیے بلایا گیا۔ وہ خود پر بہت ضبط کیے ہوئے تھی کہ اسے فاروق کا خیال تھا لیکن آخری دیدار کرتے ہوئے اس کا ضبط بھی جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ فاروق نے اس لیے بڑے بھائی کا کردار ادا کرتے ہوئے

کیتھرائن نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دادا کے غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے لیے یہاں آنا ضروری تھا۔“ فاروق نے اسے بتایا اور گاڑی سے اتر کر مسجد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے پر دروازہ کھل گیا اور ایک بارش جوان آدمی نمودار ہوا۔

”بے وقت زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس مسجد کے امام ہیں؟“ فاروق نے اس سے معذرت کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی نہیں۔ میں موذن ہوں۔ امام صاحب اپنے حجرے میں سو رہے ہیں۔“ رات گئے جگائے جانے کے باوجود موذن نے شائستگی سے جواب دیا حالانکہ وہ ایک سکھ کو مسجد کے دروازے پر دیکھ کر تھوڑا سا حیران بھی نظر آ رہا تھا۔

”امام صاحب کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ انہیں جگا دیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے اور میں ان ہی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ فاروق نے اس سے درخواست کی۔

”اچھا آپ انتظار کریں۔ میں انہیں جگاتا ہوں۔“ موذن چند لمحے تذبذب میں رہا پھر فاروق کے التجائیہ انداز پر ہنسی بکھینچ گیا۔ اس دوران وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے سامنے کھڑی گاڑی میں صرف ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور کہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فاروق کالب و لہجہ بھی اس کے سکھ حلیے سے مختلف تھا اور موذن کے دل میں تجسس سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اندر گیا اور دو منٹ میں ہی امام صاحب کو جگا کر لے آیا۔ امام صاحب آئے تو ان سے بھی فاروق نے بے وقت جگائے جانے پر معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں ہے جناب، آپ اپنا مسئلہ بتائیں۔ آپ مجھے بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“ امام صاحب نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔

”میں اس وقت اپنے بڑے بھائی کے غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے لیے آپ کی مدد کا محتاج ہوں، ان کا انتقال ایسے حالات میں ہوا ہے کہ مجھے یہ سب خفیہ طور پر کرنا پڑ رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس مشکل وقت میں اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ دیں گے۔“ فاروق نے کرب کے عالم میں ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”اوہ..... تو آپ مسلمان ہیں؟“

”جی ہاں۔ میرا نام فاروق ہے اور میں نے ضرورتاً سکھ کا روپ دھارا ہے۔“ فاروق نے انہیں بتایا تو وہ گفتگو میں جھٹکا نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے فاروق جس انداز میں ان

بس فاروق کے دل پر ہی بیت رہی تھی اور وہ ربن کی قبر کی گیلی منی اپنی منی میں تھا سے یہ عہد کر رہا تھا کہ ربن کو اس انجام سے دو چار کرنے والے کسی فرد کو روئے زمین پر چین سے نہیں جینے دے گا۔ اپنے دل کا چین واپس پانے کا اس کے پاس یہی ایک واحد راستہ تھا۔

☆☆☆

”تم جو کچھ کرنے جا رہی ہو اس پر اچھی طرح سوچ لیا ہے ناسسٹر؟ اپن تمہارے واسطے وری ہے، اپن کو لگتا ہے تم خود کو ڈنجر میں ڈالنے جا رہا ہے۔ تم اپن کو ادھر اپنے ساتھ لایا ہے پر اپن سے کچھ بولنا نہیں ہے۔ تم ایک بار اس کا نیم بولو، اپن اسے سیدھا اوپر نہیں پہنچایا تو پھر تم بولنا۔“ مضطرب سا جانی جولیٹ کے عقب میں گھڑا مسلسل اس کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولیٹ نے اس وقت گلابی رنگ کی پیاری ساڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ ساڑی ان کپڑوں میں شامل تھی جو وہ حویلی سے اپنے ساتھ لے کر چلی تھی۔ حویلی سے نکلے ہوئے وہ اپنی منزل کا تعین کر چکی تھی اس لیے اسی حساب سے تیاری بھی کی تھی۔ اس کے سامان میں میک اپ کا سامان بھی موجود تھا جو اس نے اپنے چہرے پر استعمال کر ڈالا تھا۔ بالوں کو بیچ کی مانگ نکال کر کھینچ کر جوڑے کی شکل دی گئی تھی اور مانگ میں ہندو عورتوں کی طرح سینہ دور لگا رکھا تھا۔ گلے میں ہندو عورتوں ہی کی طرح سیاہ موتیوں والا ایک ہار تھا جسے ہندو منگل سوتر بولتے ہیں لیکن اس نے حیدر آباد کی مسلمان بیاہتا خواتین میں بھی اسی قسم کے ہار کا رواج دیکھا تھا جسے وہاں ”لچھا“ یا ”سیاہ پوت“ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کے گلے میں موجود ہار وہی حیدر آبادی ”لچھا“ تھا جو منگل سوتر کا کام انجام دے رہا تھا۔ ہاتھوں میں اس نے پھولوں کے گہنے پہن رکھے تھے اور ہاتھ پیروں پر سرخ سرخ مہندی بھی بڑی نمایاں تھی۔ پھولوں اور مہندی کا انتظام اس کے کہنے پر جانی نے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد کیا تھا اور اب خود ہی پریشان تھا کہ اس ساری تیاری کے پیچھے جولیٹ کا کیا مقصد ہے۔ اس کی پریشانی سے بے نیاز جولیٹ اپنی تیاری کو دیوار گیر آئینے میں جانچنے میں مصروف تھی۔ اس سارے اہتمام نے اس کی شخصیت کو کافی حد تک بدل دیا تھا اور وہ بمبئی کی باسی جولیٹ کے بجائے ایک بیاہتا ہندو عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر اس نے گلابی ساڑی کا آئٹل اس طرح اپنے سر پر ڈالا کہ چہرے پر تھوڑا گھونگٹ سا آگیا۔ اس گھونگٹ نے اس کی شناخت کو مزید چھپا لیا اور وہ

اسے حوصلہ دیا اور واپس امام صاحب کے حجرے تک چھوڑ آیا۔ واپس آکر وہ خود بے خود ساربن کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ شخص اس کے دل میں کیا مقام رکھتا تھا اور اس کے یوں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے سے اس کا دل کیسے پارہ پارہ ہو رہا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ یہ خیال کہ اب وہ بھی اس حجرے کو نہیں دیکھ سکے گا، اس کے دل کو مٹی میں سمجھ لیتا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور دیکھتا جا رہا تھا اس کا دل اس چہرے سے نظریں ہٹانے کو راضی نہیں ہوتا تھا۔ امام صاحب اور موذن بہت دیر تک اس کی یہ کیفیت دیکھتے رہے پھر امام صاحب نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دینے والے انداز میں ہلکا سا داؤڈالا اور ملاحت سے کہا۔

”میت کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے میں مزید تاخیر مناسب نہیں ہے۔ آئیے نماز جنازہ ادا کر لی جائے۔“ انہوں نے ہی ربن کے چہرے کو کفن میں ڈھانپا اور فاروق لڑکھڑاتے قدموں سے نماز جنازہ کے لیے کھڑا ہوا۔ وہ شخص جو بمبئی پر راج کرتا تھا، جس کے ایک اشارے پر بے شمار لوگ اپنی جانیں نچھاور کر سکتے تھے، جو بہتوں کو اپنے سکوں سے زیادہ پیارا تھا، اس کی نماز جنازہ اس طرح پڑھی جا رہی تھی کہ اس میں کل تین افراد شامل تھے۔ نماز جنازہ کے بعد جنازے کو کاندھ اپنے کے لیے چوتھے شخص کی کمی کو دور کرنے کے لیے فاروق گورکن کو بلا کر لایا اور یوں رب نواز عرف ربن وادا اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچا۔ وہ جو کہتا تھا کہ جیتے جی بمبئی کو نہیں چھوڑے گا اور بمبئی کی مٹی میں ہی دفن ہونا پسند کرے گا، آج اپنے قول میں سچا ثابت ہوا تھا۔ بمبئی کی زمین پر اس کے لیے جگہ کم ہو گئی تھی لیکن بمبئی کی مٹی کے نیچے اس کو پناہ مل گئی تھی۔

میت قبر میں اتارنے کے بعد جب مٹی ڈال کر قبر کو بند کر دیا گیا تو اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ شاید ایک عظیم انسان کے اس انجام پر عظیم آسمان بھی رو پڑا تھا اور ربن کے سارے چاہنے والوں کے حصے کے آنسو خود برسارہا تھا۔ آسمان کے آنسوؤں میں فاروق کے آنسو گھل مل گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم سے گزر رہا تھا اور دلاسا دینے کے لیے وہ لوگ اس کے قریب نہیں تھے جو اس دکھ کو بالکل ویسا ہی محسوس کر پاتے جیسا وہ محسوس کر رہا تھا۔ رامو، وجے، جانی، سجو، گولو..... ایک لمبی فہرست تھی اس شخص کے چاہنے والوں کی جو آج یوں چوری چھپے بمبئی کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ زمین آسمان کو کھا گئی تھی اور عجب تھا کہ قیامت برپا نہیں ہوئی۔ جو قیامت تھی وہ

اعتماد سے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے... جانی سے بولی۔

”سواری کا انتظام تو تم نے کر ہی لیا ہوگا برادر۔ اب ہمیں چلنا چاہیے، دیر ہو رہی ہے۔“

”اپن تم سے جو بولا تم وہ کیوں نہیں سنا سسٹرا! اپن کو اس..... کا نام بولو اور پھر دیکھو اپن کیا کرتا ہے۔“ جانی نے جولیٹ کے نام معلوم مجرم کو ایک بار پھر بڑی سی گالی دیتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا تو جولیٹ اس بار اسے نظر انداز کرنے کے بجائے اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”تم نے خود بولا تھا تا برادر کہ دادا نے تم سے زیادہ مجھ سے اس آدمی کا نام پوچھا تھا لیکن میں نے اس کا نام نہیں بتایا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ دادا اپنی پاؤں رکھتا ہے کہ اس آدمی کو اس کے انجام تک پہنچا دے لیکن میں خود اس شخص کو اپنے ہاتھوں اس کے ایڑ تک پہنچانا چاہتی ہوں کہ اس کے بغیر میرے انتقام کی آگ نہیں بجھ سکتی۔ تم بس اس حد تک میرا ساتھ دو جتنا میں تم سے بولتی ہوں۔“

”بٹ سسٹرا یہ تمہارے لیے ڈنجرس ہوگا۔“ جانی اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

”کیا ڈنجرس ہوگا برادر! انسان کو سب سے زیادہ خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے اور میں تو کب کی مرچلی ہوں۔ یہ جو تم میری زندہ لاش کو چلتے پھرتے دیکھتے ہو، یہ تو بس اس لیے باقی ہے کہ میں اپنے مجرم کو اپنے ہاتھوں سے سزا دے سکوں۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو میری روح بھی ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔“ جولیٹ کا لہجہ رقت آمیز ہو گیا تو جانی بھی ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”او کے سسٹرا! جیسا تم چاہو ویسا ہی ہوگا۔ اپن اب صرف تمہارا آرڈر سنے گا۔“

”تو پھر چلیں۔“ جولیٹ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو جانی نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پہلے کمرے اور پھر ہوٹل سے باہر نکلے۔ باہر ایک تانگا ان کا منتظر تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر جولیٹ نے کوچوان کو دلدار آغا کے علاقے کا نام بتایا۔ وہ اتنی تیاری سے وہاں اس لیے جا رہی تھی کہ آغا گھر پر ہوا تو اتنی بنی سنوری عورت سے ملاقات کو رد ہی نہیں کر سکے گا۔ وہ جتنا عیاش طبع آدمی تھا اس کے لیے ایسی عورت کو واپس لوٹانا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک بار آغا کے روبرو ہو جاتی تو پھر اس کے سینے میں چاقو اتارنا زیادہ مشکل

نہیں تھا۔ جانی سے ہمیشی میں حاصل کردہ چاقو آج بھی اس کے پاس تھا اور اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ بس ایک بار آغا سے ملاقات ہونا شرط تھی۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچنے کے بعد اس نے کوچوان کو دلدار آغا کی کوٹھی پر چلنے کا حکم دیا تو جانی چونک گیا۔

”تم میرے ساتھ اندر نہیں جاؤ گے برادر۔ اگر میں اندر پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تو تم یہاں سے واپس چلے جانا اور بعد میں حالات کے مطابق جو ٹھیک لگے وہ کرنا۔“ تانگا بڑے سے گیٹ کے سامنے رکا تو اس نے سرگوشی میں جانی کو ہدایت دی اور خود نیچے اتر گئی۔ گیٹ پر موجود دربان نے ایک بنی سنوری عورت کو گھونٹ کاڑھے قریب آتے دیکھا تو چونکا ہو گیا۔

”کس نوں ملنا ہے بی بی!“ گھونٹ کے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دربان نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے لہجے میں دریافت کیا۔

”آغا صاحب اندر ہیں؟“ جولیٹ نے قدرے گنوار عورتوں کے لب و لہجے میں سوال کیا۔

”کون آغا صاحب بھیلے لو گے۔ ادھر تو کوئی آغا صاحب نہیں ہوندے ہیں۔“ دربان کے جواب نے جولیٹ کو دنگ کر دیا اور وہ بے چینی سے بولی۔

”میں دلدار آغا صاحب کو پوچھتی ہوں۔ وہ ادھر ہی تو رہتے ہیں۔“

”ہن تو ادھرنوں اڑ گئے سی۔ یہ کوٹھی میرے مالک نے خرید لی ہے۔“ دربان نے اسے اطلاع دی پھر ہمدردی سے پوچھنے لگا۔

”آپ انہاں نوں رشتے دار ہو؟“

”ہاں، پردہ کدھر گئے؟“ جولیٹ نے مختصر جواب دے کر بہ عجلت دوسرا سوال داغا۔

”گئے تو لندن تھے پر سنا ہے ادھر سے کراچی نکل گئے۔ اپنی بیگم نوں بھی ادھر کراچی ہی بلوایا ہے انہوں نے۔“ دربان کی دی اطلاع اس کے اعصاب پر بم بن کر گری۔ وہ اتنی تیاری سے یہاں آئی تھی لیکن اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی اور آغا ایک بار پھر اس کی گرفت میں آتے آتے چکنی پھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

فروری 2017ء

سپیس ڈائجسٹ



شکست

تنویر ریاض

بڑے سے بڑا وکیل شاید دنیاوی عدالتوں میں مشکل سے مشکل کیس بھی مختلف تدبیریں کر کے جیت سکتا ہے مگر جب معاملہ دل کا ہو تو یہ کیس بدقسمتی سے دنیا کی کسی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ اس میں مدعی بھی خود اور گواہ بھی خود ہونے کے باوجود وہ فیصلہ محبوب کے ہاتھ میں دینے پر مجبور ہوتا ہے کہ جو مزاج یار میں آئے اور... اس نے بھی یہی کیا۔

عمر میں نمایاں فرق ہونے کے باوجود کیو پڈ کے تیر کی شرارت

اوکلاہوما کے جنوب مشرق میں واقع ہسنگ اسپرنگ ریزورٹ اینڈ کیسینو کی وسیع و عریض عمارت کسی ایسے قلعے کے مانند نظر آرہی تھی جس کا محاصرہ کیا گیا ہو۔ غصے میں بھرے ہوئے مظاہرین صدر دروازے پر کھڑے ہوئے۔

نعرے لگا رہے تھے اور ٹی وی رپورٹرز نے بھی اپنے کیمروں کا رخ اسی طرف کر رکھا تھا جیسے انہیں کوئی بڑی خبر ملنے والی ہو۔ مظاہرین نے اپنے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے جن پر کچھ اس قسم کے نعرے درج تھے "ہراساں

فروری 2017ء

105

سپینس ڈائجسٹ

کرنا قابلِ نفرت جرم ہے، ہار جو کی چھٹی کرو، عورتوں کے خلاف جرائم بند کرو۔“ وغیرہ وغیرہ۔

میں یہاں اپنے دوست ٹومی کی مدد کے لیے آیا تھا جس کا پورا نام تھامس ہار جو تھا اور وہ اس کیسینو میں نیجر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کی منگنی باس کی بیٹی سے ہو گئی تھی لیکن کیسینو کی دو ملازماؤں نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ انہیں جنسی طور پر ہراساں کر رہا ہے اور یہ خبر کسی طرح پریس تک پہنچ گئی۔ اس وقت ٹومی کو شدت سے ایک دوست اور وکیل کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں یہ دونوں کام بخوبی کر سکتا تھا۔

میں گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا اور مظاہرین کی نظروں سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ آدھے راستے میں ایک چچ میری سماعت سے ٹکرانی اور میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔ ”مسٹر کروکیٹ..... مسٹر کروکیٹ۔“

میں اپنے شہر سے ساڑھے تین سو میل دور تھا اور سمجھ رہا تھا کہ یہاں مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ عقب میں اونچی ایڑیوں کی آوازیں کر رہی تھیں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میمنفس ٹی وی کی رپورٹر تھی۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم اپنے شہر سے ایک طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہو۔“

”اور تم بھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب میں اوکلاہوما ٹی وی سے منسلک ہو گئی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسٹر ہار جو دراصل نیسی کے ہی رہنے والے تھے اور میرا خیال ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ کیا تم اس کی نمائندگی کر رہے ہو؟“

”ٹومی ہار جو اخلاقی اعتبار سے اچھے کردار کا مالک ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم کانگریس کے انتخابات میں حصہ لے رہے ہو۔ تمہاری خواتین ووٹرز کیا سوچیں گی؟“ رپورٹر نے پوچھا۔ ”کیا تم ایک جنسی مجرم کا دفاع کرنے کا الزام برداشت کر سکو گے؟“

”میں جزوقتی سیاست دان ہو سکتا ہوں لیکن کل وقتی وکیل اور دوست ہوں۔ ٹومی نے کوئی جرم نہیں کیا اور میں یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔“

میں آگے بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ”کیا یہ عجیب بات نہیں مسٹر کروکیٹ کہ تم ایک مشہور انڈین فائٹر کی نسل سے ہو اور پیدائشی امریکن کا

دفاع کر کے اپنے سیاسی مستقبل کو داؤ پر لگا رہے ہو؟“ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں کیسینو کی لابی میں داخل ہوا، ایک آدمی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی کیونکہ میں نے ٹومی کو ہائی اسکول کے بعد نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ اپنے باپ جیسا ہی ہوگا۔ خوش وضع، خوش لباس، ترشے ہوئے سیاہ بال، نیلی آنکھیں اور چہرے پر مسکراہٹ لیکن میرے سامنے جو مخلوق کھڑی تھی اس نے بغیر استری کا بلیر رکوٹ اور گلچے رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے بال اچھے ہوئے اور آنکھوں سے وحشت فک رہی تھی۔ اس کے کوٹ پر نام کا ٹیگ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”تھامس ہار جو کیسینو نیجر۔“

”میں نے تمہیں رپورٹر سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ مجھے بچالو گے؟“ اس کی سانسوں سے شراب کی بو آرہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اگلے قدموں اپنی کارنگ جاؤں اور نیسی کے لیے روانہ ہو جاؤں لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارے پاس کچھ شراب بچی ہے؟ لگتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

ایک گھنٹے بعد ٹومی کا حلیہ بدل چکا تھا۔ شیو اور غسل کرنے کے بعد اس نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا اور کافی سے شغل کرنے لگا۔ اسکول کے زمانے میں ہم دونوں کی ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ پرنسپل کے سامنے پیشی ہوتی تھی جہاں ہمیں اپنی شرارتوں پر ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کبھی کبھی جرمانے کی سزا بھی سنائی جاتی۔ کمپنی کی سی ای او مار یا اونچی کے دفتر میں بیٹھے ہم دونوں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس بار میں بے قصور تھا اور امید تھی کہ ٹومی کے لیے بھی ایسا ہی کہہ سکوں گا۔

ٹومی مجھے پورا قصہ سنا چکا تھا۔ دو خواتین ویٹرس نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ ان کی ملازمت جاری رکھنے کے عوض ان سے جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے ہر جانے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ اسے ملازمت سے ہی نہیں بلکہ اوکلاہوما سے بھی نکال دیا جائے اور آئندہ کے لیے اس پر کیسینو کی ملازمت کے دروازے مستقل طور پر بند ہو جائیں۔ گوکہ ٹومی کے لیے کیریئر کا خاتمہ بھی تکلیف دہ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ وہ

اپنی منگیتر سے بچھڑ جانے کے خیال سے خوفزدہ تھا۔ میں خود اس تجربے سے گزر چکا تھا لہذا میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

میرے ذہن میں ماریا کا تصور ایک عمر رسیدہ اور کرخت چہرے والی عورت کا تھا لیکن وہ اس کے برعکس نکلی۔ وہ دلکش جبرے اور جاذب نظر جسمانی خطوط والی ایک پرکشش عورت تھی۔ اس کی چال میں ایسی روانی تھی جیسے پانی پر تیر رہی ہو اور اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی جگمگاہٹ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس کے ہند سے کچھ زائد تھی لیکن اس کا چہرہ بے داغ اور بال مکمل طور پر سیاہ تھے۔

میں اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا اور جب میں نے مصافحہ کے لیے اس کا ہاتھ تھامنا تو یوں لگا جیسے وقت اپنی جگہ پر رک گیا ہو اور میری آنکھوں میں اس کی تصویر منجمد ہو گئی ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب ٹومی نے میرا بازو دباتے ہوئے کان میں سرگوشی کی۔ ”ڈیوی! تم ٹھیک تو ہو؟ میں تمہیں ٹینا سے ملوانا چاہ رہا ہوں۔“

میں نے ماریا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔ ”ڈیوی کرو کیٹ!“ ٹومی نے کہا۔ ”اور یہ ٹینا ادھی ہے۔ میری.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس لڑکی کے چہرے کے نقوش بھی ماریا سے ملتے جلتے تھے۔ وہ عمر میں اس سے کہیں کم لیکن اس جیسی ہی خوب صورت تھی۔

سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ماریا بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ٹومی نے تمہیں اس خطرناک صورت حال کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہوگا؟“

میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری قوت گویا کی سلب ہو گئی۔ ٹومی نے کہا۔ ”میں بتا چکا ہوں اور یہ بھی کہ یہ سب بکواس ہے۔“

”بکواس ہے یا نہیں۔“ ماریا نے کہا۔ ”اس نے مجھے ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ کل صبح وہ لڑکیاں تمہارے اور کیسینو کے خلاف باقاعدہ الزامات عائد کر دیں گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ہمارا کاروبار ویسے ہی مندا ہے اور مقدمہ دائر ہونے کی صورت میں بالکل ہی تباہ ہو جائے گا۔ اس مسئلے کو آج رات تک حل ہو جانا چاہیے۔“

ٹومی نے کہا۔ ”ڈیوی جانتا ہے کہ میں نے ایسا کچھ

نہیں کیا اور وہ اسے ثابت کر دے گا۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا تو ماریا بولی۔ ”کیا یہ درست ہے مسٹر کرو کیٹ؟“

میں نے اپنی قوت ارادی کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“ ماریا بولی۔ ”تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ہے ٹومی لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ مسٹر کرو کیٹ کچھ زیادہ پراعتماد نظر نہیں آتے۔ شاید یہ ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور اپنی بیٹی پر اچنتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”کہ تم اپنے جرم کا اعتراف کر لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

باہمی گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ میں کہنی کے وکیل کی موجودگی میں ان دو لڑکیوں سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ ماریا نے مجھے ٹومی کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے دس بجے تک کا وقت دیا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو ماریا اپنی کرسی سے اٹھی اور ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اپنے سینے میں ایک ٹیس سی محسوس کی اور کرسی پر بیٹھ کر پلکیں جھپکنے لگا جیسے ساری دنیا کی روشنیاں گل ہو گئی ہوں۔

لابی میں آنے کے بعد بھی میں لڑکھڑاہا تھا جیسے ابھی خواب سے بیدار ہوا ہوں۔ ٹومی اور ٹینا نے مجھے ناراضگی سے دیکھا۔ ٹینا بولی۔ ”یہ تمہارا دوست ہے..... نامی گرامی وکیل جس سے تم نے بہت زیادہ امید لگا رکھی ہے؟ تم نے دیکھا کہ میری ماں پر کس طرح اس کی رال ٹپک رہی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے دم اٹھا کر بھونکتا کیوں نہیں شروع کیا۔“

ٹومی نے کہا۔ ”تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“ ”یہ بھی تمہاری طرح نظرباز ہے، اس پر کیسے بھروسہ کر سکتی ہوں۔“ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

ٹومی مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پتھر کے ہو گئے ہو؟“

میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے دیکھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔

”جانے دو۔“ وہ بے زار ہوتے ہوئے بولا۔ ”میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟“

”بالکل.....“ میں نے کہا۔ ”تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ ان لڑکیوں سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟“

”یہ شروعات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں

سجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہیں نشے کی عادت ہے تو میں کسی دوسرے وکیل کا انتظام کر لیتا ہوں۔“
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا لیکن وہ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک چوڑے جڑے اور چھوٹے بالوں والا شخص میرے پاس آیا۔ اس کے بلیر کوٹ پر جوزف اینڈریو سکیورٹی چیف کا بیج لگا ہوا تھا۔ ”تم یقیناً کروکیٹ ہی ہو۔“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہیں متاثرہ لڑکیوں تک لے جاؤں۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بے رخی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم نہیں سمجھتے کہ ان لڑکیوں نے الزام تراشی کی ہے؟“

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”تم ہمارے دوست ہو؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کتنا بدکردار شخص ہے۔ تمہارا کام اسے بچانا ہے لیکن ہمیں اسے بے گناہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔“

یہ کہہ کر وہ لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے پانچویں منزل کا بٹن دبا یا اور میری طرف دیکھ کر بے ہودہ انداز میں مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اسے لڑکیوں کو ہراساں کرتے دیکھا ہے؟“

”نہیں لیکن میری بھی آنکھیں ہیں۔ وہ جس طرح ان لڑکیوں کو دیکھتا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے جیسے وہ بریڈ پٹ ہے۔“ اس کی بات میرے دل کو نہیں لگی۔ میں جس دوست کو جانتا تھا وہ ایسا نہیں ہو سکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسکول سے نکلنے کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ اس لیے وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو ان ہونے کے بعد اس میں کیا تبدیلی آئی ہوگی۔

جوزف نے لفٹ سے باہر آتے ہوئے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ ”کمرانمبر پانچ سو تیرہ..... تمہاری بائیں جانب تیسرا دروازہ ہے۔ امید ہے کہ وہ لڑکیاں تمہاری نظروں سے محفوظ رہیں گی۔“

ایک چپوگم چپاتی سرخ بالوں والی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس نے سفید بلاؤز اور براؤن رنگ کا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بلاؤز پر کیسینو کا لوگو بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے میرے وزن کا اندازہ لگا رہی ہو پھر بولی۔ ”اگر تمہارا تعلق روم سروس سے ہے تو فی

الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“
 ”ڈیوٹی کروکیٹ!“ میں نے کہا۔ ”میں ٹوی کا وکیل ہوں۔“
 ”دیکھنے میں تو وکیل نہیں لگتے۔“
 ”تمہارے خیال میں ایک وکیل کو کیسا ہونا چاہیے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ منہ نیڑھا کرتے ہوئے بولی۔ ”خالی آنکھیں، مصنوعی مسکراہٹ، پیٹ نکلا ہوا..... تم تو ایک سیاست دان لگ رہے ہو۔“

اندر سے ایک آواز آئی۔ ”اسے اندر آنے دو۔“ وہ سرخ بالوں والی لڑکی مجھے اندر لے گئی۔ وہاں ایک موٹا شخص سرمئی سوٹ اور زرد رنگی لگائے اپنے گلاس میں مشروب انڈیل رہا تھا۔ اس کا حلیہ ہو بہو وہی تھا جو لڑکی نے بیان کیا تھا۔ خالی آنکھیں، مصنوعی مسکراہٹ اور نکلی ہوئی توند۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تعارف کروانے کی ضرورت نہیں۔ تم ہرمن ہو۔ کمپنی کے وکیل۔“

”بہت خوب۔“ اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہارجونے کیا کیا ہے۔ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ وہ جتنی جلدی قبول کر لے، اس کے حق میں بہتر ہوگا۔“

”یعنی تم قائل ہو چکے ہو کہ وہ مجرم ہے؟“
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ایک اسکینڈل میں ملوث ہو چکا ہے۔ اسے جانا ہی ہوگا۔“

ایک سنہرے بالوں والی لڑکی لیونگ روم سے برآمد ہوئی۔ اس نے بھی سرخ بالوں والی لڑکی جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ ہرمن نے کہا۔ ”تم ان لڑکیوں سے جو چاہو بات کر سکتے ہو لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہارجو بری طرح پھنس چکا ہے۔“

دونوں لڑکیاں اس بات پر قائم رہیں کہ ٹوی نے ان سے ایک سے زائد مرتبہ ناجائز مطالبات کیے تھے۔ انہوں نے حلفیہ کہا کہ وہ صرف ایک محفوظ جگہ چاہتی ہیں جہاں انہیں جنسی طور پر ہراساں نہ کیا جائے اور ٹوی کا بھی وجود نہ ہو۔ انہوں نے بار بار اس کی مبینہ ترغیب کا ذکر مزے لے لے کر کیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خفا ہونے کے بجائے خوش ہوئی تھیں لیکن میں ان کی کہانی کو جھٹلا نہیں سکا۔

ماریا زوچلنے مجھ سے اس انٹرویو کی رپورٹ مانگی تھی چنانچہ مجھے ایک بار پھر اس کے دفتر جانا پڑا اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ حسب عادت اپنی گردن میں پڑے ہوئے نیگلکس سے کھیل رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دستک دیتا، اس کا

کچھ اور لوگ بھی تمہیں پسند کرتے ہوں گے اور اس الزام تراشی سے ان کی امیدیں روشن ہوگئی ہوں گی۔

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ کسی رقیب نے میری محبت میں جھٹلا ہو کر ان لڑکیوں کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا۔“ ٹینا کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے خیال سے متفق نہیں ہے۔ ”یہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ اب میں چلتی ہوں، مجھے اپنے کام پر جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مزید کوئی بات کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

ٹومی مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اب میں پچھتا رہا ہوں کہ کیسینو میں ملازمت کیوں کی؟“

”میں اس کی وجہ جانتا چاہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”میرے باپ کا تعلق اوکلاہوما سے تھا اور انہوں نے کئی برس کیسینو میں ملازمت کی۔ وہ اچھے دن تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کا سفر فخر سے بلند کر سکوں گا لیکن میرے منجر بننے سے پہلے ہی وہ انتقال کر گئے۔“

”کوئی بات نہیں۔ تم اب بھی ان کی روح کو خوش کر سکتے ہو۔“ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

اگلے دو گھنٹے میں نے کیسینو کے عملے کے لوگوں سے گفتگو کرنے میں گزار دیے۔ ان میں خادماہیں، باورچی، دربان اور ڈیسک کلرک وغیرہ شامل تھے۔ شروع میں وہ کچھ محتاط تھے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ ٹومی کے مفاد میں کام کر رہا ہوں تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھے اور انہوں نے بتایا کہ وہ ایک مہربان اور دوسروں کا خیال رکھنے والا باس ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ٹینا کے ممکنہ امیدوار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہنچکا رہے تھے لیکن جب میں نے انہیں معاملے کی نزاکت سے آگاہ کیا تو انہوں نے دو نام لیے۔ پہلے نمبر پر ہرمن اور دوسرے نمبر پر سیکورٹی چیف جوزف تھا۔ یہی دونوں نام ٹومی کے جانشین کے طور پر بھی سامنے آئے۔ کوئی بھی ان کے حق میں نہیں تھا بلکہ کئی ایک نے کہا کہ وہ جوزف کے ساتھ کام کرنے کے بجائے ملازمت چھوڑنے کو ترجیح دیں گے۔

کسی نے بھی ان لڑکیوں کے بارے میں بات کرنے میں ہنچکا ہٹ محسوس نہیں کی۔ وہ دونوں گزشتہ دو ماہ کے دوران آئی تھیں اور ان میں سے کسی نے بھی انہیں دوست بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو یونانی نسل کہتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اسٹاف کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی تھیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے ایک دوسرے کو جانتی تھیں یا نہیں لیکن باورچی نے بتایا کہ اب وہ

لاکٹ کھل گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ کندھے جھک گئے اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ یوں لگا جیسے میری آنکھیں بھی بھیگ گئی ہوں۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر دیکھوں کہ اس لاکٹ میں کیا ہے لیکن یہ بداخلاقی ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ٹومی کی تلاش میں چل دیا۔

وہ مجھے کاک ٹیل لاؤنج میں مل گیا۔ غالباً اس وقت بھی وہ ٹینا کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ان لڑکیوں سے بات چیت کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔ ”وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں تو انہیں جانتا تک نہیں پھر وہ میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔“

”جب دو عورتیں ایک ہی بات کریں تو جیت انہی کی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں۔“

”انہوں نے پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا۔“ ٹینا بولی۔ ”کیا اس سے ان کی کہانی زیادہ قابل یقین معلوم نہیں ہوتی؟“

کوئی بھی اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ دیوار پر لگی ہوئی ٹی وی اسکرین پر غصے میں بھرے ہوئے مظاہرین نعرے لگاتے اور پلے کارڈز لہراتے مارچ کر رہے تھے۔ ایک پلے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ”ہار جو کو جانا ہوگا۔“ اسے پڑھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”ہم اسے ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مقصد ٹومی کو راستے سے ہٹانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس لیے؟ وہ اس پر مقدمہ چلانے یا سزا دینے کا مطالبہ کیوں نہیں کر رہے؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ ٹومی نے کہا۔

”ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تمہاری نوکری چلی جاتی ہے تو اس کا فائدہ کسے ہوگا؟“

ٹومی نے بھوئیں اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ کوئی میری جگہ لینا چاہتا ہے؟“

”یہ ممکن ہے، تمہارے بعد کس کا نمبر ہے؟“

ٹومی بولا۔ ”میں نہیں جانتا۔ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”اس کے علاوہ ایک اور امکان بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ کسی کی نظر ملازمت کے بجائے تمہاری منگیت پر ہو۔“

ٹینا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”میں نہیں کہہ رہا کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی ہے۔“ میں نے لفظوں کے انتخاب میں احتیاط کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ

ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔
 میں کیشیر کی کھڑکی کے پاس کاؤنٹر پر جھکا عملے کے
 ایک نوجوان رکن سے سوالات کر رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا
 چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ہلکانے لگا۔ اس کی نظریں میرے
 کندھوں کے عقب میں جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے مڑ کر
 دیکھا۔ وہاں ماریا اوچی دونوں ہاتھ کو پشت پر رکھے ہوئی
 تھی اور اس کی آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس روپ میں
 بھی وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میرا دل چاہا گھٹنوں کے بل
 جھک کر اس کے ہاتھ چوم لوں۔

ماریا نے کہا۔ ”تم کس کی اجازت سے میرے
 ملازمین سے سوالات کر رہے ہو؟“
 میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے
 خاموش رہا۔
 ”میں کام کے دوران تمہیں لوگوں کو ڈسٹرب کرنے
 کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ اس نے قدرے نرم لہجے میں
 کہا جیسے اسے میری پریشانی کا احساس ہو گیا ہو۔
 ”تم اپنا کام جاری رکھ سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔
 ”بشرطیکہ تم اپنے آپ کو ان ملازمین تک محدود رکھو جو اس
 وقت ڈیوٹی پر نہیں ہیں لیکن تمہیں جلدی کرنا ہوگی۔“ وہ اپنی
 گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا وقت ختم ہونے میں چار
 گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔“
 میں نے شکر یہ ادا کرنے کے انداز میں سر کو خم کیا تو وہ
 بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ کسی نہ کسی طرح ختم
 جائے اور تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

اس کے الفاظ سن کر مجھے شدید صدمہ ہوا۔ گوکہ
 میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا
 لیکن مجھے اس سے اس سنگ دلی کی بھی توقع نہیں تھی۔ میں
 اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، اچانک میرے عقب سے
 ایک آواز آئی۔ ”تم پھر میری ماں پر بری نظر ڈال رہے ہو
 مسٹر کروکیٹ؟“
 میں نے مڑ کر دیکھا، وہاں ٹینا کھڑی ہوئی تھی۔ ایک
 پچھلی مسکراہٹ میرے چہرے پر دوڑ گئی۔ میں اس سے
 بحث نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔
 ماریا نے ملازمین سے انٹرویو کرنے کے لیے ایک
 پرائیویٹ میننگ روم دے دیا تھا جس سے مجھے یہ خوش بھی
 ہوئی کہ شاید وہ مجھ پر مہربان ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی
 مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوئی تھی کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور
 میں ابھی تک کوئی نئی بات معلوم نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے میں

نے جلدی جلدی سوالات کرنا شروع کر دیے۔ ”کہا تم نے
 کبھی ٹومی ہار جو کو اپنے یا کسی اور کے بارے میں محسوس
 کتے ہوئے سنا؟“
 میں ذہنی طور پر اس سوال کا جواب نفی میں سننے کے
 لیے تیار تھا لیکن دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ میں نے نظر
 اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنی کرسی میں دھنسی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی
 عمر چالیس سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہاں سے پہلے وہ اوکلا ہوما
 سٹی کے ایک کیمینو میں خادمہ کے طور پر بارہ سال تک کام
 کر چکی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم میرا سوال سمجھ گئی ہو؟“
 اس کا منہ آدھا کھل گیا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک
 رہی تھی۔

”تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے
 کہا۔ ”میں صرف سچ جانتا چاہتا ہوں۔“
 ”ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ مسٹر ٹون۔ ایسی باتیں کہی
 ہیں کہ اگر ان لڑکیوں نے ان کا کہنا نہ مانا تو وہ انہیں
 ملازمت سے فارغ کر دیں گے۔“

میں یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ میں اس سے کچھ اور نہیں
 پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن میرے ذہن سے یہ بات چپک گئی۔
 اس لیے مختلف زاویوں سے یہ سوال کیا لیکن ہر بار ایک ہی
 جواب ملا۔ مجھے لگا کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہی ہے
 لیکن میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

”تم نے معاملات مزید خراب کر دیے۔“ ماریا
 اوچی نے کہا۔ ہم اس کے دفتر میں واپس آ چکے تھے۔ ٹومی
 میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور ٹینا دیوار سے لگی ہوئی کھڑی
 تھی۔ وہ تینوں مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میری غلطی
 سے یہ تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوئی ہو۔

”وہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔“ ٹومی نے کہا۔
 ”تم نے غور نہیں کیا ٹینا؟“

ٹینا نے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں
 کی۔ ماریا اپنے لاکٹ سے کھیلنے ہوئے بولی۔ ”وہ جھوٹ
 کیوں بولے گی؟“

”اسے مجھ سے کوئی عداوت ہوگی۔“ ٹومی نے کہا۔
 ”یا کسی نے اس سے یہ بات کہلوائی ہے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میرے تین ملازمین جھوٹ بول
 رہے ہیں؟“

”یہ بکواس ہے۔“ ٹومی نے کہا۔ ”تم سب میرے
 خلاف ہو۔ یہاں تک کہ تم بھی ڈیوی۔ تم میرا دفاع کرنے

میں نے مڑ کر دیکھا، وہاں ٹینا کھڑی ہوئی تھی۔ ایک
 پچھلی مسکراہٹ میرے چہرے پر دوڑ گئی۔ میں اس سے
 بحث نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔

ماریا نے ملازمین سے انٹرویو کرنے کے لیے ایک
 پرائیویٹ میننگ روم دے دیا تھا جس سے مجھے یہ خوش بھی
 ہوئی کہ شاید وہ مجھ پر مہربان ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی
 مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوئی تھی کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور
 میں ابھی تک کوئی نئی بات معلوم نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے میں

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ فروری 2017ء

کی جھلکیاں

ماہنامہ

قلم کے اس سپاہی کا احوال جس نے ادب کے
ہر میدان کو سر کیا لیکن قسمت کے آگے ہار گیا

اس عالمی کریکٹر کا زندگی نامہ جسے
ہر موز پر قسمت نے دھوکا دیا

ہرمن مولا

پاکستانی فلموں کا ایک باکمال کردار جو
ہر فن مولا تھا لیکن وہ پاکستانی نہیں ہے

ماں جانا

اس دوشیزہ کے بھائی نے جو کیا وہی اس
کے سامنے آیا، ایک سبق بھری سچ بیانی

ناسور

ایک ناقابل فراموش طویل سرگزشت
جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

(الکر) کے ہزاروں

اور بھی بہت کچھ، ڈھیر سارے دلچسپ
قصے، تاریخی واقعات اور سچ بیانیاں

فروری 2017ء

سے زیادہ میری ہونے والی ساس کو متاثر کرنے میں دلچسپی
رکھتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیٹا کو آخری بار دیکھا اور آندھی
طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہذا میں
ٹھہرتا ہوا اس جانب چلا گیا جہاں جوا ہو رہا تھا۔ میری نظر
سکیورٹی چیف جوزف پر گئی جو سامنے والی دیوار کے پاس
کھڑا ہوا تھا۔ میں ایک میز کے پاس سے گزرا۔ وہاں ایک
جواری ڈیلر کے ساتھ مل کر کھلے عام بے ایمانی کر رہا تھا۔
میں وہاں رک کر انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے دیکھ کر وہ
دونوں بے چین ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ جوزف ضرور اس
جانب متوجہ ہوگا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ اکڑ کر چلتا
ہوا وہاں تک آیا اور بولا۔ "کیا یہاں کوئی مسئلہ ہے؟"

میں نے اس کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے
کہا۔ "تم نے یہاں کمرے لگا رکھے ہیں۔ تمہیں اس میز کی فائدہ
ضرور دیکھنی چاہیے۔ یہ دونوں کھلی بے ایمانی کر رہے ہیں۔"
جوزف منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اب تم مجھے بتاؤ گے
کہ میں اپنا کام کس طرح کروں؟"

"کسی نہ کسی کو تو بتانا ہی ہوگا۔" میں نے اسے
چھیڑنے کے لیے کہا۔

اچانک ہی عقب سے ایک آواز آئی۔ "یہاں کیا
ہو رہا ہے؟"

میں اس آواز کو پہچانتا تھا اور وہ بھی مجھے جوزف کی
طرح ناپسند تھا۔ مہنی کا وکیل ہرمن میرے قریب آ رہا تھا۔
اس کے ساتھ ٹیٹا اوچی بھی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں
ایک منصوبہ آیا۔
"تم بالکل صحیح وقت پر آئے۔" میں نے ہرمن سے
کہا۔ "میں اسٹیوارڈ کو نئی ترتیب کے بارے میں بتانے ہی
والا تھا۔"

جوزف نے کہا۔ "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"
"نومی کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔" میں نے کہا۔
"گو کہ اس نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا ہے لیکن اس
کے لیے صورت حال مایوس کن ہے۔ اسی لیے ماریا نے مجھے
اس کی جگہ پر رکھ لیا ہے۔"

ہرمن پہن کر شذر رہ گیا اور جوزف پہلے سے بھی
زیادہ غصے میں نظر آنے لگا۔ جب وہ حیران و پریشان ایک
دوسرے کو دیکھ رہے تھے، میں ٹیٹا کو ایک طرف لے گیا اور
سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ اس کھیل میں
شامل ہو جاؤ۔ اس طرح ہم نومی کی مدد کر سکیں گے۔"

سپنس ڈائجسٹ

اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے بریف کیس بند کرتے

ہوئے کہا۔ ”کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

وہ دونوں لڑکیاں اور میں لیونگ روم میں ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی جو نو بج کر ستاون منٹ بتا رہی تھی۔ گویا میرے پاس ٹومی کو بچانے کے لیے صرف تین منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے بریف کیس سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھا اور کہا۔ ”تمہیں صرف اس میں خالی جگہوں کو پُر کر کے اپنے دستخط کرنا ہیں۔“

وہ ایک قانونی دستاویز تھی جس میں لکھا ہوا تھا کہ ٹومی ہار جو بے قصور ہے اور یہ کہ ان دونوں کو اس کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کرنے کے لیے ایک معقول رقم ادا کی گئی تھی۔ خالی جگہ میں اس شخصیت کا نام لکھنا تھا جس نے ان کی خدمات حاصل کیں۔

”ہم تم پر کیوں بھروسہ کریں؟“ سنہرے بالوں والی لڑکی نے کہا۔

”اس بریف کیس میں بیس ہزار ڈالر ہیں۔ کیا بھروسہ کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہیں؟“

انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا پھر سرخ بالوں والی بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”یہ کافی بڑی رقم ہے۔“ سنہرے بالوں والی لڑکی نے جواب دیا۔

”یہ سب تمہاری ہے۔“ میں نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔ ”کیا تم سودا کرنے کے لیے تیار ہو؟“

سرخ بالوں والی لڑکی کی آنکھوں میں چمک ابھری اور سنہرے بالوں والی اپنا سر ہلانے لگی۔ دونوں کی نظریں

بریف کیس پر تھیں۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

”اس کا نام کیا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کس نے تمہیں جھوٹ بولنے کے لیے پیسے دیے تھے؟“

انہوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سنہرے بالوں والی نے اثبات میں سر ہلایا۔ سرخ

بالوں والی لڑکی نے بولنا شروع کیا لیکن اس کی آواز دروازے پر ہونے والی دسک میں دب گئی۔

”دروازہ کھولو!“ میں نے جوزف کی کرخت آواز پہچان لی تھی۔

”میں مار یا اوچی ہوں۔“ ایک اور آواز آئی۔ ”اور تم سے مطالبہ کرتی ہوں کہ جو کچھ کر رہے ہو، اسے فوراً روک دو۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور انتظار کرنے لگا کہ جوزف اور ہرمن کب اس جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان کی نظر ہم پر پڑی، ان کے چہرے تاریک ہو گئے۔

”مجھے بطور منگیتر بھی ٹومی کا کردار نبھانا ہوگا۔“ میں نے ایک اور ہم گراتے ہوئے کہا۔ ”ٹینا میری بیوی بننے پر رضامند ہو گئی ہے۔“

ٹینا تمہوڑا سا کسمائی لیکن میں نے اسے مضبوطی سے بھینچ لیا۔ ہرمن اداس نظر آنے لگا جیسے کتے سے ہڈی چھین لی گئی ہو اور جوزف کی تو جیسے سانس ہی رک گئی تھی۔ گو کہ اس حرکت پر میرا ضمیر ملامت کر رہا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی اگر ان میں سے کوئی ایک مشتعل ہو کر مجھ پر جھپٹ پڑتا تو مجھے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان عورتوں کو جھوٹ بولنے کے لیے کس نے استعمال کیا ہے۔

میں اس وقت ایک مضبوط ہاتھ نے میرے کندھے کو اپنی گرفت میں لے کر جھٹکے سے کھینچا۔ میرے سامنے ٹومی خونخوار صورت بنائے کھڑا تھا۔ پھر اس نے پوری قوت سے میری ناک پر مکا دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا۔ جب حواس بحال ہوئے تو وہ مجھے کاک ٹیل لاؤنج میں لے آیا اور میرے لیے مشروب منگوا یا۔ ٹینا نے اسے بتایا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ محض ایک ڈراما تھا تاکہ سچ سامنے آ سکے۔ جب پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو اسے اپنے کیے پر افسوس ہونے لگا۔

میری وضاحت کے بعد وہ بولا۔ ”یہ اتنا بُرا آئیڈیا نہیں ہے۔ شاید تم میری ملازمت اور ٹینا کو حاصل کر سکو۔ میں تو پہلے ہی دونوں سے محروم ہو چکا ہوں۔“

”بالکل نہیں، ہمارے پاس دس بجے تک کا وقت ہے۔ کیا تم بیس ہزار ڈالر کا بندوبست کر سکتے ہو؟“

”مجھے کیسینو کے سیف سے یہ رقم نکالنا ہوگی لیکن تم اس کا کیا کرو گے؟“

”یہ ایک آخری کوشش ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کامیاب ہو گئی تو تم بچ جاؤ گے۔“

میں نے کمرانمبر پانچ سو تیرہ کے دروازے پر دسک دی۔ وہی سرخ بالوں والی لڑکی نمودار ہوئی اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”کیا تم یہ دیکھنا پسند کرو گی؟“ میں نے بریف کیس کھول کر اسے نوٹوں کی جھلک دکھلائی۔

”اگر یہ کوئی چال ہے تو تمہیں مایوسی ہوگی۔“ اس نے

میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ دروازہ کھلنے پر ماریا، جوزف اور ہرمن اندر آئے۔ وہ سب غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ ماریا نے بریف کیس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ کیسینو کی ملکیت ہے؟“

”تم جو سمجھ رہی ہو، ویسا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں کیا سوچ رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہی کہ ٹومی ہار جو نے ان لڑکیوں کو خریدنے کے لیے کیسینو کے سیف سے یہ رقم چرائی ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ان لڑکیوں سے صرف اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہ رہا تھا جس نے انہیں جھوٹ بولنے کے لیے استعمال کیا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے اور یہ مسئلہ اب ختم ہو جائے گا۔ یہ رقم تو محض ایک چار تھی۔“

”دس بیج چکے ہیں۔“ ماریا نے کہا۔ ”تمہیں جو مہلت دی گئی تھی، وہ گزر گئی۔ کل صبح ٹومی اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے استعفا دے دے گا اور اس طرح ہماری اس سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیوں نہ تم دونوں پر اس بڑی رقم کی چوری کا الزام عائد کیا جائے۔“ جوزف اور ہرمن میری طرف دیکھ کر طنز یہ انداز میں مسکرانے لگے۔ وہ دونوں خوش نظر آ رہے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ جوزف غالباً ٹومی کی جگہ سنبھال لے گا اور ہرمن کو ٹینا سے تعلق قائم کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں اپنے آپ کو حقیر محسوس کر رہا تھا۔ میں نہ صرف ٹومی کو بچانے میں ناکام رہا تھا بلکہ میری وجہ سے اس پر ایک اور الزام لگ گیا تھا۔ میں نے لاؤنج میں بیٹھ کر دو پیگ چڑھائے اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ سوئی کپڑے کا لباس پہنے جنگل کے ایک کیمپ میں ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک رائفل ہے پھر میں کیمپ کا دروازہ کھول کر باہر آتا ہوں۔ لگتا ہے کہ مجھے کسی کو شکار کرنا ہے۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوں اور میری نظر ایک غار کے دہانے پر جاتی ہے۔ میں ایک شاخ کا سہارا لے کر وہاں تک پہنچتا ہوں۔ غار کے اندر گھپ اندھیرا ہے۔ قریب میں ہی کسی جانور کے خرائے لینے کی آواز آتی ہے جو کسی ریچھ سے ملتی جلتی ہے۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ اب خراٹوں کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی ہیں اور مجھے اندرونی منظر زیادہ صاف نظر آ رہا ہے۔

وہاں دیوار کے ساتھ ایک میز رکھی ہوئی ہے جس پر کچھ چھوٹے زیورات موجود ہیں جو شاید کچھ گوشت کے دوران کہیں سے ملے ہوں گے۔ میں ان میں سے ایک زیور اٹھا کر مدھم روشنی میں اس کا معائنہ کرتا ہوں اور مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اچانک ہی ریچھ چلانا شروع کر دیتا ہے لیکن یہ کسی ریچھ کی چیخ نہیں لگتی۔ میں نے گھوم کر دیکھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور حرکت کر رہا تھا۔ اب میرے بھاگنے کی باری تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، غار میں روشنی ہو گئی اور وہ چیخ ایک لفظ میں بدل گئی۔ ”ہیلپ!“

میں نے دیکھا کہ وہ غار نہیں بلکہ بیڈروم تھا اور جسے میں ریچھ سمجھ رہا تھا، وہ ماریا اوچی تھی۔ اس نے باریک جالی کا نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور کافی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ باوجود اس کے کہ خوف نے اس کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

یہ خواب میرے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے زیور کو دیکھا اور میرے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔ وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک گول چاندی کا لاکٹ تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو میری نظر دو مسکراتے ہوئے چہروں پر گئی۔ ان میں سے ایک نوجوان ماریا تھی جس کی شکل ٹینا سے بہت مل رہی تھی اور دوسرے شخص کو بھی پہچان لیا۔ اسے میں نے بیس سال سے نہیں دیکھا تھا۔

ماریا ابھی تک چلا رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر لوگ دوڑے چلے آئے۔ پہلے آنے والوں میں ٹینا، ٹومی، جوزف اور ہرمن تھے۔

”پولیس کو بلاؤ۔“ ماریا چلاتے ہوئے بولی۔ ”میں اس شخص کو گرفتار کروانا چاہتی ہوں۔“

سب نے مجھے حیرت سے دیکھا لیکن ٹینا کچھ زیادہ ہی غصے میں تھی۔ شاید اس لیے کہ میں رات کے وقت نامناسب لباس میں اس کی ماں کے بیڈروم میں داخل ہوا تھا۔ دو باوردی سیکورٹی گارڈ جوزف کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے، اس نے ان سے کہا۔ ”اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔“ میں نے لاکٹ لہراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم سب اسے دیکھ لو۔“

یہ کہہ کر میں نے لاکٹ ٹومی کو دے دیا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“

ٹینا اس کے کندھے سے لگتے ہوئے بولی۔ ”یہ میری مام اور جی کی تصویر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ماں کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔
 ”جی.....!“ ٹومی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”وہ مام کی پہلی محبت تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا۔“ ٹینا نے کہا۔

ماریا بستر پر گر گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ ٹومی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کہہ دو کہ یہ شخص تمہارا باپ نہیں تھا۔“
 ٹینا اپنی مام کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ”نہیں۔ اس کے جانے کے بعد مام نے میرے باپ سے شادی کر لی تھی لیکن یہ شادی قائم نہ رہ سکی۔ میں نہیں جانتی کہ مام بھی جی کو بھول پائی ہوں گی۔“

ٹومی پر سکون نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم انہیں بتانا چاہو گے یا یہ کام بھی میں ہی کروں؟“
 وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جی کا اصل نام جیس ہار جو ہے۔ وہ میرا باپ تھا۔“

ماریا کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں پولیس کی ضرورت ہوگی۔ کم از کم آج رات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ اس معاملے کو صبح دیکھیں گے۔“

جوزف اور ہرسن مایوس دکھائی دے رہے تھے لیکن انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ماریا مسلسل روئے جا رہی تھی اور ٹینا اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ باقی سب لوگ ایک ایک کمرے سے چلے گئے۔

دوسری صبح ہم سب ایک بار پھر ماریا کے دفتر میں جمع ہوئے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی نادام نظر آرہی تھی جبکہ ٹینا ایک محافظ کی طرح اس کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کی ماں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر بیٹھے۔ سچی، ہوئی آنکھیں اور اترے ہوئے چہرے کے باوجود اس کی خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”ان لڑکیوں اور خادموں نے حقیقت بیان کر دی ہے۔“ میں نے اعلان کیا۔ ”ماریا نے ٹومی پر جھوٹا الزام لگانے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔“

ٹومی نے ٹینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی تمہاری ماں مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے؟“

”وہ تم سے نفرت نہیں کرتی۔“ ٹینا نے کہا۔ ”اس نے سوچا کہ تم بھی اپنے باپ کی طرح مجھے تکلیف پہنچاؤ گے۔“
 ”کیا تم ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہو کہ اس نے کیا تکلیف

پہنچائی تھی؟“

”وہ اسے شادی کے وقت چھوڑ کر چلا گیا۔“ ٹینا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بعد میں اسے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اس نے کسی اور عورت سے شادی کر لی ہے اور ٹینیسی میں رہ رہا ہے۔“

”مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔“ ٹومی نے کہا۔ ”اس نے کبھی یہ تذکرہ نہیں کیا۔“

”جب ہم نے اپنی مگنی کا اعلان کیا تو اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے گھر سے چلے جانے کی دھمکی دے دی۔ اس کے بعد لگتا تھا کہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلی جائے گی۔“

”اب سوال یہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔“ میں نے جان بوجھ کر اپنی آواز میں سختی پیدا کی۔

ٹومی یہ سن کر چونک پڑا جیسے اس نے اس بارے میں غور ہی نہ کیا ہو۔ ”اس کی سزا یہ ہے کہ اسے فوری طور پر عہدے سے ہٹا دیا جائے۔“ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ اس پر سنگین نوعیت کے الزامات ہیں اگر اس کے خلاف جنگ عزت کا مقدمہ دائر ہو گیا تو یہ کنگال ہو جائے گی۔“

”میں صرف یہ چاہتا ہوں۔“ ٹومی نے کہا۔ ”ماریا باس ہونے کے ساتھ ساتھ میری ساس بھی بن جائے، یہی اس کی سب سے بڑی سزا ہے۔“

ٹینا کی آنکھیں بھیگ نکلیں اور وہ بولی۔ ”تم کتنے اچھے ہو ٹومی۔“

ماریا نے کہا۔ ”لیکن ہم پریس کو کیا بتائیں گے؟“
 ”انہیں کسی شخص نے فرضی نام اختیار کر کے ٹومی پر جھوٹا الزام لگاتے کے لیے خریدا تھا۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ اس کا اعتراف کر لیں گی اور اس سے پہلے کہ کوئی ان سے سوال کرے، ہم انہیں ریاست سے باہر بھیج دیں گے۔“

ماریا نے ٹومی کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔“

”میں اپنے باپ کو جانتا ہوں۔“ ٹومی نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرے والدین نے کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی لیکن میری

منجائش نہیں۔“

”اسی لیے میں خوفزدہ ہوں۔ تم بہت زیادہ خوب رو اور باصلاحیت شخص ہو۔ جس کا مظاہرہ تم نے یہاں بھی کیا ہے۔ گوکہ تم دیکھنے میں مرد لگتے ہو لیکن اب بھی تمہاری بہت سی باتیں لڑکوں جیسی ہیں۔ میں نے ایک بچے کی پرورش کی ہے مسٹر کرو۔ لیکن ایک اور بچے کو پالنا نہیں چاہتی۔“

اس نے آخری بار میرے چہرے کو چھوا۔ وہ کچھ افسردہ نظر آ رہی تھی پھر وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اسے واپس بلانا چاہ رہا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ شاید میں اپنے ارادوں میں اتنا مخلص نہ ہوں جیسا کہ سوچ رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے مگر وہ چلی گئی اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔

ٹینا اور ٹومی صدر دروازے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ٹینا نے میرا اتر ا ہوا چہرہ دیکھا تو بولی۔

”میں جانتی تھی کہ تمہیں مایوسی ہوگی۔ شاید مام بھی تمہیں پسند کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ تمہارا بڑا بھائی تھا نہیں تھا۔ وہ عمر کے فرق سے خوفزدہ ہیں۔ پہلے جی انہیں چھوڑ کر چلا گیا پھر شوہر بھی ان سے بچھڑ گیا۔ اب وہ تیسرا تجربہ کرتے ہوئے ڈر رہی ہیں۔ تم ان سے چودہ سال چھوٹے ہو۔ تمہارے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ اگر تم بھی انہیں چھوڑ کر چلے گئے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔“

”میں کیسے یقین دلاؤں.....“

”اس کی ضرورت نہیں۔ کچھ حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں۔ انہیں قبول کرنا آسان نہیں ہوتا، اس وقت تم وقتی جوش اور جذبے کے تحت میری ماں پر فدا ہو رہے ہو لیکن چند ہفتوں یا مہینوں بعد جب یہ بخارا ترے گاتو تم رسی تڑا کر بھاگ جاؤ گے۔ تب وہ کیا کریں گی؟ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ انہیں ایک اور امتحان میں مت ڈالو۔“

میں جانتا تھا کہ اب میرا مزید وہاں رکنا بے کار ہے۔ اس لیے کمرے میں آکر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ واپسی کے سفر میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے ٹومی کا مقدمہ جیت لیا۔ شاید کانگریس کے انتخابات میں بھی کامیاب ہو جاؤں لیکن ایک عورت کا دل نہیں جیت سکا۔ عمر کے فرق کی وجہ سے ایسا ہوا یا واقعی میں اپنے ارادے میں سو فیصد مخلص نہیں تھا؟ شاید میری نیت میں ہی کھوٹ تھا جو یہ مقدمہ ہار گیا۔

پیدائش سے صرف ایک ہفتہ قبل ان کی شادی ہوئی تھی جب ڈیڈی نے تمہیں پروپوز کیا۔ غالباً اس وقت وہ میرے بارے میں نہیں جانتے تھے۔“

ماریا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ معاملات سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ٹومی نے کہا۔ ”اس نے میری ماں سے بحالت مجبوری شادی کی تھی۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس کی آنکھیں کس کی تلاش میں جھپکتی رہتی تھیں۔ جب وہ پورچ میں بیٹھتا تو اس کی نظریں مغرب کی جانب اڑکھتا ہوا پر ہی جمی رہتیں۔“

ٹینا ایک بار پھر ٹومی کی بانہوں میں سامنی اور اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے لیکن اب بھی مجھے کسی بات کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ ٹومی نے ٹینا کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈی! آ جاؤ..... ہم جشن منانے جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہاری ہونے والی ساس سے چند باتیں کر لوں۔“

ماریا نے بھوئیں اچکا کر مجھے دیکھا گوکہ رونے سے اس کا میک اپ خراب ہو گیا تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح پیاری لگ رہی تھی۔ اب جبکہ میں اور وہ اس کمرے میں تنہا تھے، میری گھبراہٹ دوبارہ لوٹ آئی اور میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”مسز اوپچی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا فوری طور پر واپس جانا اتنا ضروری نہیں۔ کیا تم آج شام میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گی؟“

اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ میز کے گرد چکر لگایا اور میرے سامنے آکر رک گئی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”میں پہلی ملاقات میں ہی تمہاری نظریں پہچان گئی تھی۔ لیکن اعتراف ہے کہ اسے میں نے خوشامد سمجھا۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”چوبیس سال۔“

”میں اڑتالیس کی ہو چکی ہوں۔ کیا تمہارے لیے یہ بات پریشان کن نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تم اپنے ارادوں میں کتنے مخلص ہو؟“

”سو فیصد۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں کسی شک کی

نسلی امتیاز

ملک صفدر حیات

گروہی نظام کے اگر مثبت معنی تلاش کیے جائیں تو آپس میں ایک قانون کے تحت اتحاد و اتفاق سے رہنے کے "اصول" نکلتے ہیں مگر افسوس... انسان نے اسے اپنے گرد ایک اونچی دیوار بنا کر اس طرح کھینچ لیا ہے کہ کوئی ان پر نگاہ ڈال سکے اور نہ ہی یہ خود کسی اور کے بارے میں آگاہی پاسکیں۔ وہ لوگ بھی کچھ ایسے ہی نظام کا شکار ہوئے تھے جنہیں اپنی ذات برادری اور نسل پر بڑا گھمنڈ تھا اور اسی گھمنڈ نے جانے کتنے ہنستے ہنستے گھر اجاز ڈالے مگر آج بھی بے شمار خونیں واقعات کے باوجود یہ نسلی امتیاز جوں کا توں موجود ہے اور تسلسل سے وارداتیں بھی رقم کرتا جا رہا ہے یہ اور بات کہ ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کا کردار ان وارداتوں کے وقوع پذیر ہونے کے بعد سامنے آتا ہے جو قتل و غارت گری کی الجھی گتھیاں تو سلجھا سکتے ہیں مگر نسلی امتیاز ختم کرنے میں یہ بھی ناکام رہیں گے۔

پولیس کی سرگرمیوں پر مشتمل ملک صاحب کی

ڈائری سے ایک اور واقعہ

ہوا ہے، اس کا نام مشتاق باجوہ ہے جناب۔
 "مشتاق باجوہ کرتا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
 "کبھی باڑی۔" اس نے جواب دیا۔ "مشتاق باجوہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف باجوہ اور باپ نذیر باجوہ کے ساتھ زمینداری کرتا تھا جناب۔ ابھی ایک سال پہلے ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔"
 "مشتاق باجوہ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟"
 "مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
 "واردات قتل کس جگہ پر واقع ہوئی ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے، مشتاق باجوہ کو کس مقام پر قتل کیا گیا ہے؟"
 "کھینسوں والے باڑے میں۔" اس نے بتایا۔
 "آج کل مویشیوں کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔ مشتاق باجوہ اسی لیے رات میں باڑے ہی میں سویا

ایک صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ ساتھ والے گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔ میں نے کانسٹیبل فرید خان کو روانگی کی تیاری کا حکم دیا اور اس واقعے کی اطلاع لانے والے کو اپنے پاس بلا لیا۔
 اس بندے کا نام اسحاق تھا اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ مذکورہ گاؤں "چک چوراسی" کہلاتا تھا۔ اسحاق ادھیڑ عمر کا ایک سادہ لوح شخص تھا۔
 "ہاں بھئی!" میں نے اسحاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کون قتل ہوا ہے اور کس نے قتل کیا ہے؟"
 "جناب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ قاتل کون ہے۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔
 "مقتول کو تو جانتے ہو نا۔" میں نے کہا۔ "اسی کے بارے میں کچھ بتا دو؟"
 "جی۔۔۔۔۔" وہ تھوک نچتے ہوئے بولا۔ "جو بندہ قتل



کرتا تھا۔ اسحاق سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کانشیل فرید خان نے میرے کمرے میں آکر بتایا۔ ”ملک صاحب! چک چوراسی جانے کی تیاری مکمل ہے۔ تھانے کے باہر تانگا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسحاق و فرید کے ہمراہ تانگے میں بیٹھ کر چک چوراسی کی جانب روانہ ہو گیا۔ چک چوراسی میرے تھانے سے لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور اس گاؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ نہر کی چوڑائی کم و بیش تیس فٹ رہی ہوگی۔ یہ بچہ نہر (چھوٹی نہر) آس پاس کی زرعی زمین کو سیراب کرنے کا فریضہ ادا کرتی تھی۔ وہ ماہ جون کے دن تھے اور یہ نہر اپنے کناروں تک بھری ہوئی مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی۔ جلد ہی ہم چک چوراسی پہنچ گئے۔

صبح کا وقت تھا لیکن ماہ جون کا سورج ہر ذی روح کو یہ باور کرانے پر تلا بیٹھا تھا کہ قیامت کی تیاری کر لو۔ میں ابھی آسمان سے تم لوگوں پر آگ برسانے والا ہوں۔ جائے وقوعہ یعنی بھینسوں والا بازار مقتول مشتاق باجوه کے گھر سے متصل تھا۔ اس کی چار دیواری کی اونچائی چار فٹ یا اس سے چند انچ زیادہ رہی ہوگی۔ باڑے کے احاطے کے اندر بارہ ضرب پندرہ فٹ کا ایک کمرابنا ہوا تھا جس میں کاشت کاری سے متعلق مختلف آلات پڑے تھے۔ اس احاطے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں چند بھینسیں اپنی کھریوں (کنڈیوں) پر بندھی ہوئی تھیں۔ مقتول مشتاق باجوه کی لاش باڑے کے اگلوتے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک چار پائی پر پڑی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ مقتول روزانہ اسی جگہ چار پائی ڈال کر سویا کرتا تھا۔ میں نے لاش کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ مشتاق باجوه کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ اگر بوقت موت وہ جاگ رہا ہوتا تو اپنی جان بچانے کے لیے یقیناً مزاحمت کرتا اور اس کوشش میں اس کے ہاتھ پاؤں ضرور زخمی ہوتے لیکن ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق سینے پر خنجر کے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی چھاتی، کس تیز دھار آلے کے متعدد زخم موجود تھے۔ میرے تجربے کی روشنی میں یہ مہلک وار کسی خنجر ہی کے ہو سکتے تھے۔ بعد ازاں میرا یہ خیال صد فیصد درست ثابت ہوا۔

میں نے آلہ قتل کی تلاش میں پورا بازار اچھان مارا مگر کبھی اس کا سراغ نہ مل سکا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ مشتاق باجوه کو موت کی نیند سلانے کے بعد آلہ قتل اپنے ساتھ لے گیا تھا یا پھر باڑے سے باہر کہیں پھینک دیا تھا۔

میں نے ساتھ آئے ہوئے کانشیل فرید خان کو ہدایت کی کہ وہ جائے وقوعہ کی تفصیلات نوٹ کرے اور میں خود مقتول مشتاق باجوه کے لواحقین سے پوچھ گچھ کرنے گھر میں آ گیا۔ مقتول کے باپ نذیر باجوه نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ان لمحات میں غم و اندوہ کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ جس شخص کا ستائیس سالہ بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا ہو اس کے دکھ اور تکلیف کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں ہے۔

”نذیر!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مقتول کے باپ کو مخاطب کیا۔ ”مجھے تمہارے جوان بیٹے کی موت کا بہت صدمہ ہے۔ میں مشتاق کو واپس تو نہیں لاسکتا لیکن تم سے یہ میرا وعدہ ہے کہ میں مشتاق کے قاتل کو گرفتار کر کے عدالت سے بڑی عبرت ناک سزا دلوں گا مگر.....“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”مگر..... اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ مجھ سے تعاون کرو گے نا؟“ اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا اور کمزوری آواز میں مستفسر ہوا۔ ”کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب!“

”میں جو بھی پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جی ضرور۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”تمہارے خیال میں مشتاق کو کس نے قتل کیا ہے؟“

میں نے پوچھا۔

”مم..... میں کیا کہہ سکتا ہوں تھانے دار صاحب۔“

وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

”کسی پر شک تو ہوگا.....“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ”نذیر! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ جب تک تم مجھے کوئی اشارہ نہیں دو گے، میں اپنے کام کو آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔“

”کیا ہے؟“

”آج صبح ہی جی..... سورج نکلنے سے بھی پہلے۔“
اس نے بتایا۔ ”ہم ابھی سو کر اٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کرم دین کھڑا تھا۔“

”کون کرم دین؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”کرم دین موچی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کرم دین چک چور اسی ہی میں رہتا ہے۔“
”کرم دین نے تمہیں کیا بتایا؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”کرم دین فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آ رہا تھا تو اس نے دیکھا، ایک آدمی باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلا۔“ نذیر باجوہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
”کرم دین کو حیرت ہوئی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ کرم دین نے آواز دے کر اس بندے کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں اور تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ کرم دین اسے کوئی چور اچکا سمجھا اور میرے دروازے پر آ کر اطلاع دی کہ مجھے جا کر باڑے کا جائزہ لینا چاہیے۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس کے بعد ہی ہم نے باڑے کا رخ کیا تھا۔“
”سب سے پہلے باڑے کے اندر کون داخل ہوا تھا؟“
”میں اور میرا چھوٹا بیٹا یوسف ایک ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔“ نذیر باجوہ نے بتایا۔ ”باڑے کے اندر پہلے یوسف داخل ہوا تھا۔“

”جب آپ لوگ باڑے پر پہنچے تو اس کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”دروازہ اندر سے بند تھا جناب۔“ اس نے جواب دیا۔
”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔
”پھر تم لوگ باڑے کے اندر کیسے داخل ہوئے؟“

”پہلے یوسف دیوار پھلانگ کر باڑے کے اندر گیا۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد میں باڑے میں داخل ہوا تھا۔“
”کیا مشتاق.... رات کو سونے سے پہلے دروازے کو اکڑ دیا کرتا تھا یا محض کندی ہی لگاتا تھا؟“

”وہ باڑے کے دروازے کو اندر سے باقاعدہ تالا لگایا کرتا تھا جناب۔“ نذیر باجوہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اس نے..... کچھ مشتاق کے سر ہانے کے نیچے

”جناب! میں نے سرگرمی سے پاؤں جانا ہے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”خواجواہ کسی پر شک کا اظہار کر کے میں خود کو گناہگار نہیں کر سکتا۔“
”مشتاق کی کسی شخص سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟“
”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
”کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہو.....؟“

”بالکل نہیں تھا نے دار صاحب۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”مشتاق بہت ہی خوش مزاج اور ملسار تھا۔ آج تک کسی سے اس کا لڑائی جھگڑا تو کیا، چھوٹی موٹی ناراضی بھی نہیں ہوئی۔“

”نذیر! تم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی ہے نا؟“
”جی دیکھی ہے۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔
”جس طرح خنجر کے متعدد دوار کر کے تمہارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل اس کے لیے اپنے دل و دماغ میں بے انتہا غصہ اور نفرت رکھتا تھا۔“ میں نے واضح انداز میں کہا۔ ”اس نوعیت کا کام کوئی دوست نہیں کر سکتا۔ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ تمہارے بیٹے کا دشمن تھا۔“

”جناب! میری بات کا یقین کریں۔“ وہ بھگی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں مشتاق کے کسی دشمن کو نہیں جانتا۔“
”مشتاق کب سے باڑے میں سوراہا تھا اور یہ بات کس کس کے علم میں تھی؟“ میں نے ایک نئے زاویے سے کرید کا عمل جاری رکھا۔

”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ آج کل مال مویشی کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔“ وہ بڑی رसान سے بتانے لگا۔ ”اس لیے باڑے میں سونے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پہلے یہ ڈیوٹی مشتاق کا چھوٹا بھائی یوسف انجام دے رہا تھا لیکن جب سے مشتاق کی بیوی میکے گئی ہے، باڑے میں سونے کی ذمہ داری مشتاق نے سنبھال لی تھی۔“

”مشتاق کی بیوی خیریت ہی سے میکے گئی ہے نا.....؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔
”جی سب خیریت ہی ہے۔“ اس نے مبہم سا جواب دیا۔
”کیا چک چور اسی والوں کو یہ بات چنانچہ کہ مشتاق آج کل باڑے میں سوراہا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”اور اس سے پہلے یوسف یہ ڈیوٹی دیا کرتا تھا؟“

”جی، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔“ اس نے کہا۔
”نذیر! تمہیں کب پتا چلا کہ تمہارے بیٹے کو قتل کیا

رکھی ہوئی تھی۔ یہ بات یوسف کو بھی پتا تھی۔ یوسف جب چابی لینے مشتاق کی چارپائی کی جانب بڑھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بڑے بھائی کی خون آلود لاش دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں چیخنے چلانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوا یا پھر جب میں اندر پہنچا اور صورتِ حال واضح ہوئی تو گویا مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ میرے مشتاق کو کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔“

ادھر اس نے بات ختم کی، ادھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس وقت بیٹھک میں میرے اور نذیر باجوه کے علاوہ مقتول کا چھوٹا بھائی یوسف اور چک چوراسی کے چند وسٹیک بھی موجود تھے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد پوچھا۔

”کرم دین موچی تم میں سے کون ہے؟“

”وہ یہاں نہیں ہے جناب۔“ نذیر نے بتایا۔ ”وہ اس وقت اپنی دکان پر ہوگا جو اس کے گھر کے سامنے والے حصے ہی میں ہے۔“

میں نے کرم دین موچی کے گھر کی لوکیشن اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد نذیر باجوه سے پوچھا۔ ”کیا تمہاری بیوی گھر میں موجود ہے؟“

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، ایک ادھیڑ عمر عورت بین کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ ”اس نامراد پر اللہ کا قہر نازل ہو جس نے میرے جوان جہان بیٹے کی جان لی ہے۔“

مجھے یہ سمجھنے میں چنداں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ مقتول کی ماں تھی۔ بعد ازاں اس عورت کا نام عابدہ معلوم ہوا۔ جوان بیٹے کی موت نے اس کا کلیجہ چیر کے رکھ دیا تھا۔ وہ فرط غم سے نڈھال ہو رہی تھی اور اپنے بیٹے کے قاتل کو بددعا کیں دے رہی تھی۔

میں نے یوسف کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی ماں کو سنبھالے اور وہاں سے لے جائے مگر عابدہ مسلسل سینہ کو بی کر رہی تھی اور کسی بھی طور وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی تاہم نذیر باجوه کے سمجھانے بجھانے پر وہ گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ پھر خاصی دیر تک اس کی آہ وزاری کی آوازیں بیٹھک تک رسائی حاصل کرتی رہیں۔

”نذیر! تم نے تموڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔“ میں نے مشتاق کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اس کا میکا ادھر چک

چوراسی ہی میں ہے؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جیلہ کے ماں باپ نبی پورہ میں رہتے ہیں۔ یہ گاؤں چک چوراسی سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔“

”کیا جیلہ کو خبر دے دی گئی ہے کہ اس کا شوہر قتل ہو چکا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک تو اسے اطلاع نہیں بھیجی گئی جناب۔“ نذیر نے متذبذب انداز میں بتایا۔

”کیوں؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”اطلاع نہ دینے کا کوئی خاص سبب؟“

”اصل میں بات یہ ہے تھانے دار صاحب کہ جیلہ بیمار ہے۔“ نذیر نے بتایا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ بتانا چاہ رہا ہے لیکن وہاں لوگوں کی موجودگی کے باعث ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ میں نے ان لوگوں سے سرسری پوچھ گچھ کرنے کے بعد انہیں رخصت کر دیا پھر نذیر سے پوچھا۔

”تمہاری بہو کو ایسی کون سی بیماری ہے جو وہ میکے جا بیٹھی ہے اور اتنے بڑے واقعے کی اسے اطلاع بھی نہیں دی جا رہی؟“

”جیلہ کے گھر بچی بچے ہونے والا ہے جناب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہمارے خاندان کا رواج ہے کہ پہلا بچہ تھیال میں ہوتا ہے اسی لیے وہ نبی پورہ گئی ہوئی ہے۔ بس آج کل میں زچگی ہونے والی ہے اسی لیے ہم نے یہ بری خبر اس تک نہیں پہنچائی۔“

”نبی پورہ اور چک چوراسی میں صرف ایک میل کا فاصلہ ہے۔“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں، آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی مشتاق کے قتل کی خبر نبی پورہ پہنچ جائے گی۔“

وہ خاموش نظر سے مجھے تکتے لگا۔

”مشتاق اور جیلہ کے آپس میں کیسے تعلقات تھے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تھا تھانے دار صاحب!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

”میرا مطلب ہے، وہ پیار محبت سے رہتے تھے یا ان میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

پھر میں نے چپل کا وہ پاؤں اور تین والا چاندی کا لاکٹ انہیں دکھاتے ہوئے پوچھا: "ان چیزوں کو پہچانتے ہیں آپ لوگ؟ یہ اسی باڑے میں سے ملی ہیں۔"

انہوں نے باری باری دونوں چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد نفی میں گردن ہلا دی پھر نذیر باجوہ نے کہا:

"تھانے دار صاحب! ہمارے گھر میں اس عمر کا کوئی بچہ نہیں۔ پتا نہیں، چپل کا یہ پاؤں باڑے میں کیسے پہنچ گیا اور یہ..... ہے کس کا؟"

یوسف باجوہ نے کہا: "اور یہ زنجیر بھی ہم میں سے کسی کی نہیں۔"

"یاد کرو، کسی اور شخص کی گردن میں تم نے اس زنجیر کو دیکھا ہو.....؟" میں نے یکے بعد دیگرے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"جی نہیں۔" یوسف باجوہ نے قطعیت سے جواب دیا۔

"یہ زنجیر چک چوراسی میں تو میں نے کسی کے پاس نہیں دیکھی۔"

"اور چک چوراسی کے باہر.....؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

"وہ جی..... میرا مطلب یہ تھا کہ....." وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا: "یہ زنجیر میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔"

"اور یہی حال میرا بھی ہے۔" نذیر باجوہ نے غصہ سے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"اس گاؤں میں سار کی کوئی دکان ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی....." یوسف باجوہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "دلدار مہر کی دکان ہے۔"

"دلدار مہر....." میں نے زیر لب دہراتے ہوئے پوچھا: "کیا یہ ایک ہی صراف ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور بھی یہ کام کرتا ہے؟"

"جی، اس گاؤں میں صرف ایک ہی سار ہے..... دلدار مہر۔" نذیر باجوہ نے جواب دیا۔

"اور چک چوراسی میں موچی کتنے ہیں؟"

"موچی بھی ایک ہی ہے..... کرم دین۔"

"اور اسی کرم دین نے آج صبح تمہیں اطلاع دی تھی کہ اس نے باڑے میں سے کسی بندے کو کوڈ کر باہر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا؟" میں نے نذیر باجوہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

"جی..... جی ہاں....." وہ جلدی سے سر کو اٹھاتی

"ہمیلہ بہت اچھی ہے۔ ان کی شادی کو ابھی ایک سال ہی ہوا ہے لیکن ایسا لگتا ہے، وہ کئی برسوں سے اس گھر میں رہ رہی ہے۔ جمیلہ نے پورا گھر سنبھال رکھا ہے۔ مشتاق بھی اس کے ساتھ بہت خوش تھا۔"

میں نے نذیر باجوہ سے مزید تین چار سوالات پوچھے پھر اسے فارغ کر کے باڑے کی طرف آ گیا۔

☆☆☆

کانشیل فرید خان اس دوران اپنی کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ میں باڑے میں داخل ہوا تو وہ دو چیزیں میری سمت بڑھاتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

"یہ دیکھیں ملک صاحب.....!"

"یہ کیا ہے فرید خان؟" میں نے مذکورہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا

پھر بغور ان چیزوں کا معائنہ کرنے لگا۔

ان میں سے ایک لاکٹ تھا۔ چاندی کی زنجیر میں ایک خوب صورت عقیق جڑا ہوا تھا۔ یہ سرخ عقیق تھا جسے عقیق

یمنی بھی کہا جاتا ہے۔ میرے محتاط انداز سے کے مطابق یہ عقیق پندرہ قیراط کے قریب وزن کا تھا اور اس کی جڑائی کسی صراف کی مہارت کا منہ بولنا ثبوت تھی۔

دوسری چیز چمڑے کی ایک چپل تھی، مطلب چپل کا ایک پاؤں۔ اپنے سائز کے اعتبار سے یہ کسی بارہ تیرہ سالہ

بچے کی چپل کا پاؤں لگتا تھا۔ اس چپل کا نمبر پانچ یا چھ رہا ہوگا۔

"فرید خان!" میں نے کانشیل کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ دونوں چیزیں تمہیں کہاں سے ملی ہیں؟"

"جناب! یہ مجھے اس دیوار کے پاس سے ملی ہیں۔"

وہ گلی کی جانب والی دیوار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے، دیوار کو دتے وقت قاتل کے پاؤں سے چپل کا یہ پاؤں اور گلے سے یہ زنجیر گر گئی ہے۔"

"ہاں..... ایسا ہو سکتا ہے۔" میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ "اگر واقعی یہ چیزیں قاتل سے تعلق رکھتی ہیں تو.....!"

"جی..... کیا مطلب؟" کانشیل نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

اسی دوران میں نذیر باجوہ اور اس کا چھوٹا بیٹا یوسف باجوہ بھی باڑے میں آ گئے تھے۔ میں کانشیل کو یہ جواب

دیتے ہوئے ان باپ بیٹا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ چپل تو مجھے کسی بارہ سالہ بچے کی لگتی ہے.....!"

جنتش دیتے ہوئے بولا۔

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اس نے زمین کا بغور جائزہ لیا۔ اس وقت ہم عین اس مقام پر کھڑے تھے، کرم دین موچی کے مطابق جہاں سے اس نے ایک شخص کو باڑے کی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی جانب فرار ہوتے دیکھا تھا۔

”ملک صاحب! میں نے قاتل کا کھرا پکڑ لیا ہے۔“ اللہ رکھا نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ ”وہ بندہ یہاں سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا ہے۔“

کھوجی اللہ رکھا خاصا ہوشیار آدمی تھا۔ گویا اس نے کرم دین موچی کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ چپل والا پاؤں میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ آپ رکھ لیں۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں لیکن ٹھہریں۔“ ”لجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر باڑے کی اندرونی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔“ ”میں اپنے کام کا آغاز وہاں سے کروں گا جہاں بندہ قتل ہوا ہے۔“

”چاچا! میں تمہیں فری دیتا ہوں۔ تمہارا جہاں سے دل چاہے اور جیسے دماغ کہے، تم اپنا کام کرنے کے لیے آزاد ہو۔“ میں نے چپل کا پاؤں ایک تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا یہ کانسٹیبل فرید خان بھی تمہارے حوالے ہے۔ مجھے آج شام سے پہلے قاتل تک رسائی چاہیے۔“ ”تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا ہے اور سوہنا رب ہی مجھے منزل تک بھی پہنچائے گا۔ اگر میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے آپ کو قاتل تک رسائی نہ دلوں گا تو کم از کم اس بد بخت کا سراغ ضرور لگا لوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کرتا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آج شام تھانے میں ملاقات ہوگی۔“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں باڑے سے نکل کر کرم دین موچی کی دکان کی جانب بڑھ گیا۔

کرم دین کی عمر ساٹھ بے متجاوز تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے اپنی دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ یکنخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ ملا کر مجھے سلام کرنے کے بعد بولا۔

”مائی باپ، مجھے حکم کیا ہوتا۔ میں خود چل کر آپ کی

میں نے نذیر باجوہ سے دلدار مہر سراف کی دکان کا محل وقوع سمجھ لیا پھر مقتول مشتاق باجوہ کی لاش کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کسی تیز دھار آلے کے متعدد وار کر کے مشتاق باجوہ کو اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا کہ اس کی لاش کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی، اوپر سے موسم بھی خاصا گرم ہو رہا تھا۔ اس یقینی ہوئی قیامت خیز دوپہر میں مشتاق کی لاش کو زیادہ دیر تک کھلے آسمان کے نیچے رکھنا مناسب نہیں تھا لہذا میں نے جلدی سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور مقتول مشتاق باجوہ کی کئی پھٹی لاش کو ایک تانگے میں رکھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔

اس کے بعد میں نے کانسٹیبل فرید خان سے کہا کہ وہ کھوجی اللہ رکھا کو بلا لائے۔ فرید خان ”یس سر“ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے یوسف باجوہ اور اس کے باپ سے مزید چند سوالات کیے پھر وہاں موجود دیگر افراد سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ چک چوراسی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور مشتاق باجوہ کے قتل کی خبر اب تک گاؤں کے بچے بچے کے علم میں آ چکی تھی۔

میں نے گاؤں کے لوگوں سے مقتول کے چال چلن کے بارے میں مختلف سوالات کیے اور ان کی رائے دریافت کی۔ زیادہ تر کے خیال میں مشتاق باجوہ ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا اور یہ کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ گویا میں سردست اس قتل کا محرک جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

مشتاق باجوہ کے قتل کے سلسلے میں انتہائی کارروائی میں نے مکمل کر لی تھی اور اہم گواہوں کے بیانات بھی قلم بند کر لیے تھے لہذا جیسے ہی کھوجی اللہ رکھا باڑے میں پہنچا، میں نے اسے کانسٹیبل فرید خان کے حوالے کرتے ہوئے صورت حال اور اس کی ماہرانہ صلاحیت کی ضرورت سے آگاہ کر دیا۔ میں نے چڑے کی چپل کا وہ پاؤں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ مجھے جائے واردات سے ملا ہے۔ اس کی مدد سے تم اپنی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے قاتل کا کھوج لگاؤ تو میں تمہیں اپنی جیب خاص سے انعام دوں گا۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب۔“ وہ چپل کے پاؤں کو اوپر نیچے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ لیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔“

”ایسے کیسے سمجھ لوں کہ کام ہو گیا۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کچھ کر کے تو دکھاؤ چاچا۔۔۔۔۔؟“

سال نو کا تحفہ..... خوشیاں بکھیرتا جنوری 2017ء پاکیزہ کا خوب صورت شمارہ



پاکیزہ

کراچی

ماہنامہ

شیریں حیدر کے نئے سلسلے وار ناول امرت کی پہلی تعارفی قسط

سحر ساجد کی دل گداز تحریر..... من جانبازم

سیمارضا ردا کے مٹی ناول ہم کو عبث بدنام کیا کا اگلا باب

رفعت سراج اور انجم انصار

کے ناول تیزی سے تکمیل کے مراحل طے

کرتے ہوئے

نئے سال کا بھرپور تحفہ..... نگہت سیما، بنت سحر اور رضوانہ پرنس کی خوشگوار تحریریں..... دلچسپ اور معلومات افزا..... منفرد مضامین آپ کی خوش ذوقی کا سامان

(س کے علاوہ)

نامور رائٹرز کی تحریریں جن میں بشری سیال، سفینہ یاسمین، نفیسہ سعید، ام ایمان، ہاجرہ ریحان و دیگر شامل ہیں۔

ان فنی تحریروں سے خوب صورت پاکیزہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر

”سرکار! میں نے پہلے وہی کوشش کی تھی جو آپ فرما رہے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”یعنی تم نے اس بندے کو پکڑنے کی کوشش کی تھی؟“
 ”جی بالکل۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بندہ کسی چھلاوے کے مانند کھیتوں میں غائب ہو گیا تھا۔“
 ”اس کی وضع قطع..... کوئی حلیہ وغیرہ.....“ میں نے بہ دستور ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ”قد کا ٹھہ..... کچھ تو تم نے نوٹ کیا ہوگا؟“

”جناب.....“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اس نے منڈا سا باندھ رکھا تھا اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا لیکن قد کا ٹھہ اور جسامت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ وہ خوشیا ہے.....“
 ”خوشیا..... کون خوشیا؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ڈنگر چور خوشیا جناب۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”اس کا اصل نام خوشی محمد ہے لیکن علاقے میں وہ خوشیا ڈنگر چور کے نام سے مشہور ہے، یعنی مویشی چور۔“
 ”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”کرم دین! کیا تم نے اس بندے کے پاؤں کو بھی دیکھا تھا؟“
 ”جی ملک صاحب! وہ پاؤں سے ننگا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا مطلب ہے، اس نے جوتے نہیں پہن رکھے تھے۔“

”وہ ایک پاؤں سے ننگا تھا یا دونوں پاؤں سے؟“
 میں نے تھیلے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”دونوں پاؤں سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اسی لیے مجھے یقین ہے کہ وہ خوشیا ڈنگر چور ہی ہوگا۔ خوشیا اسی طرح چہرے پر منڈا سا باندھ کر اور ننگے پاؤں مویشی چوری کرتا ہے۔“

”کیا تم نے خوشیا کو دیکھ رکھا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
 ”چک چور اسی کے کسی اور سنک نے اسے دیکھا ہے؟“
 ”نہیں جناب! آج تک کسی نے خوشیا کو نہیں دیکھا۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن اس کی دہشت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔“

”جب آج تک کسی شخص نے اسے دیکھا ہی نہیں تو پھر یہ کسے پتا چلا کہ اس کا نام خوشی محمد عرف خوشیا ڈنگر چور ہے۔“

خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“
 ”اگر تمہیں اتنا ہی احساس ہوتا تو دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی جائے وقوعہ کے آس پاس ہی منڈلاتے دکھائی دیتے۔“ میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”جبکہ اس واقعے کی اطلاع تم ہی نے نذیر باجوه کو دی تھی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار۔“ وہ ایک موزہ سے کوپڑے سے جھاڑے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔
 ”مجھے مشتاق باجوه کو پیش آنے والے واقعے کا پتا چل چکا ہے اور میں صبح وہاں گیا بھی تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میرے واپس آ جانے کے بعد آپ تشریف لائے تھے اور اگر آپ یقین کریں تو میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دوبارہ وہاں جا کر حالات حاضرہ کا جائزہ لوں کہ.....“

”کہ..... یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ.....“ میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تمہارے ایسا سوچتے ہی میں تمہاری دکان پر چلا آیا..... ہیں نا؟“
 ”جی جی.....“ وہ جلدی سے سرکوا ثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں..... آپ تشریف لے گئیں۔“

میں..... موزہ سے پر ہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ”آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے کسی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔“
 میں نے کسی تکلف سے کام نہ لیتے ہوئے اسے ایسے ”بندوبست“ سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے شدید نوعیت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے میں چلچلاتی دھوپ میں تحقیق و تفتیش میں لگا ہوا تھا۔

ٹھنڈی ٹھار، دل بہار لسی کا ایک گلاس حلق سے اتارنے کے بعد میں کرم دین موچی کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 ”کرم دین! مجھے پتا چلا ہے کہ آج صبح تم نے نذیر باجوه کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے ایک سنسنی خیز اطلاع دی تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی..... میں اس وقت مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو میں نے ایک آدمی کو نذیر باجوه کے باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلتے دیکھا تھا۔“

”کرم دین! جب تم نے اس بندے کو باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر آتے دیکھا تو پھر تم نے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”نذیر باجوه کو اطلاع دینا زیادہ ضروری تھا یا اس بندے کو قبا کرنا؟“

”تم کیا سوچ رہے ہو کرم دین؟“
”میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کسی بڑے شخص کی چپل کا پاؤں ہے۔“ وہ بہ دستور گھبرانداز میں بولا۔ ”کوئی ایسا شخص جس کا قدم بہت چھوٹا ہو اور ہاتھ پاؤں بھی کسی بارہ تیرہ سالہ بچے کے برابر ہوں اور یہ بات میں چپل کی بناوٹ کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔“

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
کرم دین کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ تجربہ کسی کوئی کا محتاج نہیں ہوتا اور تجربے کا کوئی نعم البدل بھی نہیں ہوتا۔ کرم دین کی تجربہ کار نگاہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کے درست ہونے کے قوی امکانات تھے۔ اچانک کرم دین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”سرکار..... آپ کو یہ چپل کہاں سے ملی ہے؟“
”نذیر باجوہ کے باڑے میں سے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”جہاں نذیر کا بڑا بیٹا مشتاق باجوہ قتل ہوا ہے۔“
”اب تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے تمہارے دار صاحب۔“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔
”مشتاق باجوہ کے قتل میں خوشیا ڈنگر چور ہی کا ہاتھ ہے۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے کریدا۔ ”تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو۔ اس کا کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟“
”جناب! خوشیا ڈنگر چور ایک دہلا پتلا اور پست قامت شخص ہے جو اپنی جسامت سے چودہ پندرہ سال ہی کا لگتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس سائز کی چپل وہی پہن سکتا ہے۔“

”لیکن تم نے تو کبھی خوشیا کو دیکھا نہیں۔“ میں نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”اس کے باوجود بھی تمہیں اس کے چلیے اور فدا کاٹھ کا بخوبی علم ہے.....؟“
”وہ..... جی..... میں نے خوشیا ڈنگر چور کے بارے میں جو کچھ سن رکھا ہے، وہی بیان کر رہا ہوں۔“ وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔

”لیکن قانون سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے معاملات کو آگے نہیں بڑھاتا کرم دین۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیڑول سے چلتی ہے لیکن شک میں بھی وزن کی ضرورت ہوتی ہے۔“

میں نے قدرے سخت لہجہ میں استفسار کیا۔ ”مگر آج صبح تم نے خوشیا ہی کو نذیر باجوہ کے باڑے سے نکل کر فرار ہوتے دیکھا ہے تو پھر اس ڈنگر چور نے ان لوگوں کے مویشی چوری کیوں نہیں کیے۔ وہ مشتاق باجوہ کو قتل کر کے کیوں چلا گیا؟“
”یہ تو مجھے نہیں پتا جناب.....“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

”اور جو تمہیں پتا ہے اگر اس میں تمہاری کوئی بات غلط نکلی تو پھر مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہیں رکھنا کرم دین۔“ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ”میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا نہ دار صاحب! اگر میری کوئی بھی بات جھوٹی ثابت ہو تو جو کالے چور کی سزا..... وہ میری سزا۔“

”ٹھیک ہے، سچ جھوٹ کا فیصلہ وقت کرے گا۔“
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ کہ یہ جوتے بنانے کا کام تم کتنے عرصے سے کر رہے ہو؟“
”سرکار! خاندانی موچی ہوں۔ یہ کام باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

”اپنے کام کو پہچانتے بھی ہو؟“
”جی سرکار۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”میں اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتے کو دس سال بعد بھی دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے، میں ابھی تمہارا امتحان لیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے کپڑے کے تھیلے میں سے چپل کا وہ پاؤں نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا جو نذیر باجوہ کے باڑے میں سے ملا تھا۔

کرم دین موچی نے مذکورہ چپل کو گھما پھرا کر دیکھا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”یہ چپل میرے ہاتھ کی نہیں بنی ہوئی لیکن.....“

وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے اضطراری لہجہ میں دریافت کیا۔ ”لیکن کیا کرم دین؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”سرکار! آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ چپل کتنی عمر کے انسان کی ہوگی؟“

”یہی کوئی بارہ تیرہ سال کے بچے کی۔“ میں نے جواب دیا پھر الجھن زدہ انداز میں اسے ٹکٹنے لگا۔

”جی اس کے سائز سے تو یہی لگتا ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ”لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“

رہ کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا چروہاں سے اٹھ کر
تھانے آگیا۔ اس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ دن نے
ڈھلنا شروع کر دیا تھا لیکن ابھی تک گرمی کی شدت میں کوئی
کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

شام سے کچھ پہلے کاشمیل فرید خان اور کھوجی اللہ
رکھا بھی واپس آ گئے۔ کھوجی خاصا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں
نے اس کی آنکھوں کا سبب دریافت کیا تو وہ بولا۔

”ملک صاحب! میں نے ہارے سے لے کر گاؤں
کے آخری سرے تک کھرا نکالا ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں
کے قدموں کے نشان آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے تاہم میں
نے دو آدمیوں کا کھرا الگ سے نکالا ہے اور مجھے یقین ہے
کہ انہی میں سے کوئی ایک آپ کا مطلوبہ بندہ ہے۔“

”اب ذرا ان دو بندوں کے کھرے کی تفصیل بھی
بتاؤ چاہا۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”جناب! ان میں سے ایک تو کسی ننگے پاؤں والے
فحش کا کھرا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ کھرا چک چور اسی
سے نکل کر موضع نگر والی کی طرف چلا گیا ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”کرم دین موچی نے جس شخص کو ہارے کی دیوار پھلانگ
کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا، وہ بندہ بھی ننگے پاؤں
ہی تھا اور لوگوں کا عمومی خیال یہی ہے کہ وہ خوشیا ڈنگر چور
ہو سکتا ہے۔ خوشیا کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ
چہرے پر منڈا سا باندھ کر اور ننگے پاؤں ہی موچی چوری
کرنے آتا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پست قامت ڈنگر چور
ہے۔ دیکھنے میں بارہ تیرہ سال کا لڑکا نظر آتا ہے۔“

”ملک صاحب! خوشیا کے بارے میں یہ ساری باتیں تو
میں نے بھی سن رکھی ہیں۔“ اللہ رکھا نے ٹھہرے ہوئے لہجے
میں بتایا۔ ”لیکن یہاں معاملہ خاصا گڑبڑ ہے جناب۔۔۔۔۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔ کیا گڑبڑ ہے؟“ میں نے چونکے ہوئے
لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ جو میں نے ننگے پاؤں والے آدمی کے کھرے
کی بات کی ہے نا۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں کا سائز نارمل ہے یعنی
جتنا ایک عام آدمی کا ہوتا ہے لہذا وہ خوشیا ڈنگر چور تو نہیں
ہو سکتا البتہ میں نے جو دوسرا کھرا نکالا ہے، اس پر غور کیا
جاسکتا ہے۔“

”اور وہ دوسرا کھرا کس کا ہے؟“ میں نے سرسراتی
ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”ٹھیک ہے سرکار! آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے
ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے تو جو پتا تھا، وہ میں نے
آپ کو بتا دیا۔“

”صرف میں ہی نہیں، تم بھی اپنے کام کو بہت اچھی
طرح سمجھتے ہو کرم دین۔“ میں نے سائنسی نظر سے اس کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بڑی عمر کے چھوٹے پاؤں
کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے، وہ میرے ذہن سے
چپک کر رہ گیا ہے۔ میں اپنی تفتیش کے دوران میں اس نکتے
کو بھی اپنے ذہن میں رکھوں گا۔۔۔۔۔“

میرے اس تبصرے پر وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے اس
کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر دلدار سار کی
دکان میں چلا گیا۔ دلدار مہر چک چور اسی کا اکلوتا صراف تھا۔
دلدار مہر نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ وہ
ایک متناسب قد کا مالک اچھا خاصا موٹا انسان تھا۔ وہ صراف
سے زیادہ کوئی پہلوان یا دودھ والا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنی
آمد کی غرض و غایت سے اسے آگاہ کیا اور چاندی کی زنجیر
جیب سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دی۔

وہ اس خوب صورت زنجیر کو ہاتھوں میں گھمانے
پھرانے کے بعد تعریفی انداز میں بولا۔ ”بڑی سوہنی زنجیر
ہے تھانے دار صاحب اور اس میں لگا ہوا تگ بھی عمدہ قسم کا
عقین ہے۔ جس سار نے بھی اسے بنایا ہے، وہ اپنے کام کا
ماہر کار گیر لگتا ہے۔“

دلدار کے بیان سے بہت سی باتیں واضح ہو گئی تھیں
تاہم پھر بھی میں نے سوال کرنا ضروری جانا۔

”تو تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ زنجیر تمہارے
ہاتھوں نے نہیں بنائی؟“

”جی پکا یقین ہے۔“ وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ”میں
اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے زیورات کو دور سے دیکھ کر ہی
پہچان لیتا ہوں۔“

”کیا تم کوئی اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ زنجیر کس سار نے
بنائی ہوگی؟“ میں نے پُر امید نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”کیا تم نے آج سے پہلے اس زنجیر کو کہیں دیکھا ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”میں یہ جانتا چاہ رہا ہوں کہ یہاں چک
چور اسی کے کسی بندے کے پاس اس زنجیر کو دیکھا ہو؟“

اس بار بھی اس نے نفی میں جواب دیا۔
میں مزید چند منٹ تک دلدار مہر کی دکان میں موجود

پُر خیال انداز میں کہا۔

”سراسر دھوکا ملک صاحب۔“ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے بازے کے اندر بھی مختلف مقامات کو بڑی توجہ سے چیک کیا ہے۔ ننگے پاؤں والے آدمی کا کھرا تو مقتول کی چارپائی کے نزدیک اور وہاں سے بیرونی دیوار تک پایا گیا ہے لیکن چپل کا یا اس سائز کے پاؤں کا کھرا کہیں بھی نظر نہیں آیا۔“

”اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشتاق باجوہ کا قاتل وہی ننگے پاؤں والا شخص ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس نے کیس کو الجھانے اور ہمیں گمراہ کرنے کے لیے چپل کا ایک پاؤں بازے کے اندر پھینکا اور دوسرے پاؤں سے باہر نشانات بنائے تاکہ ہمارا دھیان کسی چھوٹے ہاتھ پاؤں والے شخص کی طرف جائے جیسے خوشیا ڈنگر چور۔“

”قاتل کافی چالاک اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے ملک صاحب۔“ اللہ رکھا نے تبصرہ کیا۔ ”چپل والا کھرا صرف بازے کی دیوار سے کھیتوں تک ہے۔ اس کے بعد کہیں نہیں جبکہ ننگے پاؤں والا کھرا چک چور اسی سے نکل کر گروالی تک چلا گیا ہے۔“

”کیا تم اس ننگے پاؤں والے کھرے کے تعاقب میں گروالی گئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

موضع گروالی چک چور اسی سے لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور چک چور اسی کی اسی سمت واقع تھا جدھر نئی پورہ۔ نئی پورہ اور گروالی آپس میں قریبی گاؤں تھے۔

”جی ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس کھرے کا گروالی تک پیچھا کیا ہے۔ وہ کھرا گروالی کے اندر جا کر گم ہو گیا ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد اس شخص نے جوتے پہن لیے ہوں گے اسی لیے ننگے پاؤں کا کھرا غائب ہو گیا تھا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل کا تعلق گروالی ہی سے ہے۔“ ”فی الحال تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔“ وہ پُر خیال انداز میں بولا۔ ”اگر وہ بندہ گروالی سے نکل کر آگے کہیں گیا ہے تو اس کے کھرے کو پکڑنا ممکن نہیں۔“

”اس بد بخت کا کھرا پکڑا جائے یا نہیں پکڑا جائے لیکن میں اس کی گردن ضرور دیوچ کر رہوں گا۔“ میں نے

”آپ نے مجھے چپل کا ایک پاؤں دکھا کر کھرا نکالنے کے لیے کہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”دوسرا کھرا اسی چپل والے پاؤں کا ہے یعنی بارہ تیرہ سال کے کسی لڑکے کا کھرا مگر اس کھرے کے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے ملک صاحب۔“

”کیسا عجیب معاملہ؟“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”آپ نے مجھے چپل کا دایاں پاؤں دکھایا تھا۔“ کھوجی اللہ رکھا نے بتایا۔ ”دوسرا کھرا اسی چپل کے بائیں پاؤں کا ہے۔“

”ظاہر ہے چاچا۔۔۔۔۔ جب اس کے دائیں پاؤں کی چپل دیوار پھلانگتے ہوئے بازے میں گر گئی تو پھر باہر بائیں پاؤں کا کھرا ہی ملے گا!“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ بازے سے باہر نکلتے ہی کیا وہ بندہ ایک پاؤں کا ہو گیا تھا؟“ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے ابھمن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جناب! بازے سے کھیتوں تک صرف اس بندے کے بائیں پاؤں کا کھرا ہے اور اس کے ساتھ دایاں پاؤں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر دائیں پاؤں کی چپل بازے میں رہ گئی تھی تو باہر ایک چپل اور ایک ننگے پاؤں کا کھرا ملنا چاہیے نا؟“

”بالکل۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”لیکن ایسا نہیں ہوا ملک صاحب!“ وہ گہمیر لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی شخص نے بائیں پاؤں کی اس چپل کا کھرا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے یعنی اس چپل کے نشانات زمین پر ڈالے ہیں کیونکہ۔۔۔۔۔“ لگاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکوؤں اور مجرموں کے کھرے نکالے ہیں جو اپنی عیاری اور مکاری میں کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اپنے اسی تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بازے سے کھیتوں تک بائیں پاؤں کی چپل کا جو کھرا دیکھا ہے وہ مصنوعی ہے۔ یعنی وہ چپل کسی پاؤں نے نہیں پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں کے مخصوص دباؤ سے مختلف انداز کا کھرا بنتا ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائیں پاؤں کی چپل کا وہ کھرا دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا ہے۔“ میں نے

تاک موت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ جیلہ پر تو گویا دہری قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ایک طرف اس نے جس بچے کو جنم دیا، وہ اپنی پیدائش کے آدھے گھنٹے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جیلہ تک یہ اطلاع پہنچی کہ کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے اس کے خاوند کو قتل کر دیا ہے۔ گزشتہ رات جیلہ نے ایک بچے کو جنم دیا تھا جو اپنی زندگی کی چند سانس لینے کے بعد چل بسا تھا۔ اس دہرے غم نے جیلہ کو اس بری طرح نڈھال کر رکھا تھا کہ اس سے کچھ بھی پوچھنا ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کی ذہنی حالت اس قابل نہ ہوتی کہ میں اس سے سوال و جواب کر سکتا، اس سے بات کرنا بھی اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ تک جیلہ کے گھر والوں سے بات چیت کرتا رہا اور انہیں تسلی دی کہ میں بہت جلد مشتاق کے قاتل کو پکڑ لوں گا۔ وہ نامراد خونِ زیادہ عرصے تک آزاد نہیں گھوم سکے گا۔ اس کے بعد ہم گروالی کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں گروالی میں پہلے بھی ایک دو بار آچکا تھا۔ یہاں کے چودھری فرزند علی سے میری دعا سلام تھی۔ میں سیدھا چودھری کی حویلی پہنچ گیا۔ فرزند علی اس وقت حویلی میں موجود تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور اپنی بیٹھک میں بٹھایا۔ رکی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! خیریت تو ہے نا..... آج صبح ہی صبح ہمارے گاؤں کا رخ اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے.....“

”چودھری صاحب! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت صبح نہیں ہے۔“ میں نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا۔

”دوسری بات یہ کہ میں اسپیشلی آپ سے ملاقات کرنے نہیں آیا۔ ڈیوٹی اور فرض جب اور جس سمت دھکا دے دیں..... آنا پڑتا ہے۔“

”اوہ..... لگتا ہے، آپ کسی خطرناک مجرم کی تلاش میں گروالی آئے ہیں۔“ اس نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

”چودھری صاحب! ایک روز پہلے موضع چک چوراسی میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں اسی قاتل کی تلاش میں ہوں۔“

”کہیں آپ مشتاق باجوہ کے قتل کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”جی جی..... وہی.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تو اس واردات کی اطلاع آپ تک پہنچ چکی ہے؟“

سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی ایک اور نشانی ہے میرے پاس۔“

اللہ رکھانے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔

”چاچا! تم نے چک چوراسی سے گروالی تک کھرا نکالتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا نا..... کسی کو شک تو نہیں ہوا تمہاری کارروائی پر؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ میں کس کام پر لگا ہوا تھا۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم گھر جا کر آرام کرو اور کل صبح تھانے حاضر ہو جانا۔ تمہیں کل میرے ساتھ ہی پورہ جانا ہوگا۔“

”نہی پورہ کس لیے جناب؟“ اس نے پوچھا۔

”ہے کوئی کام۔“ میں نے سرسری انداز میں بتایا۔ ”وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم گروالی کا رخ کریں گے۔“

”سمجھ گیا ملک صاحب پر.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے پوچھا۔ ”پر کیا؟“

”وہ جی..... آپ نے مجھ سے انعام کا وعدہ کیا تھا.....“ وہ یاد دلانے والے انداز میں بولا۔

”تو میں کب اپنے وعدے سے مکر رہا ہوں۔“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ”پہلے قاتل کو قابو کر لوں پھر تمہیں انعام بھی دوں گا۔“

”بھول نہ جانا سرکار.....“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”فکر نہیں کرو چاچا!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا بھی کروں گا۔“ وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں اور کھوجی اللہ رکھا گھوڑوں پر سوار ہو کر نئی پورہ پہنچ گئے۔ نئی پورہ مقتول مشتاق باجوہ کا سسرالی گاؤں تھا جو چک چوراسی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ نذیر باجوہ نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کی بیوی جیلہ ان دنوں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کے یہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔

نئی پورہ پہنچ کر جیلہ کے گھر تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مشتاق باجوہ کے قتل کی خبر نئی پورہ پہنچ چکی تھی۔ جیلہ اپنے شوہر کی عبرت

صاحب۔ "میں نے گمبیر انداز میں کہا۔ "کیا آپ اس لاکٹ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟"

"جانتا تو نہیں ہوں....." وہ پرسوج لہجے میں بولا۔

"مگر جاننے کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں.....!" میں نے سوالیہ نظرت اس کی طرف دیکھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے بیٹھک کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔

"اوائے ظفر.....!"

اگلے ہی لمحے ایک ہٹا کٹا ملازم صورت فحش دروازے میں نمودار ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ ظفر نامی وہ شخص چودھری فرزند علی کا ملازم خاص تھا۔

"حکم چودھری صاحب!" ظفر نے بڑی فرماں برداری سے پوچھا۔

"کسی بندے کو بھیج کر منظور ستار کو یہاں بلا لے۔"

چودھری نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جی چودھری صاحب۔" ظفر گردن کے ہلکے سے خم کے ساتھ بولا۔

"اور وہ..... اندر کہہ دیا ہے نا؟" چودھری نے پوچھا۔

"جی جی..... بس دو منٹ لگیں گے....."

چودھری نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور ظفر کو جانے کا اشارہ کرنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"منظور بڑا کارگر ستار ہے ملک صاحب۔ وہ اس زنجیر کو دیکھ کر فوراً پہچان لے گا کہ گروالی کے کس بندے نے اس سے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ اس طرح قاتل تک پہنچنے میں آپ کو کافی آسانی ہو جائے گی۔"

چودھری اس تجربے کو دہرائے جاتا تھا جو میں چک چوراسی میں دلدار مہر ستار کے ساتھ کر چکا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ لاکٹ منظور ستار ہی کا تیار کردہ ہے تو پھر واقعی آسانی ہو جائے گی لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تعقیب کی گاڑی کو بریک لگ جائے گا۔"

اسی لمحے دو ملازم دوڑے اٹھائے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ مذکورہ ٹرے سامان خور و نوش سے لدی پھندی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً سمجھ لیا کہ تھوڑی دیر پہلے ظفر نے اسی "سامان" کے یہاں پہنچنے کے حوالے سے "دو منٹ لگیں گے" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

"مجھے آج صبح ہی اس واقعے کا پتا چلا ہے۔"

چودھری فرزند علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ملک صاحب.....!"

"کون سی بات چودھری صاحب؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"مشاق پاچوہ کے قتل کا گروالی سے کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے چودھری صاحب۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے قاتل کا کھرا نکلوایا ہے۔ قاتل چک چوراسی سے سیدھا گروالی پہنچا ہے۔"

"گروالی میں کہاں؟" وہ سنسناتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کھرے نے یہ بھی تو بتایا ہوگا نا کہ قاتل کس گھر میں گیا ہے۔"

"نہیں.....!" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ پتا نہیں چل سکا۔ اصل میں قاتل جو کوئی بھی ہے، اس نے چک چوراسی سے گروالی تک ننگے پاؤں سفر کیا ہے۔ گروالی میں داخل ہونے تک اس کے ننگے پاؤں کا کھرا ملا ہے۔ اس کے بعد کھرا غائب ہو جاتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ گروالی کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے جوتے پہن لیے تھے۔"

"اوہ..... یہ تو خاصی پیچیدہ صورت حال ہے۔"

چودھری نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "پھر کیسے پتا چلے گا کہ قاتل کون ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس بندے کا گروالی سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ گروالی میں داخل ہونے کے بعد اس نے جوتے پہنے اور پھر آرام سے چلتے ہوئے گروالی سے باہر نکل گیا..... مطلب کسی اور طرف چلا گیا ہو۔"

"ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو قاتل تک راہنمائی کر سکتی ہے۔"

"کیا چیز؟" اس نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

میں نے اپنی جیب میں سے وہ لاکٹ نکال کر چودھری کی جانب بڑھا دیا جس میں ایک عمدہ قسم کا عقیق جڑا ہوا تھا اور کہا۔ "یہ ہمیں جائے وقوع سے ملا ہے اور اس کا تعلق مقتول یا اس کے گھر کے کسی فرد سے نہیں ہے۔"

"اوہ..... خاصا خوب صورت لاکٹ ہے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے تعریفی لہجے میں بولا۔

"اگر جائے وقوع سے ملا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قاتل کی ملکیت ہو سکتا ہے۔"

"میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں چودھری

”گاڑی کو بریک نہیں گئے تو چھ پیٹ پوجا ہو سکے گی
تا۔“ چودھری نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر ان
ملازمین کو مختلف ہدایات جاری کرنے لگا۔

ملازمین نے بڑی صفائی اور سلیقے سے وہ نعمتیں
ہمارے سامنے چن دیں۔ چونے آم کی قاشیں، کپکے ہوئے
جامن، دودھ سے بھرے ہوئے دو جگ اور زیرے والی
چائی کی ٹمکلیں لسی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ملازمین واپس
چلے گئے تو میں نے کہا۔

”چودھری صاحب! آپ نے بہت زیادہ تکلف
کر لیا ہے۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ملک صاحب۔“ وہ زیر لب
مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تو آپ نے دوپہر کا کھانا بھی
ادھر ہی کھانا ہے۔ میں آپ کے لیے دیسی گکڑ اور بکری کا
گوشت بنوا رہا ہوں۔“

”بس بس چودھری صاحب۔“ میں نے ہنڈ زاپ
ہوتے ہوئے کہا۔ ”جو سامنے حاضر ہے، اسی سے یہ احسن
طریقہ نمٹ لیا جائے تو کافی ہے۔ دیسی گکڑ اور بکری کی
ڈشیں پھر کبھی سہی۔“

”جیسی آپ کی مرضی جناب۔“ وہ مصلحت آمیز لہجے
میں بولا۔ ”میں آپ کے ساتھ زور زبردستی تو نہیں کر سکتا ورنہ
آپ مجھے حوالات میں بند کر دیں گے۔“

”میں صرف ان لوگوں کو حوالات میں بند کرتا ہوں
جنہوں نے کوئی جرم کیا ہوتا ہے۔“ میں نے مذاق کے رنگ
میں کہا۔ ”آپ کے حوالے سے ابھی تک میرے پاس ایسی
کوئی اطلاع نہیں آئی۔“

”اور انشاء اللہ..... کبھی آئے گی بھی نہیں۔“ چودھری
نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ہم خدا کی نعمتوں سے انصاف کرتے ہوئے باہمی گفتگو
بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں منظور سنا بھی
وہاں حاضر ہو گیا۔ منظور کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان
رہی ہوگی۔ وہ متناسب جسم کا مالک ایک پست قامت شخص تھا
جس کا سر بالوں ایسی فضل سے لگ بھگ محروم ہو چکا تھا۔

منظور نے جب ماہرانہ انداز میں چاندی کے اس
لاکٹ کا معائنہ کیا تو اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی
چمک پیدا ہوئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی وقت محسوس نہ
ہوئی کہ وہ شناسائی کی چمک تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے
میرے خیال کی تائید کر دی۔

منظور کے مطابق، عقیق والا وہ لاکٹ اسی کے ہاتھوں

کا بننا ہوا تھا جو اس نے گکروالی کے ایک دستیک بھولا کے
لیے بنایا تھا۔ بھولا کا اصل نام اسلم تھا مگر وہ ”بھولا“ کے نام
سے مشہور تھا۔ میں نے بھولا کے گھر کا ایڈریس اور لوکیشن کو
نوٹ کیا اور چودھری کی حویلی سے اٹھ آیا۔

”ملک صاحب!“ میرے ساتھ چلتے ہوئے کھوجی
اللہ رکھانے کہا۔ ”جو بندہ ننگے پاؤں مقتول کے بازے
سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا اور پھر چک چوراسی سے نکل
کر ننگے پاؤں گکروالی تک آیا ہے، اس کے پاؤں کا کھرا
میرے ذہن میں محفوظ ہے اور زمین پر بھی بعض جگہ محفوظ
ہوگا۔ ہم جس بھولا کی طرف جا رہے ہیں اس کے پاؤں کو
دیکھ کر اس کھرے سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔“

اللہ رکھانے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ میں نے
کہا۔ ”ٹھیک ہے چاچا! بھولا اتنے چڑھ جائے تو یہ بھی چیک
کر لیں گے۔“

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم اسلم عرف بھولا کے
دروازے پر کھڑے تھے۔ تیسری دستک پر دروازہ ایک
جوان جہان عورت نے کھولا پھر میری وردی پر نگاہ پڑتے
ہی وہ بدکی اور فوراً دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں
نے دروازے کے بیچ میں پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش
نا کام بنادی اور کہا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں بی بی۔ میں معمول کی
ایک کارروائی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کیا یہ بھولا کا ہی
گھر ہے؟“

”جی..... جی.....“ وہ دروازے کی اوٹ سے بولی۔
”بھولا کو باہر بھیجو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے
میں کہا۔ ”مجھے اس سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”بھولا تو اس وقت گھر میں نہیں ہے جی۔“
”وہ کہاں گیا ہے اور تم کون ہو؟“ میں نے کڑے
لہجے میں استفسار کیا۔

”میرا نام زاہدہ ہے جی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور
میں بھولا کی بیوی ہوں۔ بھولا اپنی بہن سے ملنے اگوکی گیا
ہوا ہے۔“

اگوکی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو گکروالی کے شمال میں
دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے زاہدہ سے پوچھا۔
”بھولا اگوکی کب گیا ہے اور اس کی واپسی کب تک
ہوگی؟“

”جی، وہ آج صبح ہی اگوکی گیا ہے اور شام تک واپس
آجائے گا۔“ اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”آپ کو بھولا

فروری 2017ء

130

سسپنس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے قتل کر دیا ہے۔“

زاہدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔
میں نے پوچھا۔ ”کیا تم مشتاق باجوہ کو اچھی طرح جانتی ہو؟“

”نہیں جی.....“ اس نے متذبذب انداز میں سرکونی میں جنبش دی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”دیکھو زاہدہ! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں ذرا دکھری ٹائپ کا تھانے دار ہوں۔ جو لوگ مجھ سے تعاون کرتے ہیں، میں انہیں ہر قسم کی رعایت دے دیتا ہوں اور جو لوگ مجھے چکر دینے کے لیے غلط بیانی سے کام لیتے ہیں، میں انہیں سخت سزا دے کر نمونہ عبرت بنا دیتا ہوں اس لیے.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم مشتاق باجوہ یا اس کے قتل کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو مجھے سچ سچ بتا دو.....!“

”نہیں جی..... میں مشتاق باجوہ کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولی۔

”اور مشتاق باجوہ کے بارے میں.....؟“

”کچھ زیادہ نہیں جی۔“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ نذیر باجوہ کا بیٹا تھا اور یہ کہ..... ایک سال پہلے جیل سے اس کی شادی ہوئی تھی لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ مشتاق باجوہ کے قتل کے سلسلے میں ہمارا دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے ہیں؟“

”وہ اس لیے کہ مشتاق باجوہ کے قتل میں تمہارے خاوند بھولا کا ہاتھ ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہائے ربا! میں مر جاؤں۔“ وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

”بھولا ایسا کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”پولیس غلط فہمی کو بنیاد بنا کر تفتیش نہیں کرتی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھوس ثبوت ہاتھ لگتا ہے جیسی ہم پیش قدمی کرتے ہیں۔“

”بھولا کے خلاف آپ کے پاس کون سا ٹھوس ثبوت ہے؟“ وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

میں نے عقیق والی چاندی کی زنجیر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ ”اس لاکٹ کو

سے کیا کام ہے..... سب خیریت تو ہے نا؟“

اس دوران میں چند افراد بھی ہمارے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں پر تشویش جھلکتی تھی۔

وہ جانتا چاہتے تھے کہ پولیس بھولا کے دروازے تک کیوں پہنچی ہے۔

”اگر سب خیریت ہوتی تو مجھے چل کر یہاں نہ آنا پڑتا۔“ میں نے سنناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہارے گھر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں آرام سے بیٹھ کر بات ہو سکتی ہو؟“

”جی، میں آپ کے لیے بیٹھک کھولتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں زاہدہ کے روبرو اس کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس وقت زاہدہ کے سوا اس گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ جب یہی سوال میں نے

زاہدہ سے کیا تو اس نے جواب دیا۔

”تمہانے دار صاحب! اس گھر میں بھولا اور میں ہی رہتے ہیں۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”اب بتائیں، معاملہ کیا ہے؟“

”معاملہ خاصا گہمیر ہے زاہدہ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”چک چوراسی میں ایک بندہ قتل ہو گیا ہے۔“

”چک چوراسی.....“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”کون بندہ قتل ہوا ہے جی؟“

”کیا تم چک چوراسی اور وہاں کے بندوں کو جانتی ہو جو اتنی دلچسپی سے پوچھ رہی ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی..... جی ہاں.....“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”چک چوراسی میرا میکا ہے جناب۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی تو میں بیاہ کر گروالی آئی ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں زاہدہ کے انکشاف پر چونک اٹھا۔

”اب بتائیں، چک چوراسی میں کون بندہ قتل ہو گیا ہے؟“ اس نے فکر مندی سے دریافت کیا۔

”بندے کا نام ہے مشتاق باجوہ۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”کل رات میں کسی شقی القلب شخص نے اسے باڑے کے اندر سوتے میں بڑی بے دردی

پہچانی ہو؟“
 ”یہ تو بھولا کا ہے جی۔“ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔
 ”یہ تو ہمیشہ اس کے گلے میں رہتا ہے۔ آپ کو یہ کہاں سے ملا؟“

”جائے وقوعہ سے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مشتاق باجوہ کو قتل کرنے کے بعد فرار کے وقت باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے یہ لاکٹ اس کے گلے سے گر گیا تھا۔“

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں زاہدہ کو بتایا کہ کس طرح بھولا نے قتل کی اس واردات کو خوشیا ڈنگر چور کے سر ڈالنے کے لیے کسی بارہ پندرہ سالہ بچے کے پاؤں کے نشانات باڑے سے کھیتوں تک بنائے تھے اور اس سائز کی ایک چپل کا پاؤں بھی باڑے میں پھینک دیا تھا اور کس طرح اس نے خود ننگے پاؤں چک چور سی سے لگروالی تک سفر کیا تاکہ اس کا کھرا پکڑ میں نہ آ سکے۔ اس کی بد قسمتی کہ باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے اس لاکٹ کی زنجیر کھل گئی اور لاکٹ باڑے کے اندر گر گیا۔ پھر اسی لاکٹ نے مجھے تمہارا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کر دیا۔

”پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں تمہانے دار صاحب۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔“

”دیکھو زاہدہ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر تم اس واردات کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے تو بھولا کے ساتھ تم بھی سیدھی جیل جاؤ گی۔“

”نہیں..... نہیں۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا جی۔ میں جتنا جانتی تھی، وہ سب آپ کو بتا دیا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے یہ دستور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ بھولا اپنی بہن سے ملنے آگئی کیا ہے۔ اس کی آگئی والی بہن کا نام کیا ہے؟“

”سلٹی.....“ اس نے جواب دیا۔ ”سلٹی، بھولا کی بڑی بہن ہے۔“

”سلٹی کے گھر والے کا نام کیا ہے؟“

”شوکت علی۔“ زاہدہ نے جواب دیا۔ ”ان کے پانچ بچے ہیں۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔“

”ٹھیک ہے زاہدہ۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ جب شام میں بھولا آگئی سے واپس آئے تو تم اسے سیدھا میرے پاس تھانے بھیجو گی۔ سمجھ میں آئی میری بات.....!“

”تو کیا آپ اسے گرفتار کرنے آگئی نہیں جائیں گے؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”میں کیا کروں گا اور کیا نہیں کروں گا، یہ تمہارے نہیں، میرے سوچنے کا کام ہے۔“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھے میرا کام سکھانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تم سے جو کہا ہے، بس اسے یاد رکھو۔“

”جی، جی..... بالکل..... میں سمجھ گئی۔“ وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”بھولا جیسے ہی گھر آئے گا، میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گی۔“

میں کھوجی اللہ رکھا کے ہمراہ بھولا کے گھر سے نکل آیا۔ کھوجی نے مجھ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! کیا آپ واقعی بھولا کی واپسی کا انتظار کریں گے؟“

”نہیں!“ میں نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے، ہم آگئی جارہے ہیں.....؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”ہم نہیں..... تم۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں جناب۔“ اس کے لہجے میں حیرانی درآئی۔ ”کیا میں اکیلا ہی آگئی جاؤں گا؟“

”ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ہم دونوں تھانے جائیں گے۔ پھر میں تمہارے ساتھ کسی چاق و چوبند اہلکار کو آگئی کی طرف روانہ کروں گا اور تم دونوں بھولا کو گرفتار کر کے تھانے لاؤ گے، چاہے کتنی بھی دیر لگ جائے۔ بھولا آگئی سے لگروالی نہیں بلکہ سیدھا حوالات میں پہنچے گا۔“

”جی..... میں سمجھ گیا ساری بات۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر چونک کر مستفسر ہوا۔ ”ایک بات تو بتائیں ملک صاحب!“

”ہاں پوچھو چاہا۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”اگر بھولا کے پاؤں کا کھرا اس ننگے پاؤں والے بندے کے کھڑے سے میچ کر جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے قاتل کا سراغ لگا لیا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور اگر بھولا کا کھرا اس سے مختلف نکلا تو کیا پھر بھی

”کل کی کل ہی دیکھی جائے گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”اگو کی والے تجربے کی کیا رپورٹ ہے؟“

”وہ رپورٹ تو حوصلہ افزا نہیں ہے جی۔“ وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے نیچے پاؤں والے جس بندے کا کھرا نکالا ہے، وہ بھولا کے پاؤں سے میچ نہیں کرتا جناب۔“ اللہ رکھا صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اصل پتا اسی وقت چلے گا جب صبح جائے وقوعہ پر جا کر بھولا کے پاؤں کے نشانات کو چیک کیا جائے گا۔“

کھوجی کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اسے اگلی صبح تھانے میں حاضر ہونے کی تاکید کرنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی پھر بھولا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا اور یہ کہ ہم کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے پکڑ لائے ہیں۔ میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے اسے دیکھتا رہا پھر چاندی کی زنجیر والا لاکٹ اس کی نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”اسے پہچانتے ہو؟“

اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی اور وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“

”پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی پہچانتا ہوں۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا ہے..... اپنی چیز کو کوئی کیسے نہیں پہچانتے گا تھانے دار صاحب۔“

”اگر تم نے مشتاق باجوہ کو قتل نہیں کیا تو تمہارا یہ لاکٹ مقتول کے باڑے میں بیٹھا انڈے دے رہا تھا کیا.....“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ ہمیں جائے وقوعہ سے ملا ہے۔“

”جناب..... سوہنے رب دی قسم! میں نہیں جانتا یہ جائے واردات تک کیسے پہنچا۔“ وہ گھلیانے والے انداز میں بولا۔ ”میں تو خود اسے تلاش کر کے تھک گیا ہوں۔“

میں نے بڑے چاؤ سے یہ لاکٹ منظور سنار سے بنوایا تھا۔ ”تم اسے تلاش کیوں کر رہے تھے؟“ میں نے سخت

اسے گرفتار کر کے لاتا ہے؟“

”لگتا ہے، تمہیں اپنے انعام کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے۔“ میں نے ڈانٹ سے مشابہ انداز میں کہا۔ ”صورت

کوئی بھی ہو، میں آج کی تاریخ میں بھولا کو اپنے سامنے تھانے میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جہاں تک کھرے کی میچنگ کا تعلق ہے.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری

سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس میچنگ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قاتل کو پکڑ لیا۔ جب تک بھولا کا ٹرائل نہ ہو جائے اور یہ پتا نہ چل جائے کہ وہ کون سی اسٹوری سناتا ہے، ختمی طور پر کچھ نہیں کہا

جاسکتا۔“

”جی..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم تھانے پہنچ گئے۔

☆☆☆

موسم گرمیوں میں رات چھوٹی اور دن طویل ہوتا ہے اور اس حوالے سے ماہ جون گرمی کا سردار مہینہ تصور کیا جاتا ہے۔

نوجون کی شام ادھر مغرب کی اذان ہوئی، ادھر کھوجی اللہ رکھا اگو کی سے واپس آ گیا۔ میں نے سب انسپکٹر گل داد کو

اللہ رکھا کے ہمراہ، بھولا کی گرفتاری کے لیے اگو کی روانہ کیا تھا..... اور وہ دونوں کامیاب لوٹے تھے۔

اسلم عرف بھولا کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے قریب لگایا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مالک ایک پست قامت شخص تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا بھی مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ گل داد

نے اسے الٹی ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ بھولا اپنی گرفتاری پر کافی جھل بھی رہا تھا۔ جب اسے میرے سامنے پیش کیا گیا تو اس

نے شکایتی لہجے میں مجھ سے کہا۔

”تھانے دار صاحب! ان لوگوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“

گل داد نے اسے دبا مارا۔ ”اوئے باگڑ تلے کی اولاد..... قتل کی واردات کرتے ہو اور معصوم بھی بنتے ہو۔“

زیادتی کیا ہوتی ہے، یہ تو تمہیں حوالات میں جا کر پتا چلے گا۔“ میں نے اشارے سے اللہ رکھا کو اپنے پاس بلایا اور

پوچھا۔ ”تم نے کھرے کا تجربہ کر لیا..... کیا رپورٹ ہے؟“

”تجربہ تو ادھر اگو کی ہی میں کیا ہے جناب۔“ اللہ رکھا نے بتایا۔ ”جب ہم یہاں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔“

چک چور اسی میں مقتول کے باڑے سے کھیتوں تک کا تجربہ گل صبح ہی ہو سکے گا۔“

لہجے میں دریافت کیا۔
 ”تمن چار دن پہلے یہ گم ہو گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”کیا تم اسے کہیں رکھ کر بھول گئے تھے؟“ میں نے

ایک امکانی بات کی۔ ”تمہارا نام بھولا ہے نا..... بھولا سے
 بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔“

”نہیں جی۔ مجھ سے کوئی بھول چوک نہیں ہوئی۔“ وہ
 نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اسے گلے سے
 اتارتا ہی نہیں تھا۔“

”اوئے ایکثر کی اولاد.....“ میں نے گھور کر اس کی
 آنکھوں میں دیکھا۔ ”میرے سامنے اداکاری کی تو اتنا
 ماروں گا کہ آنے والی سات کسلیں سنجی پیدا ہوں گی۔“

”جناب! میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ فریادی لہجے
 میں بولا۔

”سچ کے گھوڑے!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
 ”اگر تم اس لاکٹ کو گلے سے اتارتے ہی نہیں تھے تو پھر یہ
 غائب کیسے ہو گیا۔ کیا اس کے پر نکل آئے تھے جو ”مچر“ سے
 اڑ گیا اور تمہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی؟“

”تھانے دار صاحب! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا
 ہے کہ تمن چار دن پہلے یہ لاکٹ گم ہو گیا تھا۔“ وہ حسب
 استطاعت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ایک رات میں
 گھر آ کر سویا اور جب صبح اٹھا تو یہ میرے گلے میں موجود
 نہیں تھا۔ میں نے اور زاہدہ نے گھر کا چٹا چٹا دیکھ لیا لیکن
 کہیں بھی لاکٹ نہیں ملا۔ پھر میرے ذہن میں یہی آیا کہ
 رات کو کھیتوں سے واپسی پر راستے میں کہیں گر گیا ہوگا.....“
 لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر
 اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگلی صبح میں نے سارا راستہ چھان مارا اور کھیتوں
 میں بھی اچھی طرح دیکھ لیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا اور اب.....
 آپ کے پاس ہے یہ..... میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ آپ تک
 کیسے پہنچا.....؟“

”تمہارے تو بڑے بھی جان جائیں گے کہ کیسے
 پہنچا، ایسے پہنچا، یا ویسے پہنچا۔“ سب انسپکٹر گل داد نے
 گردن سے پکڑ کر اسے ایک جھٹکا دیا پھر مجھ سے مخاطب
 ہوتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! آپ آج رات کے لیے اسے
 میرے حوالے کر دیں۔ صبح تک اس کی زبان کے سارے
 قفل کھل جائیں گے۔“

”جناب! میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ وہ دونوں

ہاتھ جوڑتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اگر آپ کو
 میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں بڑی سے بڑی قسم
 کھانے کو تیار ہوں۔“

ایک لمحے کے لیے وہ مجھے انتہائی بے بس دکھائی دیا۔
 مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں
 لے رہا اور اگر وہ ایکٹنگ کر رہا تھا تو پھر اس کی اداکاری کو
 لا جواب اور بے مثال کہا جاسکتا تھا۔ میں نے اس کی
 آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”بھولا! تم سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات
 کہاں تھے؟“
 مشتاق باجوہ کے قتل کی اطلاع آٹھ جون کی صبح
 تھانے پہنچائی گئی تھی اور لاش کی حالت سے میں نے اندازہ
 لگایا تھا کہ اسے رات کے آخری حصے میں موت کے گھاٹ
 اتارا گیا تھا یا نصف شب کے قریب یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

”جی..... اس رات میں چک چوراسی میں تھا۔“
 بھولانے جواب دیا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ ”چک چوراسی.....“ بے ساختہ
 میرے منہ سے نکلا۔ ”مشتاق باجوہ کو بھی تو چک چوراسی ہی
 میں قتل کیا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ تمہارا اس واردات سے
 کوئی تعلق واسطہ نہیں..... ہوں؟“

”جناب! مجھے تو آپ کے لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ
 مشتاق باجوہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“ وہ مسکین سے لہجے
 میں بولا۔ ”میں تو آٹھ جون کی صبح ہی چک چوراسی سے نکل
 آیا تھا اور اس وقت تک ایسی کوئی بات میرے سننے میں نہیں
 آئی تھی۔“

”تم چک چوراسی گئے کب تھے؟“ میں نے اسے کریدا۔
 ”جی سات جون کی شام میں چک چوراسی پہنچا
 تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم چک چوراسی کس مقصد سے گئے تھے؟“ میں
 نے پوچھا۔ ”اور کس کے گھر گئے تھے؟“

”جی، میں اپنی سسرال گیا تھا۔“ اس نے
 جواب دیا۔ ”ادھر چک چوراسی میں زاہدہ کے ماں
 باپ رہتے ہیں۔ زاہدہ نے کچھ سامان دے کر مجھے ان
 کے پاس بھیجا تھا۔“

زاہدہ کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ اس کا تعلق
 بھی چک چوراسی ہی سے تھا۔ چند ماہ پہلے وہ بیاہ کر
 گروالی آئی تھی۔

”کیا زاہدہ کے گھر والے یعنی تمہارے سسرالی اس

ہاتھ نہیں لیکن واقعات کی کڑیاں کچھ اور ہی بیان کر رہی تھیں۔ بھولا کا پسندیدہ لاکٹ جائے وقوعہ پر پڑا تھا اور ابھی تازہ تازہ انکشاف یہ ہوا تھا کہ سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات بھولا نے موضع چک چوراسی میں گزاری تھی۔ چک چوراسی وہی گاؤں تھا جہاں ایک باڑے میں اسی رات کے درمیانی یا آخری حصے میں مشتاق باجوہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ گویا وقوعہ کی رات بھولا جائے واردات کے بہت قریب موجود تھا۔ یہ تمام عوامل بھولا کے مجرم ہونے کی جانب اشارہ کرتے تھے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا تاہم رات جب تک میں سو نہیں گیا، مشتاق باجوہ کے قتل اور اس کے محرکات کی ایک فلم سی میرے دماغ میں چلتی رہی اور مجھے نہیں پتا، میں کب خیندکی وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

دس جون کی صبح خلاف معمول نرم خوشی، مطلب یہ کہ اس روز سورج جلالیت کے بجائے جمالیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ آسمان ابر آلود اور فضا ساکت تھی۔ نہ گرمی اور نہ خشکی۔ بس غیر یقینی سی صورت حال تھی البتہ دھوپ کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میں نے نذیر باجوہ اور اس کے چھوٹے بیٹے یوسف باجوہ کو برآمدے میں بیٹھے دیکھا۔ نذیر باجوہ نے اٹھ کر مجھے سلام کیا۔ میں سر کی اشاری جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھوجی بابا اللہ رکھا میرے پاس آ گیا۔

رکی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا: ”کیا حکم ہے ملک صاحب!“

”جو کام کل ادھورا چھوڑا تھا اس کی تکمیل ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”بس فی الحال تو تمہارے لیے یہی حکم ہے۔“

”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھولا کو اپنے ساتھ جائے وقوعہ تک لے جاؤں؟“ وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے پاؤں کے فریش کھرے کی موجودگی میں کام آسان اور جلدی ہو جائے گا۔ میں گھنٹے، دو گھنٹے میں واپس آ کر آپ کو فائل رپورٹ دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”تم باہر جا کر بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں تمہیں بلاتا ہوں۔“

”بہتر جناب!“ اس نے کہا اور میرے کمرے سے

بات کی گواہی دیں گے کہ تم نے سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات ان کے گھر میں گزاری تھی؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”جی ضرور..... وہ لوگ گواہی دیں گے۔“ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، میں کل صبح انہیں یہاں بلا کر ان کا بیان لوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جب تک تمہاری ذات شک کے دائرے سے باہر نہیں آ جاتی، تم سرکاری مہمان خانے میں رہو گے۔“

”سرکاری مہمان خانہ.....“ وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تھانے کی حوالات.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میرے تھانے کا عملہ بہت مہمان نواز ہے۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا جائے گا۔“

میری معنی خیز، سنسناتی گفتگو کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے بعد وہ فکر مند نظر آنے لگا۔ میں نے اسے سب انسپٹر گل داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا مہمان ہے گل داد! ذرا اس کی ٹہل سیوا کرو۔ صبح اس سے بات ہوگی۔ اس کے طعام قیام اور منجی بسترے کا خاص خیال رکھنا۔“

میرے تھانے کا عملہ ان پیشہ ورانہ مخصوص جملوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا۔ گل داد بھولا کو میرے کمرے سے لے جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

”گل داد..... صبح تک کام ہو جائے گا نا؟“

”آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ہی رات میں اس بھولا کو دنیا کا تیز طرار انسان بنادوں گا۔ صبح تک اس کی زبان کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتے لگے گی۔“

مجھے گل داد کی نفیثی ”صلاحیتوں“ پر کھل بھروسہ تھا۔ تھوڑی سی پھینٹی شینٹی لگتی تو بھولا راہ راست پر آ جاتا اور اپنے جرم کا اقرار کر لیتا۔ جو بات مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ابھی تک قتل کا کوئی محرک سامنے نہیں آیا تھا۔ اگر کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ بھولا نے مشتاق باجوہ کو کیوں قتل کیا ہے تو اس عقدے کو حل کرنا بہت آسان ہو جاتا۔

میں ابھی تک تذبذب کا شکار تھا۔ بھولا کا رد عمل اور رویہ یہ محسوس کرنا تھا کہ اس کا قتل کی اس واردات میں کوئی

ٹھنڈا کرنے کے لیے درندہ بن گیا تھا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد لفافے میں ڈالا اور اس لفافے کو اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے گل داد، بھولا کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔

بھولا نوٹ پھوٹ کا شکار تو نظر نہیں آتا تھا تاہم اس کی حالت سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گل داد نے اسے خاطر داری کے نام پر پوری رات چگایا تھا اور یقیناً بھوکا پیاسا بھی رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”تھانے دار صاحب! آپ لوگ میرے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ میں نے مشتاق باجوه کو قتل نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں جناب۔“

”تم کتنے بے گناہ ہو اور کتنے گناہ گار، اس کا فیصلہ بس تھوڑی سی دیر میں ہونے والا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک زیادتی کی بات ہے تو دعا کرو مجھے تمہارے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو ورنہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ٹرائل روم میں کیا کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہو سکتا ہے۔“

”جناب..... میں نے کوئی جرم نہیں کیا.....“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں اور گھر جانے دیں۔“

”بڑی جلدی ہے تمہیں گھر جانے کی۔“ گل داد نے اس کی پنڈلی پر سرکاری بوٹ سے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے خوشخوار لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے سچ نہ اگلا تو یہاں سے سیدھے بڑے گھر جاؤ گے..... ڈسٹرکٹ جیل!“

”ایک تو آپ نے مجھے کل سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا ہے، اوپر سے مارتے بھی ہیں۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا پھر آسمان (میرے کمرے کی چھت) کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

”یا اللہ..... تو ہی میری مدد فرما..... میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں.....“

”اللہ اپنے انہی بندوں کی مدد فرماتا ہے جو اس کی راہ پر چل رہے ہوتے ہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”زاہدہ کے ماں باپ کے نام کیا ہیں؟“

اس نے ایک لمحے کے لیے ابھمن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر بتایا۔ ”زاہدہ کی ماں کا نام بشیراں اور باپ کا نام قاسم ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی قاسم اور بشیراں کو تھانے بلا

کل گیا۔

میں نے سب انسپکٹر گل داد کو اپنے پاس بلا لیا۔ گزشتہ رات میں نے بھولا کو اسی کے سپرد کیا تھا۔ جب گل داد میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔

”مہمان کا کیا حال ہے؟“

”بندہ بڑا سخت جان ہے جناب!“ گل داد نے بتایا۔ ”زبان کھولنے کو تیار نہیں۔“

”اوہ.....“ میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس کی زیادہ خاطر داری تو نہیں کر دی؟ وہ چلنے پھرنے کے قابل تو ہے نا.....!“

”نہیں جناب.....“ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کی ہدایات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ ہڈی پسلی سب سلامت ہے اس کی۔“

”اسے میرے پاس لے آؤ۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ گل داد بھولا کو میرے پاس لے کر آتا، مشتاق باجوه کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ میں نے فوراً وہ رپورٹ پڑھی۔ تحریر انگریزی میں تھی جس کا اردو میں مفہوم پچاس طرح تھا۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق مشتاق باجوه کی موت سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات، نصف شب کے قریب واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات بارہ اور دو بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ یہ رپورٹ میرے اندازے کی بھی تصدیق کرتی تھی، مطلب یہ کہ مشتاق باجوه کو حالت نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن اور سینے پر کسی تیز دھار آلے کے متعدد وار کیے گئے تھے۔ آلہ قتل کے بارے میں خنجر کا گمان ظاہر کیا گیا تھا۔ درجنوں مہلک وار میں سے سب سے کاری ضرب وہ تھی جب تیز دھار خنجر کو اس کی شہ رگ پر آزمایا گیا تھا۔ رگب جان کٹ جانے کے باعث اتنا زیادہ خون بہہ گیا تھا کہ مشتاق باجوه موت کے منہ میں چلا گیا۔

یہاں پر ایک بات قابل غور تھی اور وہ یہ کہ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ مقتول سے شدید نوعیت کی نفرت بھی کرتا تھا۔ اگر محض مشتاق باجوه کی جان لینا ہی مقصود ہوتا تو اس کی یقینی موت کے لیے شہ رگ پر کیا جانے والا وار ہی کافی تھا۔ سینے، گردن اور پیٹ کے مختلف حصوں کو خنجر کی نوک کی مدد سے گودڑا لٹا قاتل کی ذہنی اور قلبی کیفیت کی عکاسی کرتا تھا۔ یہ ایک شدید نوعیت کی انتقامی کارروائی تھی۔ قاتل اپنا کیجا

اسے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟
"کیا تم بھولا کو جانتے ہو؟" میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

"جی..... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو چک چوراسی کا جمائی (داماد) ہے سرکار اور....."

نذیر باجوه بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور استفسار کیا۔
"اور..... کیا؟"

"وہ جناب....." وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
"بات دراصل یہ ہے کہ بھولا کی جس کڑی سے شادی ہوئی ہے نا، اس کا تعلق بھی چک چوراسی ہی سے ہے۔ وہ چند ماہ پہلے ہی تو یہاں سے بیاہ کر لکڑی والی گئی تھی۔"

یہ بات مجھے بھولا کی بیوی زاہدہ کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔ میں نے نذیر باجوه کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم زاہدہ کی بات کر رہے ہونا؟"
"جی جی..... زاہدہ ہی سے بھولا کی شادی ہوئی ہے۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ جو زاہدہ ہے نا....." وہ ایک مرتبہ پھر بولتے بولتے اٹک گیا۔

"کیا ہوا زاہدہ کو؟" میں نے پوچھا۔
"وہ جی..... یہ تو بتائیں کہ آپ نے بھولا کو کس چکر میں گرفتار کیا ہے؟" میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ کتنی کاٹ گیا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"نذیر! جو میں نے پوچھا ہے، پہلے اس کا جواب دو۔"
"جناب چھڈ دیں..... مٹی ڈالیں....." وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"میں نہ تو اس بات کو چھڈ سکتا ہوں اور نہ ہی اس پر مٹی یا مٹی کا تیل ڈال سکتا ہوں۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "تم زاہدہ کا ذکر اچانک گول کیوں کر گئے؟"
وہ مجھے خاصا حذبذب دکھائی دیا۔

"نذیر! کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے بیٹے کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اگر تم اسی طرح عدم تعاون کا مظاہرہ کرتے رہے تو مجھے نہیں لگتا کہ پھر یہ تیل

کر تمہارے بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ وقوعہ کی رات تم ان کے گھر پر تھے یا نہیں اور اگر تھے تو رات کے آخری حصے میں تم تھوڑی دیر کے لیے کہیں گئے تو نہیں تھے۔" لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مشتاق باجوه کو اس رات بارہ اور دو بجے کے درمیان قتل کیا گیا ہے۔"

"آپ جیسے دل چاہے، اپنی تسلی کر لیں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔"

میں نے گل داد کو خصوصی ہدایات دے کر اللہ رکھا اور بھولا کے ہمراہ چک چوراسی کی جانب روانہ کر دیا۔ اللہ رکھا کو بھولا کا کھرا نکال کر جائے وقوعہ پر پائے جانے والے کمرے سے اس کا ملاپ اور موازنہ کرنا تھا اور گل داد کو بھولا پر گہری نگاہ رکھنا تھی کہ وہ ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے بھولا کو احتیاطاً ہتھکڑی بھی پہنادی گئی تھی۔ علاوہ ازیں گل داد کو ایک اور کام بھی کرنا تھا اور وہ یہ کہ..... چک چوراسی کے وسنیک اور بھولا کے سر قاسم کو تھانے حاضر ہونے کا حکم دینا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے نذیر باجوه کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

جب آج میں تھانے آیا تھا تو میں نے نذیر باجوه کو اپنے چھوٹے بیٹے یوسف باجوه کے ساتھ تھانے کے برآمدے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ بھولا کی گرفتاری ان کی نظر سے اوجھل رہی ہو۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر کر میرے کمرے تک آیا تھا اور پھر یہاں سے واپس گیا تھا۔ میں نے صرف نذیر باجوه کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اس کا چھوٹا بیٹا باہر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

نذیر باجوه نے مجھے سلام کیا اور میرے اشارے پر ایک کرسی کھینچ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! مشتاق کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟"

"ہاں نذیر، کافی کچھ پتا چلا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "دو تین گھنٹے میں بہت سی چیزیں قائل ہو جائیں گی۔"

"جناب! یہ کیا ماجرا ہے....." وہ آواز دبا کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "میں نے ابھی بھولا کو دیکھا ہے۔"

مندھے چڑھ سکے۔۔۔۔۔ میں نے ذرا سا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر ذرا مائی لہجے میں کہا۔
”بھولا کو میں نے مشتاق کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔۔۔۔۔!“

”سک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔!“ وہ بے یقینی سے مجھے نکلنے لگا۔
”کیا بھولانے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے؟“
”ابھی تک اس نے اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
”لیکن میرے پاس بڑی مضبوط واقعاتی شہادتیں ہیں اس کے خلاف۔۔۔۔۔“

پھر میں نے نذیر باجوه کو جائے وقوعہ سے ملنے والے چاندی کے اس لاکٹ کی کہانی سنائی جس میں ایک عمدہ قسم کا عقیق جڑا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری بات سن رہا اور میرے خاموش ہونے پر اس کے ہونٹوں سے سرسرا تا ہوا جملہ جدا ہوا۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بھولا کی مشتاق سے کیا دشمنی تھی۔۔۔۔۔!“

”تمہاری سمجھ میں جو بات ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں رہی، اس کے لیے اپنے دماغ کو مت تھکاؤ نذیر باجوه۔ دوپہر تک اس کیس کی ہر قسمی سلجھ جائے گی۔ تم مجھے زاہدہ کے بارے میں بتاؤ۔ تم اس کے ذکر پر مٹی ڈلو کر دفن کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

وہ ایک لمحے کے لیے ”نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن“ والی کیفیت میں گرفتار رہا پھر تھوڑا سا آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! میرا نام نہیں آتا چاہیے۔ میں ایک عزت دار آدمی ہوں اور دوسروں کی بھی عزت کرتا ہوں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نذیر۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم بے فکر ہو کر پورے اعتماد کے ساتھ مجھ سے بات کر سکتے ہو۔ سمجھ لو کہ ہمارے درمیان ہونے والی باتیں اسی کمرے میں دفن ہو جائیں گی۔ کوئی ان کی بازگشت بھی نہیں سن سکے گا۔“

میرے حوصلہ دلانے پر وہ خاصا ریلیکس اور ایزی نظر آنے لگا اور بولا۔ ”اصل میں جناب۔۔۔۔۔ یہ زاہدہ بڑی فتنہ پرور کڑی ہے۔ سوہنے رب نے تو اپنا کرم کر کے ہمیں صاف بچالیا۔ بے چارہ بھولا اس سے شادی کر کے اپنے نصیب کو گہنا بیٹھا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں نذیر۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
”ذرا کھل کر بتاؤ کہ زاہدہ کی فتنہ پروری کا تمہارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ تمہیں خدا نے کن معنوں میں اس کے شر سے بچالیا؟“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ زاہدہ میرے مشتاق کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔“
”پیچھے پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“ نذیر کے انکشاف پر میں چونک اٹھا۔
”جی وہ مشتاق سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“ نذیر باجوه نے بتایا۔

میرا ذہن تیز رفتاری سے کام کرنے لگا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ مشتاق باجوه کے قتل کے حوالے سے کسی عظیم راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔
”اور تم نے اپنے بیٹے کی شادی زاہدہ سے نہیں ہونے دی۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“

”کیسے ہونے دیتا تھا نے دار صاحب۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔ ”ایک تو وہ بیچ ذات ہے۔ کہاں تو ہم باجوه اور کہاں وہ نائی۔۔۔۔۔“

”میری نظر میں ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں نذیر باجوه۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمام انسانوں کا ایک ہی خالق ہے۔ انسان نے خود ہی اپنے آپ کو مختلف گروہوں، ذاتوں اور خاندانوں میں تقسیم کر لیا ہے۔“

”میں آپ کی بات کو رد نہیں کروں گا تھانے دار صاحب۔“ وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن انسان کا کردار بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔۔۔۔۔!“
”بالکل!“ میں نے کتنی انداز میں کہا۔ ”انسان کے کردار اور اخلاق کی بڑی اہمیت ہے۔“

”بس جناب! یہی اصل بات ہے۔“ وہ چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔
”اسی وجہ سے میں نے مشتاق کے لیے زاہدہ کا رشتہ قبول نہیں کیا تھا۔“

”گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ زاہدہ ایک بد اخلاق اور بد کردار عورت ہے؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔
وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ”زاہدہ ایک تو زبان کی بہت تیز ہے۔ مطلب یہ کہ بد کلام ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں لیکن تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔“ لچاتی توقف کر کے اس نے امید بھری نظر

دریافت کیا۔ ”وہ سارا الزام ہمیدہ پر کیوں ڈال رہی تھی؟“
”میں نے عرض کیا نا۔۔۔ اپنے مقصد میں ناکامی نے
اس کی مت مار دی تھی۔“ اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے
کہا۔ ”ایک دو جگہ تو وہ یہ کہتے ہوئے بھی سنی گئی کہ وہ بہت
جلد جیلہ کا گھرا جاڑ کر رکھ دے گی۔“

نذیر باجوه کی زبانی یہ ایک سنگین انکشاف تھا۔ میں
نے پوچھا۔ ”کیا تم ان ایک دو افراد کے نام بتا سکتے ہو جن
سے زاہدہ نے جیلہ کا گھرا جاڑنے کی بات کی تھی؟“
”نہیں جناب۔۔۔۔۔“ وہ بے بسی سے گردن ہلاتے
ہوئے بولا۔ ”یہ تو ایک سال پرانی بات ہے۔ اب میرے
ذہن میں نہیں کہ وہ کون لوگ تھے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے
لہجے میں کہا۔ ”میں کل بھولا کو عدالت میں پیش کر کے اس کا
ریمانڈ لیتا ہوں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ
ہو جائے گا اور اس کے علاوہ میں زاہدہ کو تھانے بلا کر اس کا
انٹرویو بھی کرتا ہوں۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ
غبرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مشتاق کی لاش مجھے کب
مکمل جائے گی؟“

”میرا خیال ہے، آج دوپہر کے بعد اسپتال سے
تمہارے بیٹے کی لاش تھانے پہنچ جائے گی۔“ میں نے
امکافی لہجے میں کہا۔ ”رہی سی کاغذی کارروائی کے بعد میں
مشتاق کی لاش تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”میں یوسف کو تھانے ہی میں چھوڑ کر جا رہا
ہوں۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”ادھر گھر میں بھی
کام کافی پڑے ہیں۔ مشتاق کی تجھیز و تکفین کا بندوبست
بھی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم بے فکر ہو کر چک چور اسی جاؤ۔“ میں
نے کہا۔ ”میں مشتاق کی لاش یوسف کے سپرد کر دوں گا۔“

نذیر باجوه کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں
ڈوب گیا۔ زاہدہ کے حوالے سے اس نے جو انکشافات کیے
تھے، وہ موجودہ صورت حال میں بہت اہمیت کے حامل
تھے۔ وہ اپنی خواہش میں ناکام ہونے کے بعد جیلہ اور
مقتول مشتاق باجوه کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت کا
ایک طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔ ممکن ہے، اسی نے خوشیا ڈنگر
چور کے ذریعے مشتاق کا کام تمام کروا دیا ہو۔۔۔۔۔

اگر زاہدہ نے ہی اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے
کے لیے مشتاق کو ٹھکانے لگوا دیا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا

سے مجھے دیکھا اور یاد دہانی کرائے والے انداز میں بولا۔
”میرا نام نہیں آتا چاہیے۔ میں خدا کے قہر سے ڈرتا
ہوں۔ زاہدہ کا کردار اس کے ساتھ ہے۔ مجھے کسی سے کچھ
لینا دینا نہیں۔“

”میں نے کہا ہے نا، تمہارا کہیں نام نہیں آئے گا۔“
میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے میں تمہیں بالکل
پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن۔۔۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تشویش بھرے
لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”لیکن کیا جناب؟“

”لیکن یہ کہ میں تمہاری طرح اس معاملے سے ہاتھ
نہیں اٹھا سکتا۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”مجھے اس
معاملے سے بہت کچھ لینا دینا ہے۔ بھولا تمہارے بیٹے کے
قتل کے الزام میں زیر حراست ہے اور زاہدہ اسی بھولا کی
بیوی ہے اور تم بتا رہے ہو کہ زاہدہ ایک بدکلام اور بدکردار
عورت ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زاہدہ تمہارے بیٹے
سے شادی کی خواہاں تھی۔ جب اس کی یہ خواہش پوری نہیں
ہوئی تو وہ انتقاماً کچھ بھی سوچ سکتی ہے۔۔۔۔۔ کچھ بھی کر سکتی
ہے۔ میں اس نکتے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ
اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گھبر لہجے میں بولا۔
”مشتاق کی شادی کے بعد اس نے بڑی بکواس کی تھی۔“
”کس قسم کی بکواس؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز
میں سوال کیا۔

”زاہدہ کا خیال تھا کہ جیلہ کی وجہ سے اس کی شادی
مشتاق سے نہیں ہو سکی۔“ نذیر باجوه وضاحت کرتے ہوئے
بولا۔ ”وہ ہر طرف یہ کہتی پھرتی تھی کہ مشتاق بھی اس سے
شادی کرنا چاہتا تھا مگر جیلہ نے اس کے کردار کے حوالے
سے گندی باتیں کر کے مشتاق کو بدگمان کر دیا تھا اس لیے یہ
شادی نہ ہو سکی۔“

”تو کیا واقعی مشتاق بھی زاہدہ سے شادی کی خواہش
رکھتا تھا؟“

”زاہدہ جھوٹ بولتی ہے جناب۔“ میرے استفسار
کے جواب میں نذیر باجوه نے کہا۔ ”انہی کو کوئی بات نہیں۔
زاہدہ کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ شکر ہے، اس کی شادی
ہو گئی۔ وہ چک چور اسی سے رخصت ہو کر گروالی گئی اور
ہماری جان چھوٹی۔“

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ زاہدہ کی
جیلہ سے کیا دشمنی تھی؟“ میں نے ابھرنے والے انداز میں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

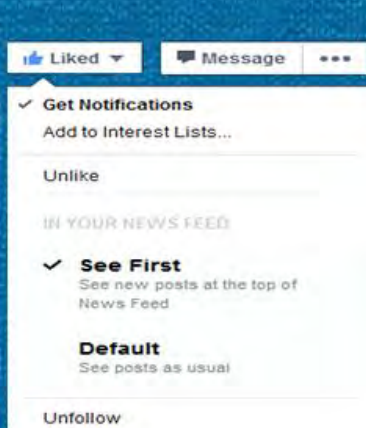
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



کہ اس نے اپنے شوہر کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا؟ اس بات کا قوی امکان تھا کہ زاہدہ ہی نے بھولا کا یمنی عقیق والا لاکٹ چرا کر قاتل کے حوالے کیا ہوگا تا کہ وہ مذکورہ لاکٹ کو جائے وقوعہ پر پھینک دے اور اس واردات کا شک بھولا کی طرف چلا جائے مگر پھر بات وہی تھی کہ وہ اس واردات میں اپنے خاوند کو کیوں پھنسانا چاہتی تھی؟

میں جوں جوں سوچتا گیا، میری الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی دوران میں مجھے زاہدہ کی چند ایسی باتیں بھی یاد آئیں جو اس تازہ ترین صورت حال میں اس کی ذات کو شکوک و شبہات کی دیز چادر میں پوشیدگی دکھائی دیتی تھیں۔ میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ مجھے زاہدہ کو فوری طور پر تھانے بلا کر اس سے کڑی پوچھ تاچھ کرنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے ایک مستعد پولیس اہلکار کو گروالی کی جانب روانہ کر دیا تا کہ وہ پہلی فرصت میں زاہدہ کو اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔

☆☆☆

دس جون دوپہر کے بعد حالات میں اچانک بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسپتال سے مشتاق باجوہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آئی تو میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش کو یوسف باجوہ کے حوالے کر دیا۔

یوسف باجوہ جیسے ہی اپنے بھائی کی لاش لے کر تھانے سے نکلا، بارش شروع ہو گئی۔ آج صبح ہی سے موسم کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مطلع ابراؤد تھا اور اب باقاعدہ بارش شروع ہو گئی تھی تاہم اس برسات میں وہ تیزی اور تندہی ہرگز نہیں تھی کہ اسے موسلا دھار کے خطاب سے نوازا جاتا۔

کچھ دیر کے بعد زاہدہ کے ماں باپ بھی تھانے پہنچ گئے۔ قاسم اور اس کی بیوی بشری ان کا کافی پریشان نظر آتے تھے۔ انہیں یہ خیال چکی تھی کہ میں نے ان کے داماد بھولا کو مشتاق باجوہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے۔

”تھانے دار صاحب! اس رات تو بھولا ہمارے گھر میں تھا۔“ قاسم نے بتایا۔ ”اس نے قتل نہیں کیا۔“

”میں نے اسی لیے آپ دونوں کو تھانے بلایا ہے کہ وقوعہ کی رات بھولا تمہارے گھر میں تھا۔“ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تا کہ یہ تصدیق ہو سکے کہ وہ پوری رات گھر کے اندر ہی موجود رہا تھا یا تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر بھی ہوا تھا؟“

”وہ جی..... گھر پر ہی تھا۔“ بشری نے اٹک اٹک

کر بتایا پھر پوچھا۔ ”آپ نے کس بتا پر بھولا کو گرفتار کیا ہے؟“ میں نے ان دونوں میاں بیوی کو یمنی عقیق والا چاندی کا لاکٹ دکھایا اور اس لاکٹ کے حوالے سے ساری کہانی سنادی۔ میرے خاموش ہونے پر قاسم نے کہا۔ ”جناب! یہ زنجیر تو بھولا ہی کی ہے۔ پر اس نے تو بتایا تھا کہ اس واقعے سے تین چار دن پہلے یہ لاکٹ کہیں گم ہو گیا تھا۔“

”اس نے مجھے بھی یہی کہانی سنائی ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی کہانی کی تصدیق کے لیے میں نے زاہدہ کو تھانے بلایا ہے۔“

”زاہدہ.....!“ بشری ایک ایک پریشان دکھائی دینے لگی۔ ”وہ کیا تصدیق کرے گی تھانے دار صاحب؟“ ”زاہدہ سے گروالی میں میری بات ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی کچھ باتیں بھولا کے بیان سے لگا نہیں کھاتیں۔ بس انہی کے بارے میں زاہدہ سے پوچھ کچھ کرنا ہے۔“

”مثلاً کون سی باتیں جناب؟“ قاسم ناکی نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تفتیش میں رکاوٹ کھڑی ہو سکتی ہے۔“

وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے مجھے نکتے لگے۔

میں نے باری باری ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔ ”تم لوگوں کو یقین ہے کہ وقوعہ کی پوری رات بھولا تمہارے گھر کے اندر موجود رہا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے بھی گھر سے غائب نہیں ہوا تھا۔ خصوصاً آدھی رات کے بعد جب مشتاق باجوہ قتل کیا گیا تھا؟“

”جی بالکل نہیں۔“ قاسم ناکی نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”وہ ساری رات بھولا نے ہمارے ہی گھر میں گزاری تھی۔“

”ٹھیک ہے، تم لوگ واپس جاسکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں دوبارہ بلالوں گا۔“

”کیا ہم بھولا سے دو باتیں کر سکتے ہیں؟“ بشری نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”وہ زیر تفتیش ہے، کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

”جی بات تو یہ تھی کہ بھولا اس وقت تھانے میں موجود

”سرکار... سوکھے شکر یہ سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا۔“ وہ پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے لہذا مجھے میرا انعام ملنا چاہیے۔“

میں نے اپنی جیب خاص میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو..... یہ رکھ لو اپنا انعام۔“

اس نے جلدی سے کرنسی نوٹ کو اپنی جیب میں ٹھونسا اور مجھے زوردار سیلوٹ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

آج کل پچاس روپے میں انسان پیٹ بھر کر ایک وقت کا..... کھانا نہیں کھا سکتا لیکن اس زمانے میں پچاس روپے کی بڑی قدر و قیمت ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط فیملی کا مہینے بھر کا راشن بچکس سے تیس روپے میں آ جایا کرتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میرا بھیجا ہوا بندہ زاہدہ کو لے کر آ گیا۔ زاہدہ اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی نند سلٹی اور سلٹی کا شوہر شوکت علی بھی تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی آج صبح ہی اگوکی سے گکردالی آئے تھے تاکہ بھولا کی خبر لے سکیں کہ پولیس نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ جب میرے عملے کا بندہ زاہدہ کے گھر پہنچا تو بھولا کی بہن اور بہنوئی وہاں پہلے سے موجود تھے لہذا یہ دونوں بھی ان کے ہمراہ تھانے آ گئے۔

میں نے زاہدہ کو اپنے کمرے میں روک کر باقی سب کو باہر نکال دیا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے سوال کیا۔

”بھولا نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے تھانے دار صاحب؟“

”تم مجھ سے پوچھ رہی ہو یا اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہو.....!“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”نہ جی..... میں کیوں ایسا چاہوں گی.....“ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں تو چاہتی ہوں کہ آپ بھولا کو جلد از جلد رہا کر دیں۔“

”اسی لیے تم نے بھولا کو گردن تک دلدل میں دھنسا دیا ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تاکہ وہ ساری زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سڑتا رہے۔“

”میں نے ایسا کیا کیا جی.....!“ وہ چہرے پر حیرت سجاتے ہوئے بولی۔

”تم نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا، یہ تو میں تمہیں بعد

ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے کھوجی اللہ رکھا اور سب انسپکٹر گل داد کے ہمراہ چک چور اسی بھیجا ہوا تھا۔

قاسم نے پوچھا۔ ”کیا ہم اس وقت تک تھانے میں رک سکتے ہیں جب تک زاہدہ یہاں نہ پہنچ جائے؟ اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی پوچھ گچھ کے بعد جب وہ فارغ ہو تو ہم اسے اپنے ساتھ چک چور اسی لے جائیں۔ بھولا آپ کی حراست میں ہے۔ زاہدہ ادھر گکردالی میں اکیلی کیا کرے گی۔“

اس کی خواہش معقول اور جائز تھی لہذا میں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ باہر برآمدے میں بیٹھ کر اپنی بیٹی کا انتظار کر سکتے ہیں۔“

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل گئے۔ تھوڑی دیر میں کھوجی اللہ رکھا، بھولا کو لے کر واپس آ گیا۔ میں نے گل داد کو حکم دیا کہ وہ بھولا کو حوالات میں بند کر دے اور کسی کو اس سے ملنے نہ دے پھر میں اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہوا۔

”ہاں بھئی چاچا! کیا رپورٹ ہے؟“

”رپورٹ جیسی تھی، ویسی ہی ہے سرکار!“ وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”جناب! آپ دیکھ رہے ہیں، اس بارش نے کھرے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جب تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی، میں نے کھرے کا اچھا خاصا کام نمٹا لیا تھا اور میری اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ننگے پاؤں والے جس شخص کا کھرا میں نے باڑے سے کھیتوں تک نکالا تھا، وہ بھولا کا کھرا نہیں ہے۔“

”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بھولا وقوعہ کی رات نہ تو باڑے کے اندر داخل ہوا اور نہ ہی دیوار پھلانگ کر وہاں سے فرار ہوا تھا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مشتاق باجوہ کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں؟“

”جناب! بھولا قاتل ہے یا نہیں، یہ پتا چلانا تو آپ کا کام ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ بھولا وقوعہ کی رات جائے واردات کی طرف نہیں آیا تھا۔ میرا علم غلط نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک ہے، اب تم گھر جا سکتے ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں دوبارہ زحمت دوں گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

میں بتاؤں گا۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب.....!“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے ہی کہنے پر بھولا وقوعہ کی رات نگر والی سے چک چور اسی گیا تھا؟“

”جی..... وہ صبح گیا تھا مگر رات کو وہاں رک گیا تھا۔“ اس نے سادے سے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ مشتاق کے قتل سے تین چار روز پہلے بھولا کا عقیق والا لاکٹ گم ہو گیا تھا؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

”بھولا نے اس لاکٹ کو پورے گھر میں تلاش کیا تھا اور گھر کے باہر بھی مگر یہ لاکٹ کہیں نہیں مل سکا تھا۔“

”تم نے یہ دونوں باتیں مجھ سے کیوں چھپائیں؟“ میں نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب میں تمہارے گھر آیا تھا تو تم نے یہ سب مجھے نہیں بتایا تھا؟“

”جناب! میں خبر اگئی تھی۔“ وہ جلدی سے بات بتاتے ہوئے بولی۔ ”یہ باتیں میرے ذہن سے نکل گئی تھیں۔“

”لیکن بھولا کی گرفتاری والی بات تمہیں اچھی طرح یاد رہی تھی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہیں.....؟“

”میں سمجھی نہیں تھا نے دار صاحب.....!“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے ٹکنے لگی۔

”جب میں تمہارے گھر سے نکل کر تھانے کی طرف آنے لگا تھا تو یاد ہے، تم نے کیا کہا تھا.....“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھ سے پوچھا تھا.....“

تھانے دار صاحب! کیا آپ بھولا کو گرفتار کرنے اگو کی نہیں جائیں گے..... جیسے تمہاری خواہش ہو کہ بھولا جلد از جلد مشتاق باجوہ کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو کر جیل چلا جائے.....“

”میں ایسا کیوں چاہوں گی جی۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ ”آپ خواخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔“

”اور تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ مقتول کے ساتھ تمہارا دلی تعلق رہا ہے۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”تم مشتاق باجوہ سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ بعد میں تم نے جیلہ کو مورد الزام ٹھہرا کر چک چور اسی میں بہت شور مچایا

چایا تھا؟“

”تو آپ کو وہ کہانی پتا چل چکی ہے.....“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

”صرف وہی نہیں..... مجھے تمہاری ہر کہانی پتا چل چکی ہے زاہدہ!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بھولا تو گیا ساری زندگی کے لیے جیل میں مگر تم بھی بچنے والی نہیں ہو۔“

وہ بے حد ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چار اچھٹکنے والے انداز میں کہا۔

”زاہدہ! اگر تم چاہو تو بھولا کو بچا سکتی ہو.....!“

”میں..... میں بھلا کیا کر سکتی ہوں جی۔“ وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”تم سچ بول کر اپنی مشکلات کو بڑی حد تک کم کر سکتی ہو۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس مجھے اتنا بتا دو کہ بھولا کالا لاکٹ اس کی گردن سے غائب ہو کر مشتاق باجوہ کے باڑے میں کیسے پہنچ گیا؟“

”مجھے کیا پتا جناب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”آپ خواخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔“

”دیکھو زاہدہ! تم مجھے سختی کے لیے مجبور کر رہی ہو۔“ میں نے بے رحمی سے کہا۔ ”تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو کہ تمہاری زبان کھلوانے کے لیے میں کون کون سے گر آزما سکتا ہوں۔“

وہ سراپید انداز میں ادھر ادھر ٹکنے لگی۔

میں نے زاہدہ کو مزید خوف زدہ کرنے کے لیے ایک کانشیل کو بلا کر اس کے کان میں خصوصی ہدایات دیں پھر برآواز بلند کہا۔

”اس کو تفتیشی کر دے میں لے جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر مجھے رزلٹ چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟“

”جی، چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہی زبان کھول دے گی۔ آپ نے جو طریقہ بتایا ہے نا، اسے جھیلنا اس بے چاری کے بس کی بات نہیں۔“

زاہدہ کانشیل کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے دیکھا مارتو وہ بادل ناخواستہ وہاں سے چلی گئی۔

میں نے کانشیل کو آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن وہ دس منٹ کے بعد ہی زاہدہ کو لے کر دوبارہ میرے

کمرے میں آگیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا؟“

پھر میں نے زاہدہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ خوف زدہ دکھائی دی۔ کانشیل نے جواب دیا۔

”ملک صاحب! میں آپ کا بتایا ہوا فارمولا آزمانے ہی والا تھا کہ چوبیس والے بنجرے کو دیکھ کر یہ ڈر گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے التجا کی کہ اگر میں اس کی زبان کھلوانے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہ کروں تو یہ سچ بتانے کو تیار ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کانشیل سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں اس کا اثر و پور کر لیتا ہوں۔“

کانشیل کے جانے کے بعد میں نے زاہدہ کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ میری میز کی دوسری جانب کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے کہا۔ ”تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ذرا تصور کرو۔ اگر کانشیل تمہاری شلوار کے پانچوں میں چوہے داخل کر کے ان پانچوں کو رسی سے باندھ دیتا تو پھر تمہارا کیا حشر ہوتا۔“

وہ ایک جھرجھری لینے کے بعد سراپمہ لہجے میں بولی۔ ”تھانے دار صاحب! اسی لیے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”سچ کیا ہے، بتاؤ؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ بھولا ہی نے مشتاق باجوہ کو قتل کیا ہے۔“

زاہدہ کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ گویا اسے اپنے شوہر کے قاتل ہونے پر ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے زاہدہ پر نفسیاتی دباؤ بڑھانے کے لیے اس کے شوہر کو سزائے موت یا عمر قید ہونے کی باتیں کی تھیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی تک مجھے اس کے خلاف کوئی ایسا ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر میں اسے قاتل ٹھہرا سکتا۔

”تم بڑے وثوق کے ساتھ بھولا کے قاتل ہونے کی بات کر رہی ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”اس نے کئی مرتبہ مشتاق کو جان سے مارنے کی بات کی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ ایسا

”اس کی وجہ۔۔۔۔۔“ میں نے تھوڑا آگے جھکتے ہوئے سوال کیا۔ ”بھولا، مشتاق باجوہ کی جان کیوں لینا چاہتا تھا؟“

”اسے شک تھا کہ میرے مشتاق باجوہ کے ساتھ تعلقات رہے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، شادی سے پہلے۔“ زاہدہ نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ”جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں مشتاق سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔“

”تم نے بھولا کا شک دور کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

میں نے استفسار کیا۔ ”بہت کوشش کی تھی جناب۔۔۔۔۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔ ”بڑی سے بڑی قسم کھا کر میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ کو پتا ہے، اگر ایک بار کسی کے دل میں شک بیٹھ جائے تو پھر اس کا لکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

”مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس بیماری کا علاج نہیں ہے۔ سنا ہے، شک اور وہم کو دور کرنے کا کوئی نسخہ حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔“

آئندہ دس منٹ میں زاہدہ نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی کے بعد جب بھولا کو یہ پتا چلا کہ وہ مشتاق باجوہ سے شادی کی خواہش مند تھی تو کس طرح بھولا نے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر آئے دن وہ کوئی نہ کوئی نئی بات نکال کر زاہدہ کی بے عزتی کرتا رہتا تھا۔ اس حوالے سے کئی بار وہ زاہدہ کو زد و کوب بھی کر چکا تھا اور ایسا جب بھی ہوتا، بھولا خطرناک انداز میں مشتاق باجوہ کو قتل کرنے کی بات کرتا تھا۔ ان لمحات میں وہ کسی خوبی و رندے کے مانند نظر آتا تھا۔

زاہدہ کی کہانی بھولا کے مجرم ہونے کی جانب اشارہ کرتی تھی۔ اگر اس نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر مجھے بھولا کے ساتھ سختی کا رویہ اپنانے کی ضرورت تھی۔ اس وقت رات ہو چلی تھی لہذا میں نے زاہدہ کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ماں باپ باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ تم ان کے ساتھ چک چور اسی ہی چلی جاؤ۔ گروالی میں اب تمہارا کون ہے جو وہاں جاؤ گی۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں یہاں سے اپنے میکے ہی جاؤں گی۔“

گرفت میں آجاتے ہیں تو وہ اسی قسم کے بیان دیتے ہیں کہ انہیں کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔

وہ منہ سے پچھ نہیں بولا، یک نیک رحم طلب نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے وارننگ دینے والے اشارے میں کہا۔

”بھولا! میں تمہیں بس ایک رات کی مہلت دے سکتا ہوں۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے تم نے فیصلہ کرنا ہے کہ سچ بولو گے یا جھوٹ پر ہی ڈٹے رہنا ہے تمہیں۔“

پھر میں بھولا کو شبینہ ڈیوٹی والے ایک حوالدار کے حوالے کر کے اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ میں نے حوالدار کو ہدایت کر دی تھی کہ آج کی رات ملازم پر صرف نفسیاتی حربے ہی آزمائیں، اس کے بدن کو ٹچ نہیں کرنا۔

☆☆☆

اگلادین بڑا ہنگامہ پرور اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ہنگامہ پرور اس لیے کہ اس روز اس طرح پے درپے واقعات پیش آئے کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہ ملی اور نتیجہ خیزان معنوں میں کہ مشتاق باجوہ کے قتل کا معما حل ہو گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ زاہدہ کے ماں باپ روتے دھوتے تھانے پہنچ گئے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ بے حد پریشان اور بوکھلائے ہوئے تھے۔

میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”تھانے دار صاحب! ہم برباد ہو گئے۔“ قاسم نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”وہ نامراد ہماری زاہدہ کو لے گیا ہے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں نے پوچھا۔ ”کون نامراد؟“

”جبرو۔“ اس نے بتایا۔

”یہ جبرو کون ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جبرو بہت خطرناک بندہ ہے تھانے دار صاحب۔“ بشیراں نے روتے ہوئے بتایا۔ ”چوری، ڈکیتی اور غنڈا گردی اس کا کام ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے زاہدہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ ہم تولٹ گئے۔ تباہ ہو گئے۔“

”یہ کیسا اندھیر مچ گیا ہے تھانے دار صاحب۔“

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ایک بات کا خیال رکھنا زاہدہ۔۔۔۔۔“ میں نے تاکید انداز میں کہا۔ ”جب تک یہ کیس سیدھے راستے پر نہیں آ جاتا، تم چک چور اسی سے باہر نہیں جاؤ گی۔ میں آج رات بھولا کو کڑی نفیث سے گزاروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کر لے گا۔ بہ صورت دیگر میں کل صبح اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ بھی لینے والا ہوں۔ اگر اس نے زبان نہ کھولی تو پھر مجھے گواہی کے لیے تمہیں چک چور اسی سے بلوانا پڑے گا۔“

”میں نے کہاں جانا ہے جی۔“ وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں چک چور اسی ہی میں رہوں گی۔“

جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ زاہدہ اپنے والدین کے ساتھ تھانے سے رخصت ہو چکی ہے تو میں نے سلمیٰ اور شوکت علی کو بھی رخصت کر کے بھولا کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس بات کا میں نے خیال رکھا تھا کہ بھولا کی بہن اور بہنوئی کو اس سے مختصر بات چیت کا موقع دے دوں تاکہ ان کی پریشانی میں کسی حد تک کمی واقع ہو جائے۔

میں نے جب بھولا کو بتایا کہ زاہدہ نے اس کے خلاف بیان دیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے چیخا چلانا شروع کر دیا اور اس دوران میں وہ زاہدہ کو غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے شانت کیا تو اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے اس کیس میں پھنسا یا گیا ہے۔۔۔۔۔“

”کون۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”تمہارے خلاف ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟“

”یہ تو مجھے پتا نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن زاہدہ نے جو میرے خلاف آپ کو اٹا سیدھا بتایا ہے، اس سے میرا شک اسی کی طرف جارہا ہے۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں ایک دوسرے کے اوپر الزام رکھ کر مجھے الجھانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم دونوں کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ سچویشن میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“ لمحائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”قتل کے اکثر مجرم جب پوری طرح قانون کی

قاسم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”اب تو کسی شریف آدمی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی۔“

میں نے جبر و بد معاش کا نام سنا ہوا تھا لیکن آج تک اس سے میرا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں جب سے اس تھانے میں تعینات تھا، میرے تھانے کی حدود میں جبر و کوئی واردات نہیں کی تھی لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جبر و زائدہ کو کیوں اٹھا کر لے گیا تھا۔ جب یہی سوال میں نے قاسم سے پوچھا تو بشری جلدی سے بولی۔

”پتا نہیں جناب..... ہماری ڈاکوؤں اور لنگلوں سے کوئی دوستی ہے اور نہ دشمنی۔“

”کوئی بد معاش کسی عورت کو خواہ مخواہ اٹھا کر نہیں لے جاتا۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ سچ بتائیں حقیقت کیا ہے؟“

”آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں سرکار۔“ قاسم نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”ایک تو ہماری بچی اغوا ہو گئی اور الٹا آپ ہم ہی پر شک کر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے جناب۔“

”کئی اور زیادتی کا فیصلہ تو بعد میں کریں گے۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”پہلے مجھے بتاؤ، زائدہ کے اغوا والا واقعہ کب پیش آیا؟“

”آج صبح جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا کہ وہ بد بخت میری زائدہ کو اٹھا لے گیا۔“

”وہ اکیلا ہی تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

”کوئی نہیں تھا اس کے ساتھ۔“ بشری نے بتایا۔

”اس نے مجھے اور زائدہ کے باپ کو بندوق کے نشانے پر رکھا اور زائدہ کو کندھے پر ڈال کر لے گیا۔“

”اس واقعے کا کوئی گواہ.....“ میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اس وقت موقع پر اور کون کون موجود تھا؟“

”اس وقت موقع پر کوئی بھی نہیں تھا تھانے دار صاحب۔“ قاسم نے جواب دیا۔ ”پھر جب ہم نے رونا دھونا شروع کیا تو آس پڑوس کے لوگ ہمارے گھر میں جمع ہو گئے اور..... اب ہم آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔“

”جبر و زائدہ کو لے کر کس طرف گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی پتا نہیں جی۔“ بشری نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔

”اس نے جب بندوق ہم پر تانی تو ہماری جان ہی

”پھر اس نے جاتے وقت خطرناک انداز میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ہم نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پہلے وہ زائدہ کو گولی مارے گا۔ اس کے بعد ہمیں بھی بھون کر رکھ دے گا۔“ قاسم نے بے چارگی سے بتایا۔ ”ہم اس کی دھمکی سے ڈر گئے تھے اس لیے ہم نے یہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی کہ وہ کمینہ کس طرف گیا ہے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے قاسم سے پوچھا۔

”میری معلومات کے مطابق جبر و چک چور اسی ہی کارہنہ والا تھا۔ وہ اپنے ہی پنڈ کی کسی عورت کو بلاوجہ اٹھا کر نہیں لے جاسکتا۔ مجھے سچ بتاؤ، زائدہ کے اغوا کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے؟“

”کوئی کہانی نہیں ہے جی۔“ بشری نے برا سامنے بتاتے ہوئے بولی۔ ”چوروں، ڈاکوؤں کی نیت کا کیا بھروسہ۔ یہ مردود تو کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں اور جہاں تک جبر و چک چور اسی میں رہنے کی بات ہے تو.....“ لچاتی توقف کر کے اس نے ایک بو جھل سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”کافی عرصہ پہلے جبر و چک چور اسی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ ہمیں نہیں پتا، وہ اب کہاں رہتا تھا.....“

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بشری مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ کیا.....؟ اس بات کا میں اندازہ نہ لگا سکا لہذا میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”تم نے بتایا ہے کہ کافی عرصہ پہلے جبر و چک چور اسی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا..... کتنا عرصہ پہلے؟“

”یہ تو اب مجھے یاد نہیں۔“ وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”جناب! ایک تو ہماری بچی اغوا ہو گئی ہے، الٹا آپ ہم ہی سے تفتیش کر رہے ہیں۔“

”یہ تفتیش تمہاری بیٹی کو بازیاب کرنے کے لیے بہت ضروری ہے بشری۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، جبر و زائدہ کی شادی سے پہلے چک چور اسی چھوڑ دیا تھا یا بعد میں وہ وہاں سے گیا ہے؟“

”سچ..... جی..... وہ زائدہ..... کی شادی کے بعد.....“ چک چور اسی سے گیا تھا۔“ قاسم نے بتایا۔ ”پر

تھانے دار صاحب! یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ابھی آپ زائدہ کو واپس لانے کی کوئی سبیل کریں۔“

”کرتا ہوں سبیل۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر

بشیراں کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”بی بی۔ تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر بیٹھو۔“

بشیراں نے سوالیہ نظر سے اپنے خاوند کو دیکھا پھر بادل ناخواستہ وہ میرے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے قاسم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو قاسم! تم مجھے ایک معقول انسان دکھائی دیتے ہو۔ کیا میں امید رکھوں کہ جو کچھ تم سے پوچھوں، اس کا سچا اور کھرا جواب دو گے؟“

”جی.....“ وہ جڑبڑہوتے ہوئے بولا۔ ”بچھیں جی۔“

”تمہارا داماد اسلم عرف بھولا اس وقت مشتاق باجوہ کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند ہے۔ میرے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو بھولا کو پھانسی کے پھندے تک لے جاسکتے ہیں۔ زاہدہ نے بھی کل واشگاف الفاظ میں بھولا کے خلاف گواہی دی ہے اور آج صبح زاہدہ کو بھی جبر و انطا کر لے گیا ہے۔ باقی بچے تم اور تمہاری گھر والی بشیراں۔“

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم دونوں کی باقی ماندہ زندگی بھی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے؟“

”نہیں جناب.....“ وہ سرکوفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ آپ ہمیں جیل بھجوا دیں گے۔“

”تمہارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تم قانون سے تعاون نہیں کر رہے ہو۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”میں بڑے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ زاہدہ اور جبرو کے معاملے میں تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے ہو.....“

بات کرنے کے دوران میں، میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے دو ٹوک انداز نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ ہر اس نظر سے ادھر ادھر نکلنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اب ایک چوٹ..... ایک کاری ضرب کی مار تھا.....

اسے گہرے تذبذب میں گرفتار دیکھ کر میں نے کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں مان سکتا کہ جبرو کو کسی پاگل کتے نے کاٹا تھا جو وہ خواہ مخواہ تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ بتاؤ، زاہدہ اور جبرو کے بیچ کیا معاملہ تھا؟“

قاسم کے چہرے پر بے بسی اور ندامت کے طے جلے تاثرات نمودار ہوئے پھر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور روہانسی آواز میں اس نے مجھے بتایا۔

”تھانے دار صاحب! جبرو، ہاتھ دھو کر میری زاہدہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ زاہدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ ہی بتائیں، ایک لٹیرے سے میں کس طرح اپنی بیٹی کو بیاہ دیتا۔ زاہدہ مشتاق باجوہ کو پسند کرتی تھی لیکن نذیر باجوہ نے ہمیں کم ذات کا طعنہ دے کر اس رشتے سے انکار کر دیا۔ آپ ایک مجبور باب کی مجبور یوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ زاہدہ کی شادی کے بعد ہم لوگوں نے سکھ کی سانس لی تھی لیکن جبرو نے ہمیں ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔“

”جب تم نے زاہدہ کے رشتے سے انکار کیا تو اس پر جبرو نے کیا رد عمل ظاہر کیا تھا؟“ میں نے اپنایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں جناب۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”بس وہ چپ چاپ پنڈ سے چلا گیا تھا۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس بد معاش سے ہماری جان چھوٹ گئی لیکن ہمیں کیا پتا تھا اس کی خاموشی کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہوا ہے اور وہ ایک دن یوں زاہدہ کو گھر سے اٹھالے جائے گا۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ قاسم نے درون گوئی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے سچائی جھلکتی تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔

”قاسم! تم اپنی بیوی کے ساتھ گھر چلے جاؤ۔ میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا کیونکہ وہ بھولا والے معاملے میں ایک گواہ بھی ہے۔“

وہ مجھے دعا میں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

میں نے زاہدہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس سے تفصیلی بات بھی کی تھی۔ وہ ایک پُرکشش عورت تھی۔ اس کے حسن میں ایک عجیب سی مقناطیسی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ اگر جبرو بد معاش اس پر مر مٹا تھا تو اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ زاہدہ کو جبرو نے اغوا کیا تھا یا وہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ گزشتہ روز زاہدہ نے مجھے بھولا کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھولا کے ساتھ بہت ہی مجبوری کی حالت میں رہ رہی تھی۔ ان واقعات میں حقیقت کا کیا تناسب تھا یہ تو اسی وقت پتا چل سکتا تھا جب میں زاہدہ کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اسی روز دوپہر میں، میں نے جبرو کی تلاش اور گرفتاری کے لیے چار چھاپا مارٹیمیں تشکیل دیں اور انہیں ارد گرد کے گاؤں دیہات کی جانب روانہ کر دیا۔ علاوہ ازیں میں نے ان علاقوں کے تمام مخبروں کو بھی ریڈ الرٹ

نسلی امتیاز

چوراسی کے شمال میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دونوں گاؤں کے بیچ لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ میرے خیر کے مطابق جبرو کوٹ گھسن سے باہر کھیتوں میں بنے ہوئے ایک ڈیرے میں دیکھا گیا تھا۔

میں نے اپنے عملے کے مستعد کانشیلو کی ایک ٹیم بنائی اور سرشام جبرو کی سرکوبی کے لیے کوٹ گھسن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہم سب سادہ لباس میں تھے۔ اگر جبرو اس ڈیرے میں چھپا بیٹھا تھا تو یقیناً زاہدہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوگی۔ میں نے اطلاع لانے والے خیر سے یہی سوال کیا۔

”جبرو چک چوراسی سے ایک عورت کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ کیا زاہدہ نامی وہ عورت بھی نہیں دکھائی دی ہے؟“ مذکورہ خیر کا نام عارف تھا اور وہ بھی اس وقت ہماری ٹیم کا حصہ ہی تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”نہیں ملک صاحب! وہ عورت اس کے ساتھ نظر نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے، اس نے زاہدہ کو ڈیرے کے اندر کہیں چھپا رکھا ہو۔“

”ہاں“ یہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے سرسری انداز

نہ دیا۔ اس دن میں نے بھولا کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات روز کاریمانہ بھی حاصل کر لیا تھا۔

☆☆☆

دورانِ ریمانڈ میں، میں نے اسلم عرف بھولا کو مختلف ٹرائل سے گزارا مگر مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ کسی بھی صورت مشتاق باجوہ کی جان لینے کی ذمہ داری قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ بار بار اس بات پر زور دے رہا تھا کہ قتل کے اس مقدمے میں اسے کسی گہری سازش کے تحت پھنسا یا گیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے زاہدہ پر اپنے شک کا اظہار بھی کیا تھا لیکن اب زاہدہ منظر سے غائب ہو چکی تھی۔ اب مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ بھولا شاید بے گناہ ہی ہے مگر زاہدہ کی واپسی سے پہلے میں اسے رہا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ابھی تک مشتاق باجوہ کے قتل کا معاملہ ویسا ہی پڑا ہوا تھا۔

یہ چھاپا مارٹیموں کو روانہ کرنے کے تین دن بعد کی بات ہے کہ ایک ہوشیار خیر نے موضع کوٹ گھسن میں مجھے جبرو بد معاش کی موجودگی کی اطلاع دی۔ کوٹ گھسن، چک

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں



بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹاٹینگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
کڑھتہ 30 سال سے آزمودہ

جتنی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور سرقبات سے تیار کردہ۔ بدقسمتوں اور جھوٹوں کو بھی سبک کر کے رنگ گوارا کرتی ہے۔

چہرے کے فاضل یا لوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی یونانی کریم

اپنی PIC روانہ کریں
watsap: 0311-5800057
Email: bdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
کراچی ہوم ڈیلری 0322-2916250
پٹنڈی ڈیلری 0300-2500026

- ☐ شالہ و خانہ صراف بازار امانیہ آباد
- ☐ قمری چٹوٹی و خانہ پکیری بازار سرگودھا
- ☐ سلیم خاں ساری گورنمنٹ روٹ خانہ آباد
- ☐ جنی القیم جڑی اسٹور پٹنڈی، پٹنڈی
- ☐ یو جی خاں اسٹور جی ٹی ٹی روٹ کوٹ
- ☐ ناصر و خانہ 20 صدر لائن پٹنڈی
- ☐ کاسک ایچ جی روٹ کوٹ
- ☐ خوجا اسٹور پٹنڈی مارکیٹ صدر کراچی
- ☐ صدر میڈیکل اسٹور پٹنڈی مارکیٹ صدر کراچی
- ☐ مسلم بازار اسٹور پٹنڈی مارکیٹ پٹنڈی
- ☐ امیر ایچ ایم پٹنڈی مارکیٹ پٹنڈی
- ☐ وکاس میڈیکل اسٹور آصف سکوائر 22 کراچی
- ☐ قمری اسٹور پٹنڈی اسٹور پٹنڈی چک بھیم بازار حیدر آباد
- ☐ نور علی و خانہ کوٹن پٹنڈی

بادشاہ دی ہٹی یو جی بازار راوی پٹنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹر پیج مفت منگوائیں
الحبيب یونانی اسٹور ٹاپ نمبر 4 نہایت میڈیسن مارکیٹ ڈیفنہا ہل کراچی 021-32720328 ریاض محمد 69 نوجوان گلی مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264
پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کسی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے خیر سے طبی سہولت بریسٹ ڈولپنگ آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔
Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

میں کہا۔

جب ہم کوٹ گھسن کی حدود میں داخل ہوئے تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ میں نے خاص طور پر رات کی تاریکی میں اس مشن کو ترتیب دیا تھا تاکہ جبرو کو پولیس کی کارروائی کی سن سن نہ مل سکے۔ مجھے امید تھی کہ جبرو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔ کوٹ گھسن ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لہذا اس کی آبادی بھی بہت کم تھی۔ جبرو اگر فرار ہونے کی کوشش بھی کرتا تو فوراً ہماری نظر میں آ جاتا۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے مستعد کانسٹیبل کو حکم دیا کہ وہ تھوڑا فاصلہ رکھ کر ڈیرے کے چاروں طرف پھیل جائیں پھر میں نے عارف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم میرے ساتھ آؤ.....!“

”آپ کا ارادہ کیا ہے ملک صاحب؟“ عارف نے متذبذب لہجے میں دریافت کیا۔

عارف پولیس ڈیپارٹمنٹ کا باقاعدہ ملازم نہیں تھا۔ میں نے اس کا شانہ چھپتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پتر! میرا ارادہ تو بہت نیک ہے۔ اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو پھر ادھر ہی رک جاؤ..... میں اکیلا ہی جبرو سے نمٹ لیتا ہوں۔“

”نہیں جناب! ڈروالی کوئی بات نہیں۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”اس نیک کام میں، میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔“

مذکورہ ذرا اپنی چھتوں والے دو کمروں اور ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ موسم کی مناسبت سے جبرو اور زائے کی چار پائیاں صحن میں ہونا چاہیے تھیں لیکن چھوٹیشن کا تہ یہ تھا کہ وہ کسی کمرے کے اندر پناہ گزیں ہوں گے۔

ہم دونوں باڑے کی نیچی دیوار کو پہنچ کر پھلانگ رہے اندر داخل ہو گئے۔ چند جانور ایک دیوار کے ساتھ بندھے دکھائی دیے تاہم صحن میں کسی ذی روح کا ”بستر“ لگا نظر نہ آیا۔ ہم دے قدموں بڑھتے ہوئے ان کمروں کی جانب پہنچ گئے جن میں سے ایک کا دروازہ بند اور دوسرے کا ادھ کھلا تھا۔ بند دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ جبرو مغوی زاہدہ کے ساتھ ادھ کھلے دروازے والے کمرے کے اندر موجود ہوگا۔

مذکورہ ذرا جانوروں کی موجودگی کے باعث اپنے آباد ہونے کا اعلان کرتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈیرے کی دیکھ ریکھ کے لیے وہاں کوئی بندہ بشر بھی ضرور رہتا ہوگا اور اسی بندے کے تعاون سے جبرو نے وہاں پناہ لی ہوگی۔

یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی تھی کہ مذکورہ بندہ اس

وقت جبرو کے ہمراہ تھا یا نہیں.....!

میں نے ادھ کھلے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے عارف سے کہا۔ ”تم گھوم کر دے قدموں بند دروازے تک پہنچو اور پھر اس دروازے پر دستک دو۔“

”بند دروازے پر دستک کیوں جی؟“ اس نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

”چند لمحے بعد تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب مل جائے گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم سے جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو.....“ بات کے اختتام پر میں نے اپنا سر دس پٹل نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

”او کے سر!“ عارف بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھ گیا۔

میں پستول تھاڑے ریڈ الرٹ تھا۔ پہلی دستک کے جواب میں ادھ کھلے دروازے والے کمرے میں کھسک پھر کر کی آواز ابھری جیسے دو افراد آپس میں ”خفیہ مشاورت“ کر رہے ہوں۔ آواز اتنی دہشت انگ تھی کہ کچھ بھی میرے پلے نہ پڑ سکا۔

دوسری دستک پر کمرے کے اندر چلتے ہوئے قدموں کی مخصوص صدا ابھری پھر یہ آواز دروازے کی سمت بڑھتی سنائی دی۔ میں سانس روک کر کمرے سے کسی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے ایک دبلا پتلا اور قد آور شخص دروازے سے نمودار ہوا اور بند کمرے والے دروازے کی طرف رخ کر کے غصیلے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”کون ہے.....؟“

میں اس غصیلے لم ڈھینگ کی پشت پر تھا۔ میں بجلی کی سرعت سے حرکت میں آیا اور میں نے سرکاری بوٹ کی مدد سے اس لبو کی تشریف پر ایک زوردار کک رسید کی اور غضب ناک لہجے میں کہا۔

”کون نہیں..... تمہارا باپ آیا ہے.....“

”کون نہیں..... تمہارا باپ آیا ہے.....“

ملک صفدر حیات.....!

وہ اپنے بدن کے حیا دار حصے پر لالت کھانے کے بعد منہ کے بل زمین پر گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا، میں پستل بے دست اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں حکم دیا۔

”ہینڈ زاپ جبرو..... تمہارا ٹھیل ختم ہو چکا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو.....“

”میں جبرو نہیں، جیلا ہوں سرکار.....“

”میں جبرو نہیں، جیلا ہوں سرکار.....“

میں نے لہجے میں گڑ گڑایا تو میں چونک اٹھا۔

فروری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

زادہ سے آثار دکھائی نہ دیے۔ تین جوانوں کو میں نے ڈیرے کی تلاشی لینے کا حکم دیا پھر جبرو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے جبرو کے گال پر ایک زنائے دار پھڑر سید کرتے ہوئے پوچھا۔ ”زادہ کہاں ہے؟“
”وہ میرے ساتھ نہیں ہے جی۔“ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

”پھر کس کے ساتھ ہے وہ.....“ میں نے دہاز سے مشابہ آواز میں استفسار کیا۔ ”چک چوراسی سے تین دن پہلے تو تم ہی اسے اٹھا کر لائے تھے؟“

”وہ..... وہ جی.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”زادہ جھوک فرید ہی میں ختم ہو گئی تھی۔“

جھوک فرید، چک چوراسی سے چھ میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ایک گاؤں تھا۔ میں نے جبرو کے دوسرے گال پر بھی ایک زوردار پھڑر مارا اور سوال کیا۔

”تم جھوک فرید میں اپنی ماں کی شادی اٹینڈ کرنے گئے تھے..... اور وہ ختم کیسے ہو گئی؟“

”جناب! آپ مجھے جیل بھجوادیں..... مجھ سے خطا ہو گئی، زادہ کو اٹھالانے کی۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔
”زادہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“

”جیل تو میں تمہیں بھجواؤں گا اور بڑا ٹھیک ٹھاک بھجواؤں گا۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”لیکن پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ زادہ کی موت کیسے واقع ہو گئی؟“

”سرکار.....!“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ ”یہ سچ ہے کہ میں زادہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ جب اس کے باپ نے میرا رشتہ ٹھکرایا تو میں دل برداشتہ ہو کر چک چوراسی ہی سے چلا گیا تھا لیکن میں زادہ کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہا تھا اور جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ زادہ کا گھر والا

بھولا اسے مشتاق باجہ کے حوالے سے طعنے دیتا ہے اور اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کرتا ہے تو مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زادہ سے ملنے مکر والی پہنچ گیا۔ میں نے زادہ سے کیسے ملاقات کی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصر آپ یوں سمجھ لیں کہ میں زادہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زادہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کا ایک کام کر دوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گی.....“

”کون سا کام؟“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوال داغ دیا۔

”دو مردوں نے زادہ کا بہت دل دکھایا تھا۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ایک مشتاق باجہ

”تم جیلا..... نیلا..... چلا..... جو بھی ہو، اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے تحکمانہ انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں، کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ چھ کی چھ گولیاں تمہارے پیچھے میں اتار دوں گا۔“
وہ دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا اس کا قد تو جبرو ایسا ہی تھا تاہم وہ جبرو نہیں تھا۔ میں نے اسے پستول کے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”جبرو کہاں ہے؟“
اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، فضا میں ”دھپ“ کی آواز ابھری جیسے کوئی بلندی سے نیچے کودا ہو۔ مذکورہ آواز اس کمرے کے عقبی حصے سے سنائی دی تھی جہاں سے وہ لمبو برآمد ہوا تھا۔
میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔
میں دیوار پھلانگ کر جب ڈیرے کے عقبی حصے میں پہنچا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ مذکورہ کمرے کی ایک کھڑکی کے دونوں پٹ وا تھے۔ یقیناً جبرو اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا تھا۔ پھر جلد ہی وہ میری نگاہ میں آ گیا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے کھیتوں کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا اور گرج دار آواز میں کہا۔
”رک جاؤ جبرو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“
میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے دوڑنا جاری رکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سادہ لباس پولیس اہلکاروں کے نرغے میں تھا۔ پھر میں بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ چاق و چوبند جوانوں نے اسے لاتوں مکوں پر رکھ لیا اور چند لمحوں میں میلے کپڑوں کے ماتند اسے دھو ڈالا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
”اسے ڈیرے پر لے چلو۔“
چند سیکنڈ کے بعد ہم سب مذکورہ ڈیرے پر تھے۔ اس دوران میں جبرو کی خاطر تواضع کرنے کے علاوہ اسے ہتھکڑی بھی پہنا دی گئی تھی۔ میں نے ٹارچ جلا کر اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں سے جبرو فرار ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، فضا میں ”دھپ“ کی آواز ابھری جیسے کوئی بلندی سے نیچے کودا ہو۔ مذکورہ آواز اس کمرے کے عقبی حصے سے سنائی دی تھی جہاں سے وہ لمبو برآمد ہوا تھا۔
میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔
میں دیوار پھلانگ کر جب ڈیرے کے عقبی حصے میں پہنچا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ مذکورہ کمرے کی ایک کھڑکی کے دونوں پٹ وا تھے۔ یقیناً جبرو اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا تھا۔ پھر جلد ہی وہ میری نگاہ میں آ گیا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے کھیتوں کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا اور گرج دار آواز میں کہا۔
”رک جاؤ جبرو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“
میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے دوڑنا جاری رکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سادہ لباس پولیس اہلکاروں کے نرغے میں تھا۔ پھر میں بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ چاق و چوبند جوانوں نے اسے لاتوں مکوں پر رکھ لیا اور چند لمحوں میں میلے کپڑوں کے ماتند اسے دھو ڈالا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
”اسے ڈیرے پر لے چلو۔“
چند سیکنڈ کے بعد ہم سب مذکورہ ڈیرے پر تھے۔ اس دوران میں جبرو کی خاطر تواضع کرنے کے علاوہ اسے ہتھکڑی بھی پہنا دی گئی تھی۔ میں نے ٹارچ جلا کر اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں سے جبرو فرار ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، فضا میں ”دھپ“ کی آواز ابھری جیسے کوئی بلندی سے نیچے کودا ہو۔ مذکورہ آواز اس کمرے کے عقبی حصے سے سنائی دی تھی جہاں سے وہ لمبو برآمد ہوا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ حفظہ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الٹ کر کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سنانے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

نے اس کا رشتہ مسترد کر کے اور دوسرے بھولا نے اس کے کردار پر شک کر کے۔ زاہدہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ان دونوں سے بھیا تک انتقام لوں تو اس کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر وہ مجھ سے شادی کر لے گی۔“

”لہذا تم نے مشتاق باجوه کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارا کہ اس کے قتل کا شبہ بھولا پر جائے۔“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بھولا کا عقین والا لاکٹ زاہدہ ہی نے تمہیں فراہم کیا ہوگا؟“

”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”بس میری قسمت ہی خراب ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی زاہدہ مجھے حاصل نہ ہو سکی..... وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔ ”اب یہ بھی بتا دو کہ جھوک فرید میں زاہدہ کے ساتھ کون سا جان لیوا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”زاہدہ کا اغوا ہم دونوں کی پلاننگ کے عین مطابق ہوا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم جلد از جلد کسی دور دراز ضلع کی جانب نکل جائیں گے۔ جب ہم جھوک فرید کے قریب سے گزرے تو زاہدہ کو رفع حاجت کے لیے رکنا پڑا اور بس یہیں پر قسمت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”زاہدہ رفع حاجت کے لیے ایک کھیت کے اندر گئی اور وہاں ایک موذی ناگ نے اسے ڈس لیا۔ اس کی چیخ سن کر جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ جان کنی کے عالم میں تھی۔ اس وقت اندھیرا چھٹ رہا تھا اور ہلکا ہلکا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ ناگ بہت ہی زہریلا تھا۔ چند ہی لمحوں میں زاہدہ دوسری دنیا میں پہنچ گئی.....“ بات کے اختتام پر اس کے ہونٹوں سے ایک سکاری برآمد ہوئی۔

اس سکاری میں درد، کرب، افسوس اور ندامت..... سب کچھ شامل تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اس کے بعد.....؟“

”مجھے زاہدہ کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ”میں اس کی لاش کو اٹھائے اٹھائے نہیں پھر سکتا تھا لہذا.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے

اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ”تم نے زاہدہ کی لاش کے ساتھ کیا کیا؟“

”میں نے..... اس کی لاش کو..... بڑی نہر میں بہا دیا.....“ اس نے بتایا۔

موضع جھوک فرید کے نزدیک سے ایک بڑی نہر گزرتی تھی جو ان دنوں کناروں تک بھری ہوئی بہہ رہی تھی۔ جھوک فرید کے آگے میلوں دور تک کوئی گاؤں دیہات واقع نہیں تھا اسی لیے ابھی تک لاش کی دریافت یا بازیافت کی کوئی اطلاع منظر عام پر نہیں آئی تھی۔

زاہدہ کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا۔ اس نے جبرو کے تعاون سے بیک وقت دو مردوں مشتاق باجوه اور اسلم عرف بھولا سے انتقام لے لیا تھا تاہم اپنی کامیابی کا جشن منانے کے لیے قدرت نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے انجام واقعی تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فتنہ سامان عورت اپنے ساتھ کئی لوگوں کا کبڑا کر گئی تھی۔

میں جبرو بد معاش اور اس کی معاونت کرنے والے جیلا کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ جیل عرف جیلا سے جبرو کی یاد اللہ تھی جیسی اس نے جبرو کو اس ڈیرے پر پناہ دی تھی۔ اس رات میرے تھانے کی حوالات میں جبرو اور جیلا کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ اگلی صبح میں نے جیلا اور بھولا کو رہا کر دیا۔

جبرو چونکہ مشتاق باجوه کے قتل کا اقرار کر چکا تھا لہذا اقبال جرم کے بعد اس کے ریمانڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کے خلاف مضبوط قسم کا چالان تیار کیا اور اسے حوالہ عدالت کر دیا۔ چند پیشیوں کے بعد عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنادی تھی۔

نذیر باجوه نے اس موقع پر زاہدہ کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ”تھانے دار صاحب! وہ کیا کہتے ہیں..... اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفائیں.....“

زاہدہ ذات کے لحاظ سے ایک نائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ نائی، موچی، دھوبی اور اسی سطح کے دیگر پیشوں کو کم ذات سمجھ کر ان سے نسلی امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں ”کمی“ کہہ جاتا ہے۔

نذیر باجوه اور اسی سوچ کے حامل دوسرے افراد کی رائے اپنی جگہ مگر میرا نظریہ اپنی جگہ اٹل تھا تاہم زاہدہ کے معاملے میں نذیر باجوه نے نسلی امتیاز برت کر غلط کیا تھا یا درست، اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں.....!

(تحریر: حسام بت)

استفسار کیا۔ ”ایسی کون سی لکیر ہے شاہ بابا اس کے ہاتھ میں؟“
شاہ بابا نے مدھم لہجے میں کہا۔
”بی بی! اس بچے کے ہاتھ میں قتل کی لکیر ہے یہ زندگی
میں ایک قتل ضرور کرے گا۔“

اپنی بات ختم کرنے کے بعد شاہ بابا خود بھی اداس
ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنی زبان پر قابو نہ رکھنے کا

شاہ بابا کی کہی ہوئی بات آج بھی شفقت کی
یادداشت میں محفوظ تھی، جو انہوں نے اچانک اس کی ننھی منی
پتھلی دیکھ کر اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہی تھی۔ ”رابعہ بی
بی! اللہ خیر کرنے تیرے بیٹے کے ہاتھوں کی لکیروں میں
ایک لکیر بڑی پریشان کن ہے۔“

رابعہ بی بی نے بے چین ہو کر اضطرابی لہجے میں

قتل کس لکیر

آصف ضیاء احمد

کہتے ہیں کہ پتھلی کی لکیروں اور قدموں تلے بچھے رستوں کا آپس
میں کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ شاید اس گٹھ جوڑ کو ہی مقدر
کہتے ہیں... بہر حال یہ طے ہے کہ لکیروں میں کچھ لکھا ہوا نہ ہو
مگر تقدیر کی ہر تحریر ضرور پوری ہوتی ہے... جانے انجانے
میں وہ بھی انہی راستوں پر چلنے کے لیے مجبور تھا جو
کاتب تقدیر نے لکھ ڈالے تھے۔

ایک مجرم کی بے بسی و بے کسی کا عبرت اثر واقعہ



انہیں خود بھی افسوس ہو رہا ہو لیکن حیران سے نکل چکا تھا۔ یہ سن کر رابعہ بی بی کے ہوش اڑ گئے۔ بدقت تمام اس نے یاس انگیز لہجے میں شکستہ آواز سے کہا۔

”شاہ بابا! کیا تقدیر کا لکھا ہمیشہ پورا ہوتا ہے؟ کاتب تقدیر تو ہر چیز پر قادر ہے، کیا وہ یہ لکھا ہوا تبدیل نہیں کر سکتا؟“

شاہ بابا نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”دعا..... دعا میں اوپر والے نے یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ کبھی کبھی لوح محفوظ کا لکھا بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ اور تو ماں ہے۔ گڑگڑا کر مانگے گی تو ہو سکتا ہے اس کا دریائے رحمت جوش میں آ جائے۔“

رابعہ بی بی نے شفقت کی انگلی تھامی اور شاہ بابا کے آستانے سے انگلی، اس عزم کے ساتھ کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے اتنی دعائیں اور التجائیں کرے گی کہ بارگاہ الہی میں یہ قتل کی لکیر ہوا میں تحلیل ہو جائے گی لیکن اس دکھاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس تو دعائیں مانگنے کی مہلت ہی نہیں ہے۔ دوسری صبح جب وہ اپنے بیمار اور قانع زدہ شوہر اور اکلوتے بیٹے شفقت کے لیے دودھ اور ڈبل روٹی لینے کے لیے گھر سے نکلی تو ایک تیز رفتار ٹرک کے نیچے آ کر زندگی کی بازی ہار گئی۔ رابعہ کی موت کے بعد اس کا شوہر شاہ نواز بھی زیادہ دن نہیں جی سکا اور شفقت کو اس بھری پری دنیا میں تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھا کر گیا۔ سب کچھ اتنا آغا فانا ہوا کہ شفقت کا معصوم ذہن کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ محلے والوں اور عزیز رشتے داروں نے کچھ دن اس کا خیال بھی رکھا اور دلا سے تسلی بھی دیتے رہے لیکن آخر کب تک..... سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔

چند دن بعد شفقت کو احساس ہوا کہ وہ دنیا کے اس لبق و دق صحرائے بالکل اکیلا کھڑا ہے۔ اس بری گھڑی میں اسے اپنے والد کے ایک دوست یاد آئے جنہیں وہ امجد چچا کہتا تھا۔ امجد چچا اس کے خاندان کے ہمدرد تھے اور اکثر ان لوگوں کی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ تھکے تھکے قدم اٹھاتا وہ امجد چچا کے دروازے پر پہنچا اور ہولے سے دستک دی۔ امجد نے نہ صرف اس کے لیے دروازہ کھولا بلکہ اپنی بانہیں بھی وا کر دیں۔ امجد کی وجہ سے ہی وہ اسکول کی صورت بھی دیکھ پایا۔ چند جماعتیں ہی پڑھ پایا تھا کہ امجد کی بیوی صغریٰ نے جسے وہ چچی کہتا تھا، یہ کہہ کر اس کا تعلیمی سلسلہ روک دیا۔ ”آج کل پڑھ لکھے لوگ برساتی کیڑوں کی طرح زمین سے ابل رہے ہیں۔ کوئی نوکریاں ان کے پاس چل

کر آرہی ہیں۔ گریجویشن اور ماسٹرز کرنے کے بعد بھی یا تو وہ سبزی بیچ رہے ہیں یا ٹیکسی چلا رہے ہیں۔ تو کیوں نہ یہ کام پہلے کر لیا جائے، وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔“

چچی کا پچاس کلو کا گٹھا ہوا جسم اور پھر ان کا اندازِ بیاں۔ چچا امجد نے اس کی حمایت میں کچھ کہنا بھی چاہا تو بیوی کی خونخوار نظروں کی تاب نہ لا کر فوراً باہر کی راہ لی۔ جس روز چچی نے اس کو اسکول جانے سے روکا، وہ اس دن خوب رویا۔ ابھی تک محض اسکول جانے کے شوق میں وہ چچی کا ہر کام دوڑ دوڑ کے کرتا تھا۔ آج اسے اپنے ماں باپ بے پناہ یاد آئے۔

☆☆☆

شفقت شکل و صورت کے اعتبار سے کسی افریقی باشندے سے کم نہیں تھا۔ پکا سیاہی مائل رنگ۔ موٹے موٹے نقوش اور الجھے کھنکھتے سیاہ بال لیکن اس کے مرحوم والدین اسے شہزادہ کلفام سمجھتے تھے۔ شکلاً وہ ضرور کتر تھا لیکن عقلاً بلا کا تیز تھا۔ بلکہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے کوئی غلط کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ سیدھی انگلیوں سے کھی نہیں نکلتا تو فوراً انگلیاں ٹیڑھی کر لو اور اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ فوراً امجد اور صغریٰ کے گھر سے فرار کا منصوبہ بنا کر دوسرے دن اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ صغریٰ نے حسب سابق مینے کی دو تارخ کو اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک موٹی گڈی تھماتے ہوئے کہا۔ ”شفو! آج تم نے تمام بلوں کی ادا ہو گئی، درزی کی سلائی کا ٹیل، مینے بھر کا راشن لے کر بقا یا رقم بینک میں جمع کروانی ہے۔ جلدی سے گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کر ڈال۔ چل جلدی کر۔“

شفو نے فرماں برداری سے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور آہستہ سے کہا۔ ”جی چچی! آپ اطمینان رکھیے، بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔“ اس کے جانے کے بعد جب شام تک شفو کی صورت نظر نہ آئی تو چچی صغریٰ منحنی سے چچا امجد سے لڑا کر پاگل ہو گئی۔ ہزار ہا صلواتیں نہ صرف شفو کو ستائیں بلکہ اس کے مرحوم والدین کو بھی نہ بخشا۔

☆☆☆

تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ٹرین میں بیٹھا شفو کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ٹرین کراچی کی جانب رواں دواں تھی۔ کراچی جانے کا فیصلہ اس نے کافی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں ضرور اسے کوئی کام کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ کئی

پر یہ فیصلہ قابل قبول نہیں تھا۔ فی الحال میرے کے آنے سے بحث کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن تینوں کے چہرے اندرونی... مددگار کی چٹلی کھا رہے تھے۔ گلو نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ کفیل کی مدد سے وہ شنو کو ایسا سبق سکھائے گا جو وہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ انگلیاں میز پر کر کے گھی ٹکانے والا شنو کا اصول وہ بھی اپنائے گا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ انسان پر سب سے برا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو غفلت سمجھنے لگتا ہے اور یہی سب کچھ شنو کے ساتھ ہوا۔ جرم و سزا کی دنیا اسے ایسی راس آئی کہ مٹی کو ہاتھ لگا تا تو وہ سونا بن جاتی۔ شب و روز روپے پیسے کی جھونکا رہی۔ اکثر وہ سوچتا کہ کاش آج اس کی ماں اور شاہ بابا بقیہ حیات ہوتے تو انہیں دکھاتا کہ اس کی تقدیر لکھنے والے نے سونے کے قلم سے لکھی ہے اور وہ خط نقدیر جو اس کی ماں کے لیے پریشانی کا باعث بنا تھا، اسے تدبیر کے زور پر بھی کا مٹا چکا ہے۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر اتنی صفائی سے کرتا کہ پولیس تا کتی رہ جاتی۔ لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اسے آسمان کی بلندی سے اٹھا کر زمین کی پستیوں میں لا پھینکا۔

☆☆☆

آج تینوں بہت خوش تھے۔ خلاف توقع تھوڑی سی محنت کے بعد ایک ٹھنڈی رقم ہاتھ لگی تھی۔ فتو جان کا بار غار تھا، اس کے موٹی باڑے میں بیٹھک۔ طے پائی گئی۔ رقم کا بیوار بھی وہیں ہونا تھا۔ تینوں نے مشترکہ طور پر ایک کھٹارا کار خرید رکھی تھی۔ اسی کھٹارا کار میں بیٹھ کر وہ اپنے مقررہ وقت پر فتو کے باڑے میں پہنچ گئے۔ شام کے ستائے گھرے ہوتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ باڑے میں خشک گھاس کے ڈھیر پر تینوں اس طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھے جیسے راجا مہاراجا اپنے سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔ زرد مدھم جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں شنو نے دونوں دوستوں پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں تھا سے ہوئے بیگ کو تھپتھپاتے ہوئے مطمئن لہجے میں دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یارو! آج تو ہمارے وارے نیارے ہو گئے۔ چلو اب مال کی تقسیم کا کام بھی نمٹا لیتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے بیگ کی زپ کھولنا چاہی۔ معاً گلو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرد لہجے میں کہا۔ ”نصہرو..... شنو بھائی! پہلے ہماری بھی ایک بات سن لو۔ پیسے کا بیوار آج ہم

دونوں کی تنگ و دو کے بعد اسے احساس ہوا کہ انسانوں کے اس جنگل میں روزگار تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریت میں سوئی تلاش کرنا۔ چچی کے سر پر دست شفقت پھیر کر اس نے جو رقم حاصل کی تھی، وہ اب قریب انکم تھی۔ کراچی کی چھوٹی بڑی شاہراہوں اور ان گنت گلیوں میں چلتے ہوئے وہ کچھ ایسے لوگوں سے ٹکرایا جو پیسا کمانے کے لیے شارٹ کٹ اپناتے ہیں۔ جرائم پیشہ طبقے سے جو لوگ تعلق رکھتے تھے، شنو ان میں ایسا گھل مل گیا جیسے شیر و شکر لیکن اتنے لوگوں میں اس کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ صرف دو انسان تھے۔ ایک گلو اور دوسرا کفیل۔

گلو جسے اپنے اصلی نام کا خود بھی علم نہیں تھا۔ بس لوگوں نے اسے گلو کہہ کر پکارنا شروع کیا اور یہی اس کا نام بن گیا تھا۔ عام سی صورت شکل لیکن مضبوط کاٹھی کا نوجوان تھا۔ طبیعتاً چالاک، مکار تھا۔ ہمیشہ دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتا اور ایسی حکمت عملی اختیار کرتا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس کے مقابلے میں کفیل سیدھا سادہ اور کمزور سا تھا۔ تینوں ہر چوری، ہر ڈکیتی نہایت منظم طریقے سے اور منصوبہ سازی کے ساتھ کرتے اور جب کوئی بڑا ہاتھ مارنا ہوتا اور معاملہ پر خطر ہوتا تو دونوں شنو کی طرف دیکھتے۔ شنو جرم کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے جائے واردات کا نقشہ، طریقہ واردات، خطرناک صورت حال میں راہ فرار کس طرح اختیار کی جائے، دونوں کو اس طرح سمجھاتا کہ دونوں بخوبی سارا کیس ہینڈل کر لیتے۔ تینوں میں یہ معاملہ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ حاصل شدہ رقم کا پچاس فیصد شنو رکھے گا اور باقی پچاس فیصد گلو اور کفیل آپس میں بانٹیں گے۔

کچھ عرصے تو کام برابر چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے گلو اور کفیل کو اس بات کا ادراک ہونے لگا کہ شنو انہیں غلام سمجھتے لگا ہے۔ آخر میں صرف زبان ہلانے کی فیس جو ففتی پرسنٹ بنتی، وہ لے کر علیحدہ ہو جاتا۔ شنو کا وجود دونوں کو کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس وقت بھی تینوں شہر کے اوسط درجے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اسی موضوع پر بحث و مکرار کر رہے تھے۔ گلو اور کفیل کا متفقہ فیصلہ تھا کہ پیسے کا بیوار تین حصوں میں برابر کیا جائے اور وہ حکمت عملی تبدیل کرنے پر بھی زور دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خطرناک لمحات میں شنو کو بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ اگر حوالات کی سیر کرنے کا موقع آئے تو تینوں مشترکہ طور پر انجوائے کریں لیکن شنو کے لیے کسی طور

لے رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی کرا رہا تھا لگا دیا جب ہی یہ دنیا سے کوچ کر گیا۔“

شفو کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ خوف اور دہشت سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا بچہ پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر جھک کر کفیل کو ہلانے لگا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ”ارے اٹھ جا میرے یار..... جو تو کہے گا وہی ہوگا۔ بس اب مجھے زیادہ پریشان نہ کر۔“ اس کے لہجے میں پچھتاوا، تاسف اور دکھ کا عنصر نمایاں تھا۔ گلو اور شفو کی لاکھ کوشش کے باوجود کفیل نے کوئی جنبش نہیں کی۔

شاہ بابا کی پرسوں پہلے کہی ہوئی بات شفو کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں گلو کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”یقین کر گلو میں نے کوئی ایسا کاری دار نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔“

گلو نے استہزاء سے ہنسی جتے ہوئے کہا۔ ”واہ شفو بھائی واہ..... اس غریب نے جان سے ہاتھ دھو لیے اور آپ کہتے ہیں میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس قتل کا۔ اگر میری زبان کل گئی تا تو آپ کی ساری عمر آہنی سلاخوں کے پیچھے کٹ جائے گی۔“

شفو نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے گلو سے کہا۔ ”گلو! اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔“

گلو نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر سے کیا کہو گے کہ میرے ایک ہاتھ نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ یہ سب سن کر ڈاکٹر آپ کی خیریت نہیں پوچھے گا بلکہ پہلی فرصت میں پولیس کو فون کرے گا اور ایسا برا وقت آنے سے پہلے میں آپ سے رخصت چاہوں گا۔“

شفو کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے گھکیاتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں روہائی آواز میں کہا۔ ”نہیں نہیں گلو، میرے دوست! اس مشکل وقت میں میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ اب بتاؤ اس لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں۔ تو جو بولے گا میں وہی کروں گا۔“

گلو نے اپنے گرد و نواح میں ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ جیسے جیسے رات بھیک رہی تھی، سردی زور پکڑ رہی تھی۔ گلو نے گرم مٹرا اپنے کانوں کے گرد لپٹتے ہوئے کہا۔ ”چلو اٹھو اور اس نومن کی لاش کو اٹھانے میں میری مدد کرو۔“

شفو نے گھبرا کر کہا۔ ”اے..... اے کہاں لے

دونوں کی مرضی سے ہوگا۔ اس مال میں تین برابر کے حصے ہوں گے۔ ابھی تک بالائی آپ لے جاتے تھے اور نیچے کا پانی ہمارے حصے میں آتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔“

شفو نے غور سے گلو کی بات سنی اور پھر غراتی ہوئی آواز میں کفیل سے مستفسر ہوا۔ ”کفیل! کیا تیری بھی ڈیمانڈ یہی ہے؟“ کفیل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں شفو بھائی! میں بھی اس احتجاج میں شامل ہوں۔“

شفو کے اعصاب تن گئے اور جبروں کو اس نے بری طرح بھینچ لیا تھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”عقل کے اندھو! تم دونوں بڑے احسان فراموش ہو۔ میں اپنی ذہانت سے تم دونوں کے لیے ایسی ایسی چالیں ترتیب دیتا ہوں کہ سرکڑھائی میں ہوتا ہے اور انگلیاں ٹھی میں..... لیکن تمہیں یہ سب اس نہیں آرہا تھا۔ تم دونوں کو ایک بار نہیں کئی بار پولیس کی ٹاک کے نیچے سے نکال کر لایا ہوں۔ ورنہ اب تک تو تم دونوں سڑ گئے ہوتے جیل کی کال کوٹھری میں۔“

ہمیشہ خاموش رہنے والا کفیل کفن بھاڑ کر بولا۔ ”بس بس شفو بھائی! کون کتنے پانی میں ہے، ہمیں بھی پتا ہے۔ اگر ہم دونوں احسان فراموش ہیں تو آپ کون سے دودھ سے نہائے ہوئے ہو۔“

شفو چیخا۔ اس کے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ سیدھا سادہ نظر آنے والا اسے طعنہ مارے گا۔

کفیل کے شیر ہوتے ہی گلو کی آواز بھی بلند ہو گئی۔ اس نے بھی کرخ آواز میں کہا۔ ”شفو بھائی! ہم نے ہمیشہ آپ کا ادب کیا ہے۔ ہر کیس میں آپ کی ذہانت ہے تو ہماری بھی محنت ہوتی ہے لیکن آپ مگر مجھ بن کر سب کچھ نکل جاتے ہیں اور ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں۔“

”کیا کہا مگر مجھ۔“ شفو نے چلا کر کہا اور بیگ ایک طرف رکھ کر سخت کرکھڑا ہو گیا۔ اب شفو کا ہاتھ تھا اور دونوں کے گریبان۔ گلو کا جسم کسرتی اور مضبوط تھا اور وہ سارے داؤ پیچ بھی جانتا تھا جبکہ کفیل جسمانی طور پر کمزور اور اس میدان میں اتاری تھا۔ وہ شفو کی لاتوں اور گھونٹوں کا جواب نہیں دے سکا اور گھاس کے ڈمیر پر ہی چکرا کر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی حالت دیکھ کر گلو نے چھلانگ لگائی اور کفیل کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر پھنسی پھنسی آواز میں چیخا۔

”ارے شفو بھائی! یہ کیا کر ڈالا؟ تو سانس ہی نہیں

پر نہیں تھا۔ جس جگہ دونوں کھڑے تھے، وہاں حد سے زیادہ تاریکی تھی اس لیے گلو نے اپنی جیب سے ٹارچ نکال کر روشنی کا محرک دائرہ ادھر ادھر پھینکا اور مدھم آواز میں کہا۔
”شفو بھائی! چادر میں لپیٹ کر اسے لیے چلتے ہیں۔ ذرا مضبوطی سے پکڑنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ شفو نے جواب دیا۔ یہ سارا علاقہ گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ راستہ حد درجہ دشوار گزار تھا۔ اچانک دور کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز بلند ہوئی اور شفو کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر لاش زمین پر رکھ دی۔

گلو نے پھر اپنی جیبی ٹارچ کا سہارا لیا اور اپنی عقابی نظروں سے اطراف کا معائنہ کیا اور کہا۔ ”میرے خیال میں تدفین کے لیے یہ جگہ مناسب ہے۔ برسوں کوئی ادھر جھانکنے کا بھی نہیں۔ اگر بھی کسی کھدائی میں ہڈیاں نکلتی بھی ہیں تو کون پہچانے گا کہ کس کی باقیات ہیں۔ کیوں صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟“

یہ کہہ کر جب اس نے شفو کی طرف نظر ڈالی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے شفو کا خون نچوڑ لیا ہو۔ گلو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شفو بھائی۔ آپ کا ایک دوست مرا ہے لیکن دوسرا زندہ ہے۔ آپ ایسا کریں واپس جا کر آرام کریں۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں، میں سب کر لوں گا۔“

گلو کی بات سنتے ہی شفو نے ایک پرسکون سانس خارج کی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس نے اظہار تشکر کے طور پر زور سے گلو کا ہاتھ دبا یا اور کہا۔ ”تم صحیح کہہ رہے ہو، اس وقت میری حالت بالکل غیر ہو رہی ہے۔ اگر یہ سارا جہال تم غمناک تو میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔“

گلو نے ایک سنگدلانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ”میں کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں، احسان کرنا، نیکی کرنا یہ اپنی فطرت میں نہیں۔ اپنا تو اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ آپ کے ساتھ کھرا اور صاف ستھرا سودا کرنا ہے۔ اس سارے معاملے کو نمٹانے کا معاوضہ یہ ہوگا کہ آج کا سارا مال اپن کا۔ آپ کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی اور میں زندگی بھر ہونٹوں کو قفل لگا کر رکھوں گا لیکن آپ کو ہر مہینے اس کی دیمٹ کرنی ہوگی۔ اگر آپ اس معاہدے پر کاربند رہتے ہیں تو پانچ بی یاروں کے یار ہیں۔ ورنہ پھر آپ کو معلوم ہے

جا میں گے؟“ اس سخت سردی میں بھی وہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ سراپنگی اور خوف سے اس کا برا حال تھا۔ چوری چکاری تو ایک الگ چیز تھی۔ کسی کے خون سے پہلی بار ہاتھ رنگے تھے۔ ذہنی طور پر وہ بالکل ہی مفلوج ہو گیا تھا۔ اس کے استفسار پر گلو کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں جوابا کہا۔ ”ارے شفو بھائی! کیا بالکل ہی دماغ چل گیا ہے۔ اس ڈیڈ باڈی کو یا تو دور یا برد کرنا ہوگا یا کہیں تدفین کر کے اس کی فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کا.....“

درمیان میں ہی شفو نے جملہ اچک لیا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ اور زور زور سے اثبات میں گردن ہلا کر لاش اٹھانے میں گلو کی مدد کرنے لگا۔ دونوں کے نصیب اچھے تھے کہ باڑے کا چوکیدار آج چھٹی پر تھا۔ دونوں نے لاش کو عقی سیٹ پر لٹا کر چادر ڈال دی۔ گلو ہمت سے کام لے رہا تھا۔ گاڑی کا انجن پہلے تو غراتا رہا، اس کے بعد چند ہچکیاں لیں اور اسٹارٹ ہو گیا۔ ایک دھچکے سے گاڑی چل پڑی۔ سڑک طویل اور سسناں تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت ادھر بہت کم ہی تھی۔ اس وقت شفو ہاتھوں کی لکیروں میں الجھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ شاہ بابا کی پیش گوئی کتنی سچی ثابت ہوئی تھی۔ حقیقت میں اس کے ہاتھ میں قتل کی لکیر تھی اور آج وہ واقعی ایک قتل کر چکا تھا۔

سارا راستہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔ گلو نے سڑک کے کنارے کچے میں گاڑی روک دی۔ لفیل کی لاشیں دونوں نے سنبھال کر اتاری اور زمین پر لٹا دی۔ دونوں نے اطمینان کی سانس لی اور پھر گلو نے سکوت توڑا اور کہا۔ ”شفو بھائی! اس لاش کو ٹھکانے لگانے سے پہلے میں آپ سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

شفو جو کہ دہشت کے مارے خزاں رسیدہ پتے کی طرح بل رہا تھا، اس نے تھوک نلگتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ ”گلو! میں تیری ایک نہیں ایک ہزار باتیں سن لوں گا لیکن سب سے پہلے اس مصیبت سے میری جان چھڑا۔ ورنہ یقین کر میں یہیں دم چھوڑ دوں گا اور تجھے ایک نہیں دو لاشوں کا کریاکرم کرنا پڑے گا۔“

گلو نے اس کی بات پر کھل کر قہقہہ لگایا۔ اس کی یہ ہنسی اتنی زندہ اور جاندار تھی کہ ایسا بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے مقتول دوست کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ دکھ، غم اور پریشانی کا ہلکا سا شائبہ بھی اس کے چہرے

کہ اپن کیا چیز ہے۔“

شفو گلو کے عالم میں کھڑا گلو کی باتیں سن رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ گلو کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اگر روشنی ہوتی تو اسے نظر آ جاتا کہ گلو کی آنکھوں میں شیطانیات اور ہوس ناچ رہی ہے۔ تمام حالات چونکہ شفو کے خلاف جارہے تھے اور خوف و دہشت نے اس کی عقل سلب کر لی تھی، اس لیے وقت کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس نے دل پر ہتھ رکھ کر ہائی بھری۔

جیسے ہی اس کے منہ سے ہاں نکلی، گلو کے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ اس نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔ ”بس اب آپ کی چھٹی..... آپ جا کر خواب خرگوش کے مزے لیں۔ یہ ساری ذمے داری اب میری ہے۔ بس رقم کا بیگ مجھے تھماتے جائیے گا۔“

شفو کو جیسے ہی گلو کی طرف سے اجازت ملی، وہ ایسے بھاگا کہ عقب میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور اس کی غراہٹ سنائی دی پھر آواز بتدریج کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ گلو سمجھ گیا کہ شفو اس علاقے سے نکل چکا ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور اپنے کوٹ کی جیب سے پانی کی بوتل نکال کر دو گھونٹ پیے اور باقی کا سارا پانی کفیل کے چہرے پر انڈیل دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کفیل نے ایک جھر جھری لی اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو ایک لمبی سانس کے ساتھ اس نے بہت سی آکسیجن اپنے پیچھے پھڑوں میں بھری اور پھر دونوں نے ”ہڑے“ کا نعرہ لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے پلٹ گئے۔ ان کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ کفیل نے آہستہ سے گلو کے کان میں سرگوشی کی۔ ”گلو اپنی چال کامیاب ہو جائے گی نا؟“

گلو بولا۔ ”ہو جائے گی کا کیا مطلب، چال کامیاب ہو چکی ہے۔ ویسے میرے یار تو نے یہ سانس روک کر دم سادھے رکھتے کافن کس سے سیکھا ہے؟“

کفیل نے جواباً کہا۔ ”اپنے ابا سے سیکھا ہے۔ وہ ہندو جوگیوں اور سادھو سنتوں میں بہت اٹھتے بیٹھتے تھے اور میری اماں انہیں ہمیشہ روکتی تھی لیکن ابا کبھی کسی کی بھی نہیں سنتے تھے۔ جب ابا مجھے سانس روکنے کی مشق کرواتے تو ان کا اور اماں کا زبردست جھگڑا ہوتا۔ اس لیے میں اسے مکمل طور پر سیکھ نہیں پایا۔ بلکہ یہ سمجھو میں بالکل کچا اور اناڑی ہوں۔ جبکہ میرے ابا اس فن کے ماہر تھے۔“

گلو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ”ویسے دوست! تیرے ابا نے بھلے ہی ورثے میں تیرے لیے کچھ

نہ چھوڑا ہو لیکن تجھے ایسا اصول ہنر سکھا کر گئے ہیں کہ ہم ساری زندگی اب چین کی بانسری بجائیں گے۔ لیکن تیرے پاس جو یہ ہنر ہے، اس کے بارے میں کسی اور کو تو علم نہیں؟“ اس کی بات سن کر کفیل کے چہرے پر سلوٹس پڑ گئیں۔ وہ دماغ پر زور ڈال کر سوچنے لگا پھر پرخیاں انداز میں گلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اماں اور چھوٹی بہن کو اس بات کا علم ہے کہ ابا یہ ہنر مجھ میں منتقل کر کے گئے ہیں۔“

گلو نے جھلا کر ترش روئی کے ساتھ کہا۔ ”ابے میں تیری اماں یا تیرے خاندان کی بات نہیں کر رہا بلکہ اپنے گینگ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اگر کبھی کسی نے شفو کے کان میں سور پھونک دیا تو ہمارا سارا ڈراما ٹیل ہو جائے گا۔ پھر ہم دونوں کو شفو پھانسی پر لٹکائے بغیر نہیں مانے گا۔“

کفیل نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”نہیں، نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تیرے علاوہ ہمارے گروہ میں کسی کو بھی میری اس صلاحیت کا پتا نہیں۔ حالانکہ اپنے ساتھیوں میں سے کتنوں نے مجھ سے یہ سوال بار بار کیا کہ میں نشہ کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کسی کو تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ میرے ابا نے مجھے پہلا سبق بھی دیا تھا کہ اگر میں کسی بھی قسم کے نشہ کو ہاتھ لگاؤں گا تو پھر اپنی سانسوں پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ اسی لیے میں سگریٹ اور شراب سے دور رہتا ہوں۔“

گلو نے بھوس اچکاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ اسی لیے تو ان چیزوں کو چھوٹا بھی نہیں ہے۔ ورنہ ہمارے دن ورات تو شراب اور شراب کے بغیر نامکمل ہیں۔ اس دلدل میں اترنے کے بعد تو پیر دھنتے ہی جاتے ہیں۔“ کفیل نے اچانک اس سے سوال کیا۔ ”گلو! کبھی تو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا کون ہے اور کہاں سے تعلق ہے؟“

گلو نے ایک زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”معلوم ہوتا تو بتاتا نا۔ مجھے تو آسمان نے پھینکا اور زمین نے جھیلیا۔ بس میرے علم میں اتنی بات ہے۔ چل اب چلتے ہیں، سردی کے مارے ہڈیوں کا گودا بھی جم گیا ہے۔“ دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے کنارے پہلی زمین پر نکل آئے جہاں ان کی کھٹارا کار آ کر رکی تھی۔ گلو نے روشنی کے دائرے میں زمین کو غور سے دیکھا اور کہا۔

”میں نے اس چھکڑے کو یہیں روکا تھا۔“ کفیل نے بھی ٹائر کے نشانات دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج اس چھکڑے نے ہمیں مروا ہی دیا تھا۔ یہ شفو ہے بھی بلا کا ذہین، تم صحیح کہتے ہو اسے اگر ذرا سی بھی سن گن ملتی تو ہم دونوں کو چھوڑے گا نہیں۔“

دونوں کافی دور تک پیدل چلتے رہے، اس کے بعد گلو نے استفسار کیا۔

”کفیل! میرے ساتھ میرے گھر چلو گے یا.....“
کفیل نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اب کبھی تمہارے ساتھ یا گروہ کے کسی آدمی کے ساتھ نظر آنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ میں تم لوگوں کے لیے مفرور اور شفو کے لیے مردہ ہوں۔ بس اب معاہدے کے مطابق میرا آدھا حصہ میرے بتائے ہوئے پتے پر میرے حوالے کر جانا۔ اگر بے ایمانی کی تو سیدھا شفو کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

گلو ہنسنے لگا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں، اطمینان رکھو۔ ہم کام ضرور بے ایمانی کا کرتے ہیں لیکن ایمانداری کے ساتھ کرتے ہیں۔“ ایک چوراہے پر آکر دونوں دوستوں کے راستے علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

☆☆☆

شفو کھے دل اور ڈمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہ جاتے ہی جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ بار بار اس کے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ اس نے کفیل پر بالکل ہلکا ہاتھ اٹھایا تھا، کوئی کاری ضرب نہیں لگائی پھر اچانک اس کی موت کیسے واقع ہو گئی؟ سوچتے سوچتے جب دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بری طرح پچھتاوے کا شکار تھا۔ بالآخر تھک ہار کر اس نے اپنے سیل فون پر گلو کا نمبر ڈائل کیا۔ گلو کو کافی راستہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی نصیب ہوئی تھی اور ابھی ابھی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہی تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ نیند کا خمار سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ موبائل پر نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے ”ہیلو“ کہا۔

”نہایت مدہم اور آہستہ آواز میں شفو نے استفسار کیا۔ ”گلو! کام ہو گیا؟“

”کونسا کام؟“ گلو کا جواب تھا۔ اس کا غیر دانشمندانہ جواب سن کر شفو اس فکر و پریشانی میں بھی بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر موبائل آف کر دیا۔ سپیدہ سحر نمودار ہو چکی تھی لیکن شفو کے بیڈ کی چادر اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔ گمرے میں اب بھی قبرستان کا سانسنا چھایا ہوا تھا۔ گلو اپنی کبھی ہوئی بات پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ وہ ہر مہینے جا کر شفو کے سر پر سوار ہو جاتا اور شفو اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھما دیتا۔ گلو ایک عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا بھتا وصول کرتا اور ”اچھا اگلے مہینے ملاقات ہوگی“

شفو بھائی۔“ کہتا ہوا رخصت ہو جاتا اور شفو خون کے گھونٹ پی کر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہتا۔ گلو وہاں سے نکل کر ٹھکانے پر آتا اور وہاں پہنچ کر لفافے کو اچھا خاصا ہلکا کرنے کے بعد کفیل کے ٹھکانے پر پہنچتا اور کفیل کے ہاتھ میں لفافہ رکھ کر کہتا۔ ”جو رقم ملی تھی، وہ میں نے ففتی ففتی بانٹ لی ہے۔ یہ تمہارا حصہ۔“ اور کفیل خوشی سے پھولے نہ ساتا کہ بغیر محنت مشقت کے ایک بڑی رقم خود چل کر اس کے پاس آ رہی تھی۔ کفیل مکمل پردہ پوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔

☆☆☆

شفو اب پہلے والا شفو نہیں رہا تھا۔ جب سے اس کے ہاتھوں کفیل کا قتل ہوا تھا، اس نے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کو یکدم ترک کر دیا تھا۔ اگر کچھ کرنا بھی چاہتا تو اچانک وہ وحشت ناک رات اسے یاد آ جاتی اور دل بیٹھنے لگتا۔ آہستہ آہستہ خیالات نے کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا کہ اس راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ لاکھ دولت کے انبار ہوں گے لیکن خوف و دبشت کی تلواریں سر پر لگی ہوگی۔ آخری ٹھکانا جیل کی چار دیواری اور پھانسی کا تختہ ہوگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے زمینوں کی خرید و فروخت اور بلڈنگ کنسٹرکشن میں اپنا سرمایہ لگایا۔ اپنی جمع پونجی جب اس نے اس کام میں لگائی تو وہ بری طرح ہراساں تھا لیکن غلامت کے اس جوہڑ میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پوری محنت اور دلچسپی کے ساتھ کام کرتا رہا اور پھر اسے مثبت نتائج سامنے آئے کہ وہ خود حیران رہ گیا۔ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ بہت تیزی سے اس نے اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنالی۔ اس نے اپنا اسٹینڈرڈ تبدیل کیا۔ کرائے کا چھوٹا سا کمرہ چھوڑ کر متوسط پیمانہ علاقے میں ایک فلیٹ خرید لیا اور کھانا کاروبار ہمیشہ کے لیے گلو کو بخش دی اور خود اس نے مناسب داموں میں ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی جو کافی بہتر حالت میں تھی۔ فلیٹ کا پتا بھی اس نے گلو کو نہیں بتایا۔ رقم کا لین دین کسی ہوٹل یا ریستورنٹ میں ہوتا تھا۔ شفو کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں اور وہ کیا کر رہا ہے، اس کی خبر نہ صرف گلو کو رہتی بلکہ در پردہ رہنے والے کفیل کو بھی اس کا علم ہوتا۔ شفو کا پھلتا پھولتا کاروبار دیکھ کر دونوں کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ دونوں اپنی ڈیمانڈ بڑھانا چاہ رہے تھے لیکن گلو مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور پھر ایک دن گلو نے باتوں ہی باتوں میں اس بات کا اظہار کر ہی دیا کہ راز کو راز رکھنے کی قیمت بڑھانی جائے۔ شفو نے بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال کر اپنا دامن بچا لیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروری 2017ء

سینس ڈائجسٹ

کے قلیٹ سے رونے دھونے اور بین کرنے کی آواز آئی۔
کھانا یونہی چھوڑ کر وہ قلیٹ کا دروازہ کھول کر تیز تیز
قدموں سے راہداری میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے
قریب ترین قلیٹ کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جگمگانا
ہوا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے اس کا پوچھنا بھی فرض
تھا۔ چپچپے کے قریب آ کر اس نے ایک معمر خاتون کو
مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا ہوا آنٹی
..... یہاں اتنی بھیڑ کیوں لگی ہوئی ہے؟“

خاتون نے رندمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ارے
بیٹا! کیا بتائیں، بیچاری معصومہ کی والدہ کی حالت بہت
خراب ہے، فوراً اسپتال نہیں لے گئے تو اللہ نہ کرے کچھ ہونہ
جائے۔ میں نے اپنے نواسے کو بھیجا ہے ٹیکسی لانے، وہ بھی
بہت دیر سے گیا ہوا ہے۔ معصومہ کا ترپنا نہیں دیکھا جا رہا
ہے۔ وہ دیکھو غریب کیسے بلک بلک کر رو رہی ہے۔“

اور جب اس بھیڑ کو چرتے ہوئے شنفو کی نگاہیں معصومہ
پر جا کر ٹھہریں تو وہ ہتھربن گیا کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جو اس
سے تھوڑی دیر پہلے لفٹ کے لیے کوٹزار ہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا
کہ لڑکی کو کوئی گینگ استعمال کر رہا ہے۔ وہ ابھی گن پوائنٹ پر
اس کی جیب پر ہاتھ صاف کرے گی اور پھر اس سے گاڑی کی
جابی طلب کرے گی۔ چونکہ ماضی میں اس کا تعلق بھی ایسے ہی
لوگوں سے رہا تھا جو حسین و جمیل لڑکیوں کو ٹریڈ کر کے لوٹ مار
کا بازار گرم رکھتے تھے۔ اپنے کہے ہوئے جملے اسے یاد آئے
تو وہ شرح سے پانی پانی ہو گیا۔ کفیل کے قتل کے بعد یہ دوسرا
گھناؤنا فعل تھا جب اسے اپنے آپ سے کراہیت محسوس
ہوئی۔ اس نے اسی خاتون کو پھر مخاطب کیا۔

”آنٹی! اگر کسی کو اعتراض نہ ہو تو مریدہ کو میں اپنی
گاڑی میں اسپتال لے جاؤں؟“ معمر خاتون نے خوش
ہو کر پل ہی پل میں اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں اور
جلدی سے قلیٹ میں گھس کر معصومہ سے سرگوشیاں انداز میں
کچھ کہا اور پھر دونوں مریدہ کو سہارا دے کر باہر لائیں۔

معصومہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ نحیف و نزار
خاتون کو سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن خود بری طرح
لڑکھڑا رہی تھی۔ شنفو آگے بڑھا اور کہا۔ ”آپ ہٹ
جائیے۔“ یہ کہہ کر اس نے بوڑھی خاتون کو اپنے بازوؤں
میں اٹھالیا۔

اب معصومہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں
حیرت اور استعجاب کا رنگ تھا۔ ہلکی سی آواز میں اس نے
تھر تھراتے لبوں سے کہا۔ ”آپ.....؟“

جون کی چلچلاتی دھوپ آگ برسا رہی تھی۔ لوہے
تھپڑے ایسے چل رہے تھے جیسے برچھیاں اور بھجر۔ سڑکوں
پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ شنفو کو اپنے کام کے سلسلے
میں اس گرم موسم میں باہر نکلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس وقت
اپنے قلیٹ میں اسے سی کی ٹھنڈک میں آرام کر رہا ہوتا۔ اس
وقت وہ ایسی سڑک سے گزر رہا تھا جہاں ہمیشہ گہما گہمی اور
چل پھل ہوتی تھی لیکن آج نسبتاً درجہ حرارت کچھ زیادہ تھا
اس لیے دور تک سناٹا تھا۔ اچانک شنفو کی نظر ایک برقع پوش
خاتون پر پڑی جو اسے لفٹ کے لیے ہاتھ دے رہی تھی۔
شنفو کسی کو لفٹ دینے کے سخت خلاف تھا۔ اس وقت اس نے
گاڑی کی رفتار مدہم ضرور کر دی لیکن گاڑی روکی نہیں۔ برقع
پوش خاتون اتنی تیز رفتاری سے گاڑی کے قریب آئی کہ شنفو
سمجھا کہ وہ گاڑی سے نکلنا نہ جائے۔ گھبرا کر جلدی سے اس
نے بریک لگائے اور سخت لہجے میں کہا۔ ”محترمہ! کیا خود کشی
کے لیے میری ہی گاڑی ملی تھی؟“

برقع پوش خاتون نے فوراً اپنے چہرے کا نقاب ہٹا
دیا۔ شنفو کی نظریں جیسے ہی اس کے چہرے سے نکرائیں،
نظریں وہیں جم کے رہ گئیں۔ برقع میں ملبوس وہ ایک نوعمر
لڑکی تھی۔ چہرہ حد درجہ جاذب نگاہ، دو دھیان رنگ میں ڈھلے
سبک اور حسین نقوش۔ ایسا صبح چہرہ اس نے پہلے کبھی نہیں
دیکھا تھا۔

وہ ابھی حسن کے اس شاہکار کو دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی کی
مترنم آواز اس کی سماعت سے نکرائی۔ ”سر! بڑی مہربانی ہوگی
اگر آپ مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے دیں تو..... دراصل
میری والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور انہیں فوراً طبی امداد
کی ضرورت ہے۔“ لڑکی کا حسین سراپا، دلکش انداز گفتگو۔ وہ
گنگنی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر لڑکی پھر
گھمکیائی۔ ”دراصل یہاں اس وقت کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں
آ رہی ہے ورنہ میں آپ کو بالکل زحمت نہیں دیتی۔“

اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور دہنگ آواز میں
کہا۔ ”محترمہ! میں نے مچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی، سارے
شہر میں آپ لوگوں نے لوٹ مار چا رکھی ہے۔“ لڑکی بھونچکی
سی اسے تنک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ شنفو
نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کی اور یہ جاوہ جا۔ لڑکی حسرت
بھری نظروں سے غبار اڑاتی گاڑی کو جاتا دیکھتی رہی۔

اپنے قلیٹ پر پہنچ کر سب سے پہلے شفقت نے
شاہ لیا اور گرمی اور پسینے سے نجات حاصل کی۔ اس کے
بعد اس نے کھانا گرم کر کے میز پر رکھا ہی تھا کہ قریب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



شفوائی دیر میں کار تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے معصومہ سے کہا۔ ”آپ دروازہ کھولیے۔“ معصومہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اس نے معصومہ کی والدہ کو پچھلی سیٹ پر لٹا کر کہا۔ ”آپ اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لیجیے۔“ اور پھر ساتھ آنے والی معمر خاتون سے کہا۔ ”آئی! آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیے۔“

ان لوگوں کو بٹھا کر وہ دوڑتا ہوا گیا اور اپنے فلیٹ کو تالا لگا کر فوراً لوٹ آیا۔ آتے ہی اس نے اسٹیرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اسپتال کی پارکنگ میں کار روک کر اس نے فوراً اسٹریچر کا انتظام کروایا۔ مریضہ کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا کیونکہ ان کی سانس بے ترتیب چل رہی تھی۔ معصومہ شدید پریشانی اور اضطراب کا شکار تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ پہلا اور ہلکا سا ہارٹ ایک ہے۔ اگر غفلت برتی گئی تو معاملہ سیریس بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ کرنے کے بعد مناسب دوا میں تجویز کیں اور کچھ گھنٹے روکے رکھا۔ کافی دیر بعد ڈاکٹر نے امید افزا خبر سنائی تو معصومہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ ساتھ آنے والی خاتون کے گلے لگ کر اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر شفو کو ممنون نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ان حسین آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر شفو کا دل چاہا کہ ان میں ڈوب جائے۔

شام کا دھندلا پھیل چکا تھا جب اسپتال سے ان لوگوں کی واپسی ہوئی۔ معصومہ کی والدہ کی حالت کافی بہتر تھی۔ شفونے گاڑی روک کر میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا تو کانوں میں پھر کسی نے شہد ٹپکایا۔ ”آپ کے اسپتال میں جو اخراجات ہوئے اس کے بھی مجھ سے پیسے نہیں لیے اور اب آپ دوائیں بھی لے آئے ہیں۔ گھر چل کر مجھے مل دے دیجیے گا۔“ شفونے ”جی بہتر“ کہہ کر اٹھاتی انداز میں سر کو جنبش دی اور کار اسٹارٹ کر دی۔

معصومہ کی والدہ کی حالت بتدریج بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ شفوقا فوفا جاکر ان کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ اسی بہانے معصومہ کے رخ روشن کا دیدار بھی ہو جاتا تھا۔ معصومہ چونکہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی، اس لیے وہ ان اوقات میں وہاں جاتا ہی نہیں تھا جب معصومہ گھر میں نہیں ہوتی۔ اس کے خوابوں خیالوں کا مرکز اب معصومہ تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ معصومہ کی والدہ سے بات کر کے

اسے اپنی دلہن بنا کر اس ویران فلیٹ میں لے آئے لیکن شیشہ دیکھ کر اسے اس سنگین حقیقت کا احساس ہوتا کہ اس کا اور معصومہ کا کوئی جوڑ نہیں۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

آج صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ دیکھا تو سورج چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا کیونکہ آج اسے کئی کام نمٹانے تھے۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنا ناشتا تیار کیا۔ اس دوران اس کے لیوں پر ایک گیت چل رہا تھا۔ معاصی اس کی نظریں دروازے کی طرف انھیں تو اسے ایسا لگا خواب میں آنے والی کلی مجسم بہار بن کر دروازے میں کھڑی ہے۔ معصومہ اپنی تمام تر جھڑپوں کے ساتھ دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔

شفو بری طرح بوکھلا گیا۔ گرم گرم چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کا منہ جل گیا۔ اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ”جی مجھ سے کوئی کام ہے؟ اماں کی طبیعت تو بہتر ہے؟“ معصومہ نے اس کی بوکھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”جی اللہ کا شکر ہے، اماں بخیر و عافیت ہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں نے دراصل ان کی صحت یابی کی خوشی میں نیاز دلوائی تھی۔ سب جگہ تو مٹھائی تقسیم کر دی لیکن آپ کا دروازہ صبح سے بند ہی نظر آ رہا تھا اس لیے اب لے کر آئی ہوں۔“

شفو کی گھبراہٹ میں کافی کمی آگئی تھی۔ اس نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”جی دراصل میں رات دیر تک جاگا ہوں۔“

معصومہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“ شفو کا دل چاہا کہ اسے چیخ چیخ کر بتا دے کہ میرے رت جگے کی وجہ تم ہو، تم مجھے سونے دیتی ہو نہ کوئی کام کرنے دیتی ہو۔ یہ سب کچھ وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ معصومہ کی ”کیوں“ کا اس نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا۔ ”جی رات ایک ضروری اور اہم کاروباری میٹنگ تھی اس لیے سونے میں کافی دیر ہو گئی۔“

معصومہ نے مٹھائی کا ڈبا جھک کر اس کی ناشتے کی میز پر رکھا اور کہا۔ ”اچھا میں چلتی ہوں۔“

شفو کا دل چل اٹھا، اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر معصومہ کو روک لے مگر وہ ایسا کرنے کا۔ گلابی بہار کا جھونکا آیا بھی اور اس کے پاس سے گزر بھی گیا۔ وہ اس دروازے کو گھورتا رہا جس سے گزر کر ابھی ابھی معصومہ باہر گئی تھی۔ معصومہ جیسے ہی شفو کے فلیٹ سے باہر نکلی تو اسے

محسوس ہوا کہ اسے مختلف دروازوں اور کھڑکیوں سے کئی آنکھیں تنک رہی ہیں۔ خواتین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں جو اشارے بازیاں کر رہی تھیں، وہ بہت اچھی طرح معصومہ کی سمجھ میں آ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے سر سے دو پٹا کھینچ لیا ہو۔ بجلی کی سی رفتار سے چلتی ہوئی وہ اپنے قلیٹ میں داخل ہوئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ماں اسے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔ بے چین ہو کر استفسار کیا۔

”کیا ہوا، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو، کسی نے کچھ کہا کیا؟“

معصومہ نے مغموم نگاہوں سے ماں کو دیکھا اور آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے کہا۔ ”کسی کی زبان نے تو کچھ نہیں کہا اماں لیکن آنکھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔“

ماں نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر کہا۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری اور ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے میں جا کر چار پائی پر لیٹ گئی۔

ماں نے بھی اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ ماں کی آواز پر ہی اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ سوتے جاگتے روتی بھی رہی ہے۔ ماں نے بغیر کوئی استفسار کیے کھانے کی طرف اشارہ کیا جو وہ چار پائی کے قریب ایک سال خوردہ ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ معصومہ نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے دو چار چھپکے مارے اور چار پائی پر تنک گئی۔

ماں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سکوت توڑا۔

”تمہاری پسندیدہ ڈش بنائی ہے میں نے لیکن تم ایسی گہری نیند سو رہی تھیں کہ ساری بریانی ٹھنڈی ہو گئی۔ بہر حال دوبارہ گرم کی ہے۔ تم کھا لو اس کے بعد تھوڑی سی بریانی شفقت کو بھی دے آنا۔“

ماں کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد معصومہ بری طرح بھنا گئی۔ ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ پلیٹ اس نے ایک طرف سرکا دی اور نہایت غصیلے اور کڑوے لہجے میں اس نے ماں کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”اماں! آئندہ نہ میں شفقت صاحب کے یہاں جاؤں گی اور نہ آپ کو جانے دوں گی اور اگر وہ بھی بار بار ہمارے یہاں آتے ہیں تو انہیں سختی سے منع کر دیجیے۔“

ماں نے حیران و پریشان نظروں سے بیٹی کی طرف

دیکھا اور کہا۔ ”معصومہ! شفقت ہمارا محسن ہے، اس کا بہت بڑا احسان ہے ہم پر..... اگر ہم نے اس کے لیے کچھ کر دیا تو اس میں کیا قیاحت ہے۔ ویسے شفقت نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ تم نے اس کے خلاف محاذ تیار کر لیا۔“

معصومہ نے ماں کے کندھے پر سر رکھ کر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ ”اماں! مجاز میں نے نہیں اس معاشرے نے ہمارے خلاف تیار کر لیا، کیونکہ انسانوں کی اس بھیڑ میں ہم دونوں ماں بیٹی بغیر کسی مرد کے سہارے جی رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط رہ کر گزارہ کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ کرائے کی چھت بھی ہم سے چھین لی جائے گی۔ سب کی نظریں ظاہر پر جاتی ہیں، باطن کی پاکیزگی کو کون دیکھتا ہے۔“

معصومہ کی ماں جہاندیدہ خاتون تھیں۔ فوراً بات سمجھ میں آ گئی کہ آج معصومہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پر خیال انداز میں بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شفقت آئے گا تو اس سے بات کروں گی۔“

دونوں ماں بیٹی جیسے ہی مغرب کی نماز سے فارغ ہوئیں دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں نے جیسے ہی جانے کے لیے قدم بڑھائے معصومہ فوراً اٹھ کر ماں کو روکے ہوئے خود دروازے کے قریب آ کر پردے کی اوٹ سے مستفسر ہوئی۔ ”کون؟“

”جی میں شفقت ہوں۔ اماں کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔“

معصومہ نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”اماں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں..... اور آپ سے میری ایک گزارش ہے کہ آپ بار بار ہمارے دروازے پر نہ آیا کریں۔ آس پاس رہنے والے اس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اور نہ مجھے اور میری والدہ کو یہ باتیں پسند ہیں۔“

شفقت پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ تو آج بے شمار امیدیں اور خواب لے کر آیا تھا کہ معصومہ کی والدہ کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ وہ کھیانا سا ہو گیا۔ شفقت نے بھی تیز اور تلخ لہجے میں کہا۔ ”جی بہتر.....“ اور فوراً واپسی کے لیے پلٹا لیکن اسی اثنا میں معصومہ کی والدہ نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

”شفقت بیٹا! اس کی باتوں کا خیال مت کرو، میں اس کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آ جاؤ۔ مجھے تم

سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

شفقت کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر معصومہ کی والدہ کو دیکھتا رہا۔ چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں رقصاں تھیں، بمشکل مایوس لہجے میں گویا ہوا۔
”اماں! آپ کی صاحبزادی مجھے دروازے پر آنے کے لیے منع کر رہی ہیں اور آپ مجھے گھر میں بلا رہی ہیں۔ میں کس کی بات مانوں؟“

معصومہ کی والدہ نے مربیانہ تبسم کے ساتھ کہا۔
”میری بات ماننی ہوگی تمہیں کیونکہ میں بڑی ہوں اور بیٹی تو پرایا دھن ہے، یہ گھر اس کا نہیں میرا ہے۔“ پھر انہوں نے ٹھکانا لہجے میں بیٹی سے کہا۔ ”معصومہ! تم اندر جاؤ۔“

شفقت نے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی اور جب آواز معدوم ہوگئی تو وہ پردہ اٹھا کر ہچکچاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ معصومہ کی والدہ نے ایک کرسی کھینچ کر شفقت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی اس کے مقابل ایک ٹوٹے پھوٹے اسٹول پر ٹپک گئیں۔ ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گفتگو کا آغاز کرنا چاہتی ہیں لیکن اس کے لیے انہیں مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہوں۔ کافی دیر بعد انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے شفقت کو مخاطب کیا۔ ”بیٹا! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اپنا مدعا کس طرح تمہارے گوش گزار کروں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مرد و زن کی ملاقات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ نہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے اور ماشاء اللہ.....“
اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتی، شفقت نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔ اگر کسی نے ایک لفظ بھی کہا ہوگا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ کر اس کے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔“

شفقت کے اندر کا پرانا شفو جاگ اٹھا تھا۔ لہجہ بھی تیز و تند اور کرخت تھا۔ معصومہ کی والدہ اس کے لب و لہجے سے گھبرا کر فوراً بولیں۔ ”ارے نہیں بیٹا، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ میرے دل کا شک مجھے ہی کھا رہا ہے۔ ماشاء اللہ تم دونوں جوان جہان ہو اس لیے قانون اور شرع نے جو راستہ ہمیں دیا ہے، کیوں نہ اس پر چل کر لوگوں کے منہ بند کر دیے جائیں۔ تم دونوں پھر ساتھ ساتھ بھی نظر آؤ گے تو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔“

اپنا جملہ مکمل کر کے وہ ٹوٹنے والی نظروں سے شفقت کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور شفقت..... شفقت تو گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے لگا یہ بھی کوئی سنہرا خواب ہے۔ آنکھ کھلے

گی اور یاسیت اور اداسی کا صحرا ہوگا اور اس کی ذات ہوگی لیکن معصومہ کی والدہ نے پھر اپنی بات دہرا کر اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”اماں! آپ کے خاندان میں شامل ہو کر میں یہ سمجھوں گا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں لیکن اس سلسلے میں آپ اپنی بیٹی سے ضرور بات کر لیں۔ میری صورت، شکل، تعلیم کچھ بھی آپ کی بیٹی کے ہم پلہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد آپ لوگ پچھتا سکیں۔ آپ معصومہ پر کوئی زور زبردستی نہ کریں بلکہ پوری آزادی سے اسے فیصلہ کرنے دیجیے!“

معصومہ کی والدہ نے طمانیت بھری سانس لی اور کہا۔
”بالکل بالکل، مجھے کوئی جلدی ہے۔ اس کی رضامندی سے ہی سب کچھ ہوگا۔“ کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد پھر کہا۔
”ویسے بیٹا تم اپنے بارے میں، اپنے والدین کے بارے میں اور اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ویسے تو تم مجھے نہایت شریف اور نیک لگتے ہو۔“

شفقت کے گلے میں ایک گولا سا انک گیا۔ تذبذب کے عالم میں وہ آنکھیں پھاڑے معصومہ کی والدہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فن گفتگو میں ماہر تھا۔ اس لیے اس خوبی سے اپنی ہنسی بیان کی کہ وہ سیاہ باب پورا کا پورا احذف کر گیا جو اس کی زندگی کا حصہ تھا۔ انہوں نے سب کچھ سننے کے بعد پرسکون لہجے میں کہا۔ ”بس بیٹا تم کلمہ گو ہو، شریف ہو اور ایک اچھے انسان ہو اور ہمیں کیا چاہیے۔ میری بچی بھی تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گی۔“ شفقت کا دل خوشیوں اور مسرتوں کے ہندولے میں جھول رہا تھا۔ معصومہ کی والدہ سے اجازت لے کر وہ اپنے قلیٹ میں چلا آیا اور کافی دیر تک اپنی سوچوں اور خیالات سے الجھتا رہا۔ رات کے آخری پہر اسے گہری نیند آگئی۔

☆☆☆

شفقت جیسے ہی قلیٹ سے باہر نکلا، معصومہ نے کمرے سے نکل کر ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور ماں کی طرف مڑتے ہوئے شدید طیش کے عالم میں کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہی تھیں آپ اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا؟“

ماں نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”بہت عقل مند اور سمجھدار لڑکا ہے۔ فیصلہ اس نے تم پر چھوڑا ہے۔ رات بھر اچھی طرح سوچ لو اور صبح مجھے

تمہارا جواب چاہیے۔ اقرار یا انکار لیکن ایک کڑوی حقیقت میں تمہیں بتا دوں کہ آج یہ رشتہ تل رہا ہے، کل یہ بھی نہیں ملے گا۔ نہ ہمارے پاس دولت کی چمک دمک ہے اور نہ کسی مرد کا سہارا۔ باپ کے سائے سے پہلے ہی محروم ہو چکی ہو۔ دے کر ایک بھائی ہے، وہ بھی اپنی دنیا میں گمن ہے۔ کبھی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لیتا۔ میری حالت دیکھ رہی ہو۔ چراغ سحر ہوں۔ جانے کب بجھ جائے۔“

حقیقت سے باخبر کرنے کے بعد ماں نے اپنا بستر سنبھالا اور نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔ جبکہ معصومہ کے لیے یہ بڑی اور فیصلہ کن رات تھی۔ خوابوں خیالوں میں شفقت تھا تو دماغ میں ماں کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ بالآخر جب نیند آنکھوں میں اترنے لگی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ماں بھی کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہیں اور شفقت بھی معمولی شکل صورت کا ضرور ہے لیکن خوش اخلاق، خوش مزاج اور انسان دوست آدمی ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ ایک مستحکم اور بڑے بزنس کا مالک ہے۔ سونے سے پہلے وہ شفقت کے حق میں اپنے جملہ حقوق محفوظ کر چکی تھی۔ دوسری صبح ماں نے جب اس سے جواب مانگا تو اس نے اشیائی انداز میں سر کو جنبش دی اور ناشا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ چہرہ خوشی اور شرم سے گلنار ہو رہا تھا۔

شفقت مجسم انتظار بنا دروازے کو تک رہا تھا۔ ہر آمٹ پر اسے لگتا کہ معصومہ کی والدہ شادی کی نوید لے کر دروازے پر کھڑی ہیں۔ جب انتظار شدید ہو گیا تو وہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ دل امید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اسی وقت معصومہ کی والدہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں اور جب انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی اس شادی کے لیے تیار ہے تو اس کی آنکھوں سے تشکر کے موتی چمکنے لگے۔

شفقت اور معصومہ کی شادی تو انتہائی سادگی سے انجام پائی لیکن شفقت نے دعوت و لیمہ نہایت شاندار طریقے سے کی اور اس تقریب میں اس نے اپنے تمام دوستوں اور سگی ساتھیوں کو مدعو کیا۔ گلوبھی جب دلہا دلہن کے ایچ کے قریب پہنچا تو شفقت نے نہ صرف اس کا استقبال کیا بلکہ معصومہ کو مخاطب کر کے اس کا تعارف بھی کروایا اور جیسے ہی گلو نے قریب سے معصومہ کو دیکھا، وہ بری طرح چونکا۔ اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکھرتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی اور پھر مبارکباد دے کر ایچ سے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجان کی سی کیفیت تھی اور آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اپنی

پلٹ میں رومنڈ چکن کا ٹین اتار کر اس نے دانتوں سے اڈیڑتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

”شفقت بھائی! بس اسی طرح تمہیں بھی اڈیڑتا ہے کیونکہ میری مانگ اور تمہاری کنجوسی بڑھ رہی ہے۔ تم نے اس لڑکی سے شادی کر کے سارا گیم میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔“ کھانا کھاتے ہوئے وہ ایک عجیب سے غلبان میں جتلا رہا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کے دماغ کی بند گھڑیاں چل پڑی ہیں۔ وہ بار بار معصومہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو عروسی جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھی۔

موسم بہار میں جب پھولوں پر شبنم گرتی ہے تو ان کا نکھار مزید بڑھ جاتا ہے۔ کچھ اس طرح کا معاملہ شفقت اور معصومہ کے ساتھ بھی ہوا۔ جیون کی ڈور میں بند ہونے کے بعد خوشیوں اور مسرتوں کی بہار ایسی ٹوٹ کر برسی کہ دونوں اس میں شرابور ہو گئے۔ دونوں اماں کے احسان مند تھے جن کی کوششوں سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ شادی کے فوراً بعد شفقت نے وہ علاقہ چھوڑ کر کراچی کے پوش اور بارونق علاقے میں گھڑی فلیٹ خرید کر بیوی کو منہ دکھائی میں ٹھکٹ کیا تھا۔ معصومہ نے جب فلیٹ دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ اپنی قسمت پر۔ دونوں نے اماں کو بھی ساتھ ہی رکھا تھا۔ بیٹی، داماد کی خوشیاں دیکھ کر وہ بھی نہال ہو جاتیں۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے فلیٹ کو قیمتی فرنیچر اور نفیس ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا۔ دونوں کا ہر دن خوشگوار اور ہر لمحہ پر مسرت تھا۔ معصومہ اپنے ہاتھوں سے شفقت کے لیے پر تکلف ناشا اور کھانا تیار کر کے سراپا انتظار بنی رہتی۔ جب تک شفقت گھر نہیں آتا معصومہ بھی بھوکی پیاسی بیٹھی رہتی۔ معصومہ کے سنگ رہتے ہوئے شفقت کی بری عادتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اب وہ بھرپور نیند لینے کے بعد وقت پر بیدار ہو کر ہشاس ہشاس اپنے کام پر روانہ ہوتا تھا۔ پہلے جلد بازی اور گرم مزاجی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن اب وہ کافی صبر و سکون اور تحمل سے کام لیتا۔ اپنا خوفناک اور تکلیف دہ ماضی بھی اسے اس وقت یاد آتا جب گلو کھکھول لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ پہلے حرام کمائی سے گلو کا حصہ نکالتے وقت دل میں درد نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ اب خون پسینا ایک کر کے محنت سے کما رہا تھا اس لیے جب بھی گلو آتا، اس کا دل چاہتا کہ اسے جڑ پھاڑ کر رکھ دے۔ گلو کی صورت بھی اسے زہر کھٹنے لگی تھی لیکن مجبور تھا۔ گلو بھی پرانا پانی تھا۔ شفقت کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی وہ بھانپ گیا کہ یہ گاڑی اب مزید نہیں چلنے والی۔

ادھر کفیل بھی اب قید و بند سے گھبرا گیا تھا اور آزادی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ وہ کھلی فضاؤں میں اڑنا چاہتا تھا۔

وہ لمحہ شفقت کے لیے ناقابل فراموش تھا جب لیڈی ڈاکٹر نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ عنقریب وہ باپ بننے والا ہے۔ دونوں بے انتہا خوش تھے اور یہ خبر سننے کے بعد دونوں میں گرم جوشی، وارفتگی اور خود پسندی اور بڑھ گئی تھی۔ اماں تو ہر طرح سے بیٹی کا خیال رکھتی تھیں لیکن بذاتِ خود شفقت بھی ہر وقت اس کے آرام اور خوراک کا خیال رکھتا تھا اور جب معصومہ نے دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بیٹیوں کے نام بھی اس نے خود ہی تجویز کیے۔ ایک کا نام ”شاداں“ اور دوسری کا ”فرحاں“ رکھا۔ کیونکہ اس کی زندگی بھی اب مکمل طور پر شاداں و فرحاں تھی۔ دونوں بیٹیاں صورتِ شہادت، ناک نقوش سارا ماں کا لے کر آئی تھیں اس لیے ہر دیکھنے والے کو وہ بہت پیاری لگتیں اور جو بھی دیکھتا، وہ اپنی باتیں پھیلا کر انہیں اپنی گود میں لینے کی کوشش کرتا۔

دونوں بیٹیاں شفقت کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی یاد اسے اس قدر بے چین کر دیتی کہ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلا آتا۔ معصومہ اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھی۔ وہ اسے منع کرتی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ ”میری بیٹیاں مجھ سے ایک پل کے لیے بھی جدا ہوتی ہیں تو میں بے قرار ہو جاتا ہوں۔“

ایک دن بھری دوپہر میں وہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ گھر میں نہ اماں ہیں اور نہ معصومہ۔ دونوں بیٹیاں گہوارے میں پڑی نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ لیکن میں ملازمہ تھی جو سنک پر برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اس نے سارے گھر کا راؤنڈ لیا اور پھر ملازمہ سے سوال کیا۔ ”اماں اور معصومہ کہیں گئی ہیں کیا؟“

ملازمہ نے منہ بگاڑ کر کھردرے لہجے میں کہا۔ ”ارے صاحب جی! اب تو بی بی جی ہر دو دن کے بعد ہم سے کہتی ہیں کہ نورین دونوں لڑکیوں کا خیال رکھنا، میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔ صاحب جی! جب آپ لوگوں نے ہمیں کام پر رکھا تھا تو کہا تھا کہ بس گھر کے کام کرنے ہیں مگر اب تو دونوں بے بی لوگ کو بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔ دونوں کو بڑی مشکل سے ابھی ابھی سلا یا ہے۔ اس کے پیسے آپ کو تنخواہ کے علاوہ دینے ہوں گے۔“

نوکرانی کی تقریر شفقت نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ سنی اور پھر دوسرا سوال داغ دیا۔ ”آیا گہری کب سے کر رہی ہو؟“

نوکرانی نے۔۔۔۔۔ جیسے ہی دیکھا کہ شفقت اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس نے ہمت کر کے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ ”پچھلے کئی ہفتوں سے ہم آپ کی دونوں بیٹیوں کو سنبھال رہے ہیں کیونکہ گھر میں نہ اماں ہوتی ہیں اور نہ بی بی جی۔ میں تو صاحب پہلی تاریخ کو ہزار روپے زیادہ لوں گی۔“

شفقت نے ہنسا کر کہا۔ ”اچھا لے لیتا۔ اب بکواس بند کرو۔“ یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ موڈ سخت خراب تھا۔ گاڑی بھی انتہائی غصیلے انداز میں اسٹارٹ کی۔ دل و دماغ میں شکوک و شبہات اور شیطانی دوسے سانپ بن کر سرسرا رہے تھے۔ نوکرانی نے جو انکشاف کیا تھا وہ اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ پردہ ذہن پر جیسے ہی معصومہ کا چہرہ ابھرا وہ سوچتا میری معصومہ تو حقیقت میں معصوم، باحیا اور پاک و صاف ہے۔ کسی کام سے ادھر ادھر گئی ہوگی۔ ملازمہ ضرور پیسے کھینچنے کے چکر میں الٹا سیدھا ہانک رہی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل کچھ ہلکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کی رفتار بھی ہلکی کر دی۔

جب وہ دفتر پہنچا تو کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ شفقت جیسے ہی فلیٹ سے نکلا، ملازمہ نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر ملائے اور پھر آواز دبا کر کہا۔ ”صاحب! جو کام آپ نے کہا تھا ہم نے کر دیا۔ اب ہمارا مختلانہ کب ملے گا؟“ جو جواب اسے ملا وہ یقیناً اتنا خوش کن تھا کہ نورین کا چہرہ لال گلال ہو گیا۔ اب وہ دھلے ہوئے برتن ریک میں جماتے ہوئے زور زور سے کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔

رات جب شفقت اپنے بستر پر سونے کے لیے گیا تو معصومہ اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنی محرومی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھا کرنے لگی۔ وہ بڑی مسکون اور محبت بھری نظروں سے شوہر کو تنگ رہی تھی۔ شفقت نے اس کے ہاتھوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا آج تم کہیں گئی تھیں؟“

معصومہ نے ایک سادہ اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ارے جناب! اب تو ہم قیامت تک کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو چھوڑ کر قبر میں ہی جائیں گے اور بھلا کہاں جاسکتے ہیں۔“

شوہر کی بات وہ مذاق میں لے اڑی جبکہ شفقت پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ آج وہ اور اماں دونوں بچیوں کو ملازمہ کے بھروسے چھوڑ کر گھر سے غائب تھیں۔ بیوی کے جھوٹ سے شک کے جج کی آبیاری ہوئی اور اس

روز تو وہ تناور درخت بن گیا جب اپنے تمام کام چھوڑ کر وہ اچانک گھر آدھکا۔ اس روز بھی نورین دونوں بچیوں کی دودھ کی بوتلیں تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ فرحان تو سو رہی تھی لیکن شاداں نے رورور کر گھر سر پہ اٹھالیا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ یہ سب دیکھ کر شفقت کا پارہ چڑھ گیا۔ شاداں کی بوتل لے کر اس نے اپنے ہاتھ سے فیڈ کروایا اور تنٹاتا ہوا گھر سے نکلا، ابھی وہ گاڑی اسٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ سیل فون بول اٹھا۔ سارا غصہ فون کرنے والے پر اتارا۔ وہ زور سے دہاڑا۔ ”ہیلو!“

دوسری جانب سے آواز آئی۔ ”کیوں کیا ہوا، بیگم صاحبہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ چلو ہم بتا دیتے ہیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ آپ کو کہاں ملیں گی۔ ہوٹل سٹی ویو میں چلے جائیے۔“ شفقت نے دانت پیستے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”پہلے یہ تو بتا کہ تو کون ہے؟“ ایک زوردار قہقہے کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔ شفقت ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ ہوٹل سٹی ویو اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ وہ بے پناہ ذہنی انتشار کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ معصومہ اور اس کی ماں وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ یقیناً دونوں کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے ہے اور اس وقت اس کا شک اور بھی پختہ ہو گیا جب دونوں ماں بیٹی کو اس نے اپنی آنکھوں سے ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا۔

اس نے رات کو گھر آتے ہی انتہائی سرد اور تلخ لہجے میں باز پرس شروع کر دی۔ پہلے تو معصومہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس کے ہر سوال کا جواب ہنستے مسکراتے دیتی رہی لیکن جب دیکھا کہ نہ صرف اس کا موڈ آف ہے بلکہ خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا ہے تو اس کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دیا۔ اچھی خاصی مہا بھارت چھڑ گئی۔ معصومہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے انتہائی شدید غصے میں کہا۔ ”شفقت! مجھ پر اعتماد رکھنا۔ کبھی میرے بارے میں کچھ غلط مت سوچنا ورنہ پچھاؤ گے۔“ بیوی سے لڑ جھگڑ کر اس کا دل نہیں بھرا۔ وہ تنٹاتا ہوا ساس کے پاس آدھکا۔ ابھی تک اماں اماں کہتے ہوئے اس کی زبان خشک ہوتی تھی لیکن اس نے نہ ان کے بڑھاپے کا خیال کیا اور نہ رشتے کا۔ اس دن کی بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑے کے بعد دونوں ماں بیٹی نے اپنے بچہ روک لیے تھے۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ وہ نہ معصومہ سے بات کر رہا تھا اور نہ ساس سے۔ گھر میں ایک سو گوار فضا

چھائی ہوئی تھی۔ اب معصومہ اس کے من پسند کھانے بنا کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی لیکن اس کا صرف ایک جواب ہوتا۔ ”میں نے کھانا باہر کھالیا ہے۔“ دونوں ماں بیٹی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتیں اور پھر ایک تکلیف دہ سناٹا چھا جاتا۔

محرومی اور یاسیت جس سے عرصہ ہوا شفقت کو چھٹکارا مل چکا تھا، وہ پھر سے عود کر آئی تھیں۔ محل مزاجی رخصت ہو چکی تھی اور صبر کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ آج اس نے اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ معصومہ کو ہمیشہ ہمیش کے لیے زہر دے کر سلا دے گا۔ جب ایک قتل کر چکا ہے تو دوسرے سے کیا ڈرنا اور اس کے لیے اس نے اپنے ایک دوست عظیم سے بھی بات کر لی تھی جو کسی کیسٹ کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا۔ ایک خطرہ رقم کے عوض اس نے ایسا زہر لا کر دیا جو بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ تھا۔ کسی بھی جاندار کے معدے میں پہنچنے کے بعد وہ چند منٹوں میں اپنا کام دکھاتا اور کچھ گھنٹوں بعد معدہ اس طرح صاف ہو جاتا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کسی زہر خورانی کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا۔

جس روز سے یہ جادوئی زہر اس کے ہاتھ میں آیا تھا، وہ کئی بار معصومہ کو دینے کی کوشش کر چکا تھا لیکن قدرت اسے ہر بار بچا لیتی تھی۔ وہ سوچتا شاہ بابا نے ایک قتل کی پیش گوئی کی تھی اور چونکہ وہ قتل کر چکا ہے اس لیے معصومہ ابھی تک محفوظ ہے لیکن اس زہر کی حفاظت وہ جان سے زیادہ کر رہا تھا کہ پتا نہیں کب ضرورت پڑ جائے۔

آج ضروری میٹنگ سے فارغ ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ موبائل نے تیل دی اور دوسری طرف وہی شخص تھا جو اسے پاگل بنا رہا تھا۔ اس کی غلیظ اور خوفناک آواز سے اس کے کان اچھی طرح آشنا تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مسٹر شفقت! ابھی تک آپ اپنے آپ کو سوسو تسلیاں دے کر بہلاتے رہے ہیں لیکن عزت نفس اور انا بھی کوئی چیز ہے۔ انسان کا اپنا بھی کوئی مقام ہوتا ہے۔ بہر حال اب آپ اپنی بیوی کے مطلوب اور محبوب نہیں بلکہ ایک ناکارہ.....“

”جپ رہ کیئے!“ شفقت حلق کے بل چیخا۔ اس کے اعصاب چٹختے لگے تھے۔

دوسری جانب سے ایک کریہہ ہنسی کی آواز آئی اور پھر بولنے والا بھی بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس نے بھی دانت کچکچا کر کہا۔ ”ابے ہوٹل کے نام کے ساتھ کمر نمبر بھی بتا رہا ہوں۔ دیکھ لے جا کر تیری بیوی کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے اور تیری ساس دونوں کی رکھوائی کر رہی ہے۔“

وہ سخت اشتعال اور طیش کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ گاڑی کا رخ اس کے اپنے گھر کی جانب تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں گھر میں داخل ہوا۔ معصومہ اور اماں آج بھی گھر پر نہیں تھیں۔ نورین بچن میں تھی اور دونوں بچیاں جھولے میں پڑی تھیں۔ باپ کو دیکھ کر دونوں خوشی سے غوغا کرنے لگیں اور دونوں نے ہمک، ہمک کر باپ کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن آج شفقت نے انہیں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ دماغ میں تیز و تند طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے کمرے میں جا کر اپنا پستول تلاش کرنے لگا لیکن چونکہ ان چیزوں سے عرصہ ہوا اس کا رشتہ اور تعلق ختم ہو چکا تھا اس لیے کافی تلاش بسیار کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اچانک اسے گلو کا خیال آیا جو آج بھی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ وہ بہت تیزی سے فلیٹ سے نکلا اور گاڑی پھر دوبارہ برق رفتاری سے دوڑنے لگی۔ اسٹیزنگ وکیل پر اس کے دونوں ہاتھ پیسے سے جیچا رہے تھے مگر اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ جب وہ گلو کے گھر پہنچا تو وہ انگور کی بیٹی سے دل بہلا رہا تھا۔ فوراً ایک گلاس بھر اور شفقت کو دیتے ہوئے کہا۔

”ارے شفو بھائی! آپ نے بہت دنوں سے اسے منہ نہیں لگایا لیکن آج تو تھوڑی سی چمک لو۔“

شفقت نے مایوس، اداس اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں گلو..... ابھی نہیں..... میں جس کام سے جا رہا ہوں وہ ہو گیا تو آج رات ہم دل بھر کر پیئیں گے۔“

گلو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے، یہ آپ کے لیے بنا کر رکھ رہا ہوں۔ آپ ہی کو آکر پینا ہوگا۔“

شفقت نے بھنا کر کہا۔ ”ہاں ہاں، میں ہی آکر خالی کروں گا۔ تو فکر نہ کر جیسے ہی میرا کام ختم ہوگا، میں یہیں لوٹ کر آؤں گا۔ اب تم جلدی سے مجھے اپنا کوئی ریوالور یا پستول دو، بہت سخت ضرورت ہے۔“

گلو چند لمحوں کے لیے سوچتا رہا اور پھر کمرے سے ملحقہ اسٹور میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ شفقت بہت زیادہ مضطرب اور بے چین تھا۔ وہ بار بار شراب کے بھرے ہوئے گلاس کی جانب جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی اس نے چند گھنٹوں کے لیے تو وہ آسانی سے معصومہ کو قتل کر سکے گا لیکن پھر خیال آتا کہ نشے میں کہیں نشانہ خطا نہ ہو جائے اور وہ ناکام واپس آئے پھر اس صورت میں وہ کیا کرے گا؟ دماغ نے فیصلہ صادر کیا کہ اگر ناکام واپس آتا ہے تو جو زہر معصومہ کے لیے رکھا ہے وہی پی لے گا۔۔۔

اس سوچ کے ساتھ اچانک اس کا ہاتھ جیب میں گیا اور وہ سریلٹ الاٹرز ہر نکال کر اس نے گلاس میں ڈال دیا۔ شراب کی رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا جبکہ زہر پوری طرح اس میں حل ہو چکا تھا۔

چند لمحوں کے بعد گلو اسٹور روم سے برآمد ہوا اور بھرا ہوا ایک پستول اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”شفو بھائی! کفیل کے بعد کس کی باری ہے؟“

”خاموش رہ!“ شفقت غرایا اور شراب سے بھرے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری امانت ہے، اسے ہاتھ مت لگانا۔ اس کے ایک ایک قطرے پر میرا نام لکھا ہے۔“

گلو نے ایک خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جائے آپ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے پھر بوتل سے منہ لگا لیا۔ شفقت پستول لے کر بجلی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

شفقت کے سارے جسم میں چنگاریاں بھرمی تھیں۔ رگ و پے میں زہرا ابل رہا تھا۔ ہونٹ چمک کر وہ ڈانٹنگ ہال میں ایک کرسی پر برا بھان ہو گیا۔ اس وقت سوچوں کی کشتی بنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ معصومہ کی بے وقافی کا ابھی تک یقین نہیں تھا لیکن جو انجان کالز اسے موصول ہو رہی تھیں، اس کی تصدیق ضروری تھی۔ جو نمبر اسے بتایا گیا تھا، وہ بالائی منزل پر تھا۔ وہ تیزی سے لوگوں کی نظروں سے بچتا بچتا زینہ چڑھتا چلا گیا۔ کوریڈور سنسان تھا۔ کئی کمرے خالی تھے اس لیے ان پر تالے لگے ہوئے تھے۔ اپنے مطلوبہ نمبر کے کمرے پر پہنچ کر اس نے کان دروازے کی جھری سے لگا دیے۔ اندر سے معصومہ کی آواز آرہی تھی۔ اس کے بعد زور سے کسی مرد کے ہنسنے کی آواز آئی۔ شفقت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے جنونی انداز میں بند دروازہ کھولا اور اس کی انگلی نے پستول کی لیبی دبا دی۔ معصومہ زور سے چیختی۔

”شفقت! یہ میرا سگا بھائی ہے کفیل۔“ جست لگا کر وہ بھائی کے سامنے ڈھال بن گئی۔ شفقت کے پستول سے نکلی ہوئی گولی معصومہ کے سینے میں اتر چکی تھی اور تیزی سے بننے والا خون کمرے کے قالین کو سرخ کر چکا تھا۔ شفقت حیران پریشان کبھی کفیل کو دیکھتا اور کبھی معصومہ کی لاش کو نکلتا۔ اماں دیوار سے لگی کھڑی کانپ رہی تھیں۔

اماں نے ہانپتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان شفقت سے کہا۔ ”ارے کچھ تو مبر کیا ہوتا۔ آج

اس کی آنکھوں میں آپ ہی آپ تھے۔ آپ کے خلاف وہ کچھ سننا پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ آج بھی وہ اور اماں مجھے یہی سمجھانے آئے تھے کہ میں آپ سے ملاقات کروں اور بحرمانہ زندگی چھوڑ کر شرافت کی زندگی بسر کروں لیکن میں آپ کے سامنے آنے سے کترار ہا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ معصومہ نے آپ سے شادی کی ہے اس لیے میں اماں اور معصومہ سے دور جانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی جلد بازی میں آپ نے میری ماں کی گودا جاڑ دی اور اپنی بیٹیوں کے سر سے ہاں کا سایہ چھین لیا۔“

فرط غم سے شفقت کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ اپنے اشکوں کو آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”گلو نے شہر نج کی بساط پر جتنے مہرے فٹ کیے تھے، وہ سب مجھے شکست دے گئے اور وہ خود اتنی چابکدستی سے کھیلا کہ ساری بازی اس کے ہاتھ میں رہی۔ شکست اور ہار میرا نصیب بنی۔ میں نے اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا۔ میری ساری خوشیوں اور مسرتوں کو وہ اس طرح نگل گیا جیسے کوئی خوشخوار بھیڑیا اپنے شکار کو گھٹاتا ہے۔ میرا اور اس کا انصاف یہاں کی عدالت نہیں بلکہ منصفِ حق تعالیٰ کرے گا اور بہت جلد کرے گا۔ میری معصومہ کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔“

پولیس کی بھاری نظری نے ہوٹل کو گھیر لیا۔ معصومہ کی لاش کو پولیس نے اپنی جھیل میں لے لیا تھا۔

جب شفقت کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈالی گئیں تب اس نے آنسو بھری آواز میں کفیل سے کہا۔ ”کفیل! میری بگیا کی دو کلیاں ہیں، انہیں مرجھانے مت دینا۔ سن بلوغت پر پہنچ کر انہیں وہ سب مل جائے گا جو میں نے ان کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ بس اس سے پہلے ان کی پرورش کی ذمے داری تیری ہے۔ اتنا خیال رکھنا کہ کبھی حرام نوالہ ان کے پیٹ میں نہ جائے۔“

اماں اور کفیل کی آہوں اور سسکیوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ دونوں کو اچھی طرح علم تھا کہ شفقت معصومہ کا قاتل ہے اس کے باوجود نہ انہیں شفقت سے نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ناراضگی اور غصے کا۔ بلکہ اس کی بے بسی دیکھ کر دونوں ماں بیٹا نوحہ کناں تھے۔ اس کی گرفتاری پر دونوں کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ پولیس اہلکار نے جب شفقت کو اپنی طرف گھسیٹا تو وہ ایک جھٹکے سے ساس کے قدموں میں جھکا اور اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ ان کے قدموں میں رکھ کر کہنے لگا۔

میری بیٹی تجھے سب کچھ بتانے والی تھی۔ میرا بیٹا غلط راستے پر چل نکلا تھا اس لیے ہم دونوں کی کو بتائے بغیر خاموشی سے اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ میری بیٹی تم سے یہ راز پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی کہ اس کا بھائی ایک مجرم اور جلساڑ ہے لیکن آج ہم دونوں نے سوچ لیا تھا کہ اب سارا راز آشکار کر دیا جائے۔ یہی سب کچھ سمجھانے کے لیے ہم دونوں کفیل کے پاس آئے تھے کہ اپنی بحرمانہ سرگرمیاں چھوڑ کر سیدھا سچا راستہ اختیار کرے۔ مگر شفقت تو نے سب کچھ نہیں نہیں کر دیا۔ تیری سوچ اتنی ادنیٰ اور گھٹیا ہوگی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک بار میری بچی سے بات تو کر لی ہوتی۔“

اماں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر تھا۔ معصومہ کی لہو لہان لاش ان کے درمیان پڑی تھی۔ اتنے اذیت ناک اور کرہناک لمحے تھے کہ نہ کچھ کہنے کے لیے تھا اور نہ سننے کے لیے۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھنڈ اور ساکت کھڑے تھے۔ شفقت ہوش و ہواس سے بیگانہ پتھرائی ہوئی نظروں سے معصومہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اسی کیفیت سے کفیل بھی دوچار تھا۔ دکھ اور پچھتاوے کی وحشت نے دونوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ شفقت نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ درحقیقت شاہ بابا کی پیش گوئی آج پوری ہوئی۔

کفیل نے بدقت تمام اپنے بند ہونٹ کھولے اور کہا، آواز میں اس قدر لرزش تھی کہ الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ دیوار سے اپنا سر لگا کر لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا..... شفو بھائی! میری ساری خطاؤں کی سزا میری بہن کو دے ڈالی۔ آپ کے پستول سے نکلی ہوئی گولی کے لیے میرا سینہ حاضر تھا۔ میری بہن یہاں بھی مجھ پر بازی لے گئی۔ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا اور وہ.....“ اتنا کہنے کے بعد وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا۔

شفقت نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کفیل کہ تو زندہ و سلامت ہے۔ میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ تیری لاش کو تو حشرات الارض کب کا چاٹ چکے ہوں گے۔“

کفیل نے ایک گہری لمبی سانس لی اور کہا۔ ”میرے قتل کا سارا ڈراما میرا اور گلو کا رچایا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی زد میں میرا سارا خاندان آجائے گا۔ میری بہن جو ہمیشہ آپ کے نام کا کلمہ پڑھتی تھی اس کی سانسیں میں،

”اماں! مجھے معاف کر دینا، میں آپ کی فرشتہ صفت بیٹی کی حفاظت کر سکا اور نہ ہی قدر کر سکا۔“

اماں نے ایک دلخراش چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئیں۔

☆☆☆

گلو جب دل بھر کر پی چکا تو اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ منتخب کر کے جلاتا ہی چاہا تھا کہ اس کا خاص کارندہ جمن خان... کمرے میں داخل ہوا۔ گلو نے ایک خوفناک ہنسی ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

”جمن خان..... کیا ہوا۔ کچھ ہمیں بھی تو سناؤ؟“

جمن خان نے شراب کے بھرے ہوئے گلاس کو نذیری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”ہونا کیا تھا گلو استاد..... جو آپ نے سوچا تھا وہی ہوا۔ شغوی ساری زندگی جیل کی کال کوٹھری کی نذر ہو جائے گی۔ کفیل اور اس کی ماں ساری زندگی معصومہ کے لیے بلبلاتے رہیں گے۔ دونوں لڑکیوں کے پالنہار اب ماموں اور نانی ہی ہیں۔“ کچھ لمحے کے بعد جمن خان مستفسر ہوا۔ ”استاد جی! ایک بات تو بتائیے۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ شفقت کی بیوی کفیل کی بہن ہے؟“

گلو نے لائٹ سے شگریٹ کو شعلہ دکھایا اور دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے ایک عیار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کفیل پر لے درجے کا احمق تو تھا ہی، اس نے ایک بار اپنی ماں اور بہن کی تصویر دکھائی تھی۔ وہ کبھی بھی ان سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ اس کی بہن کی تصویر دیکھ کر اپنا دل آگیا تھا اس پر لیکن اتفاق سے وہ مگرانی شغو سے۔ شغو کو شاید علم ہوتا تو وہ کبھی بھی مجھے اپنے ویسے میں مدعو نہ کرتا لیکن بس اس کی شامت آگئی تھی۔ روکڑا دینے میں بھی آنا کافی کرنے لگا تھا۔ ادھر اس کا سالا کفیل ساری بندشیں توڑنے پر تلا ہوا تھا۔ بتاؤ پھر میں کیا کرتا اگر دونوں آمنے سامنے یا مد مقابل آجاتے تو یقیناً معصومہ انہیں نئی رشتے داری کا واسطہ دے کر سارے محلے شگوے ختم کروا دیتی۔ دونوں کے درمیان جو نفرت جو دشمنی تھی، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتی کیونکہ دونوں معصومہ کی بات کبھی نہ ٹالتے۔ معصومہ اگر کفیل کی چیت ہی بہن تھی تو شغوی محبوب بیوی۔ کفیل اور شغو اگر ایک ہو جاتے تو سارے اچھے دھاکے سلجھ جاتے اور پھر دونوں میرا قیمہ بنا کر جیل کوڑوں کو کھلا دیتے۔ لیکن اس سے پہلے میں نے شغوی ایک کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ شغوی سنگت میں مجھے علم تھا کہ اس کو شدید اشتعال، غصہ اور طیش دلایا جائے تو اس کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔ اس لیے تو کے پاڑے میں جو

ٹانک کھیلا تب بھی اسے اچھی طرح بتایا اور معصومہ کے قتل میں بھی یہی حکمت عملی اختیار کی۔ تمہارے ذریعے شغو کو گناہ کا لڑکھوایا۔ کفیل کو میں نے خود اکسایا کہ تیری ماں بیمار رہنے لگی ہے اس لیے ماں بہن سے ملاقات کر لے۔ نورین کو آلہ کار بنا کر معصومہ اور اس کی ماں کو کفیل سے گاہے بہ گاہے ملوایا اور پھر آج تینوں کو ایک ہونٹ میں اکٹھا کر کے شغو کے غصے کا ٹپر پچھڑاتا تیز کیا کہ اسے معصومہ کی بدکاری اور بے وفائی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ سمجھو جمن خان بغیر ہاتھ پیر ہلائے سارا کام انجام پا گیا۔ کیوں کیسی رہی؟ اب بتاؤ شغو زیادہ ذہین اور ہوشیار تھا یا میں۔“

جمن نے خوشامدانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”استاد جی! بھلا آپ کا بھی کوئی ثانی ہے۔“ اس کی تعریف سن کر گلو پھول کر کیا ہو گیا اور شراب کا گلاس ہاتھ میں تھامتے ہوئے خود کلائی کرتے ہوئے کہا۔

”چیچ چیچ..... کہتا تھا اس پر میرا نام لکھا ہے، میری امانت ہے، ہر گھونٹ میرا ہے۔ میں آکر خالی کروں گا۔ آہ بے چارہ..... تشنہ لب۔“

یہ کہہ کر اس نے شراب اپنے لبوں سے لگائی ہی تھی کہ جمن خان نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”استاد جی آج میں نے آپ کے لیے بڑی دوڑ بھاگ کی ہے۔ یونی یونی درد کر رہی ہے۔ آج یہ چھلکتا ہوا گلاس مجھے دے دو۔“

گلو نے استہزاء سے قہقہہ لگایا اور حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ابے جمن! گلو نے کبھی اپنے ہاتھ کی چیز کسی کو دی ہے جو تجھے دے گا۔ اس پر دراصل میرا نام لکھا ہے۔“

یہ کہہ کر غٹا غٹ ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہاں گلو کی اکڑی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی اور جمن خان لاش پر بین کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ہائے استاد جی! ابھی تو آپ ٹھیک ٹھاک تھے۔ یہ ابھی کے ابھی کیا ہو گیا۔ کہیں آپ میرے ساتھ بھی کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے ہو کیونکہ جھوٹے اور مکر و فریب کے کھیل کھیلنا آپ کی پرانی عادت ہے۔“ وہ رو بھی رہا تھا اور گلو کی قیمتی گھڑی، سونے کی انگوٹھیاں، سونے کی زنجیر اور جیبوں سے رقم نکال کر اپنی جیبوں میں بھر رہا تھا۔

شاہ بابا کی برسوں کی ہوئی بات پوری تو ہوئی لیکن شاہ بابا بھی شاید غلط کہہ گئے تھے۔ شغو کے ہاتھ میں قتل کی ایک لکیر نہیں بلکہ دو لکیریں تھیں کیونکہ گلو بھی شغو کے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔



محفل شہر و سخن



✽ محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی
دیکھی ہے بے رخی کی آج ہم نے انتہا
ہم پر نظر پڑی تو وہ محفل سے اٹھ گئے

✽ خواجہ رمیز..... لاڑکانہ
نیند آواز پہ آواز دیے جاتی ہے
اور ہم شہر کی گلیوں میں بلائیں خود کو
ایک مدت سے یہی کام کیے جاتے ہیں
اپنی تکمیل کریں اور مٹائیں خود کو

✽ دانش عمیر..... گلستان جوہر کراچی
کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات
ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جا سکا



✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانوال
یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس بیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا
کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم تو آئے گی لیکن
تنتلی کے پروں کو بھی چھلتے نہیں دیکھا

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ڈاہرہ اٹوال
آگئیں بازار میں بکنے خدا کی عظمتیں
جی اُچی ہیں خواہشیں اور مر گیا ہے آدمی

✽ وزیر محمد خان..... بل ہزارہ
میری آنکھوں میں ایک مدت سے
قافلے رت جکوں کے ٹھہرے ہیں

✽ عبدالبجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور
آشنا ملتا نہیں نا آشنا سے مل چلو
ہے تقاضائے وفا اک بے وفا سے مل چلو

✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی
چھو کر ہی آئیں منزل امید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹنا؟ جب پاؤں چھل چکا

اس وقت بھی خاموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفق بھی دشمن سے مل چکا

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانوال
لوٹ کر آیا تو سارا شہر ویراں تھا
سب وہی چہرے تھے بس اپنے یار کی صورت نہ تھی

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
اس کے پیچھے نہ چلو اس کی تمنا نہ کرو
چاند تو ہرجائی ہے ہر گھر میں اتر آتا ہے

✽ عبدالبجبار..... فیصل آباد
سر اٹھاتی ہے خواہش تعمیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں

اک تمنا کے سادہ خاکے میں
رنگ بھرتے خزاں کو دیکھتا ہوں

✽ محمد امجد ریاض..... اقبال نگر، چیچہ وطنی
تم ہمسفر ہوئے تو ہوئی زندگی عزیز
مجھ میں تو زندگی کا کوئی حوصلہ نہ تھا

✽ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
✽ ناہید اعوان..... میانوالی

خواب اور پھول اسے دے آتا
اس سے محفل اگر آئندہ رہے
اپنی تصویر سے باتیں کر کے
اپنے ماحول میں ہم زندہ رہے
✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

برآمدے میں کھڑا رہوں گا
میں آج اس سے نہیں ملوں گا
میں خود کو دیکھوں گا آئینے میں
کہ دل کے سارے گلے سنوں گا
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

ایک دنیا ہمیں خراب ملی
ایک دنیا کو ہم خراب ملے
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی
جب اک ہجوم دل میں سیٹھے ہوئے ہو تم
پھر اس کی یاد کس طرح آباد ہووے گی

✽ اشرف علی..... لاہور
دھند میں ڈوبی ساری فضا تھی اس کے بال بھی کیلے تھے
جس کی آنکھیں جھیلوں جیسی جس کے ہونٹ ریلے تھے
جس کو کھو کر خاک ہوئے ہم، آج اسے بھی دیکھا تو
ہنسی آنکھیں افسردہ تھیں، ہونٹ بھی نیلے نیلے تھے

✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
ہم سے اگر پچھڑو تو سن لو
ہم جیسا ملے تو پھر نہ گنونا

✽ فرخندہ ادریس..... اسلام آباد
ہم بھی کیا عجیب موسم تھے
اپنے ہی آپ پر گزرتے رہے

✽ مہوش خان..... سیالکوٹ
خوشبو سا بدن پھر کوئی مجھ سے نہیں لپٹا
جھونکے تو ہواؤں کے سکتے ہیں ابھی تک

✽ مدحت..... کراچی
کتنی صدیوں میں ہوا یہ احساس
کوئی مجھ سے نہیں بہتر میرا
یہ زمانہ تو مرا کیا ہوگا
کاش ہو جائے مرا گھر میرا

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
کہیں ہو جائے اب یہ راستہ تبدیل ممکن ہے
ادھر سے خواب کی اس طرح بھی تکمیل ممکن ہے
لبو میں سرسراہی آہٹوں کے پھول کھلتے ہیں
یہ لگتا ہے نئی دنیا کی اب تکمیل ممکن ہے

✽ سرفراز احمد..... گجرانوالہ
اس سے آسان نہ تھی رسم تعارف بھی مگر
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی
دیکھ کر آج اسے حال ہوا کچھ ایسا
دل کو معمول پہ آنے میں بہت دیر لگی

✽ نعمان علی..... سرگودھا
زندگی رقص سمجھی کرتی تھی
اب تو چپ چاپ پڑی ہے مجھ میں

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
خود اپنے ہونے کا ہر اک نشان مٹا ڈالا
شناس پھر کہیں موضوع گفتگو ہونے ہم

✽ امتیاز احمد..... منڈی بہاؤ الدین
صدیوں کی ریت ڈھانپ کر آسودہ ہو گئے
سر کو ہمارے تن سے کٹے دیر ہو گئی

✽ ورداء آریز ملک..... کراچی
مجھے نہ سوچ، کہ میں ہوں بکھرتا بنتا خواب
مجھے نہ دیکھ، کہ اک نقش راہیں ہوں میں
مجھے نہ ڈھونڈ، کہ میں ہوں گزرتا اک لمحہ
ابھی تو ”ہونے نہ ہونے“ کے درمیاں ہوں میں

✽ نوشین نصیر..... سکھر
بتاؤ نا تمہیں کیسے بھلاؤں
تم تو واقف ہو اس ہنر سے

✽ ایم عمران قاسم..... تحصیل کلر سیداں
ہم جو تیرے بغیر زندہ ہیں
سب دکھاوا ہے، دنیا داری ہے

شہزاد احمد..... بہاولپور

یہ جو دل میں قیام کرتے ہیں
یہی جینا حرام کرتے ہیں

محمد اقبال..... کورنگی، کراچی

اب کوئی پھول کبھی ایسا نہیں کھل سکتا
ترے جیسی کوئی صورت نہیں ہونے والی

نازیہ خالد..... سکھر

نامیدی ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

رشید خان..... کوئٹہ

راتے کب سے ہیں اپنے منظر
ہو چکی ہے شام چلنا چاہیے

اسلم حیات..... فیصل آباد

ستارے شام سے اب آنکھیں موند لیتے ہیں
عجب سکوت سا دیوار و در میں رہتا ہے

ثاقب کمال..... نواب شاہ

نہ جانے کون سی افتاد آڑی غم پر
ہم ایسے ہجر نصیبوں کے گھر چلا آیا

اولیس احمد..... کوہاٹ

ہم نے کتنے ہی چاند چھوڑ دیے
دل کے بس ایک داغ کی خاطر

رمضان خان..... پشاور

نہ جانے آئی ہے کیسی یہ مجھ میں تبدیلی
کہ بات کرنے کو مجھ سے پھل رہا ہے کوئی

شا کر علی..... مری

کبھی کبھی تو یقیں سے بھی کوئی بات کرو
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ

محمود اختر..... سیالکوٹ

فضا میں اڑتے پرندو، ہماری بات سنو!
زمین پہ آگ لگی ہے اڑان میں رہنا

حمیرا رشید..... منڈوالہ یار

دنیا پہ رنگ اپنے اتارے نہیں گئے
ہم زندگی سے گزرے، گزارے نہیں گئے

کفیل احمد..... ملتان

شریکِ بزم بہت سے حسین لوگ بھی تھے
نہ جانے کیوں ہمیں چہرہ ترا پسند آیا

پرویز خان..... لاہور

اُن کے نرم ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں اکثر چیزیں
میری زندگی لگی ہے ہاتھ اُن کے خدا خیر کرے

صباحر..... کراچی

وہ اکثر مجھے کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے
کبھی لوگوں میں، کبھی الجھنوں میں

مہتاب احمد..... حیدر آباد

کانٹے تو آنے تھے ہمارے نصیب میں
ہم نے یار جو گلاب جیسا چتا تھا

انعم کمال..... حیدر آباد

وہ جو اک شخص ہی نہیں ملتا
لے کے ہم ساری کائنات کیا کریں گے

اطہر حسین..... کراچی

یہ بھی ممکن ہے تجھے عشقِ ولایت دے دے
یہ بھی ممکن ہے تیرے ہوش ٹھکانے آجائیں

ناہید یوسف..... اسلام آباد

وجود پتھر کا ہو تو شیشوں سے محبت نہیں کرتے
احساسِ چاہت نہ ملے تو پتھر بھی ٹوٹ جاتے ہیں

شاہین تبسم..... ملتان

بہت پختہ مزاج ہو تم
یاد رکھتے ہو کہ یاد نہیں کرنا

سمیل احمد..... لاڑکانہ

محبت میں خود کو ہمیشہ بادشاہ سمجھا
احساس تب ہوا جب کسی کو ماتنگا فقیروں کی طرح

مَحْفِل شِعْر و سَخَن

کوین

برائے

شمارہ

مارچ

2017

نام:

پتا:

فروری 2017ء

170

پبلس ڈائجسٹ

Downloaded From Paksociety.com

فنگرپرنت

سلیم انور

قانون سے کھیلنے والوں کے لیے ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب قانون اسی مجرم سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے... اور اس کی بوکھلاہٹوں پر مسکرا کر اس کے گرد شکنجہ کس لیتا ہے۔ وہ بھی خوش فہمی کا شکار تھا جو ذرا ماکھیلنے کھیلنے اچانک ایک لائن پر ایسا پھنسا کہ ساری پرفارمنس دھری کی دھری رہ گئی۔

سبھداری سے چلتے چلتے اچانک ناگہی کے جال میں پھنسنے والے قانون شکن کا قصہ

اس لمحے جب ڈاکٹر گورڈن کی نگاہیں کمرے میں بھٹکتی ہوئی حسن اتفاق سے اس قرمزی انگلی کے نشان پر پڑیں تو اسے ایک شدید جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک مدت سے بیمار ہو۔

بے کلی کے اسی عالم میں اسے احساس ہو گیا کہ اس کے چہرے کی رنگت پھیکلی پڑ چکی ہے اور اس کے ہاتھ بے قابو انداز میں کپکپا رہے ہیں۔ ”جیسس!“ اس نے سوچا۔ ”میں لازمی طور پر انہیں یہ احساس نہ ہونے دوں کہ میں

سپینس ڈائجسٹ 171 فروری 2017ء

خوفزدہ ہوں۔“ وہ بھیانک اور بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والا انٹرویو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بالآخر شاید سی آئی ڈی کے یہ تمام لوگ اس قمری دھبے پر توجہ دیے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے لیکن یہ اس کی ایک پُر امید خواہش تھی۔ بھلا ایسا ممکن ہو سکتا تھا؟

اس نے ایک خوفزدہ اور سرسری سی نگاہ انگلی کے سرخ نشان پر ڈالی..... اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ دھبہ غائب ہو چکا ہو یا کسی نہ کسی طرح جلد غائب ہو جائے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ فنگر پرنٹ اس کے علاوہ کسی اور کا کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور اگر ان سی آئی ڈی کے لوگوں میں سے کسی ایک کی نگاہ اتفاق سے اس پر پڑ گئی تو.....؟

اُوہ خدایا! اس کمرے کا ایک اور مرتبہ باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو یہ دھبہ اس مرتبہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ یہ دھبہ اس چھوٹی سی عام میز کے کنارے پر لگا ہوا تھا۔ اگر یہ میز شاہ بلوط کی سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی ہوئی تو پھر دھبے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ اس قدر نمایاں نہ ہوتا۔

لیکن میز کی سطح زردی مائل سفید رنگ کی تھی اور خوف زدہ ڈاکٹر کو یہ لگ رہا تھا جیسے تاریکی میں کوئی سرخ رنگ کی روشنی نمایاں طور پر جگمگا رہی ہو۔

یہ سب کچھ حقیقت میں بڑا معجزہ تھیں۔ خون کے ایک خفی سے قطرے نے اس جیسے سخت گیر طبیب کو گھٹنے کپکپانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے جھپچھپا رہا تھا لیکن خون کا یہ خفی سا دھبہ جو بلاشبہ میز پر اس کی انگلیاں چھونے کے نتیجے میں وہاں اپنا نشان چھوڑ گیا تھا، اس کی زندگی اور ہر شے کا خاتمہ کر سکتا تھا۔

اگر سینڈرا اس وقت اس کی یہ کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی تو خوب قہقہے لگاتی۔ شاید وہ مارلن منرو کی نقل اتارنے والی آواز میں یہ کہتی۔ ”اُوہ پور ڈارلنگ..... گریٹ بگ ڈاکٹر اور خون کے خفی سے دھبے سے اس قدر خوف زدہ!“ وہ اکثر ہنستی رہتی تھی اور دیر تک ہنستی رہتی تھی۔ ڈاکٹر گورڈن سینڈرا کی اس تمسخرانہ ہنسی کو پورے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتا رہا تھا لیکن پھر ایک دن اس کا پیلا بہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے نہایت بے رحمی سے اپنی اس کیفیت کا سینڈرا کے رویہ و اظہار کر دیا۔ اس وقت تک وہ صرف سینڈرا کے جسم سے خوفزدہ تھا کیونکہ جس انداز سے اس نے ڈاکٹر کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا تھا اور جس طریقے سے وہ اسے مالی طور پر کمزور کر رہی تھی، وہ اس سے غافل نہیں تھا۔

اور اب وہ اچانک سینڈرا کے انتقامی ذہن سے خوف

خوش قسمتی سے بھانڈا پھوڑنے والا وہ انگلی کا نشان جو یقیناً خود اسی کا تھا..... قدرے اندھیرے میں تھا۔ ایک گلدان میں موجود گلابی کارنیشن جو اب اس سنہری زلفوں والی فیشن ماڈل سینڈرا کے مانند بالکل بے جان ہو چکے تھے، کھڑکی سے آنے والی روشنی اور خونی رنگ کے انگلی کے نشان کے درمیان حائل تھے۔

”ڈاکٹر گورڈن.....“ ڈیکو انسپکٹر میتھیوز دھیرے دھیرے گھومتے ہوئے دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”جہاں تک ہمارے علم میں ہے، تم آخری فرد تھے جو سینڈرا لیک سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ یقیناً اپنی پیشہ ورانہ حیثیت میں۔“

ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے سراغ رساں کے لہجے میں قدرے طنز کا عنصر شامل تھا۔ ”کیا اس فلیٹ میں سب کچھ من و عن ایسا ہی ہے جیسا کہ اس وقت تھا جب تم آخری مرتبہ یہاں آئے تھے.....؟“

ڈاکٹر نروس زدہ انداز میں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ”ہاں، میرا یہی خیال ہے لیکن میں حقیقت میں یقین سے نہیں کہہ سکتا..... کیوں؟“

”ڈاکٹر! قدرتی طور پر ہم یہ ثابت کرنے کے لیے فکر مند ہیں کہ کل کوئی سینڈرا سے ملنے کے لیے تو نہیں آیا تھا لیکن اس وقت تک ہم کوئی جواب نہیں پاسکے ہیں۔“

ڈاکٹر گورڈن کو آگاہی ہو چکی تھی کہ اس کی کنپیٹیوں پر پسینے کی خفی بوندیں ابھرتی ہیں۔ وہ بولا۔ ”ویل، ہم یہ بات تو جانتے ہیں کہ اس سے ملنے کے لیے ایک فرد یقیناً یہاں آیا تھا..... وہی جس نے اسے قتل کیا ہے..... اگر وہ کوئی مرد ہے۔“

انسپکٹر میتھیوز کمرے کے وسط میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی خاص شے پر مرکوز نہیں تھیں۔ بھلا یہ اپنا

وہ انسپکٹر میتھیوز کی جانب دیکھتے ہوئے بے دلی سے مسکرا دیا اور بولا۔ ”تمہارے پاس سگریٹ تو نہیں ہوگا، اولڈ چیپ؟“

سراغ رساں یہ سن کر حیرت سے چونک پڑا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ڈاکٹر کے سامنے کر دیا۔ ڈاکٹر گورڈن نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا اور اپنی جبینیں ٹٹولنے لگا۔ انسپکٹر میتھیوز نے سگریٹ کا پیکٹ واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”حسب عادت میرے پاس لائٹر بھی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر گورڈن نے کھسپائے ہوئے لہجے میں کہا۔ انسپکٹر میتھیوز نے خوش اخلاقی سے لائٹر نکالا اور ڈاکٹر گورڈن کے سگریٹ کو شعلہ دکھا دیا۔

ڈاکٹر گورڈن سگریٹ کے سلگتے ہی گھوم گیا اور تیز تیز کس لگانے لگا پھر سرسری انداز میں ٹھٹھا ہوا اس چھوٹی سی میز کی جانب بڑھ گیا۔ وہی چھوٹی سی کریم کلر کی میز جس کے کنارے پر سینڈرا کے گرم خون کا دھبا دکھائی دے رہا تھا جو ڈاکٹر کی انگلی کے نشان سے پڑا تھا۔

اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے ڈاکٹر گویا ہوا۔ ”مس سینڈرا اپنے بے شمار خطوط کو نے میں موجود اس چھوٹی سی رائٹنگ ڈیسک میں رکھا کرتی تھی انسپکٹر۔ میرے خیال سے تمہیں اس کی تلاشی لینے کا خیال بھی آنا چاہیے۔“

”یہ ان پہلی جگہوں میں شامل ہے جن کی ہم تلاشی لے چکے ہیں، ڈاکٹر۔“ سراغ رساں نے جواب دیا۔ ”بے شک۔۔۔۔۔ بے شک۔ یقیناً تلاشی لے لی ہوگی۔ میں تو سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے بے دھیانی کے عالم میں جلتا ہوا سگریٹ اس کریم رنگ کی چھوٹی سی میز پر اس طرح رکھ دیا کہ اس کا سلگتا ہوا کنارہ عین انگلی کے نشان کے اوپر آ گیا جہاں وہ خون کا دھبا پڑا ہوا تھا۔

”تم کیا سوچ رہے تھے، ڈاکٹر؟“ ڈاکٹر گورڈن ٹھٹھا ہوا رائٹنگ ڈیسک کے پاس چلا گیا۔ ”مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ ایک مرتبہ سینڈرا نے اس میز میں کسی خفیہ دراز کو استعمال کیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ میرا واہمہ ہو۔ کاش مجھے صحیح یاد ہوتا۔۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے رائٹنگ ڈیسک کے سامنے کا حصہ نیچے گرا دیا اور بظاہر اس کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح جب وہ وقت گزاری کے کھیل میں مصروف ہوگا تو انسپکٹر کی توجہ اسی کی جانب مبذول رہے گی۔

زودہ ہو گیا تھا۔ ”تم یہ خیال بھی ذہن میں مت لانا کہ تم مجھ سے چھٹکارا حاصل کر لو گے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو ڈاکٹر کہ میں تمہیں اپنے دل کے نہاں خانے سے خارج کر دوں؟ ایک خاتون مریم کے ساتھ رسوا کن تعلقات اور دیگر سب کچھ؟ کیا یہ اتنا آسان ہوگا۔۔۔۔۔ جبکہ تم خود بھی غشیات میں مبتلا ہو۔۔۔۔۔“

اسے بھرپور یقین تو نہیں تھا لیکن اس کا خیال یہی تھا کہ سینڈرا اپنے مخصوص تسخرانہ انداز میں مسکرائی تھی اور ساتھ ہی اس لمحے لاشعوری طور پر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا اور اپنی اس جنونی کیفیت پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے تجربہ نما لیٹر اوپنر سے سینڈرا کے جسم پر لگا تار تین وار کیے تھے۔ اسے تب بھی یہی یقین تھا کہ مرنے کے بعد بھی سینڈرا اپنے مخصوص تسخرانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اس تسخرانہ مسکراہٹ کی یاد نے اس کے مجروح ذہن کو مزید کچھ کے لگا دیے لیکن سی آئی ڈی کے یہ لوگ ممکنہ طور پر اس پر شبہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر گورڈن نے سوچا۔۔۔۔۔ یا کر سکتے ہیں؟ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز اور عزت دار شخصیت کا حامل تھا۔۔۔۔۔ ایک ایسا شخص جو کمیونٹی کے معاملات میں ہمیشہ فعال رہا تھا۔ مقامی کونسل اور یوتھ کلب کی کمیونٹی میں بھی وہ دلچسپی سے حصہ لیا کرتا تھا۔ پھر بھلا ڈاکٹر گورڈن جیسا شخص سنہری زلفوں والی ماڈل کو کیونکر خنجر گھونپ سکتا تھا۔ یہ بات فکری طور پر اس کے کردار سے موافقت نہیں رکھتی تھی، تو پھر بھلا وہ لوگ اس پر کسی طرح کا کوئی شبہ کر سکتے تھے۔۔۔۔۔؟

نہیں، ان کے پاس اس کے خلاف اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا تھا، ماسوائے خون کے اس فشی سے نشان کے جو کریم رنگ کی چھوٹی سی میز کے کنارے پر موجود تھا۔۔۔۔۔ اور یہ اس کی انگلی کا نشان تھا!

وہ سینڈرا کے دردِ حقیقہ کا علاج کرتا رہا تھا اور وہ لوگ مشکل ہی سے اس کی اس بات پر یقین کریں گے۔ اگر اس نے یہ کہا کہ سینڈرا کا خون اس کے ہاتھ پر خالص پیشہ ورانہ وجوہات کی بنا پر لگ گیا تھا۔ کسی بھی صورت میں یہ بات بھی بعید از قیاس تھی کہ سینڈرا کا خون ڈاکٹر کے اپنے نایاب بلڈ گروپ سے میچ کرتا ہو۔

لہذا اسے کچھ اور ہی سوچنا ہوگا۔۔۔۔۔ سوچو ڈاکٹر سوچو! اچانک اسے اپنے سینے میں بھیگے ہوئے ہاتھوں کا خیال آیا جو اس وقت اس کے گوت کی جیب میں تھے اور ان پر بدستور کپکپاہٹ طاری تھی۔

”ہاں، نہایت پرکشش!“

”میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ مرد اس کے اطراف میں منڈلاتے رہتے ہوں گے۔“ ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

یقیناً وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سینڈرانے کبھی بھی کسی سے آزادانہ جنسی تعلقات نہیں رکھے تھے۔ بس ڈاکٹر گورڈن ہی وہ واحد مرد تھا جس کے ساتھ اس نے اپنا حقیقی تعلق جوڑا تھا۔ کسی چم چمڑے کے مانند اس سے چٹ گئی تھی اور پھر اس کی بربادی کا سبب بن چکی تھی۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کی زندگی میں دیگر کوئی مرد شامل نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو سی آئی ڈی کے کوجیوں کو اپنے دانت گاڑنے کے لیے دیگر شکار بھی مل جاتے..... چند ایسے طزمان جن کی جانب ان کی توجہ مبذول ہو جاتی اور ڈاکٹر کو کچھ سکون میسر آ جاتا.....

اور اب ڈاکٹر کو انہیں صرف مصروف رکھنا تھا تاکہ سگریٹ انگلی کے اس سرخ نشان کو جلا کر ناقابل شناخت بنا دے۔ شاید اب مزید ایک منٹ کا وقت لگ جائے..... لیکن تب انسپکٹر میتھیوز اچانک گھوم گیا۔ اس کا رخ اس چھوٹی سی کریم رنگ کی میز کی جانب تھا۔ ڈاکٹر گورڈن شدید خوف و ہراس کے عالم میں پیٹ پیٹ آنکھوں سے سراغ رساں کو دیکھ رہا تھا۔

انسپکٹر میتھیوز نے میز پر سے جلتا ہوا سگریٹ اٹھا لیا۔ ”تمہیں اس بارے میں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کہ تم اپنا جلتا ہوا سگریٹ کہاں رکھ رہے ہو، ڈاکٹر۔“ سی آئی ڈی کے آدمی نے کہا۔ ساتھ ہی جلتا ہوا سگریٹ سراغ رساں کے ہاتھ سے لے کر ایک ایش ٹرے میں رکھ کر بچھا دیا۔ ”تمہاری وجہ سے میز میں گڑھا پڑ جاتا۔“

”میری وجہ سے؟ اوہ مائی ڈیئر..... میری بے پروائی!“ ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے سینے میں پسلیوں پر تھوڑے برسا رہا ہو۔ اس کی قمیص کے نیچے بہتا ہوا پسینا اس کی بنیان کو تر کر رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم تمباکو نوشی نہیں کرتے، ڈاکٹر۔ کیا تم نے مقامی اخبارات میں سگریٹ نوشی کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے پوتھ کلب کے ممبروں کو تنبیہ نہیں کی تھی؟“ ”ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، انسپکٹر لیکن میں..... مجھے شاذ و نادر ہی اس کی طلب محسوس ہوتی ہے جیسے کہ اس وقت ہوئی تھی.....“

”میرے خیال سے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے“ انسپکٹر میتھیوز نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے حیکھے

اور وہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور محاسبہ کر رہا ہوگا۔ میں ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار ہوں اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اصل مقصد ان لوگوں کی توجہ کچھ دیر تک کے لیے دھبے کی جانب سے ہٹانا تھی تاکہ اس دوران جلتا ہوا سگریٹ اپنا کام دکھا دے اور انہیں پتا بھی نہ چلے۔

اس نے جلتا ہوا سگریٹ پورے دھیان اور مکمل احتیاط کے ساتھ بالکل صحیح مقام پر رکھا تھا۔

اس نے حساب لگا لیا کہ جلد ہی سگریٹ میز کے کریم رنگ کے پیٹ کے اس حصے کو جلا دے گا جہاں وہ خون میں ڈوبی انگلی کا دھبہ پڑا ہوا تھا۔ بس رنگ کے جلنے کی بواں کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کرائے..... اف خدایا..... بس ذرا سی مہلت اور مل جائے۔

اسے ان لوگوں کی توجہ اس نشان سے ہٹ کر کسی اور جانب مبذول کرائے رکھنا ہوگی۔ ان کی توجہ کسی صورت جلتے ہوئے سگریٹ کی جانب نہیں جانی چاہیے..... اس وقت تک نہیں جب تک وہ مخفی سا خون کا بیضوی دھبہ جو اس کی انگلی کے نشان کا تھا، جل کر ناقابل شناخت نہیں ہو جاتا..... انسپکٹر میتھیوز اس کے پیچھے کھڑا اس کے شانوں کے اوپر سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

ڈاکٹر گورڈن نے اپنے اوپری ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور مایوسی سے بولا۔ ”نہیں انسپکٹر! اس میں کوئی خفیہ دراز نہیں ہے۔ یہ میرا دھبہ تھا لیکن میرے خیال سے تمہیں ڈبیک میں ہر جگہ کی مکمل جانچ کر لینی چاہیے۔ اس میں مجھے اپنا ایک بل بھی دکھائی دیا ہے۔ وہ میری پرائیویٹ مرینے بھی تھی اور دیگر چند خطوط بھی ہیں.....“ اور وہ خنجر نما لٹراؤ پتر بھی تھا جس پر سے وہ پہلے ہی ہر قسم کے نشانات رگڑ کر صاف کر چکا تھا۔

”ہاں۔ ہم وہ تمام خطوط دیکھ چکے ہیں، ڈاکٹر۔ عجیب بات ہے کہ وہ سب کے سب خواتین کی جانب سے تحریر کردہ ہیں۔ کیا سینڈرانے بھی یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کا میلان ہم جنس پرستی کی جانب ہے؟“

”نہیں، کبھی نہیں!“ ڈاکٹر کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ”میرا مطلب ہے کبھی کوئی اس قسم کی علامات دکھائی نہیں دیں۔“ سی آئی ڈی کا آدمی پریشان نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

”اس کا کوئی مرد دوست نہیں تھا؟ یہ بات قدرے خلاف معمول ہے۔ ہے نا، انسپکٹر؟ مس سینڈرا تو ایک نہایت پرکشش عورت تھی۔“ ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نوٹ کر چکا تھا کہ تمہارے ہاتھ کس بڑی طرح کپکپا رہے تھے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کیا تم اس سگریٹ کو درست مقام پر رکھنے میں کامیاب ہو سکو گے یا نہیں۔“

”درست مقام؟“

”اس فنکر پرنٹ پر، ڈاکٹر!“ سراغ رساں نے میز کے کنارے سطح پر موجود سرخ نشان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک خراب کوشش نہیں تھی۔ اس کوشش پر تمہیں پورے نمبر ملنے چاہئیں۔ ایک یا دو منٹ اور لگتے تو یہ جل کر شناخت کے قابل نہ رہتا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس نشان کا تذکرہ اگر پہلے کر دیتا تو تمہیں یہ ساری زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔“

انسپکٹر میتھیوز نے بات مکمل کرنے کے بعد اپنی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور نفرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اسے ڈاکٹر پر تھوڑا سا ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ کبھی کسی فرد کو بکھرتے دیکھ کر لطف اندوز نہیں ہوتا تھا۔

اور ڈاکٹر گورڈن بالکل ہی ڈھے چکا تھا۔ وہ ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اپنا چہرہ اپنی لائبریری حساس انگلیوں کے پیچھے چھپا لیا۔

”ہمارے خیال میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ نشان وہاں کیسے پڑا تھا، ڈاکٹر۔ تمہارا اس بارے میں کیا موقف ہے؟“

ڈاکٹر گورڈن نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کوئی معقول جواب دے سکے لیکن اس کے ہونٹوں سے مبہم اور بے معنی الفاظ کے سوا اور کچھ نہ ادا ہو سکا۔ وہ سسکیاں لینا چاہتا تھا، رونا چاہتا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک عرصے سے بیمار ہو اور کمزوری اور ناتوانی نے اس پر غلبہ پالیا ہو۔

اس نے اپنے ذہن کے پردے پر خود کو اس چھوٹی کریم رنگ کی میز کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ اپنے ذہن میں مچلنے والے طوفان کی رو میں بہہ چکا تھا اور سینڈرا کو قتل کر چکا تھا۔ اس پر نیم بیداری کی کیفیت طاری تھی۔ وہ سینڈرا کی مشروب کی بوتل میں سے اپنے لیے ایک جام انڈیل رہا تھا۔ شاید یہی وہ وقت تھا جب اس نے میز کے کنارے کو چھوا ہوگا۔

اس نے ہر شے رگڑ کر صاف کر دی تھی۔ کوئی بھی چیز باقی نہیں چھوڑی تھی کہ جس پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جاتے لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ماسوائے اس میز کے!

اسے یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ یہ جتنی سا سرخ دھبہ اسے آج ہی کیوں دکھائی دیا تھا۔ اس وقت کیوں نظر نہیں آیا تھا جب اس سے نادانستگی میں یہ نشان میز کی سطح پر پڑا تھا۔

انسپکٹر میتھیوز اور سارجنٹ ڈاؤن اسے جلاد کی سی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی سفاک نظریں اسے اپنی روح میں کسی برے کے مانند سوراخ کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ ”میں بتاتا ہوں۔“ وہ پھٹ پڑا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“

بالآخر جب ڈاکٹر گورڈن نے سب کچھ بیان کر دیا تو سراغ رساں میتھیوز بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا، ڈاکٹر۔ یہ ہمیشہ بہتر رہتا ہے لیکن اگر تمہیں حیرانی ہے کہ میں نے اس فنکر پرنٹ کا تذکرہ تم سے پہلے کیوں نہیں کیا تھا تو بہتر ہوگا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ نشان تمہاری انگلی کا نہیں ہے۔“

ڈاکٹر گورڈن نے دھیرے دھیرے سراو پراٹھا یا اور پھر تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”میری انگلی کا نشان نہیں ہے؟“

”نہیں۔ یہ انگلی کا نشان خود سینڈرا نے چھوڑا تھا۔ جب تم نے اسے قتل کیا، اس سے پہلے سے یہ نشان وہاں موجود تھا، ڈاکٹر!“

ڈاکٹر گورڈن یہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔ ”اور یہ نشان خون کا بھی نہیں ہے۔“ سراغ رساں نے انکشاف کیا۔

ڈاکٹر کی آنکھیں یہ سن کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سراغ رساں میتھیوز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ نشان جو توں پر لگائی جانے والی سرخ رنگ کی کریم کا ہے جو سینڈرا اپنے کسی سرخ رنگ کے جوتوں کو چکانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔“

ڈاکٹر گورڈن نے ایک بار پھر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کے حلق سے ایک ہذیبانی قہقہہ بلند ہوا۔ پھر قہقہوں کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس پر یک ہشریائی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس ہذیبانی جنون کی کیفیت میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں کسی جگہ سینڈرا بھی اپنے مخصوص مسخرانہ انداز میں قہقہہ لگا رہی ہے۔





انتالیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھری پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک پتھرہ گئی روپ، کچی چھاؤں کچی دھوپ، محبت کی مٹاؤں، رقاؤں اور قاتلوں کا ایک دل ربا سلسلہ



Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

پیداستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی منگی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ بھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوثھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منگی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضائقاتی علاقے میں گوثھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا مگر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا وڈیرا اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برپا کر کے قاتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منجی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میجر اکوئیکر بیڑی کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرعہ لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سکیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوثھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کورہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ، جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے کھینچے سے فرار ہو گیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مرینہ دوبارہ TMET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پچھڑے ہوئے بچے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر کٹر جزل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہو گئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھا تا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاؤں کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے لگا یا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بھگات نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت کھائیں ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھا لیا اور بشری اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسر اقتدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے جوئے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک

حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زادی ناویدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگلی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابدی دس برس کا ہو گیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابدی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابدی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدی بیسے مگر عابدی نے ان کو شکانے لگا دیے۔ عابدی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابدی رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کر گئی۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کو یو یو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالے۔ عابدی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابدی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمہ داری عابدی کے سپرد کر دی۔ عابدی نے ماریہ سے نکاح پڑھ لیا۔ عابدی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کر دے سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابدی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ جل بسی۔ سب سمجھتے تھے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابدی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دین اسلام کی طرف مائل ہو کر عابدی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلماں نے عابدی کی مدد کر کے ان نون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ بارود اسے عابدی کے تختے سے نکال کر لے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے چھانٹ کر مراد سے نکاح کر لیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگئی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سانسے آگئی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کر دیا۔ دشمن عابدی کو ٹریپ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ادھر بین زبان نے دو جادو گروں کے ذریعے اپنے اور لارا کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ عابدی کو ایک لڑکی پسند آگئی اور اس نے اس سے شادی کر لی۔ ادھر لارا کی خدمات پر مامور جادو گروں نے لارا کو تختے میں لے لیا۔ اس نے عابدی اور ماروی سے مدد مانگی۔ عابدی نے جادو گر کو ہلاک کر دیا۔ اس نے حیرت انگیز قوتوں کی مالک چار عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ عابدی کو زہر دے کر اس کی طاقت کو ختم کیا جا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر مکمل رہا تھا۔ بالآخر عابدی کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ ادھر شیطان نے ٹیلی ٹھنسی جاننے والوں کو ناکارہ کر دیا تھا اور اس نے لارا کو افریقا پہنچا دیا تھا، دانش اور ماروی اس تک پہنچ نہیں پارہے تھے کیونکہ اس کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔ دانش نے عذر باد کے سانسے عزم کیا کہ وہ اپنی ماں کو وہاں سے ضرور نکال لائے گا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اور الم واندوہ سے عبارت تھی مگر یہ دھماکا جو عذر باد نے مراد علی منگلی پر کیا تھا، وہ حقیقت تھا، جس نے مراد کو پہلے ایسولینس اور پھر اسپتال پہنچا دیا تھا لیکن ماروی اور دانش نے بھی وہاں پہنچ کر عذر باد کا غرور خاک میں ملانے کی کوشش کی تھی جب ماسٹر کو یو یو کے شوٹرز اور فائٹرز وہاں مراد کی مدد کے لیے موجود تھے اور اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے تو عذر باد نے ایک آلہ کار کے دماغ میں پہنچ کر اسے مراد پر جب گولی چلانے پر اکسایا اور اس نے مراد کا نشانہ لے کر گولی چلائی بھی..... مگر عین وقت پر گولی عذر باد کے اپنے ہی ساتھی کو لگی، تو اسے فوراً احساس ہو گیا کہ ماروی وہاں موجود ہے۔ بعد میں وہ مراد کو دھمکیاں دیتا ہوا گیا تھا، لیکن ہوٹل پہنچتے ہی اس نے واقعی حقیقت دھماکا کر دیا ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی، جانے کتنے لوگوں کی ہلاکتیں ہوئیں اور کتنے ہی زخمی ہوئے۔

جب تک انسان زندہ ہے، اپنے اندر امید بھی زندہ رکھتا ہے۔ اور..... انسان موت جیسی اٹل حقیقت کو بھی بھلانے لگتا ہے۔ ضروری نہیں قضا صرف بیمار یا بوڑھے آدی پر ہی آئے۔ اچھے بھلے چلتے پھرتے جوان، اچانک موت کے جھپٹے پر دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں اور موت کے قریب پہنچے ہوئے صاحب فراش، بھلے چنگے ہو کر گھر کو پہنچ جاتے ہیں۔ امید کا یہی جوہر ہے..... شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ امید پہ دنیا قائم ہے۔

دانش کا الٹا ہاتھ لگنے سے پہلے ہی وہ ابلیسی چیلہ..... عذر باد غائب ہو کر یہ بتا چکا تھا کہ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے اچانک دھماکا کر دیا تھا، بالکل ایسا ہی دھماکا جیسا کالی دنیا کے ابلیسی چیلوں نے عابدی کی یقینی موت کے سلسلے میں کیا تھا۔ اگرچہ عابدی کی موت کے سلسلے میں وہ دھماکا عذر باد تھا جس کی حقیقت بڑی غمناک

ایک دن دوبارہ اپنی سابقہ قوت اور توانائی پالے گا مگر ڈھنڈیا تو اس بات کی پڑی ہوئی تھی کہ آخر اس سلومونیو ڈسٹھ پوائزنگ میں عالی جیسے پہاڑ کو کس نے اور کس طرح موت کے قریب پہنچایا تھا.....؟

عالی کے صاحب فراموش ہونے پر ایک عالم میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اب شہرت والے سے زیادہ شہرت دینے والے کے بارے میں سوالات کیے جا رہے تھے۔
”آخر کس سورمانے سورماؤں کے سورما کو زیر کیا تھا؟“

”وہ لوہا کون ہے، جس نے اپنے جیسے لوہے کے ایک پہاڑ کو کاٹ ڈالا تھا.....؟“
”وہ مہاشیطان کون تھا جس نے ارض اسلام کے اس گہر و سپوت کو یوں بستر علالت پر اور اس کے بعد خاک تلے شیخ دیا تھا؟“

ابھی ان سوالوں کے جوابات کی تلاش جاری تھی، ادھر بھی ادھر بھی.....

ادھر..... دوست نما دشمن، بن زیان، صیہونی تنظیم کے اہم عہدے دار کریگ ہوشن سمیت یہودی اکابرین، سپر پاورز، ان کے اتحادی، حتیٰ کہ تاریک دنیا کے پاسی لاراء، آنکس اور طاغوتا وغیرہ جبکہ ادھر..... روشن دنیا میں ارض اسلام کے ریاستی حکمران مراد علی منگی، زیب النساء بی خواہ ماسٹر کو بولہ، ان سب کو ان کڑے سوالوں کے جوابات کی ضرورت تھی نہیں تھی تو فقط ماروی کو..... وہ اپنی باطنی نظروں سے تاریک دنیا میں پاتال کی ناپاک گہرائیوں کے قعر قعر میں دو افراد کو محو رقص دیکھ رہی تھی، جہاں ایک جشن عظیم کی سی شان و شوکت کا سماں طاری تھا۔

ایک لمبے لمبے جے میں ملبوس کالا بھنگ شیطان، جسے خود پر ابن شیطان ہونے کا دعویٰ تھا، ایک حوالے سے وہ خود کو شیطان کا مندوب بھی کہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ رقص و سرود میں مگن تھا۔ ان کے ساتھ جادو گروں کا ٹولہ بھی تھا۔

یہ..... بھی ایک شیطانی جادو گر تھا۔ اس ابن شیطان اور مندوب شیطان کا نام خلیس تھا اور اس کی محبوبہ ہامی تار تھی۔ ہامی تارا کو جون بدلنے کی صفت خلیس نے دی تھی۔ ماروی اپنے بھائی دانش کے مقابلے میں زیادہ روحانی قوتوں کی مالک تھی۔ اگرچہ دونوں ہی خیال خوانی کے ماہر تھے مگر دانش کیا، ماروی تک لارا کی برین واشنگ کرنے والے کا کھوج نہیں لگا سکی تھی، بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، شیطان نے اس بار مثبت پہلو سے منگی چال چلی

جس وقت مراد کو زخمی حالت میں ایبوی لنس کے ہسپتال میں ڈال کر اسپتال لے جایا جا رہا تھا تو عذر باد پھر اس کے روبرو آ گیا اور طاغوتی طاقت کے نشے میں اس سے بولا تو مراد نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر کہا تھا۔

”تم سمجھ لو کہ میں زخموں سے چور ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بھی اس جادوگری (منگی) کا ناکہ ٹھکانے جنوبی افریقا کی سمت (تک جاؤں گا۔“
پھر یہی وہ وقت تھا جب دانش نے بھی حاضر ہو کر کہا تھا۔

”میں بابا جانی کے سائے میں اپنی مام کو ضرور وہاں سے لاؤں گا۔ تو دفع ہو جا۔“
اور عذر باد واقعی وہاں سے دفع ہو گیا تھا.....

جب مراد کو ایبوی لنس میں ڈال کر ٹرینڈا کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچایا جا رہا تھا تو اس کے اندر دانش سمیت موجود ماروی، اپنے باپ کی حالت زار کو دیکھ کر اندر سے لرز بھی رہی تھی..... مراد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے نیم بے ہوش تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا، جس کا ثبوت ماروی اور دانش کا ہنوز اس کے اندر موجود رہنا تھا۔ لیکن یہ بھی درست تھا کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش سے دو چار تھا۔

”آپی! بابا کی جان بچ جائے گی نا؟“ اچانک اسے اپنے بھائی دانش کی لرزیدہ سی سرگوشی سنائی دی۔ جانے کیا تھا اس سرگوشی میں کہ ماروی کانپ سی گئی بولی۔

”کیوں بھائی؟ تم نے ایسا کیوں پوچھا؟ اللہ بہت بڑا ہے، مارنے والے سے بچانے والا بڑا زبردست اور طاقت والا ہے، پھر یہ مایوسی کیوں؟“

”بھیا جانی (عابد علی منگی) کے لیے بھی پورے ارض اسلام میں ہی نہیں دنیا بھر میں دعائیں مانگی گئی تھیں مگر.....“
”تمہاری یہ مایوس کن باتیں میرا دل دہلا رہی ہیں دانش بھائی! پلیز، ایسا مت کہو۔“ ماروی سسک کر بولی۔

ایبوی لنس چینی چلاتی ہوئی ٹرینڈا کے کسی قریبی اسپتال کی جانب دوڑی چلی جا رہی تھی اور ماروی کا دماغ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ ماضی کے تناظر میں اپنے بھائی دانش کی اس بات کا موازنہ کرتے ہوئے سوچنے پر مجبور تھی کہ اس کے بھائی دانش نے ایسا کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا، یہ حقیقت ہی تھی کہ اپنے مرد آہن خوب بیٹے کے سلسلے میں خود مراد علی منگی کو بھی یہی امید تھی کہ..... اس کا پہاڑ جیسا زور آور اور فولاد جیسی طاقت رکھنے والا..... اپنی ذات میں ون من آری جیسی حیثیت کا حامل بیٹا عالی.....

لیکن جب پانچوں انگلیاں باہم مل جائیں تو ایک طاقت ور گھونسا بن جاتی ہیں۔ عالی اب تک ایک گھونے کی ہی مثال تھا مگر تلے اوپر شادیوں نے اس کی طاقت کو منقسم کر دیا، یہ جسمانی طاقت نہیں بلکہ ذہنی طاقت کا شاخسانہ تھا۔ جسم ذہن کا طالع ہے، ذہن منتشر ہو تو طاقت بھی منتشر ہو جاتی ہے۔ یہی عالی کے ساتھ ہوا۔ بہر حال جو کچھ ہوا وہ روپ بہرہ میں ہوا۔ نصیب خاتون کے روپ میں خلیس نے ہامی تارا کو بھیجا، اس کا کنٹرول اپنے مقرب خاص کارپرداز چیلے عذر باد کو دیا۔

ہامی تارا یوں تو خلیس کی رکھیل یا محبوبہ تھی مگر وہ دونوں شیطان کے ازلی اصولوں کے تحت، ایک دوسرے کے ساتھ بھی گناہ گارانہ "تعلق" رکھے ہوئے تھے۔ اصل تو اس کی طاقت کو سنبھالنے والی ہامی تارا ہی تھی، اس نے بھی نصیب کے روپ میں وقفے وقفے سے آکر اس کی طاقت کو ذہنی انتشار کے ذریعے منتشر کیا تھا۔ ہامی تارا جانتی تھی کہ ماروی اور دانش خیال خوانی کے ذریعے نصیب خاتون کے دماغ میں آتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اسی وقت آتی تھی جب نصیب خاتون کا دماغ خالی ہوتا۔ اس کے علاوہ عالی کی خوراک میں پہلے ہی ایسا زہر شامل کیا جا رہا تھا جس نے اسے بستر مرگ پر پہنچا دیا تھا۔ اس کا کسی کو پتا ہی نہ چل سکا اور عالی فنا ہو گیا۔

قائم رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے..... انسان تو فانی ہے، چاہے جتنا شہ زور ہو۔ اب تک ماروی کا تب تقدیر کے لکھے ہوئے کو مان کر اور اس کی مصلحت جان کر اپنے بابا جانی مراد علی منگی سے بہت کچھ چھپاتی رہی تھی مگر اب یہ حقیقت اسے بتانے کے لیے بے چمن ہو گئی، وہ اپنے بابا جانی کو یہ حقیقت بتانے کے لیے تڑپ گئی تھی کہ اپنے چیلوں (لارا، آبنوس، کاہن، طاغوتا وغیرہ) کی ناکامی کے بعد اصل شیطان اب خود اپنی محبوبہ ہامی تارا اور عذر باد کے ساتھ پاتال کی منحوس گہرائیوں سے نکل کر ان کے مقابلے پر آچکا ہے اور عارضی طور پر اسی نے سب سے پہلے اپنے چیلوں کا برین واش کر کے انہیں بت جیسا بنا دیا ہے تاکہ روشن دنیا والے یہی سمجھیں کہ کوئی بڑا عامل ان کے (شیطان کے) مقابلے میں آگیا ہے۔ یہی منافقت کا روپ ہے کہ دوست بن کر دھوکا دیا جائے اور خلیس اور اس کی حسین محبوبہ ہامی تارا..... چیلے عذر باد، روشن دنیا والوں کو بھٹکانے خود آرہے تھے۔

ماروی کو یہ سب بہت پہلے ہی اس کی پوشیدہ روحانی

تھی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیوں اس نے اپنے چیلوں لارا، آبنوس اور طاغوتا وغیرہ کے اذہان بھی واش کر ڈالے تھے؟ تاکہ کسی کو دشمنی کا شبہ نہ ہو سکے۔

ماروی نے اپنی باطنی آنکھ پر زور دیا، نور نظر کو گہرائیوں، بلند یوں اور پستیوں سے لے کر ارض و سما کے بیچ ہولناک خلاؤں اور ویرانوں تک دوڑایا تو اسے ایک شے دکھائی دے گئی۔ وہ بھی پردہ..... یہ دو پردے تھے۔ ایک سیاہ اور دوسرا سفید.....

وہ اسے ہٹانے کی کوشش کرتی، آیا پردہ اسرار کے پیچھے ہے کیا؟ پردہ اسرار بھی ہٹ گیا، جو منظر دکھائی دیا، اسے سمجھنے کے لیے ماروی کے دماغ کی چولیس تک مل گئیں۔ کبھی سفید پردے کے پیچھے اسے باریش نورانی چہرے دکھائی دیتے اور سیاہ پردے کے عقب میں کالے بھنگ کر وہ چہرے، پھر یکنخت سفید پردہ دوبارہ پھر پھڑا کے ہٹا تو اس کے پیچھے شیطانی چہرے اور یہ عین اسی طرح سیاہ کے پیچھے نورانی بشرے..... دھت تیرے کی، عقل ماؤف کر دینے والے ہی تو مناظر تھے یہ..... پہلی بار جیسے روحانی قوتوں کو ایک چیلنج کا سامنا پڑ رہا ہو..... یہ تو انسانی عقل کی سوچ تھی، ورنہ تو کاتب تقدیر بھی انسانی بھلائی اور فلاح کے لیے کچھ ایسے فیصلے صادر کرتا ہے جو یہ ظاہر کڑوے لگتے ہیں مگر ان میں بڑی حکمت ہوتی ہے، جیسے بیماری میں کڑوی گولی لگنا۔ شیطان کو جو طاقتیں ملی ہوئی ہیں وہ اللہ ہی نے اسے دی ہیں۔ اس میں حکمت ہے۔

"میں انسان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑوں گا۔ مجھ میں انہیں سیدھے راستے سے بھٹکانے کی طاقت ہے۔"

ماروی کو پہلی بار راہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے تصور میں بابا صلاح الدین اجیری ایک سفید لباس میں ملبوس ہو کر آئے پھر ماروی کے سامنے ایک جہان دیگر کھلتا چلا گیا.....

تمام پوشیدہ گوشے ماروی کے سامنے وا ہوتے چلے گئے۔ اس پر سیاہ و سفید کی حقیقت کھلنے لگی۔ شیطان چہرے بدل بدل کے ایمان والوں پہ حملے کرتا ہے۔

عالی کے مقابلے کی پہلی شہ زور خاتون بے شک ایک دین دار اور عالی کی وفادار بیوی تھی مگر شیطان نے اس کے اندر لہو بن کر اسے بھٹکا دیا تھا۔ اس نے عالی کی یہ شرط مان کر کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں بھی کرے گا تو اسے (نصیب خاتون کو) کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

خلیس جانتا تھا کہ ایک انگلی میں طاقت نہیں ہوتی

قوت نے دکھا دیا تھا مگر وہ ابھی مصلحت کسی سے اس کا اظہار کرنے سے قاصر تھی، بالکل اسی طرح جس طرح تھوڑے دنوں پہلے تک وہ اپنے باپ مراد کو اس کے بیٹے دانش کی حقیقت بتانے سے قاصر تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب بھی وہ دانش کے سلسلے میں اپنے باپ مراد کو کچھ بتانے کی کوشش کرتی تو وہ فقط اتنا ہی کہہ پاتی۔

”بابا جانی.....“

اس کا صاف مطلب یہی ہوتا تھا کہ ابھی رکاوٹیں ویسے ہی قائم تھیں۔ ماروی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی..... کیا یہ بھی کاتب تقدیر کی کوئی مصلحت تھی یا پھر کوئی کالا جادو.....؟ وہ سمجھ گئی، اسے جہاں بہت سی روحانی طاقتیں حاصل تھیں وہاں کچھ کمزوریاں بھی تھیں، کوئی انسان سو فیصد پرفیکٹ نہیں ہوتا، انہیں میں کی کمی رہ جاتی ہے۔ کہیں یہ کمی کوئی معنی نہیں رکھتی مگر کبھی یہی ایک کمی بڑی ثابت ہوتی ہے۔

ماروی کو بھی یہ کمی محسوس ہوئی تھی لیکن اس نے اس کا حل بھی ہمیشہ کی طرح خود ہی نکال لیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی دانش پیدا ہونے کے بعد تاریک دنیا میں موجود تھا مگر وہ اسے اپنی روشن دنیا میں نہیں لاسکی تھی نہ ہی اس کے بارے میں اپنے باپ مراد کو بتا سکی تھی۔ پھر بعد میں کاتب تقدیر کی طرف سے کئے گئے مقررہ وقت پر دانش کو وہاں سے نجات ملی مگر یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی شیطان کی پیچان مال لارا کو بھی بھلا نہیں سکا تھا۔

مگر اب دانش کی حقیقت سب جان چکے تھے۔ اس کا باپ مراد علی منگی بھی..... یہ تب کی ہی بات تھی جب دانش کو ایک طالب علم کی حیثیت سے اسلامک یونیورسٹی لایا گیا تھا۔ وہ اپنی بہن ماروی کے ساتھ ارض اسلام کی یونیورسٹی اور جم خانے میں بھی آگیا تھا۔ مراد سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اور مراد نے اسے دیکھ کر اپنے اندر ایک عجیب سی خوبی کشش محسوس کر کے گلے لگا کر اسے پیٹا کہا تھا۔

ماروی نے فیصلہ کیا، ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی، وہ خود خلیس، اس کے چیلے عذر باد اور اس کی محبوبہ ہامی تارا پر نگاہ رکھے گی۔ ان کے شیطانی منصوبے ناکام بتاتی رہے گی اور جہاں تک ممکن ہو سکا وہ اپنی غیر معمولی روحانی طاقتوں کے بل بوتے پر انہیں شکست سے دوچار بھی کرتی رہے گی۔ یوں اب باطنی آنکھ سے یہ تماشا دیکھنے لگی۔

اللہ نے شیطان اور اس کے پیچاریوں کو بھی ایک

خاص وقت تک کے لیے ڈھیل دے رکھی ہے۔ دنیا کا نظام ایسے ہی چل رہا ہے۔ خیر و شر کی جنگ ازل سے اسی طرح جاری ہے۔ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ زمین پر رہنے والے ایک کیڑے کا بھی اس دنیا میں آنے کا ایک مقصد رکھا ہے۔

لارا، آنکس اور طاغوتا کسی کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ بن زیان، لاما کیشورا کا کے جادو کی حفاظتی حصار میں خود کو محفوظ و مامون سمجھ رہا تھا۔ ماروی نے وہاں شعلہ بھڑکا کر اسے جزیرے میں دوڑانے پر مجبور کر دیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ وہ بہت جلد اسے لاما کیشورا کا کے جادو کی حصار سے باہر نکال کر رہے گی۔ ماروی کی کرامات دیکھ کر بن زیان نے لاما کیشورا کا سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے ساری صورت حال سے آگاہی دی اور بولا۔

”وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ چکی ہے کیونکہ وہ جان گئی ہے کہ میں اس کے باپ اور بھائیوں کا دشمن نمبر ایک ہوں۔“

”وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“ لاما کیشورا کا نے اسے تسلی دی اور آگے بولا۔

”وہ بے بس ہو کر تمہیں محض گیدڑ بھکیاں دے رہی ہے۔“ مگر اس کا بھائی عالی اپنی بہن ماروی کی مدد سے زومبی گاٹا کو شکست دے چکا ہے۔“ بن زیان نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

”بے شک! لیکن اس کا بھی تو انجام دیکھو کیا ہوا، خاک سے خاکستر ہو کر منوں مٹی تلے چلا گیا۔“ لاما کیشورا کا معنی خیر لہجے میں بولا۔

”تت..... تو کیا تم نے عالی کو اس حال تک پہنچایا ہے؟“ بن زیان کی آنکھیں حیرت و خوشی سے پھیلنے لگی تھیں۔ ”نہیں مگر میں یہ حقیقت جانتا ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“ ”بس! ایک حد تک سوالات ٹھیک ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ ہی منقطع کر دیا۔

بن زیان نے اپنے ذرائع سے تسلی کی خاطر ایک بار پھر پتا چلایا۔ صورت حال ابھی تک وہی تھی۔ ”کاش! وہ شیطان اس نفی آفت کی پرکالہ ماروی کا بھی کچھ کر لے۔“

☆☆☆

ماروی خیالات سے اس وقت چوکی جب دانش نے اسے خیال خوانی میں شہوکا دیا۔

”آپ! بابا کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ ہم شاید زیادہ دیر ان کے اندر موجود نہیں رہ سکتے۔“ بھائی کی بات سن کر ماروی کو بھی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اسے اب اپنے باپ کے اندر رہنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ دونوں حاضر ہو گئے۔ دونوں فکر مند اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ دانش کے مقابلے میں ماروی کو بہت سی پیش آمدہ اور پیش آئندہ باتوں کا ادراک تھا۔ اس نے خیال خوانی کرتے ہوئے بابا صلاح الدین اجیمیری کا تصور کیا اور تب ہی اس کی سماعتوں میں غیبی آواز ابھری۔ وہ اسے بہت غور سے سنتی رہی۔ اس کے بعد وہ پس منظر سے ”پیش منظر“ میں حاضر ہوتے ہوئے، دانش سے بڑے عجیب لہجے میں بولی۔

”ہمیں بابا کو اسی حالت میں یہاں سے لے کر جانا ہوگا۔۔۔۔۔“

☆☆☆

لاما کی شورا کا..... جس وقت بن زیان سے باتیں کر رہا تھا، تبت کی ایک خانقاہ میں لاتعداد معتقدین اس کی دستیابی سے فیوض حاصل کرنے کے لیے اس گنبد نما حجرے میں جمع تھے۔

تبت بر فباری کی شدید لپیٹ میں تھا۔ کڑکڑاتی سردی

میں بھی اس کے ماننے والے آبادی سے میلوں دور یہاں بریلی بلندی میں اس کا درس سننے آتے تھے۔ وہ ان کا روحانی پیشوا بن کر یہاں انہیں مختلف اچھی و بری پیش گوئیوں سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

ان سے فارغ ہو کر وہ اپنے دو خاص خادموں کے ذریعے گنبد کے سب سے اوپر بنے کمرے میں آ گیا۔ وسط میں ایک چھوٹی سی چوکور میز تھی اور اس پر ایک ڈیڑھ فٹ قطر کا کرشل بال رکھا ہوا تھا۔ خادم دروازے کے باہر پہرے پر کھڑے ہو گئے تھے اور وہ اکیلا اندر تھا۔

اس نے کرشل بال کے قریب آ کر زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور دوسرے ہی لمحے کرشل بال اپنے اسٹینڈ میں دھیرے دھیرے گول گول گھومنے لگا۔ اس کا رنگ پہلے برف جیسا سفید تھا، پھر سرخ ہوا اور اس کے بعد گہرا بنفشہ ہو گیا۔ وہ اب تیزی سے گھوم رہا تھا۔ لاماک کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ کرشل بال میں ایک چہرہ متحرک ہونے لگا۔ وہ کسی بوڑھی عورت کا چہرہ تھا۔ چہرے پر منحوسیت کے ڈونگرے برس برسے تھے آنکھیں بند تھیں، بند کیا تھیں، ایک لکیری چٹنی ہوئی تھی، بغیر پلکوں کی۔

موسم سرما کی دل بھاتی بے خودی
جاسوسی کے شمارے کی منفرد قیامت خیزی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

کھیل کے میدان سے شروع ہونے والی محبت اور عداوت کی سنسنی خیز داستان **پروین زبیر** کی لازوال تحریر

شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عوام کی یکجائی جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی...

● اولین صفحات

● انگارے

● آواز گاد

عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی
سرورق کی کہانیاں

خطاؤں کی راہ گزر پر چلتے پھرتے خطا کے پتلوں کا سفر پر خار **سلیم فاروقی** کی یادگار تحریر

● پھلا رنگ

سائنس کے ان زاویوں کی فتنہ سازی جو عام انسانی آنکھ سے اوجھل تھے **شبیم شفیق** کی زبردست تجزیہ نگاری

● دوسرا رنگ

آپ کے تہمے...
مشوے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

برف پوش پہاڑیوں سے نکل کر چار دانگ پہنچے
والا تھا؟ لیکن اس میں وہ شیطان کی جسے داری کو نامناسب
خیال کر رہا تھا۔

لاما اپنی فطرت کے مطابق بلا شرکت غیرے اور
پوری دنیا میں اپنے تقدس اور اپنے مذہب کے پرچار میں
دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی جنونی واقع ہوئے
ہیں۔ اس نے ماتورا ما سے یہ سوال کیا تھا، جواب اسے
ملتا تھا۔

”طاقت اسی کی ہوگی، جو ہر تیرا ہوگا۔ وہ کسی کو دکھائی
دے گا نہ اس کا پرچار کر سکے گا۔ دنیا والے صرف تجھے
دیکھیں گے۔“

وہ اپنی ماں کی بات سمجھ گیا۔ واقعی شیطان اسی کو تو
کہتے ہیں کہ وہ خود نظر نہیں آتا مگر اپنے کرتوتوں سے جانا جاتا
ہے۔ گویا کرتوت اس جلیس کے ہوں گے اور عمل اس
کا کہلائے گا۔

کچھ دنوں بعد اسے ماتورا ما کی طرف سے اشارہ ملا کہ وہ
ارض اسلام کے مراد علی منگی کو مقابلے کا چیلنج دے ڈالے۔
پہلے تو وہ گھبرایا۔ زومی گانا کا انجام اسے یاد آنے لگا۔
اسے پھر اشارہ ملا۔

”بے وقوف.....! روشن دنیا کے لوگوں کو چیلنج دینے
سے ہی تو تاریک دنیا کے جلیس کی نظروں میں تو اہم
نمبر بنے گا.....! اسے ہر وقت کسی نہ کسی چیلے کی ضرورت پڑتی
ہے۔ فوراً عمل کر میری پیش گوئی پر.....! ماں نے
ڈپٹا۔ اس نے فوراً ماں کی نصیحت پر عمل کر ڈالا۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوا.....! ماروی کو اپنی مخفی صلاحیتوں سے
کچھ ایسے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے کہ کوئی بڑی کالی
طاقت ان کے مقابلے میں آنے والی تھی مگر وہ ظاہر نہیں ہو
رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی دانش سے اس سلسلے میں بات
کی پھر دونوں نے خیال خوانی سے اپنے چنیدہ دشمنوں کے
دماغ تک رسائی حاصل کی، ماسوائے بن زیان کے، چور
خیالات سے اور کہیں سے بھی پتا نہ چل سکا کہ وہ آندھی جیسی
کالی طاقت کون تھی اور اس کا نزول کس خطے سے ہونے والا
تھا؟ اگرچہ تاریک دنیا کی طرف سے ان کا اندازہ تھا۔

”میرا خیال ہے، بن زیان کے علم میں سب ہوگا۔
اگر کسی طرح اس کے دماغ تک رسائی حاصل کر لی جائے
تو.....! دانش نے کہا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لاما
کیثور کا کے جادو کی حصار میں تھا۔

”گریت مدر، ماتورا ما.....! تیری مہربانی کہ تو نے
مجھے مہاشیطان کے پاتال سے باہر نکل آنے کی خبر دی،
پر اب تک تو نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مجھ سے کب رابطہ کرنے
والا ہے؟“ کیثور اکانے پوچھا۔

دفعاً اس بڑھیا کی لکیر جیسی بند آنکھوں میں جنبش
پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں چلیوں
سے عاری تھیں، فقط سفیدی تھی۔ باہر چلنے والی کاٹ دار
برقی ہواؤں کا شور بلند چپت کے گول رخسوں سے اندر تک
سنائی دے رہا تھا۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے لاتعداد، خونی اور
شیطانی چمکاؤں کی چیخ رہی ہوں۔

گھومتے ہوئے کرشل بال سے چلاتی ہوئی آواز
برآمد ہوئی۔

”جلدی نہ کر فرزند کیثور کا.....! وہ دن دور نہیں
جب تو اور جلیس اس کی محبوبہ ہامی تارا، اس کا چپلا عذر باد
پوری دنیا میں اپنی طاقت اور شہرت کا ڈٹکا بجانے والے
ہیں۔ انتظار کر.....!“

اس کے ساتھ ہی اس مکروہ آنکھوں اور منخوس چہرے
والی بڑھیا کی آنکھوں کی جگہ دوبارہ باریک لکیروں نے لے
لی۔ کرشل بال بھی گھومتے گھومتے رک گیا۔ رکنے کے
دوران بھی اس کا رنگ اسی طرح بدلتا ہوا، دوبارہ سفید برف
جیسا ہو گیا۔

لاما کیثور کا فطرتاً گھمبڑی تھا۔ بن زیان نے جب
اس سے مدد مانگی تھی اور اسے اپنے دشمنوں (مراد اور عالی
وغیرہ) کے بارے میں بتایا تھا تو لاما کیثور اکانے اسے تسلی
دیتے ہوئے چپکی میں اس کے دشمنوں کو اڑانے کا دعویٰ کیا
تھا، پھر جب اس نے زومی گانا کا عالی کے ہاتھوں
حشر دیکھا تو وہ ذرا بدکا مگر پھر اس نے اسے ایک مغرور قہقہہ
میں اڑا دیا۔ غرور بھی ایک بھوت کی طرح انسان کے سر پر
سوار ہوتا ہے، یہ لاتوں کا بھوت ہوتا ہے۔ لاما کیثور اکا کو
بھی ایسی ہی ایک لات لگنے والی تھی، کب؟ یہ صرف قدرت
کو معلوم تھا۔

لاما کیثور اکا، کو اس کی ماں ماتورا مانے ہی یہ پیش
گوئی کر کے بتایا تھا کہ.....! اس کے ساتھ پاتال کی
منخوس گہرائیوں کا ایک مہاشیطان جلیس عنقریب اس کی
طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والا ہے۔ اس پر وہ بے حد خوش
ہوا تھا۔ خوشی حد سے بڑھ جائے تو بہت سے اندیشناک
واہموں کو بھی جنم دیتی ہے، اسے بھی یہ وہم سا ہونے
لگا تھا کہ کیا واقعی اس کی شہرت اور وجہ بے کا ڈٹکائیت کی

تحفہ

بہت دن گزرے دوستوں کی محفل میں ایک صاحب نے یہ قصہ سنایا تھا جو آپ کے گوش گزار ہے۔ تو صاحبو! قصہ کچھ یوں ہے کہ تقسیم ہند سے قبل اکثر لوگ پانیادہ سفر کرتے تھے۔ ایک جاٹ کو سفر درپیش تھا۔ وہ صبح سویرے پانیادہ چل پڑا۔ دوپہر کا وقت جون کی آگ برساتی دھوپ میں اس کا پیاس کے مارے برا حال تھا۔ اس کا گزر ایک پسماندہ سے گاؤں سے ہوا۔ گاؤں میں سب سے پہلا گھر سردار گرتام سنگھ کا تھا۔ جاٹ نے دروازے پر دستک دی تو سردار کی سیدی سادی بیوی دروازے پر آئی۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ جاٹ نے پانی مانگا تو اس عورت نے پانی دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔ کہاں سے آرہے ہو۔ پیاس کی وجہ سے جاٹ کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے جل کر کہا، جہنم سے آرہا ہوں۔ عورت نے ہائے کہہ کر سینے پر ہاتھ مارا اور پوچھا وہاں میری اجیت کور تو نہیں تھی؟ (اجیت کور جوانی میں فوت ہو گئی تھی) جاٹ کو اپنی پیاس بھول گئی۔ بولا، میں تو تمہارا ہی گھر ڈھونڈ رہا تھا۔ اجیت کور کا تو وہاں بہت برا حال ہے۔ فرشتوں نے بے چاری کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑاھے میں پیچیک رکھا ہے۔ میں چھٹی پر گھر جا رہا تھا تو اجیت کور نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میری ماں سے کہنا کہ میرا سارا زیور تمہارے ہاتھ مجھے بھجوادے تاکہ میں وہ فرشتوں کو دے کر اس عتاب سے چھٹکارا پاسکوں۔ تیرنٹا نے پرہیزا۔ سردار نے زار و قطار روٹی جاتی تھی اور بیٹی کے لیے بے شمار سندھیے دیتی جاتی تھی۔ اس نے بیٹی کے زیور کے علاوہ اپنا سارا زیور بھی پوتلی میں پاندھ کر جاٹ کے حوالے کیا۔ جاٹ اپنی پیاس بھول گیا اور اسے تسلی دے کر تیزی سے واپس اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گرتام سنگھ گھر آیا تو سردار نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔ سردار کو سخت غصہ آیا۔ بولا تم سے تو میں آکر پوچھتا ہوں۔ پہلے میں اس ٹھگ کو پکڑ لوں اور گھوڑی پر بیٹھ کر اسی سمت روانہ ہو گیا۔ جنگل میں اسے جاٹ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جاٹ کو لگا کر۔ جاٹ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے میری کے درخت پر چڑھ گیا۔ سردار نے گھوڑی درخت کے نیچے کھڑی کی اور درخت پر چڑھنے لگا۔ جب وہ آدھے درخت پر چڑھ گیا تو جاٹ نے نیچے چھلانگ لگا دی اور گھوڑی پر بیٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ سردار بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو زور سے آواز دے کر کہنے لگا۔ اوئے جٹا! اجیت کور تو میرے دلوں پیار دیویں تے نالے آکھیں دے زیور تیری ماں دلوں تے اے گھوڑی بائیں دلوں تحفہ قبول کر لوں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک چمن شریف

”ہمیں بن زیان کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“

”میں دوبارہ کوشش کر چکی ہوں، اب تیسری بار کرتی ہوں۔“ ماروی نے بھائی سے کہا اور خیال خوانی کے ذریعے وہ اس جزیرے تک جا پہنچی۔ اس نے اپنی مخفی روحانی طاقت سے پھر وہی شعلہ بھڑکایا جس سے بن زیان بدکنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

شعلہ رقص کرتا ہوا بن زیان کی طرف لپکا اور وہ اس سے بچنے کے لیے اٹھ کر بھاگا اس نے بھی شعلے سے بچنے کا توڑ یہی نکال رکھا تھا کہ وہ پورے جزیرے کا بھاگ بھاگ کر طواف کرے، اس نے یہی کیا۔ بالآخر ہانپتا ہوا دوبارہ اپنے بیلے میں بے دم ہو کر آگرا۔ شعلہ غائب ہو چکا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس بار شعلہ اس کی جانب لپکا تو وہ نہیں بچ سکے گا۔ ایسا زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اس نے فوراً کریگ ہوشن سے رابطہ کیا۔

”وہ آفت کی پرکالہ ماروی ہاتھ دھو کر میزے پیچھے پڑ چکی ہے۔ اس کا سد باب کرنا ہوگا۔ اس نے میرا بنگلا جلا کر خاکستر کر ڈالا، میری فوج کو قتل کر دیا۔“

”تم لاما کی طور کا سے کیوں نہیں رابطہ کرتے؟“

کریگ ہوشن نے کہا۔

”وہ یہی کہتا ہے کہ بہت جلد ارض اسلام پر ایک بڑی شیطانی قوت حملہ آور ہونے والی ہے۔ پرنس عالی کو بھی اسی کالی طاقت نے ڈھیر کیا اور اب مراد بھی ٹریڈا کے ایک اسپتال میں اپنی زندگی کے دن گن رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے اس پیش گوئی کا۔“ بن زیان ہانپتے ہوئے بولا۔

”تو پھر انتظار کرو روشن دنیا والوں کی بربادی کا۔“

کریگ ہوشن نے کہا۔

”لیکن تب تک ماروی میرا بھر کس نکال دے گی..... اوہو..... وہ پھر آرہی ہے۔“ بن زیان چلایا اور شعلے کی جھلک دیکھتے ہی اٹھ کر دوڑا۔ حتیٰ کہ جزیرے کے ساحل کی ریت پر بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب اس نے ماروی سے سودے بازی کرنے کے لیے اسے اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دے ڈالی۔

”میں نے کہا تھا کہ تم بچ نہ سکو گے۔“ ماروی کی باریک آواز اس کے دماغ میں ابھری۔

”مجھے مار کے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا ننھی آفت!“ وہ ہد یانی لہجے میں بولا۔

”نہ ہی تم اس بربادی کو روک سکو گی

جو عنقریب تم سب کا مقدر بننے والی ہے۔“ اس نے آخر میں دھمکا یا بھی۔ ماروی بولی۔

”یہ وقت بتائے گا کہ کون اور کس کی بربادی کرے گا۔ تم نے لاما کیسوراکا سے ساز باز کر کے ہمارے خلاف کھلی دھمکی کا اعتراف کر لیا ہے۔ موت سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ لاما کیسوراکا کو اس کالی طاقت کی طرف سے کیا اشارے ملے ہیں؟“

”ہا..... ہا.....“ بن زیان نے ایک ہڈ پانی قہقہہ لگایا۔ وہ مکار سمجھ چکا تھا کہ اس کے دماغ میں ٹھنسنے کے باوجود وہ اس کے ان خیالات کو پڑھنے سے قاصر ہے جو اس کے اور لاما کیسوراکا کے مابین تھے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔

جب بن زیان نے سمندر میں ڈوب مرنے سے بچنے کے لیے ماروی کو اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دی تھی تو ماروی نے بلا دیر اس کے ان خیالات کو پڑھنے کی کوشش کی تھی جو اس کے اور لاما کیسوراکا سے متعلق تھے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

”لاما کیسوراکا ہی تم سب کی بربادی کا سامان بننے والا ہے۔ جاؤ..... اس سے جا کر مقابلہ کرو۔“

ماروی نے طیش میں آکر اس کے دماغ کو جھٹکا دیا، وہ حلق کے بل چیخا۔ اس نے سانس روک کر ماروی کو بھگادیا۔ ماروی نے دوبارہ شعلہ دکھایا۔ وہ اٹھ کر دوڑا اور سمندر میں کود گیا۔ ابھی وہ اٹھلے پانی سے دور تھا۔ غوطے کھانے لگا۔ ماروی نے اسے چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنے بھائی دانش کے پاس آکر اس سے بولی۔

”بن زیان نے مجھے یہی اشارہ دیا ہے کہ لاما کیسوراکا ہی ہماری سرزمین پر ہلا بولنے کی تیاری کیے بیٹھا ہے۔“

”آؤ بہنا! ہم دونوں لاما کیسوراکا کے دماغ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔“ دانش نے کہا اور دونوں بہن بھائی نے لاما کیسوراکا کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر انہیں ناکامی ہوئی۔

☆☆☆

مراد اور عابی (مرحوم) کے دوست نما دشمنوں کو جب اس پر اسرار کالی طاقت کے بارے میں علم ہوا کہ وہ عنقریب ارض اسلام پر ہلا بولنے والی ہے تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ انہیں کریگ ہوشن کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔

”آخر ہتا تو چلے کہ یہ پر اسرار کالی طاقت ہے کون اور اس میں کتنا دم ہے؟“ سپر پاور کے ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔

”کہیں یہ رگھوناتھ جیسا ثابت نہ ہو، اس نے بھی مراد اور عابی کو ختم کرنے کا ایسا ہی دعویٰ کیا تھا مگر اس کا حشر کیا ہوا، یہ ہمارے سامنے ہے۔“ ایک یہودی اکابر نے بھی کچھ ایسے ہی خدشے کا اظہار کیا تو صیہونی تنظیم کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کچھ خوش فہمی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور اتحادیوں کو امید دلانے کے انداز میں کہا۔

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ کچھ ایسا اشارہ ملتا ہے کہ وہ کالی طاقت پاتال کے ایک بڑے مہاشیطان کی صورت ظاہر ہونے والی ہے۔ رگھوناتھ جیسے اس کے چیلے رہے ہیں، کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ ارض اسلام کے فرماں روا عابد علی منگی کو کس حال پر پہنچا دیا۔ مراد کا کیا حشر کر کے رکھ دیا.....“

یہ حقیقت تھی، سب نے اتفاق کیا۔ ایک اعلیٰ حاکم جوش مسرت سے بولا۔

”اگر ایسا ہے تو ہمیں بھی حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ یہی موقع ہوگا کہ جب ہم بھی اپنے دل میں چھپی برسوں کی بھڑاس نکالیں۔ مراد علی منگی بھی بستر علالت پر پڑا ہے۔“

”لیکن زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس مہاشیطان سے رابطہ کریں اور اس سلسلے میں اس سے بھی مدد چاہیں کہ ہم اس کے ہم خیال اور اتحادی بننے کو تیار ہیں۔“ بہت کوشش کی گئی کہ کسی طرح اس پر اسرار مہاشیطان سے رابطہ ہو سکے مگر تا حال اس میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔

لارا، آبنوس اور طاغوتا وغیرہ کی اچانک برہن واشنگ کے بعد ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے مہاشیطان (نہلیس) ان کی جگہ اپنے کچھ نئے مہرے میدان میں لانے والا تھا۔

اللہ نے انسان کو عقل کے ساتھ عقل سلیم بھی دے رکھی ہے۔ جس کے ذریعے وہ کسی بھی رونما ہونے والے واقعے کی پہلے ہی سے تصویر کشی کر ڈالتا ہے اور اسی کے مطابق عملی قدم اٹھاتا ہے۔ یہ عقل زیادہ تر قیاس آرائی اور محتاط اندازوں کے بل پر ہوتی ہے۔

خیالات اور عقل کے گھوڑے دوڑائے گئے تو اندازہ ہوا کہ اس ان نون پر اسرار کالی طاقت کا تعلق کسی ماورائی دنیا سے ہی تھا جو پہلے چھپ کر یہ سارا تماشا اور اپنے چیلوں کی ناکامی کا کھیل دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

ارض اسلام میں افسردگی کی فضا قائم تھی۔ ابھی عابی کی دائمی جدائی کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ ٹرینڈا سے مراد کی

”تاریک دنیا کے بارے میں ہمیں پتا چلانا ہوگا کہ وہاں اب کس کے ہاتھ میں کمان ہے؟“ وہ نہیں جانتے تھے کہ ماروی کو سب معلوم ہے مگر وہ بعض مجبور یوں کے باعث ابھی انہیں یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہاں اصل مہاشیطان ”خملیس“..... جو خود کو مندوب شیطان کہتا ہے، وہی نمایاں ہے۔

ہمزاد بولا۔ ”وہاں تین ہی اہم شخصیات تھیں، لاراء، آنوس اور طاغوتا مگر ان کے برین واش کر دیے گئے ہیں وہ کسی اور کو تو کیا، خود کو بھی پہچاننے سے قاصر ہیں۔ عذر بادی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیروز ایسٹینشن، سٹریٹ 10، کلاں روڈ، کلاں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

شدید علالت کی خبر آگئی تھی۔ اگرچہ ماروی نے انہیں بابا صلاح الدین اجیری کے حوالے سے تسلی تو دی تھی، تاہم اس عمل کی باریابی اور یہ خیر اختتام میں ابھی وقت تھا، لہذا سب ہی مراد علی منگی کی علالت پر تشویش میں مبتلا تھے۔ ہمزاد متفکر تھا اور زیب النساء ہر اسامی۔ اس کی دن بہ دن بگڑتی حالت پر ریاست ملول تھی۔

”مراد پر کسی کالے جادو یا شیطانی قوتوں کا اثر غالب آتا محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ آج تک کس نے ان کا بال بھی بیکانہ کیا ہے۔“ ہمزاد نے خیال ظاہر کیا۔ ”ہمیں انہیں خود بابا صلاح الدین اجیری کے حجرے میں لے جانا چاہیے۔“ زیب النساء کو ہمزاد کا یہ مشورہ اچھا لگا۔ تاہم وہ قدرے فکر مند ہی سے بولی۔

”لیکن انہیں ریاست سے باہر ہندوستان کیسے لے جایا جائے؟ کیا خبر جس شیطانی قوت کا یہ شاخسانہ ہے وہ بھی یہی چاہتی ہو کہ پرنس کو ریاست سے نکالا جائے اور خدا نخواستہ اسے نقصان پہنچانے کا موقع حاصل ہو جائے۔“

بات غلط بھی نہیں تھی۔ وہ پراسرار شیطانی قوت ہی کیا، اب تو سبھی کھل کر دشمنی پر اتر آئے تھے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوئے، مراد کو موت کے منہ میں جاتا دیکھا جائے چنانچہ فوراً ماسٹر کو بو بو سے ٹیلی فونک رابطہ کیا اور مشورہ طلب کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ مراد کو بیک وقت بہت سے دشمنوں سے خطرات لاحق ہیں۔“ وہ بولا۔ ”بیرونی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تو میں بھی مدد میں شامل رہوں گا اور دی ماسٹرزنسٹ کیٹ اور ریڈ الرٹ بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمیں۔۔۔ مراد کو ہندوستان علاج کے لیے بابا صلاح الدین اجیری کے ہاں لے جانا ہی ہوگا۔“

”لیکن ماسٹر! ماروی اور دانش نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تو ہے اور ہمیں ماروی کی روحانی طاقتوں پر بھروسہ بھی ہے مگر موجودہ حالات بتا رہے ہیں کہ شیطانی قوتیں پیترے بدل کر اپنی طاقتوں کو ہمارے خلاف بار آور کرنے کے لیے ہر طرح سے کوشاں ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی اسی طرح ان کا جواب دینا چاہیے اور صرف ایک سورس پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔“

اس کے مشورے کو سب نے تسلیم کیا۔ لہذا اسی وقت انڈین اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کیا گیا اور غایت بتائی۔ انہیں ایک دن انتظار کرنے کو کہا گیا۔ ریاست میں ایک بار پھر ایک میٹنگ کال کی گئی۔

منظر عام پر آیا ہوا ہے جبکہ لارا ہنوز غائب ہے۔“
 ”ہماری نفی ماروی..... ارض اسلام کی وہ واحد ہستی
 ہے جو تاریک دنیا میں آجاسکتی ہے۔“ زیب النساء بولی۔
 ”لیکن پتا نہیں کیوں وہ کچھ بتانے سے قاصر رہتی ہے۔“
 ”تمہیں کیسے یہ بات معلوم ہوئی؟“ ہمزاد نے اس
 کی طرف دیکھ کر قدرے چونک کر پوچھا۔

”مجھے اپنے اندازوں سے کچھ ایسے اشارے ملے
 ہیں۔ چونکہ ہماری نفی ماروی بھی اپنے بھائی عابی کی طرح
 ایک عجوبہ ہے، رکھونا تھکا لیا اور زومی گانا کا حشر ہمارے
 سامنے ہے۔“

ماری کو فوراً طلب کیا گیا۔ ہمزاد نے بڑی محبت اور
 شفقت سے اس کے سامنے یہ باتیں دہرا دیں۔ ماروی کی
 آنکھیں بھیگ گئیں، وہ اب فر فر ساری حقیقتیں بیان کرتی
 چلی گئی، جو پہلے باوجود کوشش کے نہ اگلی جاسکتی تھیں۔

یہ سچ ہی تو ہے کہ اللہ نے ہر ہونی انہونی کا ایک وقت
 مقرر کر رکھا ہے۔ کوئی بھی ہونے والی چیز اپنے وقت سے
 ایک سیکنڈ سے لمبی کم وقت میں آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ اب
 بھی یہ یہی ہوا۔

اس نے بتایا کہ خلیس نامی ایک مہاشیطان اور اس
 کی محبوبہ ہامی تارا اور عذر بادی تاریک دنیا کی نئی ابھرنے
 والی وہ کالی طاقتیں ہیں جو عنقریب ارض اسلام پر حملہ کرنے
 کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں کیشوراکا
 ان کا زبردست اتحادی بننے والا ہے۔

ماروی کی زبانی یہ ساری حقیقتیں جان کر وہ سب متحکک
 ہو گئے ریاست ارض اسلام کے خلاف شیطانی عزائم عروج
 پر تھے۔ عابی دنیا میں نہیں رہا تھا، مراد بستر علالت پر تھا۔
 ہمزاد نے بھی خواہوں کے مشورے کے بعد مراد کے
 ساتھ خود جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”بابا! میں اور دانش بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔“
 ماروی نے کہا تو ہمزاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں بیٹی....! ان حالات میں تم دونوں کا ابھی
 ریاست میں ہونا ضروری ہے۔“

ہمزاد کی بات پر دونوں بہن بھائی خاموش ہو گئے مگر
 وہ جانتے تھے کہ وہ ساتھ جائیں نہ جائیں لیکن ان کے بہت
 قریب رہیں گے وہ دونوں.....

وہ ہندوستان جانے کے لیے اپنی فوج اور دیگر
 سیکورٹی اہلکاروں کی پلٹن تیار کرنے لگا ہمزاد گھبراہٹ
 سے بھی رابلے میں تھا کہ اسی رات ماروی کے علاوہ ہمزاد کو

خواب میں بابا صلاح الدین اجیری کی زیارت ہو گئی۔
 وہ ایک سفید باریش ہالے کی صورت میں ہمزاد کو
 دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس سے مخاطب تھے۔ ان کی
 آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ کہتے چلے گئے اور
 ہمزاد خاموشی سے سن رہا۔ صبح بیدار ہوا تو وہ عجیب و غریب
 کیفیات سے دوچار تھا۔

☆☆☆

تاریک دنیا کے لارا، آنسو اور طاعون خالی الذہنی
 کے عالم میں تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ بت بنا دیے گئے
 ہیں۔ لارا کو البتہ فعال کیا گیا تھا مگر اس طرح کہ اس کی صرف
 یادداشت ختم کر دی گئی تھی۔ صرف اس کے بیٹے دانش کو رکھا
 گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خیال خوانی کرنا تک بھول گئی تھی
 اور اس وقت راجر ہارڈی کی بیوی بن کر اس کے زیر تصرف
 تھی۔ البتہ شیطان نے کاہن کو بھی آنسو اور طاعون جیسا بنا
 دیا تھا کیونکہ اس کے علم میں آیا تھا کہ وہ بھی ٹیلی پتھی جانتا
 ہے اور اس..... کے کام آسکتا ہے۔ اس وقت وہ تینوں
 پاتال کی منحوس گہرائیوں کے ساتویں غار میں خلیس کے
 سامنے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ خلیس اپنے لمبے
 سے چونے کا ایک دامن ہاتھ میں تھامے ہوئے آہستہ آہستہ
 ان کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہامی تارا کھڑی
 تھی۔ خلیس اپنے ان تینوں چیلوں پر کوئی عمل کر رہا تھا، اس
 کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور وہ بدہیت ہونٹوں تلے
 دھیرے دھیرے کچھ بدبانے میں بھی مصروف تھا۔

جیسے ہی خلیس نے اپنا یہ سارا عمل بند کیا اسی وقت
 تینوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

”مہاشیطان خلیس نے تم تینوں کو ایک خاص وقت
 تک بے عمل رہنے کے بعد کچھ نئی شکلیوں کے ساتھ دوبارہ
 سدھ عطا کی ہے تم تینوں پر لازم ہے کہ اس مہربانی پر خلیس
 کا شکر بجالاؤ.....“ ہامی تارا نے کاہن آنسو اور طاعون کی
 طرف دیکھ کر کہا۔

”ہمیں دوبارہ نئی شکلیوں کے ساتھ بیدار کرنے
 پر معظم خلیس کا ہم دل کی گہرائیوں سے شکر بجالاتے ہیں۔“
 تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”تم تینوں اسی وقت ہمارے ایلچی بن کر بت کے لاما
 کیشوراکا کے پاس پہنچو اور اسے بتاؤ کہ ہمارا اتحادی بننے
 کے لیے مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں ہمارا وہ کس حد
 تک ساتھ دینا پسند کرے گا؟“ خلیس نے کہا۔

تینوں چیلے خیال خوانی کے ذریعے فوراً لاما کیشوراکا

سنگار

شوہر سفر سے اچانک گھر پہنچا تو دیکھا کہ میز پر رکھی ایش ٹرے میں سلگا ہوا سنگار رکھا تھا۔ وہ بیوی پر برس پڑا۔ بہت دیر تک شوہر اور بیوی میں زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ شوہر نے چلاتے ہوئے کہا۔
”سچ بٹاؤ، یہ سنگار کہاں سے آیا؟“ کپڑوں کی الماری سے ایک لرزتی کانپتی ہوئی آواز آئی۔
”بنگلور سے!“

پر حملہ کرنے میں صرف ان کا ہی نام نہ آئے بلکہ اتحادیوں کا نام آنا بھی ضروری ہے، اسی لیے وہ آپ کے بعد فوراً یہودی اکابرین، سپر پاورز وغیرہ سے بھی اس سلسلے میں رابطہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ کاہن نے کیشوراکا سے کہا۔
”ارض اسلام پر فتح اور مراد علی منگی کی شکست قاش کا کریڈٹ وہ آپ سمیت ان کے دشمنوں کو دینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا اپن سمجھ لو۔“ آنوس نے کہا۔
لاما کیشوراکا نے فوراً اس کی ہامی بھری۔ وہ تینوں اس کے دماغ سے چلے گئے۔

یہاں سے جملیس کا آگے پیغام پہنچانے کے لیے یہ تینوں بٹ گئے۔ آنوس نے کریگ ہوسٹن کی راہ لی، طاغوتا نے یہودی اعلیٰ حاکم کا رخ کیا، جبکہ کاہن بن زیان کے دماغ میں جا پہنچا۔

”تم بھی ٹیلی پتھی جانتے ہو؟ اس سے پہلے تو تم کبھی خیال خوانی کے ذریعے میرے پاس نہیں آئے، خیر..... فی الحال سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اس آفت کی پرکالہ ماروی نے میرا جینا حرام کر ڈالا ہے، بڑی مشکلوں سے میں نے اس سے اپنی جان چھڑائی ہے۔ لا را بھی اتنے دنوں سے نہیں نظر آ رہی ہے۔“ اس کو اپنے دماغ میں محسوس کرتے ہی اس نے کہا۔ اگرچہ اس نے مراد وغیرہ کی دشمنی سے بچنے کے لیے لا را کو اپنے اندر آنے سے منع کیا تھا مگر وہ اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

دیگر چیلوں کی طرح کاہن کو بھی ماروی کی کارستانیوں کا علم تھا۔ بن زیان کے حفاظتی حصار میں ہونے کے باوجود ماروی نے یکنی کا ناچ بجا رکھا تھا۔ بن زیان ٹیلی پتھی جاننے والوں کی راہنمائی کیا کرتا تھا اور اس حوالے سے لا را وغیرہ کو بھی اس کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی رہتی تھی مگر جب سے مہاشیطان جملیس نے ان تینوں کا برین واش کرنے کے بعد ایک طرح سے ”اپ گریڈ“ کیا تھا، اب انہیں کسی کی راہنمائی

کے دماغ میں جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر ان تینوں کو ایک سرت انگیز حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اس سے پہلے کسی بڑی طاقت والے اجنبی کے دماغ میں گھسنے سے پہلے انہیں اس کی اجازت طلب کرنا پڑتی تھی مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ مگویا معظم جملیس نے ان کی ٹیلی پتھی کی قوت کو دو چند کر دیا تھا۔

لاما کیشوراکا کو خود بھی ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس وقت اپنی ماں ماتوراما کے ساتھ صلاح و مشورے کمر کے فارغ ہوا تھا کہ اسے لگا بھیسے کوئی اس کے دماغ میں گھس آیا ہو، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہاں اسے پہلی بار اپنی طاقت کی کمی کا جھٹکا لگا۔ اس نے بھاری اور رعب داب والی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟ اور اس طرح زبردستی میرے دماغ میں کیوں اور کس طرح گھسے چلے آئے ہو.....؟“
”ہم معظم جملیس کا سلام لے کر تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ادھر سے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔“ طاغوتا نے جواب دیا۔

جملیس کا نام سنتے ہی لاما کیشوراکا کو خوشی محسوس ہوئی مگر باوجود اس کے وہ پریشانی کا شکار تھا کہ جملیس کا یہ پیغام قبل از وقت تھا، کیوں؟ جبکہ اس کی ماں ماتوراما..... کے مطابق، جب تک وہ یعنی کیشوراکا ارض اسلام پر حملہ کرنے کا بگل نہیں بجاتا، جملیس اس سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ جملیس نے اس طرح زبردستی اپنے ان چیلوں کو اس کے دماغ میں گھسا کر اپنی طاقت دکھانا چاہی ہو.....؟“ اس نے سوچا پھر اسے فراموش کر گیا اور تینوں چیلوں سے پہلے شکایتی لہجے میں بولا۔

”دوست تھے تو دوست بن کر تمہیں آنا چاہیے تھا، مجھ سے پہلے اجازت طلب کی جاتی۔“

”معتظم جملیس کو کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں، ویسے بھی انہوں نے خیر سگالی اور دوستی کا پیغام بھیجا ہے آپ کو۔“ طاغوتا بولا۔ ”ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔“

لاما کیشوراکا نے جو کہنا تھا کہہ دیا تھا۔ وہ اب مقصد کی بات پر آتے ہوئے ان سے خیر مقدمی انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں معظم جملیس کا شکر بجا لاتا ہوں..... تم اس کا میرے پاس کیا پیغام لائے ہو؟“

”معتظم جملیس عنقریب ارض اسلام پر حملہ آور ہونے والے ہیں، انہیں اگرچہ کسی کے اتحاد کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ خیر سگالی کے طور پر ایسا چاہتے ہیں کہ ارض اسلام

کی ضرورت نہیں تھی۔ لہذا وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”فکر مت کرو..... عنقریب اسلامی ریاست ارض اسلام پر حملہ ہونے والا ہے۔ میں تمہیں یہی خوش خبری سنانے آیا تھا تا کہ تم بھی ہمارے اتحادی بن کر اس جنگ میں شریک ہو جاؤ۔ ان اتحادیوں میں دنیا کے ایک بڑے شیطانی ادارے ”دی کچر“ کے سربراہ مسٹر راجر ہارڈی بھی ہمارے ساتھ ہیں۔“

بن زیان کو کاہن کی بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ دشمن مراد اور عابی کے خلاف عرصے سے برسرِ پیکار تھے اور ارض اسلام پر دھاوا بولنے کی پلاننگ کرتے ہی رہتے تھے مگر اس بار اسے کاہن کا لہجہ بدلا ہوا ہی نہیں بلکہ کچھ حاکمانہ محسوس ہوا۔ اس نے بھی گہری سنجیدگی کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔

کاہن وغیرہ کو خلیس کی طرف سے اس بات کی ممانعت تھی کہ وہ تینوں ماسوائے لاما کیٹورا کا کے کسی اتحادی اکابر کو خلیس کے بارے میں نہ بتائیں۔ اسی لیے کاہن نے بھی بن زیان کو گول مول سا ہی جواب دیا۔ وہ سابقہ لہجے میں بولا۔

”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے، ہماری تاریک دنیا کی طاقتیں کھپتی بڑھتی رہتی ہیں مگر کھنسنے کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ وہ کم ہوتی ہیں، بلکہ پہلے سے زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہمیں بھی زیادہ کالی شکلیاں حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر گھٹا دیا گیا تھا۔“

”اب تم لوگوں کو ایسی کون سی بڑی شکلیاں حاصل ہو گئی ہیں؟ ذرا میں بھی تو سنوں؟“ بن زیان کے لہجے میں طنز تھا۔ جسے محسوس کر کے کاہن نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں نے تم سے جو کہنا تھا کہہ دیا، میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو اچانک بن زیان کو خیال آیا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔ تاریک دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، اسے واقعی کاہن کی نصیحت کے مطابق آم کھانے سے مطلب رکھنا چاہیے۔ وہ فوراً بولا۔

”رکو..... رکو..... پلیز.....“

وہ ٹھہر گیا۔ وہ کچھ بچی لہجے میں اس سے بولا۔

”اگر تمہیں اور طاغوتا وغیرہ کو واقعی ایسی بڑی کالی شکلیاں حاصل ہو ہی گئی ہیں تو پلیز، میری کسی طرح سے ماروی سے تو جان چھڑا دو۔“

”عنقریب ان سب سے ہماری جان چھوٹنے والی ہے، بائے.....“ وہ یہ کہہ کر اس کے دماغ سے چلا گیا۔

”کتے کا بچہ.....!“ بن زیان غصے سے بڑبڑایا۔

ادھر آنسو اور طاغوتا نے بھی خلیس کا یہ خفیہ پیغام یہودی تنظیموں اور سپر پاورز سمیت مراد اور عابی کے دشمنوں تک پہنچا دیا تو وہاں ایک ہلچل مچ گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ مہاشکتی ہے جس نے عابی جیسے فولادی اور ناقابلِ تسخیر انسان کو دھول مٹی میں بدل دیا۔ گویا حملے سے پہلے ارض اسلام والوں کو ایک چٹاؤنی دی ہے کہ اس بار ان کے مقابلے میں ایک بڑی طاقت ہے۔ لہذا انہوں نے بھی فوراً ہامی بھری تھی۔ وہ اب کھل کر مراد وغیرہ کے خلاف دشمنی پر اتر آئے تھے۔

☆☆☆

ماروی نے لاما کیٹورا کا کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہوا میں کر دوڑا بن کر پرواز ہی اچانک اس کا سامنا ایک بارش بزرگ سے ہو گیا اور وہ ان کی جھلک پہچان کر ہی مودب ہو گئی۔

”واپس لوٹ جاؤ بیٹی! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اپنے باپ کے پاس جاؤ۔“ ماروی اسی وقت آدھے راستے سے واپس ہو گئی۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ گئی تھی کہ ضرور اس کے باپا مراد کے بارے میں کوئی خبر ہے..... لہذا وہ جب وہاں پہنچی تو اسے حقیقت کا علم ہو گیا۔

مراد بدستور بے ہوش تھا۔ ڈاکٹری اصطلاح کے مطابق وہ کوما میں تھا مگر ماروی کو باپ کے پاس پہنچنے ہی پر وہ غیب سے معلوم ہو گیا کہ مراد کو ہندوستان لے جانے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس کے بیمار وجود کی شفا تبت کے ایک برقیلے غار ”گالان“ میں رکھ دی گئی ہے.....

ریاست کے سربراہ کی شفا یابی کی راہ پاتے ہی پورے ارض اسلام میں امید و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ماروی اور دانش کو بھی ان کے ساتھ چلنے کی اجازت مل گئی تھی۔

حفاظتی دستہ، ناسٹرکوبو کے ساتھی اور دیگر اتحادی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ ایک بڑا سا جہاز چارٹرڈ کروایا گیا۔

ہمزاد نے مراد بن کر تبت کے دارالحکومت لہاسا میں اعلیٰ تبتی افسران سے رابطہ کر کے اپنی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔ اسے فوراً اجازت نامہ مل گیا۔ چارٹرڈ جہاز اور دیگر ضروری انفارمیشن کے تبادلے کے بعد تمام تیاریاں مکمل کر لی گئیں اور بالآخر روانگی کا وقت آ پہنچا۔ ہمزاد نے با اعتماد وزیر کو ریاست کے معاملات سونپے۔

مراد کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر جہاز میں سوار کرایا گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ لاغر اور ہوش سے

بیگانہ وجود کبھی ایک ناقابلِ تسخیر قوتوں کا مالک تھا، ایک عالم جس سے لرزتا تھا۔ دشمن اس سے خوف زدہ ہو کر دشمنی بھول کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آج وہی مراد علی منگی اس حالت میں تھا کہ ... دشمن خوش ہو رہے تھے ... اپنے تو اسے دیکھ کر پورے جی جان سے کڑھ کر رہ جاتے تھے۔

امید اور تسلی کا بھی یہ کس قدر خوبصورت وحیرہ ہے کہ مایوسیوں کے اندھیاروں میں ایک ذرا سی غمگینی تو بھی زندگی کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔ اسی ایک لہر کے سہارے مراد کو ہزاروں میل دور جت کے برقاب ویرانوں میں بھی بہ بغرض علاج کے لیے جایا جا رہا تھا۔

ادھر جلیس نے فوراً اپنی محبوبہ ہامی تارا کو ہدایت کر ڈالی۔ جو دراصل اس کی چیلی بھی تھی۔ ”فورا لاما کیثورا کا کے پاس جاؤ اور اسے مطلع کرو کہ ہمارے دشمن نمبر ایک اس وقت تبت کا سفر کیے ہوئے ہیں۔ خبردار! مراد کو گالان کے اس غار کے قریب بھی نہ پہنچنے دے، جہاں ہماری کالی شکتیاں بھی بیکار ہو جاتی ہیں۔“

جلیس نے ہامی تارا اور عذر باد کو الگ الگ کام سوچے ہوئے تھے۔

ہامی تارا نے اسی وقت خیال خوانی کی پرواز کی اور لاما کیثورا کا کے دماغ پر خیال خوانی کی دستک دی۔ اپنا تعارف کرایا تو لاما کیثورا کا نے اسے اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دے دی۔

جلیس کا پیغام ہامی تارا نے لاما کیثورا کا کو سنا دیا۔ جلیس کا پیغام سن کر وہ ہامی تارا سے بولا۔

”معظم جلیس تو بے پناہ کالی شکتیوں کا مالک ہے، حیرت ہے وہ گالان کے اس پہاڑی غار کو تباہ نہیں کر سکتا؟“

”ہمیں یہ اعتراف ہے کہ بعض روحانی قوتوں کے سامنے ہم بھی بے بس ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل ہی کچھ نہیں کر سکتے۔ عالی کتنا طاقت ور بنتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کو انجام تک معظم جلیس نے ہی پہنچایا، بس! ہماری کالی شکتیاں بھی ایک خاص حالات و مواقع سے متعلق ہوتی ہیں مگر اپنے علم سے معظم نے اتنا تو پتا لگایا ہے کہ تم ان دونوں بہن بھائیوں کا راستہ روک سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے، یہ خوشی کی بات ہے۔ میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔“ لاما کیثورا کا نے جواب دیا۔

ہامی تارا رخصت ہو گئی۔ لاما کیثورا کا سو جتنے لگا۔

یہ اس کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ اتنی بڑی بات اس سے چھپی کیسے رہی تھی؟ مگر چھپی کہاں تھی؟ یہ تو ظاہر ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا یہ دوست کے دشمن سے جنگ کرنے کا سنہری موقع ہے۔ اس کا اپنے بھی خواہوں میں بڑا نام ہو جائے گا۔ سپر پاورز اور ان کی اعلیٰ قیادت اس کی احسان مند ہو جائے گی، جس طرح مراد کی ایک دنیا میں عزت، نام اور شہرت تھی، اس کی جگہ اب اس کی ہو جائے گی۔ وہ جہاں جائے گا، اپنے تبلیغی مشن کو۔ یہ آسانی پورا کر سکے گا۔ تمام ممالک اس کی اپنے وطن آمد کو خوش نصیبی خیال کریں گے اور جھک جھک کر اس سے ملیں گے۔

وہ اسی قسم کے سہانے خواب بننے لگا اور اسی وقت اپنی خصوصی سواری پر گالان کی پہاڑی کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ باندھنے لگا کہ اچانک اسے اپنی ماں ماتوراما کا خیال آ گیا۔

”بھلا اس معاملے میں ماں سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے سوچا۔

”یہ تو میں خود بھی فیصلہ کر کے کر سکتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد جب شام کے سائے برف زاروں میں جھکنے لگے تو اس نے اپنی سواری نکالی، جس

میں چار موٹے تازے ”یاک“ بٹے ہوئے تھے۔ اس ”یاک گاڑی“ میں ایک بڑا سا چوبلی کینبن فٹ تھا، اس کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں خادم، دوسرے میں لاما کیثورا کا کے سونے کا انتظام تھا، جبکہ تیسرے میں بیٹھنے کی کشادہ جگہ تھی۔ یہ لاما کیثورا کا کی پر تعیش سواری تھی۔ دیکھنے میں قدیم طرز کی اس یاک گاڑی میں جدید سہولتیں موجود تھیں۔ ہیڈ لائٹس کے طور پر دو تیز نیم لائٹس نصب کی گئی تھیں۔ یاک گاڑی کو ایک بوڑھا کوچبان، خاصی تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا گالان کی پہاڑیوں کی طرف لیے جا رہا تھا۔

گالان کی پہاڑیوں کے قریب پہنچتے ہی اس غار کی تلاش شروع کر دی گئی۔ لاما کیثورا کا کو خود بھی اس بات کا تجسس تھا کہ آخر یہاں ایسا کون سا تارک الدنیا حکیم یا وید موجود تھا، جو مراد کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ اپنے علاج میں کامیاب ہو گیا تو اس کی شہرت چہار دہائی پھیل جائے گی کیونکہ مراد کو کوئی معمولی شخصیت نہ تھا۔

پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس غار کی تلاش شروع کر دی گئی۔ پتا چلا یہاں تو ایسے بر فیلے غاروں کی کمی نہ تھی۔ گویا ایک ڈھونڈو، ہزار ملنے کے مصداق، یہاں ان کی بہتات تھی۔

آتی تھیں۔ یہی نہیں ان سے پہلے وہاں ان کی افواج، جانثاروں کے ہتھیار بدست ٹولے پہنچا دیے جاتے تھے۔ تبت کی طرف ایک پوشیدہ سی پہنچل مچ گئی تھی۔ سپر پاورز اور یہودی تنظیموں کے اکابرین درپردہ تبت کی حکومت کو ان لوگوں کی آمد کو --- اپنے ملک میں خطرہ قرار دیتے ہوئے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کی آمد سے ان کے ملک کی سلامتی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ تبتی حکمران اعلیٰ ان --- کی آمد کو اپنے وطن اور عوام کے لیے باعث فخر سمجھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ریاست ارض اسلام کے حکمران مراد علی مکی کو ان کی سر زمین تبت سے شفا مل جاتی ہے تو یہ کم شہرت والی بات نہ ہوگی۔ تبتی حکمران خود بھی ارض اسلام کے ساتھ دوستانہ روابط رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ انہیں ہمیشہ سے ہی بھارتی جارحیت کا خطرہ رہتا تھا اور ارض اسلام کے بھارت کے پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

انہوں نے نہ صرف کھلے دل سے اجازت دے دی بلکہ ہر طرح سے مدد پہنچانے کا بھی عندیہ دے ڈالا۔ ہمزاد ماروی اور دانش مراد کے ہمراہ لہاسا کے ایئر پورٹ پر اترے تو وہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور ان کی رہائش کا تو پہلے ہی بندوبست کر دیا گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری مہمان خانے کا گیٹ ہاؤس تھا اور جس مقام پر تھا وہاں سے تھوڑی دور ایک کمانچ تھا، جو اسنو کمانچ کے نام سے موسوم تھا۔ وہ اکثر خالی رہتا تھا مگر اب وہاں پچھلے تین دنوں سے چار افراد نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ان میں دو عورتیں اور دو مرد تھے، خود کو انہوں نے نیا نیلا شادی شدہ جوڑا ظاہر کیا تھا، جو ہنی مون منانے کے لیے ٹورسٹ کی حیثیت سے آیا ہوا تھا لیکن درحقیقت یہ کریگ ہوشن کے بھیجے ہوئے شوٹرز تھے۔ انہوں نے مراد کو نشانہ بنانا تھا۔

کریگ ہوشن نے بن زیان کے ذریعے ان چاروں کے دماغ لاکڈ کر ڈالے تھے، لہذا ان چاروں کی حیثیت اب ریبوٹ سے زیادہ نہیں تھی، جن میں یہ پروگرام فیز کر دیا گیا تھا کہ مراد کو نشانہ بنانا ہے۔

ادھر ماروی اور دانش بھی اپنے چھپے ہوئے دشمنوں کی خفیہ سازشوں سے بے خبر نہیں تھے۔ ماروی کو معلوم ہو چکا تھا کہ جہاں مدد ان کے ہمراہ تھی، وہیں دشمن اور شیطانی طاقتیں بھی ان کے جلو میں آستین کا سانپ بن کر کٹہلی مارے ہوئے تھیں، لہذا گیٹ ہاؤس میں فروکش ہوتے ہی سب سے پہلے، ماروی اور دانش نے گیٹ ہاؤس کے آس

لاما کیٹورا کا جھلا کر اپنی نشست گاہ والے حصے سے اٹھ کر دوسرے حصے میں آگیا۔ یہاں اس کا کرٹل بال موجود تھا، وہ اسے ہر وقت اپنے قریب رکھتا تھا۔ اس نے فوراً یہ دریافت کرنے کے لیے اپنی ماں کو طلب کیا۔

”بے وقوف! تو منہ پھاڑ پنچے جھاڑ یہاں چلا آیا۔ مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔“ بڑھیا ماں تو رمانے اسے جھڑکا۔ ”وہ غار تجھے اس طرح کبھی نہیں مل سکے گا۔ پہلے ان دونوں بہن بھائیوں (ماروی اور دانش) کو آنے دے اور یہاں وہ جس غار میں فروکش ہوں، وہی غار گالان کا ہوگا۔“

”گریٹ مدر! میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اس غار میں ایسا کیا ہے، جس میں مراد کی شفا رکھی گئی ہے؟“ لاما کیٹورا کانے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بس! جو کہا ہے ابھی وہ کرو، اس کے بعد مجھے بتانا۔“ اس نے کہا اور چلی گئی۔

لاما کیٹورا کانے اپنے مختصر قافلے کو واپسی کا حکم دے ڈالا، البتہ اس نے کچھ جاسوس پہاڑیوں میں چھوڑ دیے کہ جیسے ہی وہ دونوں بہن بھائی یہاں پہنچیں اور جس غار میں ٹھہریں، اسے فوراً مطلع کر دیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایسے وقت وہ دونوں نادیدہ نہیں رہیں گے۔

مگر کیٹورا کا کو پھر بھی قرار نہ ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان دونوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی کچھ ایسے جتنی نوعیت کے انتقامات کر لے کہ وہ دوبارہ یہاں سے جاتی نہ سکیں۔

ادھر دیگر دشمن طاقتیں بہ شمول شیطانی ادارے دی کچر کارا جہارڈی اور خلیس سمیت اس کے چیلے عذر باد اور ہامی تارا بھی ماروی اور دانش کی راہ کا کٹنا بننے کی تیاری میں تھے۔ کریگ ہوشن اور بن زیان نے اپنے خفیہ لڑاکا گروپ تشکیل دے دیے تھے اور انہیں تبت روانہ کر دیا گیا تھا۔ یہ ظاہر یہ لوگ سکیورٹی کے لیے انتظامات کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے اور خیر سگالی کے جذبات کا بھی اظہار کر رہے تھے کہ ہز ہائی ٹس مراد کو گالان کی پہاڑیوں میں شفا مل جائے۔

روشن دنیا والے آستین کے سانپوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ماروی اور دانش کو بھی پورا احساس تھا ان خدشات کا، جو ان کو اور ان کے بابا جانی کو لاحق تھے۔ ادھر ماسٹر کو بوبو نے بھی اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے، ماسٹر --- سٹریٹکٹ اور ریڈ الرٹ بھی ان کی ایک ہی کال پر ماروی اور دانش کی حفاظت کے لیے دوڑی چلی آئی تھیں، دنیا کے جس علاقے میں مراد وغیرہ کو ان کی ضرورت پڑتی، یہ دوڑی چلی

یہ جیب باہر بالکل تیار کھڑی تھی۔ جیب کے ساتھ دو کاریں بھی تھیں، جس میں مسلح افراد کا ٹولہ مستعدی کے ساتھ موجود تھا۔ ماسٹر سنڈیکیٹ اور ریڈ الرٹ کی پوری فوج بھی اپنی چار عدد اپشنل گاڑیوں میں موجود تھی۔

یہ قافلہ گالان کی پہاڑیوں کی طرف سفر کی تیاری میں تھا۔ دانش اور ماروی، مراد کو لے کر سرکاری گیٹ ہاؤس سے نکلے تو ادھر اسنو کا منج میں کریگ ہوشن کے بھیجے ہوئے شوٹرز بھی فوراً حرکت میں آ گئے۔ دو نے لپک کر اس کھڑکی کے قریب آ کر پوزیشن سنبھال لی تھی، جدھر سرکاری گیٹ ہاؤس کا گیٹ تھا اور وہاں سے یہ دونوں بہن بھائی کچھ ہی دیر میں مراد کو لے کر باہر آنے والے تھے، جبکہ باقی اسٹاپر بہ دست شوٹرز اوپری منزل سے اس احاطے کو کور کرنے لگے تھے، جدھر سے ان کو گزر کر مراد سمیت اپنی جیب میں سوار ہونا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کسی وجہ سے مراد پہلے دو شوٹرز کی گولیوں سے بچ جاتا تو دوسری کھڑکی کی طرف پوزیشنیں سنبھالے ہوئے دو شوٹرز ان کا کام تمام کر ڈالتے۔ اگرچہ اس کے امکانات کم ہی تھے، تاہم احتیاطی طور پر یہ تدبیر کی گئی تھی۔

پہلے دو شوٹرز نے اپنی آنکھیں اسٹاپر کی ٹیلی اسکوپ کے ساتھ لگا دی تھیں۔ گراؤنگ پیش کرنے والے گول عدد سے میں گیٹ ہاؤس کا دروازہ نظر آ رہا تھا، جو بند تھا۔ جب کھلا تو اس کے اندر سے مراد برآمد ہوا، جو اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا۔ دانش ہمراہ تھا مگر بہن غائب تھی، انہیں اچنبھا تو ہوا مگر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی کہ ممکن ہے وہ کسی وجہ سے بعد میں برآمد ہو اور ابھی اس سنہری موقع کو ضائع تو نہیں کرنا چاہیے مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے دانش بھی غائب ہو چکا تھا۔ اب صرف دیگر بھی خواہ اسٹریچر کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔

مذکورہ دونوں شوٹرز نے اپنی سائیں تک روک کر اٹھیاں لیلی پر رکھ دیں اور ٹھیک اسی وقت جب وہ مراد کے سر کا نشانہ لے کر لیلی پر اپنی انگلی کو متحرک کرنے لگے تھے، ایک زوردار ہوا کا جھونکا کھڑکی سے اندر آیا اور ان کو ہلا دیا۔ وہ چونکے، ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک ایک جھٹکے سے دونوں دروازے اس قدر زوردار آواز میں بج کر بند ہوئے کہ دونوں شوٹرز کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ وہ اٹنے قدموں پلٹ کر لڑکھڑا گئے اور اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ مگر ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس طرح گر کر ان کے سینے پر آن لگی

پاس کی عمارتوں کا جائزہ لیا تو انہیں تھوڑی دور واقع وہ "اسنو کینج" دکھائی دے گیا۔ جہاں وہ چاروں شوٹرز نے شادی شدہ جوڑوں کی صورت میں فروکش تھے۔

اس سرکاری گیٹ ہاؤس کے دور قریب جتنے بھی لوگ رہائش پذیر تھے، دونوں بہن بھائیوں نے باری باری ان کے دماغوں میں جا کر یہ تسلی کر لی تھی کہ ان میں کوئی ان کے بابا جانی کا دشمن نہ تھا لیکن جب ماروی اور دانش نے اسنو کینج کے ان چاروں کمینوں (شوٹرز) کے دماغوں میں گھسنے کی کوشش کی تو انہیں ناکامی ہوئی۔

دونوں بہن بھائی ٹھنک گئے۔ انہیں اس بات کا یقینی حد تک شبہ ہو گیا کہ یہ چاروں ان کے بابا جانی کے دشمن ہی ہو سکتے ہیں اور ان کے دماغوں کو لاکڈ کر دیا گیا ہے۔

"ان دونوں کو فوراً سے پیسٹر موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔" دانش نے بہن کو مشورہ دیا، وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں بھائی! یہ دونوں تو بے چارے حکم کے غلام ہیں، انہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کس کو اور کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کو بے گناہ جان سے مارنے کے میں حق میں نہیں ہوں۔"

"مگر آپ! ان چاروں نے بابا جانی کو مارنے کا ناپاک عزم کر رکھا ہے۔" دانش بولا۔

"ٹھیک ہے، ہم دونوں ان کا راستہ کھوٹا تو کر سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ماروی اسے سمجھانے لگی اور دانش مطمئن ہو کے اپنے سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔ ماروی نے ماسٹر کو بو بو اور اپنے دیگر حفاظتی دستوں کو خطرات سے باخبر کر دیا۔ ماسٹر کے شوٹرز اور دیگر بھی خواہ فوراً حرکت میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ سب اس وقت گالان کی طرف سفر کی تیاری باندھ رہے تھے۔ تبت کے برف زاروں میں گالان کی پہاڑیوں کے اس دشوار گزار سفر کو پاٹنے کے لیے خصوصی سواری کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ ایک پانچ ہزار ہارس پاور کی چوڑے اور مخصوص اونچے ٹائروں والی ٹریلو پاور جیب تھی، جسے خاص برف پر چلنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں پانچ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی دو سٹین تو آ گئے تھیں، جبکہ درمیان میں لیٹنے کے لیے ایک برتھ نما اسٹریچر رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی، جس طرح ایمبولینس میں ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد تین افراد کے بیٹھنے کے لیے سٹین نصب کی گئی تھیں۔

تھیں کہ ان کی نالوں کا رخ ان کے چہروں کی طرف ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی خوف سے ہلکی بندھ گئی۔ وہ حلق کے بل چیخنے لگے۔ یہ شاخسانہ ماروی کا تھا، جو ان کے لاکڈ دماغ میں تو داخل نہیں ہو سکی تھی البتہ اپنے یقین کی حد تک شجے کے بل بوتے پر وہ ان کی نگرانی ضرور کر رہی تھی پھر ان کے عزائم کا پتا چلتے ہی اس نے ہوا کا ایک غضب ناک جھونکا بن کر ان کے ہوش اڑا دیے اور فرش بوس کر ڈالا تھا۔

وہ انہیں اسی طرح نظر آئے بغیر ہاتھ روم تک لے گئی اور وہاں لے جا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ دوسری کھڑکی کے پاس پوزیشنیں سنبھالے کھڑے باقی دو شوٹرز نے بھی اس شور شرابے کی آواز سن لی تھی وہ چونک کر اپنے ساتھیوں کی خبر لینے کو لپکے تو وہاں دانش ان کی ”خبر“ لینے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ ماروی ان کو نظر نہیں آ رہی تھی مگر دانش کی وہ جھلک دیکھ چکے تھے جو انہیں ایک نوعمر شرارتی بچے کی صورت میں دکھائی دیا تھا۔ وہ دونوں چیخ مار کر اس کی طرف دوڑے، وہ یہی سمجھے تھے کہ یہ کوئی شیطان بچہ تھا جو نہ جانے کیسے ان کے کالج میں گھس آیا تھا۔ ان دونوں نے جوش میں آ کر دروازے کو دھکا دینا چاہا۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ دروازہ ضرور باہر سے بند کر دیا گیا ہوگا، ان کے زوردار دھکے سے کھل جائے گا مگر وہ تو باہر سے پہلے ہی کھلا ہوا تھا، دونوں ہی اپنی جھونک میں دروازے سے ٹکرا کر باہر فرش پر آن گرے۔ گتیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں، پاس چھپے کھڑے دانش نے فوراً پھرتی سے لپک کر گتیں اٹھائیں۔ ایک تو اس نے پرے پھینک دی جبکہ دوسری اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر اس کی نال کا رخ ان دونوں کی طرف کر دیا۔

”خبردار.....! اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔“ دانش نے ان کو للکارا۔ دونوں متحیر ہوئے پھر پریشان۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ بچہ جان بوجھ کر ان کے ساتھ کوئی شرارت کر رہا ہے۔ لہذا سامھی شوٹر لڑکی نے اس کی طرف جارحانہ انداز میں قدم بڑھائے۔

”ٹھائیں.....“ گولی چلی اور شوٹر لڑکی کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور مارے تکلیف کے کراہنے لگی۔ اس کا مرد سامھی ہکا بکا رہ گیا۔ دانش جیسے نوعمر لڑکے کی یہ کارستانی دیکھ کر اسے شبہ ہونے لگا کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں اور مزید یہ کہ اس کا یہاں آنے کا کوئی مقصد ہے۔ وہ محتاط ہو گیا۔

”کون ہو تم اور میری ساتھی کو کیوں زخمی کیا ہے تم نے؟“ اس نے کڑک کے کہا تو دانش نے اپنی گن سے ایک اور فائر کر دیا۔ شوٹر مرد بھی حلق کے بل چیخ کر گر ا۔ اس کی بھی ایک ٹانگ گولی لگنے سے زخمی ہو گئی تھی۔ دانش پھر نہیں رکا۔ دروازہ کھول کر اس کمرے میں آ گیا جہاں اس کی بہن ماروی کھڑکی سے باہر ذرا دور گیٹ ہاؤس کی طرف نکلے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب اطمینان تھا۔ وہ ہولے سے زیر لب بڑبڑائی۔

”میرے پیارے بابا جانی! اللہ آپ کو جلد شفا عطا فرمائے..... آمین۔“

”آمین۔“ قریب کھڑے دانش کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔ ماروی اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی..... اس کے بعد دونوں وہاں سے غائب ہو کر اسٹریچر کے قریب حاضر ہو گئے۔

ادھر میرا دکھیں معلوم تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹے ٹوٹے رہ گئی تھی۔ اگرچہ اسے خود اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ دانش اور ماروی اسے جیپ میں سوار کروا کے روانہ ہو گئے۔ باقی گاڑیاں بھی ساتھ روانہ ہو گئیں۔

تحتی حکومت نے اپنی طرف سے بھی ان کی سکیورٹی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ سفر کئی گھنٹے جاری رہنے کے بعد ”لہاسا“ کے نواح میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے گالان کی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ وہاں سے یہ قافلہ دوسری سمت کو بڑھا اور دو ڈھائی گھنٹوں کے دشوار گزار سفر کے بعد گالان کے دامن میں اس مقام پر پہنچ کر رک گیا جہاں وہ غارتھا جو بابا صلاح الدین اجیری نے ماروی کو خواب میں دکھایا تھا۔ ماروی نے اس غار کا جائزہ لیا۔ دن کی روشنی میں بھی وہ غار اندر سے تاریک نظر آتا تھا۔

مراد کا اسٹریچر ابھی جیپ سے نہیں اتارا گیا تھا۔ پہلے ماروی خود اندر جا کر اس کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے اطمینان تھا کہ اس کے اندر بابا جانی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا کیونکہ بابا صلاح الدین صاحب کا دکھایا ہوا غار تھا لیکن پھر بھی ماروی پہلے خود اندر جا کر دیکھنا چاہتی تھی۔

ماروی کے ساتھ مین چابک دست خادم تیز لائیں لے کر اندر داخل ہو گئے مگر تینوں خادموں نے ابھی غار کے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے، انہیں یوں لگا جیسے ان کے جسم میں اچانک آگ بھڑک اٹھی ہو جبکہ ماروی بڑے آرام سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ خادموں کی اس حالت پر ماروی کو تو نہیں البتہ دیگر سب کو حیرت ہوئی

سنہری باتیں

☆ دعا کبھی بھی بیکار نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔

☆ آپ جنہیں بے وقوف سمجھ رہے ہیں، دراصل وہ آپ کی حرکتیں نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔

☆ جہاں جاؤ خوشیاں چھوڑ آؤ تاکہ لوگ تمہیں یاد رکھیں۔

☆ اہم ہونا خوب صورت ہے، خوب صورت ہونا اہم نہیں۔

☆ جس طرح کئی بادلوں میں پانی نہیں ہوتا اسی طرح بعض خوب صورت لوگوں میں خوب صورتی نہیں ہوتی۔

☆ ہر مشکل میں صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔

☆ زبان ایک ایسا درندہ ہے کہ اگر اس کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو عجب نہیں کہ تمہیں بھی پھاڑ کھائے۔

☆ انسان کی زبان دل کی ترجمان ہے اور چہرہ دل کا آئینہ ہے۔

☆ جس چیز کا علم نہیں اسے زبان سے مت کہو۔ جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو مت کرو۔ جو راستہ معلوم نہ ہو اس پر سفر مت کرو۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ایک زمانے میں مجلس قانون ساز کے رکن تھے۔ اسمبلی کا اجلاس شمال میں ہو رہا تھا۔ مولانا اس میں شرکت کی غرض سے شمال گئے تو خان بہادر پیرزادہ ذکاء اللہ خان کی کوٹھی میں قیام پذیر ہوئے۔ ایک دن پیرزادہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ ان کی تعریف میں بھی کچھ لکھ دیا جائے۔ مولانا نے فی البدیہہ ایک رباعی لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔

محو جمال سادہ ہوں سرشار بادہ ہوں
دونوں پہ حق میرا ہے کہ میں پیرزادہ ہوں
تہذیب مغربی کہ نہ ڈاڑھی ہے نہ مونچھ
صورت بتا رہی ہے کہ نہ ہوں نہ مادہ ہوں
مرسلہ۔ عبدالباقی رومی انصاری، چوہنگ، لاہور

تھی۔ سمجھ لیا گیا کہ اس کے اندر صرف ماروی اور مراد ہی جاسکتے تھے۔ حتیٰ کہ دانش نے بھی باپ کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش چاہی، تو اس کا پاؤں بھی جلنے کے قریب ہو گیا تھا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بہر کیف..... ماروی ہاتھ میں ایک طاقتور بیٹری ٹارچ لیے اندر چلی گئی۔

غار سیدھا نہیں تھا، بل کھاتا ہوا تھا۔ اس کی چھت بھی خاصی نیچی تھی، اس کی دیواروں اور محراب نما چھت سے برف، سورج کی روشنی میں پگھل کر بہتی ہوئی، جم کر یوں تاثر پیش کرنے لگی تھی جیسے تیز دھار نیزے اور بھالے نوک کے بل جھول رہے ہوں۔ ماروی ان سے بچتی بچاتی مختلف تنگ سے موڑ کاٹتی، تقریباً بیس پچیس قدم جلنے کے بعد رک گئی۔ یہاں غار ختم ہوتا تھا۔ سامنے برف کی دیوار تھی۔ غار کا فرش بھی گویا برف کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ماروی کو وہاں..... یہ ظاہر کوئی خاص قابل ذکر بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑی سوچنے لگی کہ بھلا یہاں بابا جانی کے لیے کون سی شفا رکھی گئی تھی؟ جبکہ یہاں تو کوئی موجود بھی نہیں ہے۔

بہر کیف..... وہ پلٹی اور غار سے باہر آ گئی۔ اس نے خادموں کو حکم دیا کہ جیب سے بابا جانی کا اسٹریچر اتارا جائے۔

ایک بار پھر خدام ڈرتے ڈرتے اسٹریچر اٹھا کر غار سے اندر لے جانے لگے تو ان کی دوبارہ وہی حالت ہوئی۔ اب پریشانی ہو گئی کہ کیا ماروی کو اکیلے ہی اپنے بابا جانی کا اسٹریچر اٹھا کر اندر لے جانا پڑے گا؟ یہی کرنا پڑتا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بالآخر ماروی نے اکیلے ہی باپ کا اسٹریچر سنبھال لیا اور اسے ٹھسٹی ہوئی اندر لے گئی۔ یہاں تک کہ وہ ہانپ گئی اور غار کے انتہائی سرے پر پہنچ کر رک گئی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آیا ادھر ہی ڈیرا ڈال کر باپ کے پاس غار میں تارک الدنیا ہو کر بیٹھ رہے؟ ماروی ابھی اسی شش و پنج کا شکار تھی کہ اچانک غار میں ایک شناساسی پرجلالی آواز ابھری۔

”واپس پلٹ جاؤ.....“

بابا صلاح الدین کی آواز پہچان کر ماروی مطمئن ہو کر پلٹی اور جب غار کے دہانے سے باہر نکلی تو بری طرح ٹھنک کر رک گئی.....

☆☆☆

لاما کیٹورا کا کی ہدایت پر اس کے جاسوسوں نے فوراً عمل کیا تھا۔ وہ دور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے

تھے۔ ایک مختصر قافلہ جو بڑی بڑی بھاری گاڑیوں پر مشتمل تھا، آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ محدود فاصلے سے ان کا تعاقب کرتے ہوئے گالان کے مطلوبہ غار تک پہنچے تھے۔ گویا اب لاما کیثوراکا کے جاسوسوں نے مراد کے قافلے کا تعاقب کر کے اپنا مقصد پالیا تھا۔

دونوں جاسوسوں نے لاما کیثوراکا کے کانوں تک جیسے ہی یہ بات پہنچائی، وہ ایک بار اسی شان سے اپنی پاک گاڑی لیے روانہ ہو گیا۔ اس غار کی نشاندہی کرنے کے لیے دونوں جاسوس بھی ساتھ تھے جو اوپر والے حصے میں ایک بڑے سے چوٹی تختے پر بوڑھے تبتی کوچبان کے ساتھ بیٹھے تھے۔

پاک گاڑی کے مخصوص پیسے برف پر پھسلے جا رہے تھے اور وہ دوڑ رہی تھی۔ لاما کیثوراکا اپنی نشست گاہ والے حصے میں براجمان تھا اور کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے ویران برف زاروں کا نظارہ کرنے میں محو تھا۔ اس کے چہرے سے جوش مترشح تھا۔

جلد ہی پاک گاڑی ان دونوں جاسوسوں کی نشاندہی پر اس مقام کے قریب جا پہنچی جہاں وہ غار تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں نظر آ رہا تھا، یہ سب گاڑی سے نیچے اترے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ غار انہیں دکھائی نہیں دیا۔ لاما کیثوراکا نے غصے سے ان دونوں جاسوسوں کی طرف دیکھا اور قہر بار لہجے میں ان سے بولا۔
”بدبختو! ادھر تو مجھے کوئی غار دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

دونوں جاسوس بری طرح پریشان اور شپٹائے ہوئے تھے۔ وہ حواس باختہ سے انداز میں گرد و پیش پر نظر ڈالنے لگے مگر انہیں وہاں کوئی غار نظر نہیں آیا۔ انہوں نے اچھی طرح آس پاس گھوم پھر کر بھی دیکھ لیا مگر وہ غار نہیں ملا۔

”کہیں تم دونوں کو کوئی مغالطہ تو نہیں ہوا ہے؟“ لاما کیثوراکا نے ان دونوں جاسوسوں کی طرف گھور کر پوچھا۔
دونوں نفی میں اپنا سر ہلا کر جوابا بولے۔

”ہرگز نہیں، ہم دھوکا کھا سکتے ہیں نہ ہی کوئی غلطی کر سکتے ہیں، وہ غار اسی مقام پر تھا۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے ماروی کو اپنے باپ کا اسٹریچر اندر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

دونوں جاسوسوں کے یقین بھرے لہجے نے لاما کیثوراکا کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اپنے کام میں ماہر تھے اور آج تک

انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ تیزی سے پاک گاڑی میں سوار ہوا اور کرسٹل ہال کے سامنے آ بیٹھا۔ زیر لب کچھ بڑھ کر ہال پر پھونکا اور تب ہی وہاں ماتوراما کا چہرہ متحرک نظر آنے لگا۔

”گریٹ مدر! وہ غار مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ حالانکہ میں ٹھیک اسی مقام پر اس وقت موجود ہوں۔ کیا اس میں کوئی روشن دنیا والوں کی کرامت ہے؟“ اس نے ماں سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں پہلی بار بے بسی کی جھلک ہوید اٹھی۔

”تو ٹھیک سمجھا ہے فرزند!“ بالآخر ماتوراما نے جواب دیا۔ ”وہ غار دشمنوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ وہ اب کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔“

اس کی بات پر کیثوراکا پریشان ہو گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔

”لیکن گریٹ مدر! میں پھر کس طرح ان دونوں آفت کے پرکالے بہن بھائیوں کا یہ منصوبہ ناکامی سے دوچار کر سکتا ہوں؟“

”جھلیس سے رابطہ کرو۔ اس کے پاس اس کا ضرور کوئی حل موجود ہوگا۔“

جھلیس سے رابطے کے لیے لاما کیثوراکا کو پہلے کاہن سے بات کرنا پڑتی تھی۔ اگرچہ اس کی جھلیس سے براہ راست پہلی بار گفتگو ہونے والی تھی۔ ٹیلی فون پر وہ ہامی تارا سے بولا۔

”مجھے اسی وقت معظم جھلیس سے بات کرنی ہے۔“
”کس سلسلے میں؟“ ہامی تارا نے پوچھا۔ لاما کیثوراکا کو اس کا انداز پسند نہ آیا۔ وہ بھی خود کو گم نہیں سمجھتا تھا اس لیے دانت پیس کر بولا۔

”میں نے ان سے اسی سلسلے میں بات کرنی ہے، جس کے لیے معظم جھلیس نے تمہیں میری طرف بھیجا تھا۔“
ہامی تارا نے بھی کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی مسئلہ ہوا ہے تو مجھے کہہ دو، میں ان سے بات کر کے تمہیں بتا دوں گی۔ وہ براہ راست ابھی باہر کی دنیا کے کسی فرد سے بات نہیں کرتے۔“

لاما کیثوراکا کو جھلیس کی اس سرچڑھی ہامی تارا کا یہ جواب انتہائی ناگوار گزرا۔ اس نے مزید کچھ کہے بغیر غصے کے اظہار کے طور پر رابطہ ہی منقطع کر دیا اور غصے سے بھناتا ہوا ساتھیوں کو واپس معبد کی طرف چلنے کا کہا۔

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

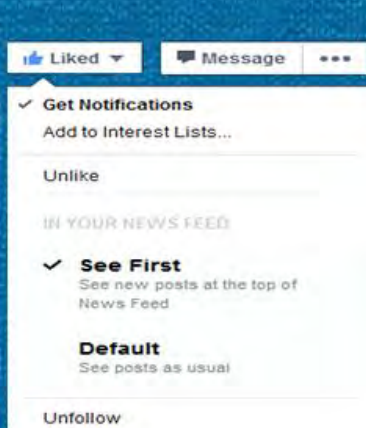
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



میں اپنے سیکرٹ ایجنٹ پھوڑ رکھے تھے مگر ابھی تک کوئی ایسی خبر ان تک نہیں پہنچی تھی جس پر یہ لوگ مل کر جشن مناتے۔
 ”فکر مت کرو بن زیان! اچھی خبر جلد ہی سننے کو ملے گی۔“ کریگ ہوشن نے بن زیان سے اذراہ قشقی کہا۔
 ”تاریک دنیا والوں نے ارض اسلام کے اس حکمران کی موت کا تبت کے ان ویران برف زاروں میں پکا بندوبست کر رکھا ہے۔“

”لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ وہ لوگ اپنے کسی روحانی پیش رو کے اشارے پر وہاں گئے ہیں۔“ بن زیان نے کہا۔
 ”تاریک دنیا والے روشن چہروں کے ساتھ ہی دھوکا دیتے ہیں، عابی کی مثال کیوں بھول رہے ہو تم؟ شیطانی طاقتوں نے اسے دھول کر ڈالا۔“ کریگ ہوشن نے یاد دلایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں جتنا نظر آتا تھا۔ آگے بولا۔ ”تم دیکھتے جاؤ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ کالی دنیا کی ناپاک گہرائیوں سے ابھرنے والے اس مہاشیطان جہلیس نے لگتا ہے باپ سمیت اس کی بیٹی ماروی کو بھی قتل کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور وہ لامحدود مہا کالی شکتیوں کا مالک ہے۔“
 بن زیان کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

کریگ ہوشن فتح سے پہلے، فتح کے جشن سے چور ہو رہا تھا اور پینے پلانے میں مگن تھا کہ اچانک ملنے والی اطلاع نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ وہ اطلاع اس کے بھیجے ہوئے ماہر اور انتہائی تربیت یافتہ شوٹرز کی بری طرح ناکامی کی تھی۔ اسے اول تو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح خود کلامیہ انداز میں چیخ کر بولا۔

”ناممکن..... ی..... ی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مراد..... ان حالات میں آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سب اس وقت مراد کی بیماری میں الجھے ہوئے تھے۔ میں ابھی پتا کرتا ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

وہ پاگل پن کی حد تک پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اپنے ان چاروں ماہر شوٹرز پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے ٹیلی فوننگی جاننے والوں کے ذریعے پتا چلا لیا کہ یہ کارستانی ماروی کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔

تاہم اس نے اسی وقت مختلف بجیس میں، تبت روانہ کیے ہوئے اپنے کچھ سیکرٹ ایجنٹوں سے رابطہ کیا اور مراد وغیرہ سے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ مراد کو گالان کے اس مطلوبہ پہاڑی غارتگ لے جانے کا منصوبہ کامیاب ہو چکا ہے اور اب صرف وہاں سے

ماروی سامنے کا منظر دیکھ کر چوکی تھی۔

یہ غار کے باہر کا وہ منظر ہرگز نہیں لگتا تھا، جہاں ان کے ساتھی اور جاں نثار گاڑیوں میں موجود تھے، بلکہ یہاں تو کوئی ذی نفس تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تب ہی اچانک ماروی کی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر تھا جو اسے خاص مواقع پر مگر کبھی بھی صرف اسے ہی نظر آتا تھا۔ وہ بابا صلاح الدین اجیری کی درگاہ کا منظر تھا۔ اس نے دیکھا کہ بابا صاحب کے آستانے کے بالکل سامنے ایک اسٹریچر رکھا ہوا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی اسٹریچر تھا جس پر اس کے بابا جانی کو لایا گیا تھا مگر ایک بات تشویش کی حد تک چونکا دینے والی تھی کہ وہ اسٹریچر خالی تھا۔ وہاں اس کے بابا جانی کا لاغر وجود نظر نہیں آتا تھا۔ وہ حیران و پریشان سی ہوئی۔

”کیا ہوا آپنی.....! تم رک کیوں گئیں؟ آؤ نا، گاڑی میں بیٹھتے ہیں، ہماری واپسی کا انتظار ہو رہا ہے۔“ دانش نے ماروی کو اس طرح رکستے پا کر بڑی محبت سے کہا۔

”شاید ہمارے بابا جانی کی شفا انہی ویران برف زاروں میں لکھی گئی ہے اور..... ہمیں یہاں سے چلے جانے کا حکم ملا ہے۔“ دانش کا لہجہ ممکن اور افسردہ خاطر ہو رہا تھا۔
 ماروی کی باطنی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں، وہ ابھی اس کا بھائی دانش دیکھنے سے قاصر تھا وہ بہت دیر سے سے بھائی سے بولی۔

”بھائی.....! تم چلو، مجھے ادھر ہی رکنے کا حکم ملا ہے۔“ بہن کے میکا کی انداز گفتگو نے دانش کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا، بہن کی نگاہیں اسے کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز محسوس ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور جیب میں سوار ہو گیا۔ ماروی اب کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

کریگ ہوشن اور بن زیان بڑی بے چینی کے ساتھ اس خبر کے منتظر تھے جو انہیں مراد کی ہلاکت اور اس کے صاحب فراش حالت میں بے خانماں و بربادی سے متعلق ملنے والی تھی۔ وہ خود ایک دوسرے سے بار بار ٹیلی فونک رابطوں کے ذریعے اس سلسلے میں پوچھ رہے تھے۔

کریگ ہوشن تو کسی حد تک مطمئن تھا مگر بن زیان خاصا فکر مند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر مراد نہیں مرا اور بھلا چنگا ہو گیا تو اس کی اپنی شامت بھی دور نہیں۔

سپر پاور اور یہودی تنظیموں نے اس خبر کے انتظار

درخواست تھی اس کی کہ وہ مدد کا خواہاں تھا، میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنے مشن میں بری طرح ناکام ہو گیا ہے۔ اس نے بھی غصے سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

”ناکامی کی صورت میں وہ اور کربھی کیا سکتا ہے۔“ جلیس نے متکبر انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ بالکل بے کار نہیں ہوا ہے۔ روشن دنیا کے جتنے بھی دشمن ہیں وہ سب ہمارے دوست ہیں۔ تم اسی وقت اس کے معبد خانے میں جا کر اسے مناؤ اور اسے میرا ایک راہنما پیغام بھی پہنچاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے جلیس نے اسے کچھ بتایا اور ہامی تارا اسی وقت لاما کیسوراکا کے معبد خانے میں ایک خوب صورت داسی بن کر جا پہنچی۔ اس بار وہ اس کے دباغ کے ذریعے داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بھی ظاہر ہے کہ جلیس کی نئی ہدایات کا دخل تھا۔

لاما کیسوراکا سے اس نے اپنا تعارف کروایا تو وہ پہلے تو بھڑک اٹھا مگر پھر کچھ سمجھ کر دھیمہ پڑ گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر حلقی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”تمہارا معظم جلیس کیسا دوست ہے ہمارا؟ ہم سے بات تک کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور جب خود ہم سے اس نے بات کرنا ہو تو بڑے دھڑلے سے تمہیں زبردستی ہمارے دماغ میں پہنچا دیتا ہے تو کبھی داسی کے روپ میں سیدھا ہمارے معبد خانے میں بھیج دیتا ہے۔“

ہامی تارا..... جیسا کہ مذکور ہوا جلیس نے روپ بدلنے کی صلاحیت دے رکھی تھی اور وہ اس وقت اپنے اصل روپ کے بجائے ایک خوب صورت تبتی پہاڑی دوشیزہ کے روپ میں وہاں آئی ہوئی تھی۔ ایک دلنشین مسکراہٹ سے بولی۔

”جلیس معظم کا یہی طریقہ کار ہے مگر وہ اپنے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ہاں اگر تم واقعی ناراض ہو تو پھر میں واپس چلی جاتی ہوں۔“ ہامی تارا نے آخر میں مکاری سے کہا تو کیسوراکا منہ بناتے ہوئے بولا۔

”اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے درحقیقت جلیس معظم سے مراد وغیرہ کے سلسلے میں ایک مدد لینا تھی۔ میرے جاسوسوں نے ان کا ٹھکانا ڈھونڈ نکالا تھا مگر میں وقت پر وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لگتا تو یہی ہے کہ ہمارے مقابلے میں روشن دنیا والوں کا علم زیادہ طاقت ور ہے۔“ اس نے آخر میں جلیس کی محبوبہ کو جوش دلا یا تو وہ بولی۔

”ایسی بات ہرگز نہیں ہے، جنگ میں کبھی جیت تو کبھی

دانش واپس سرکاری گیسٹ ہاؤس میں لوٹ آیا ہے۔ تاہم وہ خاصا افسردہ دکھائی دیتا ہے مگر مایوس نہیں ہے۔

کریگ ہوشن کو کچھ تسلی ہوئی، اس لیے نہیں کہ مرادکا بیٹا دانش اسے بہ غرض شفا گالان کے غارتک پہنچانے میں کامیاب ہو چکا تھا بلکہ اس بات پر وہ قدرے مطمئن اور... خوش نظر آ رہا تھا کہ وہ جلیس کی چال میں آچکا تھا۔

کریگ ہوشن کی اس خوش فہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روشن دنیا والوں کے روحانی پیش رو بابا صلاح الدین اجمیری کا آستانہ ہندوستان میں تھا اور اس کے مطابق مراد کو شفا یابی کے سلسلے میں سب سے پہلے وہیں پر لے جانا چاہیے تھا مگر دور دراز تبت جیسے خطہ برفاب میں مراد کو لے جانے میں اسے مراد کے دشمنوں ہی کی کارستانی لگتی تھی اور وہ اب خاموشی سے کسی ”خوش خبری“ جیسی اطلاع کا منتظر تھا مگر اپنے تربیت یافتہ شوٹرز کا انجم دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور اسے اب بن زیان کی یہ بات درست محسوس ہونے لگی تھی کہ مراد کو یقیناً اپنے روحانی پیش رو کے اشارے پر ہی تبت لے جایا گیا ہوگا اور اب وہ دن شاید دور نہیں جب مراد بھی اپنے بیٹے عالی کی طرح دوبارہ ”ون شن آرمی“ بن کر ابھرے گا اور ان سب کے بچے ادھیڑ کر رکھ دے گا کیونکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ اس بار مراد کی شفا یابی، اس کی روحانی قوتوں اور امداد فیزیکی کی تفویضات کا شمر ہوگی ورنہ مراد کی بیماری اور گالان کے اس دور دراز غار میں اسے لانے کا کیا بہانہ اور کیا راز تھا.....؟

وہ یہ سوچ کر بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے پورا ایک کمانڈو گروپ تشکیل دیا۔ یہ سات انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کا گروپ تھا جو یہودی آرمی ”ریڈ یاور“ سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں دو ٹیلی فون تھے جاننے والوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ یہ موسی گا اور رونڈا تھے۔ ان دونوں کو خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ماروی کو ٹارگٹ کریں۔

مذکورہ اقدامات اٹھانے کے بعد وہ کچھ مطمئن ہوا تھا۔

☆☆☆

تاریک دنیا کی منحوس گہرائیوں میں محبوب جلیس..... خاصا جھلایا ہوا تھا۔ لاما کیسوراکا اس کے لیے بے کار ثابت ہوا تھا۔ خود وہ کھل کے ابھی سامنے نہیں آنا چاہ رہا تھا پاتال میں بیٹھا ڈوری ہلا رہا تھا۔ اس کی محبوبہ ہامی تارا نے اسے بتایا تھا کہ لاما کیسوراکا نے اسے فون کیا تھا، وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ایک ہی

مات ہوتی رہتی ہے۔ میں تمہاری مدد کو ہی آئی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ روشن دنیا والوں کی ایک بڑی روحانی طاقت مدد کر رہی ہے مگر میں بھی دھوکا فریب دینے کی پوری صلاحیت حاصل ہے۔ میں ابھی جا رہی ہوں۔ تم میرا انتظار کرو اور کسی جلد بازی کا مظاہرہ مت کرنا ورنہ مایہ جاکے۔“ وہ یہ کہہ کر لوٹ گئی۔

بات واضح تھی جو لاما کیثورا کا کی سمجھ میں آتی تھی، اسی لیے وہ خوش اور مطمئن تھا کہ تھلیس اس کی مدد میں پیش پیش تھا۔

کالی دنیا والے اس مختص و مقدس کیے گئے غار کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، جس میں مراد کے بیمار وجود کو ایک خاص عرصے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ لاما کیثورا کا اور دیگر دشمن غار کے اندر داخل ہو سکتے تھے مگر اسے تلاش کرنا ان کے بس کی تو کیا سردست کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

ہامی تارا دانش کے پاس سرکاری گیسٹ ہاؤس جا پہنچی۔ وہ اس وقت رات کو سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ماحول میں خواب ناکی کا اثر غالب تھا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔

ہامی تارا نے پہلے ایک خادمہ کے روپ میں کھانے کے دوران اسے کوئی نشہ آور شے پلا دی اور پھر جب وہ اپنے نرم گرم آرام دہ بستر پر جا کر لیٹا تو اسے بے چین سی نیند محسوس ہونے لگی۔ بے چین اس لیے کہ وہ گہری نیند نہیں سو پارہا تھا، بس نیم غنودہ سا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور باقی اندھیرے کا راج تھا۔

ہامی تارا نے اس کی ماں لارا کا بہروپ بدلا اور پھر اس کے بیڈ کے بالکل قریب آگئی۔ یہی نہیں وہ اس کے بیڈ پر، اس کے بالکل پاس بیٹھ گئی پھر اس پر جھکی اور دھیرے دھیرے دانش کی پیشانی اور اس کے سر کے بال سبلانے لگی، پھر اپنا نرم و نازک ہاتھ اور مخروطی انگلیاں اس کے سینے پر پھیرنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب دانش نے اپنی نیم باز سی نیند سے بوجھل آنکھیں داکیں اور اسے اپنے سامنے ماں کا مہربان چہرہ دکھائی دیا۔ پہلے تو وہ غیر یقینی انداز میں اپنی آنکھیں بار بار جھپکاتے لگا۔ اس کے بعد بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”مام! کک..... کیا یہ واقعی تم ہی ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟“

تب ہامی تارا نے اس کی ماں لارا کے روپ اور

آواز میں نہایت ہی ملاحت آمیزی اور متا بھرے لہجے میں کہا۔

”میرے بچے! کیا تم چاہتے ہو کہ یہ خواب ٹوٹ جائے؟“

”نہیں مام! میں چاہتا ہوں تم اسی طرح میرے پاس..... میرے قریب بیٹھی رہو..... مگر.....“ وہ اٹکنے لگا تو ہامی تارا مکاری سے بولی۔

”تو پھر بس! اسی طرح لیٹے رہو اور مجھ سے باتیں کرتے رہو۔“ ہامی تارا نے اسی محبت سے کہا جو دانش اپنے وجود میں بھی اس کے لیے محسوس کر رہا تھا۔

”آپ شیطان کی پوجا چھوڑ دیں نا..... مام! تاکہ ہمارے بیٹے، ایک ماں بیٹے کے بیچ..... بار بار اس طویل جدائی کا خاتمہ ہو سکے۔“ دانش نے رسائی سے کہا، وہ کچھ متا کے جذبات کی پیاس اور کچھ دوا کے زیر اثر نیم غنودہ سی آواز میں بولا۔

”شیطان اور اس کے چیلوں کو فنا ہے، مگر اللہ جل شانہ واحد ہستی ہے جو سدا قائم رہنے والی ذات ہے۔ صرف اسی وحدہ لا شریک کی بندگی میں پناہ ہے۔“

ہامی تارا کو دانش کی یہ بات بری طرح کھلی تھی مگر اس نے لارا جیسا متا بھر ابرتاؤ اپنائے رکھنا تھا، بولی۔

”میرے بچے! کتنی بار تجھ سے کہا ہے، ایسا میرے لیے ممکن نہیں۔ تو ہی نہیں تیری بہن ماروی بھی مجھے کئی بار یہ سب کہہ چکی ہے۔ میں شیطان معظّم اور کالی طاقتوں کی پوجا نہیں چھوڑ سکتی۔ بس ایک وعدہ کرو اگر تم چاہتے ہو یہ سلسلہ چلتا رہے، اسے راز میں رکھنا کہ میں تم سے ملنے آتی ہوں، ورنہ یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔“ مکار اور چلترا باز ہامی تارا نے ماں (لارا) کے روپ میں دانش کو جذبہ بانی بلیک میل کیا، کیونکہ وہ اس کی بہن ماروی سے خائف تھی۔

دانش نے وعدہ کیا مگر یہ بھی کہا۔ ”مام! میں آپ کی کونہ بھی بتاؤں کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں، تو پھر بھی اسے پتا چل جائے گا کہ کچھ ہوا ہے۔“

اس کی بات سن کر ہامی تارا اپنی نصف کامیابی پر نہال ہو گئی کہ دانش اب اس بیچ پر سوچنے لگا ہے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اپنی ماں کے لیے اب بھی کس قدر محبت تھی، اسی سبب تو لارا اب تک نورانی طاقتوں کے عذاب سے بچی ہوئی تھی، ورنہ کب کی فنا کے گھاٹ اتاری جاتی۔ دانش ہی تھا، جس کی وجہ سے نیک دنیا

چاہے تمہیں.....؟“

ہامی تارا اپنی تعریف پر نہال ہو گئی۔ رقص کے انداز کا ایک اسٹیپ دکھا کر جملیس سے اک ادا کے ساتھ بولی۔
”مُعظم جملیس! اس کنڈل داسی کے لیے آپ کی تعریف ہی انعام ہے، بس! مجھے آپ خود سے دور مت کیجیے گا، آپ کا دل بھاتے رہنا ہی میری خوشی ہے اور یوں بھی یہ ساری شیطانی عقل و خرد آپ ہی کی تو دین ہے۔“

”ہم نے تو اپنے دوستوں کو آج تک خود سے دور نہیں کیا ہے تو پھر بھلا تمہیں کیوں دور کریں گے۔ تم ہمارے معبد کی خاص الخاص کمینوں میں سے ہو لیکن ہم نے تمہارے دل میں ابھرنے والی خفیہ خواہش کو پڑھ لیا ہے۔ آج سے تم عذر باد کے لیے اور وہ تمہارے لیے آزاد ہے اس کے ساتھ رہو اور مجھ سے تم دونوں جو مانگتے رہو وہ تمہیں بلاتا خیر ملتا رہے گا۔ جاؤ..... دونوں مل کر دشمنوں کی تباہی کا جشن مناؤ۔“

ہامی تارا فوراً عذر باد کے پاس حاضر ہوئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا مگر ہامی تارا کی نشاط انگیز قربت کے سمندر میں وہ بھی ڈوب گیا، جب طوفان بدتمیزی تھا تو ہامی تارا نے اپنے نئے ”چلتر“ کی کامیابی اور جملیس کی ”عنایت“ سے اسے آگاہ کر دیا۔

ہامی تارا کا خیال تھا کہ عذر باد یہ سن کر اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لے گا مگر وہ اس کے بالکل برعکس۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ ہامی تارا کے گال پر جڑ دیا۔ وہ ہک بک سی، اسے تکتی رہ گئی..... منہ سے کچھ برآمد ہی نہ ہو سکا۔ غیر متوقع صورت حال میں بھی انسان کو اس طرح کا سکتہ ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں رہتا ہے مگر رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔

”یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی ہے، نادان عورت؟“ عذر باد غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ہامی تارا کے حسن و شباب کا سارا نشہ ہرن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ آگے بولا۔
”تم نے میری ساری پلاننگ برباد کر دی، مجھ سے مشورہ تو کر لیا ہوتا یہ کرنے سے پہلے..... بس! مُعظم جملیس کے سامنے تم ہر وقت نمبر بنانے کے چکروں میں رہتی ہو۔“
”لل..... لیکن مُعظم جملیس..... نے تو مجھے اس کام پر انعام.....“

”شٹ اپ۔“ عذر باد چیخا۔
”تم نہیں جانتی ہو کہ میں نے ریاست ارض اسلام کے قلعے کی مضبوطی کو توڑنے کے لیے راجہ ہاروشی کے ساتھ

والوں نے لارا کو ڈھیل دے رکھی تھی، اس امید پر بھی کہ شاید وہ راہ راست پر آجائے۔ بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر ہی سہی..... مگر یہاں کالی طاقتیں، دانش کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھیں۔

ہامی تارا متا بھرے انداز میں دانش کی ایک بار پھر پیشانی چوم کر محبت سے بولی۔

”تم اجازت دو تو میں تمہارے دماغ کو ماروی کی طرف سے لاکنڈ کر ڈالوں؟ پھر وہ تمہارے اور میرے بیچ ان ملاقاتوں کا کبھی سراغ نہیں لگا سکے گی۔“ اس کی بات پر دانش سوچ میں پڑ گیا۔ دوا کے زیر اثر وہ زیادہ گہرائی سے نہ سوچ پایا اور فوراً سر ہلا کر اثباتی جنبش دی اور اپنی آنکھیں موند کر ڈھکن اور دماغ کو خالی چھوڑ دیا۔ دانش کے جس خائنائے نہاں میں ہامی تارا ہمیشہ کے لیے قبضہ جمانا چاہتی تھی، وہ اسے حاصل ہو گیا تھا۔

دانش اس کے قبضہ گرفت میں آچکا تھا۔ وہ اپنی اس بڑی کامیابی پر مسرور تھی، اسی وقت اپنی تاریک دنیا کی شیطانی عبادت گاہ میں پہنچی اور جملیس کے سامنے بڑے تقاضے کے ساتھ دوزانو ہوئی۔

”اے پاتال کی منحوس گہرائیوں اور ارض و سما کے درمیان بھٹکے ہوئے ہولناک خلاؤں کے شہنشاہ مندوب شیطان، مُعظم جملیس.....! تمہاری یہ ادنیٰ کنڈل داسی نے آج ایک بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے میں نیک دنیا کے ایک اہم باسی اور فرماں روا ارض اسلام دانش پر پوری طرح قابض ہو چکی ہوں۔“

شیطانی مجسمے کے اندر حرکت پیدا ہوئی اور پھر جیسے کسی ہنراد کی طرح ایک اور مجسمہ تجلیلی انداز میں نکل کر پہلے والے مجسمے کے ساتھ استادہ ہو گیا اور تب ہی اس کی وہی مکروہ شکل و صورت بن گئی۔

جملیس..... اب اپنی اصل شکل میں تھا۔ اس کے مونے اور بھدے ہونٹوں پہ بدہیت سی مسکراہٹ تھی۔ وہ توصیفی لہجے میں اپنی محبوبہ نما چٹیلی سے بولا۔

”تم نے واقعی ایک ایسے وقت میں اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جب ریاست ارض اسلام ایک انتہائی نازک وقت سے گزر رہا ہے۔ ابھی نیک دنیا کے باسی اپنے فرماں روا عابی کی موت کا غم نہیں بھولے تھے کہ ان کے حکمران کی علالت ناگہانی کا انہیں زخم سہنا پڑا، ایسے میں اب ان کے آخری فرماں روا..... دانش کو بھی تم نے اپنے شیطانی سحر میں جکڑ کر دشمنوں کو تہری چوٹ دی ہے۔ بولو..... کیا انعام

کیسا جامع اور گہرا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا اور مزید یہ کہ لارا اب میرے ایک شیطانی عمل کے زیر اثر ہے۔“

پھر اس نے اپنے منصوبے کی صراحت سے ہامی تارا کو آگاہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ وہ کس طرح کھلی گائنا کی خفیہ رہائش گاہ پہنچا تھا، جہاں لارا، زومی گائنا کی لاش والے کمرے میں ایک زندہ لاش کی مثل قید تھی اور راجر ہارڈی کی خواہش کے بدلے میں اس نے ایک معاہدہ طے کیا تھا کہ لارا سزا ہارڈی بنا دی جائے گی..... مگر اس کی ٹیلی پیٹھی کی صلاحیتوں کو وہ خود استعمال میں لائے گا، نیز لارا کو اپنا تابع بنا کر وہ اسے اس کے بیٹے دانش کو بلف کرنے کی سہی چاہے گا۔ وہ بیٹے سے یہی کہے گی کہ شیطان سے تابع ہو کر اب نیک زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ یوں دانش اسے (لارا کو) ارض اسلام کی عظیم یونیورسٹی میں لے جاتا اور لارا کے اندر رہتے ہوئے، عذر باد ارض اسلام میں ٹھکنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ خود سے اندر جانے سے قاصر ہے۔

”مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ دانش کیوں کر ماں کی اس بات پر اعتبار کر لے گا؟ اور پھر ماروی بھی تو ہے؟“

ہامی تارا نے اس کے یہ ظاہر بے داغ منصوبے میں سقم نکالنے کی کوشش چاہی تو اس پر وہ پھر دانت پیس کر بولا۔
”دل کرتا ہے اب ایک تھپڑ اور رسید کر دوں تمہیں..... تم یہ بتاؤ، تم جب اس کی ماں لارا کے گیس میں دانش کے پاس گئی تھیں تو اس نے تم پر کیسے اتنی جلدی بھروسہ کر لیا تھا؟ بے وقوف! دانش کا ماں کے لیے اور ماں کا اپنے بیٹے کے لیے دل دھڑکتا ہے یہی وجہ ہے کہ لارا اب تک مراد اور ماروی سمیت اپنے طاقت ور دشمنوں سے بچی ہوئی ہے، ورنہ کب کی ختم کی جا چکی ہوتی..... اور میں ماروی کو نہیں بھولا ہوا ہوں، اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم نے دوا کے ذریعے دانش کے ساتھ جو گل کھلانے کی کوشش کی ہے، وہ بھی بے کار ثابت ہوئی، اس لیے کہ ماروی کو شبہ ہو جائے گا کہ دانش کے پاس اس کی اصل ماں نہیں بلکہ ایک ”ڈمی مدر“ بھیجی گئی تھی۔ یوں دانش اور بھی محتاط ہو جائے گا۔ جبکہ میرے منصوبے میں کوئی سقم نہ تھا۔ لارا، اصل میں ہی لارا بن کے دانش کے پاس جائے گی، تاکہ ماروی بھی اسے دانش کی اصل ماں کی حیثیت سے اچھی طرح پہچان لے اور اس کی باتوں میں وہ بھی آجائے گی کہ لارا یہی کہے گی کہ

وہ اب تابع ہو چکی ہے۔“

ہامی تارا نے جب اپنے محبوب نمبر دو کی یہ بات سنی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تاہم وہ ایک موہوم سے احساس تلے کمزوری آواز میں بولی۔
”لیکن میں نے دانش ہی سے اجازت لے کر اس کا دماغ اس کی بہن ماروی کی طرف سے لاکھڑا کر دیا ہے، تاکہ وہ میرے بارے میں ماروی کو کوئی معلومات نہ دے سکے اور نہ ہی ماروی اس سے میرے متعلق کچھ جان سکے..... یوں بھی اگر..... میں غلطی پر تھی تو پھر معظم جہلیس نے مجھے انعام.....“

”یہ انعام کا پہاڑا بھول جاؤ اب بے وقوف عورت!“ عذر باد اس کی بات کا مٹے ہوئے بولا۔ ”جہلیس کے لیے ہمیشہ وہ سب باتیں حوصلہ افزا ہوتی ہیں، جن سے اس کے چیلے نیک انسانوں کو بھٹکاتے رہے ہیں، اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے شیطان کے اصولوں پر کار بند رہتے ہوئے ہی یہ سب کیا ہے۔ اس لیے وہ تمہاری حوصلہ افزائی کیسے نہیں کرے گا۔“

یہ سب سننے کے بعد ہامی تارا نے عذر باد کے پاؤں پکڑ لیے۔

”میرے محبوب! مجھے سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔ اب میں تمہارے مشورے اور تمہیں بتائے بغیر کوئی عمل نہیں کروں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔“ مگر عذر باد بری طرح بھنایا ہوا تھا، تب ہی جہلیس نے اس کے اندر آ کر کہا۔
”ہامی تارا کو معاف کر دو..... یہ غلطی پر ضرور تھی مگر اس نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ ہماری روش پہ چلی تھی، اس سے روگرداں تو نہیں ہوئی۔“ یہ کہہ کر جہلیس چلا گیا۔

عذر باد نے ایک گہری ہنکاری لی، وہ شیطان اور مندوب شیطان جہلیس کی ان منطقوں سے واقف تھا۔ اس نے جبکہ کر ہامی تارا کو تھام لیا اور اس کا ایک بھر پور بوسہ لے کر اسے معاف کر دیا اور ساتھ ہی مزید ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

شیطانی ادارے کا سربراہ..... ہارڈی، لارا کو پاکر بہت مسرور تھا۔ وہ تھی بھی اسی قدر حسین مگر اصل میں وہ اس کے شیطانی منصوبوں کی ایک پٹری تھی جس پر اس نے سفر کرنا تھا۔ اب اسے ایک ٹکٹ میں دو مزے مل رہے تھے، لارا کے پُر شباب بدن کی رعنائی اور اپنے شیطانی منصوبوں کی سہل پائی۔

عذر باد کے ساتھ اس نے جو معاہدہ کیا تھا، وہ اس پر

آئندہ بھی کاربند رہنا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے اسی کے مطابق لار کو عذر باد کے حوالے کیا اور اس نے اسے خیال خوانی کے ذریعے اپنا تابع بنا کر دانش کے پاس بھیج دیا۔

اب پتا نہیں لارا کی یہ اپنی ہی بد قسمتی تھی یا پھر خوش قسمتی کہ وہ اپنی ہی شیطانی قوتوں کے بیچ نہ صرف سینڈویچ بن چکی تھی، بلکہ کھلونا بھی.....

جس وقت وہ اپنے بیٹے دانش کے پاس بھیجی جانے والی تھی، اس سے کچھ دیر پہلے ماروی تبت کے بیچ بستہ ویرانے میں گالان کے غار کے اندر اپنے سامنے ایک مرگ چھالا سے بستر پر اپنے باپ مراد کو لیٹا دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کب تک یہاں بیٹھے رہنا تھا مگر اسے حکم تھا کہ وہ ادھر ہی رہے گی اور غار کے اندر قدم رکھنے اور رکنے کی صلاحیتیں صرف اسی کو تفویض کی گئی تھیں اس کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں رہ سکتا تھا، اگرچہ دانش کی بھی از حد خواہش یہی تھی کہ وہ بھی یہاں باپ اور بہن کے ساتھ اس وقت تک موجود رہے جب تک ان کی ریاضت شربا نہیں ہو جاتی اور ان کے باپ کو شفا نہیں مل جاتی لیکن دانش کو اس کی ممانعت تھی اسی لیے وہ..... لہذا اس کے گیسٹ ہاؤس میں واپس جانے پر مجبور تھا۔

ماروی کو اپنی روحانی طاقتوں کے بل بوتے پر اس بات کا علم تھا کہ یہاں برقاب ویرانے میں ان کا ایک طاقت ور دشمن لاما کیثورا کا موجود تھا اور وہ زبردست شیطانی قوتوں کا ہی مالک نہ تھا بلکہ اسے جہلیس کی آشیر باد بھی حاصل تھی۔ یہی نہیں عنقریب اور بھی دشمن یہاں کا رخ کرنے والے تھے، گویا اس کے باپ کی زندگی ہر طرف سے خطرے سے دوچار تھی۔ یہ تسلی اپنی جگہ کہ کالی طاقتوں والے اور ٹیلی پیتھی کے کوئی بھی ماہر دشمن اس غار تک نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن باوصف اس کے جانے کیوں اس کا دل گھبرانے لگا۔ حالانکہ وہ ایک بہادر لڑکی تھی اور آج تک کبھی دشمنوں سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ جب سے اپنے مرد آہن بھائی عالی کو مرتے دیکھا تھا، وہ اندر سے کچھ ٹوٹ چکی تھی، اگرچہ اپنے بھائی کی موت سے پہلے ہی اسے اپنی روحانی قوتوں سے کچھ ایسے اشارے ملے تھے کہ اب اس کا بھائی ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا ہے۔ مشیت ایزدی اسی میں تھی، وہ کیا کرتے؟ اب مشیت ایزدی کیا کہنے والی تھی، وہ نہیں جانتی تھی مگر اس نے غار میں رہتے ہوئے دن رات اللہ کے حضور عبادتیں

کی تھیں اور کر رہی تھی کہ اس کے باپ کی جان بچ جائے اور وہ دست قضا سے ہی نہیں، اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ رہیں۔ ایک امید تو قوی تھی جب اسے روحانی اشارہ ملا تھا کہ مراد کو گالان کے برف پوش علاقے میں لے جانا ہے، کیونکہ وہیں اس کی شفا رکھی ہوئی ہے مگر وہیں ایک مصلحت ایزدی بھی ہے، دنیا کو دکھانا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی پیارے کی جان بچانے کی خاطر کس طرح دور دراز کا سفر کرتا ہے مگر قضا وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔

”اے اللہ! ہمیں اور میرے باپ کو اس آزمائش سے بچانا.....“ ماروی گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگتی اور جب ہی اس نے بابا صلاح الدین اجیری کا تصور کیا تو اچانک خود بخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، شاید اسے کوئی خواب دکھایا جانے والا تھا اور وہ جب عالم خواب میں پہنچی تو اس نے دیکھا دو انسانی ہیولے جو بے ڈھنگے سے تھے، ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ لیے دندنا تے ہوئے غار کے اندر داخل.... ہوئے اور پھر انہوں نے اندھا دھند دونوں باپ بیٹی پر قاتلنگ کر دی، تب ہی ماروی چیخ مار کر بیدار ہو گئی۔

اس نے اپنے اس خواب پر غور کیا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ کوئی ایسا دشمن ہے جو اس غار کے اندر داخل ہونے کی سکت رکھتا ہے۔ وہ اس سے آگے زیادہ نہ سوچ سکی تھی کہ ایسا کیوں تھا؟ جبکہ کسی بھی دشمن کو گالان کے اس غار تک پہنچنے کی قدرت حاصل نہ تھی تو پھر ایسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ وہ مشیت ایزدی اور قدرتی حکمتوں کا ادراک کرنے لگی تھی۔ اس نے فوراً اس دشمن کے تدارک کا سوچنا شروع کر دیا اور اسی وقت غار سے باہر نکل آئی۔ جانتی تھی کہ وہ دو دشمن کہیں اریب قریب ہی تھے۔

اس وقت گالان غار کے باہر بیچ بستہ ویرانوں میں ٹھہرتی ہوئی شام اترنے لگی تھی۔ یہاں سے دور جنوب مشرقی سمت پر ایک اونچے بریلے پہاڑی چبوترے پر واقع کیثورا کا کی خانقاہ کا مخروطی مینار کسی واضح ناور کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اندر اپنے خاص کمرے میں وہ کرشل بال کے سامنے بیٹھا اپنی گریٹ مدر ماتوراما کے ساتھ جو گفتگو تھا۔

”گریٹ مام! یہ تیرے بیٹے کی کیسی بے بسی ہے کہ اس کا ایک بڑا دشمن یہاں موجود، موت وزیت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور میں بے بس ہوں۔ کیا میری طاقتوں میں، میری عبادتوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟ کیا میں نے ہمالیہ اور افریقا کے گھنے جنگلوں میں عظیم یوگوگا ما کی عبادتوں میں کوئی کمی کر دی ہے، جس کا ہمارا خاندان برسوں سے پجاری رہ چکا ہے؟ بتا گریٹ

بزدلانہ باتیں بے حوصلگی کا باعث بنتی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی کوئی بات سنی ہی نہ جائے۔“ لاما کیشور کا خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ اب میں جھلیس کے ساتھ برابری کی سطح پر بات کروں گا۔“

اسی وقت محرومی چھت والے اس معبد خانے میں کالے رنگ کے دھوئیں کا۔۔۔ بادل گردش کرنے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سر اٹھائے اس دھوئیں کو دیکھنے لگا جواب ایک عجیب شبیہ کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ یوں کہ سر منجھا، جسم موٹا بھدا، ناک موٹی اور آنکھوں کے بڑے بڑے ڈیلے باہر کو ابلے پڑے ہوئے۔ جسم پیٹ کے نیچے ٹانگوں سے عاری اور اس کی جگہ ایک دم بھی وہ کسی پھولے ہوئے ہیلیئم گیس کے غبارے کی طرح ادھر ادھر دیواروں سے سر پٹنار ہا۔ اس کے بعد وہ پرواز کرتا ہوا نیچے آیا اور لاما کیشور کا کے چہرے کے بالکل سامنے آکر مطلق ہو گیا۔

”پہچان لے مجھے میں جھلیس ہوں..... یوں! کیا مرضی ہے تیری؟ میرا کہنا مانے گا یا اپنی روش پہ قائم رہے گا۔“ لاما کیشور کا پہلے تو ڈرا لیکن پھر من ہی من میں کچھ بد بدانے کے بعد ذرا ہمت کر کے بولا۔

”میں برابری کی سطح پر اور ایک ہم پلہ دوست کی حیثیت سے تمہاری ماننے اور اپنی بات منوانے کے لیے تیار ہوں۔“

”ہم تمہارے ہی نہیں اپنے تمام دوستوں کے ساتھ برابری ہی کی سطح پر بات کرتے ہیں۔ تم دوست ہو اور رہو گے۔“ جھلیس نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا تو لاما کیشور کا کا سینہ ایک بار پھر غرور سے پھول گیا۔

”روشن دنیا کا پیر و کار اور ارض اسلام کا حکمراں..... مراد علی منگی اس وقت اپنی بیٹی ماروی کے ساتھ گالان کے غار میں موجود ہے، مگر افسوس تم ابھی وہاں تک کوئی رسائی بھی حاصل نہیں کر پائے ہو۔ ہم نے دیکھو اسے بیمار اور لاغر کر کے آدمی موت کے قریب پہنچا دیا۔“

”تم صحیح کہتے ہو.....“ لاما کیشور کا اعترافی لہجے میں بولا۔ ”لیکن میں مایوس نہیں ہوں، اسی کوشش میں ہوں کہ کسی طرح مجھے وہ غار نظر آ جائے۔“

”وہ غار کسی کو دکھائی نہیں دے گا اور ہمارا دشمن نمبر ایک وہاں شفا پاتا رہے گا اور ایک دن دوبارہ طاقت پکڑ کے ہمارے نیچے ادھیڑ دے گا۔ عابی کی موت کے بعد بھی اس کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے، اگرچہ بیٹے کی دائمی جدائی کا غم اسے اپنی جگہ ہے۔“

مام! میں کیا کروں؟ کیسے اپنی ناک کے نیچے موجود دشمن اور اس کی بیٹی کو موت و فنا کے گھاٹ اتاروں؟“

کرشل بال کے اندر اسی مکروہ صورت بڑھیا کا طوطے کی چونچ والے ناک کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں کی لکیریں دائیں۔ پھر اس کے پتلے پتلے بدہیت ہونٹ متحرک ہوئے اور ماتور اما کی خواہش سے بھرپور آواز ابھری۔

”فرزندار جہند! اس میں سارا تیرا قصور بھی نہیں ہے اور نہ ہی صرف تو ہی بے بس ہے۔ اس روئے زمین پر موجود ان روشن دنیا والوں کے سارے ہی دشمن بے بس ہیں، حتیٰ کہ تاریک دنیا کی کالی طاقتیں بھی مگر یہ سب عارضی بے بسی ہے اور وہ سب جانتے ہیں۔ حیرت ہے تجھے ابھی تک اس کا اور اک کیوں نہ ہو سکا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے شیطانی دنیا کے جھلیس کے ساتھ وہ خاطر خواہ رویہ اختیار نہیں کیا جس کا میں تجھے بار بار مشورہ بھی دیتی رہی تھی۔“

”جھلیس میرے سلسلے میں بہت مغروری برتا چلا آ رہا ہے گریٹ مدر!“ لاما کیشور کا نے شکایتی لہجے میں جواب دیا۔ ”حتیٰ کہ اس کے چیلے بھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔“

”وہ حق بجانب ہیں میرے فرزند کیشو!.....“

ماں نے کپکپاتے لہجے میں اعتراف کیا۔ ”اس لیے کہ اس کے جو بھی کرتوت ہوں گے ان کا فائدہ نہیں ہی ہوگا۔ تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے، میرے بچے! تمہیں جھلیس کے سامنے ہی نہیں بلکہ اس کے قریبی چیلوں کے سامنے بھی دوز انور ہتا ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو گریٹ مدر؟“ لاما کیشور کا کو اپنی ماں کی بات بری لگی اور وہ پُر غرور لہجے میں بولا۔

”ہم عظیم یوگوگاما کے نام لیوک اور پجاری ہیں، جس کے سامنے افریقا کی ایک دنیا جھکتی ہے۔“

”مگر شیطان کے سامنے یوگوگاما کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے میرے نادان بچے! افسوس کہ تم بھی اپنے باپ کی طرح ضدی اور مغرور ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم بھی اس کی طرح مارے نہ جاؤ۔“ اس کے لہجے میں خوف سما گیا۔

لاما کیشور کا نے ایک منتر پڑھا اور کرشل بال پر پھونک مار دی گریٹ مدر کا چہرہ غائب ہو گیا۔ وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سستی در سستی کے پاس آیا اور اسے نیچے پھینک دیا۔ کرشل بال بلندی سے گر اور کرہٹی کرہٹی ہو گیا۔

”ہوئے..... باپ صحیح کہتا تھا کہ تمہاری ماں کی

اٹھایا۔ اسی وقت خصوصی طور پر اپنی ”یاک گاڑی“ ان دونوں عام آدمیوں کی طرف بھجوا دی اور خود ان کا بے چینی سے منظر ہو کر بیٹھ رہا۔

وہ دو آدمی یہودی تنظیم کے دو نائب ایجنٹ موسیٰ گا اور رونڈا تھے، جنہیں خاص لہاسا کے راستے ماروی کو ٹارگٹ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مکار یہودی جانتے تھے کہ ان کے بڑے اور دشمن نمبر ایک مراد علی منگی کی اصل طاقت عالی، ماروی اور دانش ہیں، نیز اس کے بھی خواہ بھی۔ عالی کو ایک گہری اور گھناؤنی سازش کے تحت ختم کرا دیا گیا تھا۔ اب یہودیوں کا ٹارگٹ ماروی تھی۔

مخ بستہ سردی میں اس سرد جنم کی خوراک بننے کے لیے ان دونوں ایجنٹوں نے ابھی اس برف زار کی سرحد پار کی ہی تھی کہ لاما کیشوراکا کی یاک گاڑی انہیں لینے وہاں پہنچ گئی۔ یہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کا اندرونی ماحول گرم محسوس کرتے ہی، موسیٰ گا اور رونڈا کی جان میں جان آئی تو ان کے ہوش بھی ٹھکانے آئے۔

”یہ کس کی مدد پہنچی ہے؟ کیا تم واقف ہو؟“ موسیٰ گا نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ جواباً رونڈا نے اپنے سر کو فٹی میں حرکت دی اور اپنی گرم جیکٹ کی زپ کھولی تاکہ یاک گاڑی کے اندر کی غیر معمولی گرمی سے کاٹ وار ٹھنڈک کا اثر زائل کر سکے۔

”حیرت ہے..... اس سلسلے میں ہمیں کوئی بریفنگ نہیں دی گئی۔ ٹھہرو..... میں ابھی لاسکی رابطہ کر کے پوچھتا ہوں۔“

یہ کہہ کر موسیٰ گا نے اپنی گرم موٹی جیکٹ کے اندر سے ایک بڑا سا فونک ڈیوائس نکالا اور اپنے چیف کریگ ہوشن سے رابطہ کرنا چاہا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ شاید موسم کی خرابی اس کا سبب تھا یا پھر کوئی اور وجہ، تاہم اس نے رونڈا کو بتا دیا کہ کسی سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ لہذا اب کیا کیا جائے؟

”خاموشی سے جوہر رہا ہے ہونے دو..... یقیناً اس سواری کا بندوبست پہلے ہی سے ہمارے لیے کیا گیا ہوگا۔“ رونڈا نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ اس مہم سے کچھ بیزار بیزار سا ہو رہا تھا۔ تاہم اس کے مقابلے میں موسیٰ گا خاصا پر جوش اور پر امید نظر آتا تھا۔ تاہم وہ اپنے ساتھی ایجنٹ کے اس خیال سے متفق ہی تھا کہ یہاں اس دشوار گزار علاقے میں ان کی آسانیوں کا بندوبست کرنے والا انہی کا کوئی اپنا ساتھی گینگ ہو سکتا تھا۔

”گاڑی دیکھو کتنی شاندار ہے، یہ کوئی خاص ایجنٹ

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”ہم نے اس مشکل کا حل نکال لیا ہے کہ اس غار میں کوئی شیطانی طاقت یا نیلی چیتھی جاننے والا داخل ہو سکتا ہے نہ ہی اسے یہ نظر آ سکتا ہے۔“ جملیس نے کہا۔

”تو پھر.....؟“ لاما کیشوراکا نے کچھ امید بھری نظروں سے جملیس کی طرف دیکھا۔

”اتنی سی بات تھی اور اتنی سی بات ہی بسا اوقات بڑے سے بڑے عامل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ لفظوں پر ہم غور نہیں کرتے، تو غور کرو۔ اس مقدس غار میں کوئی شیطانی طاقت یا نیلی چیتھی جاننے والے کا داخلہ ممنوع ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی اوجھل رکھا گیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ صاف سی بات ہے، وہاں کوئی عام آدمی ہی داخل ہو سکتا ہے اور اسے ہی وہ غار نظر آ سکتا ہے۔“

”بڑی ہی عجیب بات ہے، اس سے زیادہ آسان بھی مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“ لاما کیشوراکا کے لہجے میں حیرتیں اٹھ رہی تھیں۔ ”عام آدمی سے اتنا بڑا دشمن ڈھیر ہو جائے گا؟ وہ بھی بڑی سیت جو خود بھی بد اسرار طاقتوں کی مالک ہے؟“

”روشن دنیا کی مصلحتیں سب کی سمجھ سے بالاتر ہوتی رہی ہیں۔“ جملیس گہرے لہجے میں بولا۔ ”وہیں شیطانی طاقتیں انہی مصلحتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ مراد کیا ہے۔ محض ایک عام سا آدمی، اس کی حقیقت جانو گے تو تمہیں اور بھی حیرت ہوگی کہ وہ ماضی میں ایک گدھا گاڑی چلانے والا غریب نوجوان تھا۔ اپنی ذات میں وہ اب بھی ویسا ہی ہے لیکن اس کے گرد ایسے ہی خواہوں کا ٹولہ جمع ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے وہ آج اس مقام پر ہے۔“

”تم آدمی کا ذکر کر رہے تھے، وہ کہاں سے دستیاب ہوں گے؟“ لاما کیشوراکا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”وہ آدمی عنقریب یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تمہیں ان کے ٹھکانے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنا ہوگی۔ وہ لہاسا سے اس برف زار میں داخل ہو چکے ہیں مگر موسم کی سختی ان کی برداشت سے باہر ہے، لہذا آپس کا غصہ چھوڑو اور اسی وقت انہیں یہاں لانے اور آگے کی حکمت عملی کا بندوبست کرو..... چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی جملیس اسی کالے دھوئیں کی صورت در تیجے سے باہر پرواز کر گیا۔

لاما کیشوراکا کو جملیس کی کچھ باتیں سمجھ آئیں، کچھ نہیں اور جتنی سمجھ آئیں اس کے تحت اس نے فوراً قدم

ساتھی لگتا ہے ہمارا....." رونڈا بولا۔ موسیٰ گانے بولے سے مسکرا کر محض اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پاک گاڑی کے ایک ٹک سے چوبارے سے باہر اس طرف جھانکا جہاں کو چبان بیٹھتا تھا۔ وہاں چوبی تختے پر اسے ایک بوڑھا متی بیٹھا نظر آیا جس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ اس نے سور کا گرم لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر سفید گھنی ڈاڑھی تھی اور مونچھیں اور بھوؤں کی بھی یہی حالت تھی، اس کا لباس بھی سرخ تھا۔

"اس پاک گاڑی کو سانتا کلانڈ ٹائپ کا کوئی بوڑھا چلا رہا ہے۔" موسیٰ گانے مسکرا کر کہا تو رونڈا بولا۔
"ذرا اس سے پوچھنا تو یہ ہے کون اور اسے کس نے ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے؟"

"ہے..... کون ہو تم؟ مہربان سانتا کلانڈ.....! تمہیں ہمارے کس مہربان ساتھی نے بھیجا ہے؟"

مگر موسیٰ کی خرابی اور شور کی وجہ سے آواز اس تک شاید نہیں پہنچی تھی۔ تاہم دونوں خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ادھر ماروی نے خیال خوانی کی پرواز کے ذریعے پتا چلا لیا تھا کہ اس مقدس غار میں جو دودھن داخل ہو کر ان باپ بیٹی پر حملہ کرنے کی سکت رکھتے تھے، وہ درحقیقت جیوش ریڈ آرمی کے شوٹرز تھے اور ایک پاک گاڑی میں لاما کیشوراکا کی میزبانی حاصل کرنے اس کے معبد خانے کی طرف گامزن تھے۔

اس نے فوراً اس کو چبان کے اندر قبضہ جمایا جس کا حلیہ سانتا کلانڈ جیسا تھا اور اسے پاک گاڑی..... لاما کیشوراکا کے معبد خانے کے بجائے اس کا رخ کسی اور جگہ موڑنے کا حکم دیا۔

لہا سا کے برف زار ویرانے کا یہ وہ علاقہ تھا جہاں بھوکے اور خونخوار برفانی بھیڑیوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ وہاں پہنچ کر برفانی بھیڑیوں کے غول کے غول ان کی پاک گاڑی کے پیچھے چیتنے غراتے دوڑ پڑے۔ پاک بری طرح بد کے اور بے قابو ہو کر دوڑ پڑے۔ پاک گاڑی کو زبردست جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ اس صورت حال پر اندر بیٹھے موسیٰ گا اور رونڈا چونک پڑے..... انہوں نے جو سر باہر نکال کر جھانکا تو دہل گئے۔ بھوکے، خونخوار بھیڑیوں کے ایک نہیں بلکہ غول کے غول چیتنے غراتے ہوئے ان کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے۔

کو چبان کے روپ میں ماروی نے ایک اور چال اس وقت چلی جب موسیٰ گانے چیخ کر اس سے کہا۔

"اوائے پاگل بڑھے ایہ تو ہمیں کدھر بھیڑیوں کے علاقے میں لے آیا ہے؟"

"ہا..... ہا..... یہ لاما کیشوراکا کا حکم تھا کہ تم دونوں کو یہاں ان بھوکے اور خونخوار بھیڑیوں کی خوراک بنادیا جائے۔"

"سن آف! تمہیں پتا نہیں اس طرح تم خود بھی جان سے جاؤ گے؟ ہمارے پاس تو ہتھیار ہیں۔" موسیٰ گانے اسے گالی دے کر کہا اور اسی وقت گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹا اور وہ الٹ گئی، موسیٰ گا اور رونڈا امنہ کے بل برف پر گرے۔ انہوں نے بھیڑیوں کے غول پر اپنا جدید اسلحہ استعمال کیا مگر کب تک، کتنے بھیڑیے مرتے، یہاں تو ایک کے بعد ایک برفانی گچھاہ سے برآمد ہو رہا تھا، وہ بھی غول کی صورت میں..... رونڈا نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ساتھی موسیٰ گا پر خونخوار بھیڑیوں کا ایک پورا غول جھپٹنے اور

پل کے پل..... اسے چیرتے پھاڑتے دیکھا تو اس نے فوراً ایک ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک چھتر سچ ڈیوائس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر سچ کر دیا کہ ان کے ساتھ دوستی کی آڑ میں لاما کیشوراکا نے کیا سہایا تک دھوکا کیا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جس وقت خونخوار بھیڑیوں کا ایک بھوکا غول اسے چیرنے پھاڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا، اس نے بوڑھے کو چبان کو ایک پاک پر فرار ہوتے دیکھا۔

یہودی تنظیم ریڈ آرمی کے "داروم" میں جب رونڈا کا یہ سچ پہنچا تو وہاں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ جسے وہ اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے تھے، اس نے ہی ان کے عظیم دشمن سے خفیہ ساز باز کر رکھی تھی۔ رہی سہی کسر ماروی نے خیال خوانی کے ذریعے ان

افواہوں کو پھیلا کر پوری کردی کہ لاما کیشوراکا نے ماروی اور مراد کو اپنے علاقے میں پورا تحفظ دے رکھا ہے اور دوسری طرف اس بات کا جھوٹ موٹ رونا رو رہا ہے کہ وہ اس غار (گالان) اور ان دونوں باپ بیٹی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے، وغیرہ۔

اسی وقت لاما کیشوراکا کے خلاف مشترکہ طور پر ایک جنگی محاذ بنالیا گیا اور اسے ختم کرنے اور اس کے معبد خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا حکم صادر کر دیا گیا۔

اتحادیوں کی ایک پوری فوج کو شکاریوں کے ایک بڑے ٹولے کی صورت، جو یہ ظاہر برفانی لومڑیوں اور بھیڑیوں کا شکار کرنا چاہتے تھے، لہا سا کے اس دور افتادہ برف زار

روانہ کر دیا گیا۔

208

فروری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”نہیں، تم دانش کے قریب بھی نہیں جاؤ گی۔“
عذر باد نے سختی سے انکار کیا۔ ”وہ میرا شکار ہے اور میں اس کے ذریعے بڑا شکار کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں بڑا شکار مراد اور ماروی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“ اس بار ہامی تارا نے قدرے طنزیہ انداز میں پوچھا، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق بڑے شکار لہاسا کے اس برف زار ویرانے میں موجود تھے مگر عذر باد اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے یا پھر نہ سمجھتے ہوئے جواب بولا۔

”میرا بڑا شکار ریاست ارض اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنا اور اس کی تباہی ہے۔ لا را جب تک وہاں رہے گی میں بھی اس کے اندر موجود رہتے ہوئے وہاں رہوں گا۔ مراد اور ماروی اگر لہاسا کے برف زاروں سے زندہ واپس آ بھی گئے تو ان کے گھر میں ہی، میں ان کی قبریں بھی تیار رکھوں گا۔ تم اب جاؤ اور اپنا مشن پورا کرنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ان میں صرف جھلیس وہ واحد ہستی تھا جو ماروی کی اس چال کو سمجھ چکا تھا مگر وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ شیطان کے منہ کو ایک حد تک ہی کھلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا تھا، وہ خود بھی لاما گیٹورا کا کی مغرور صفت اور ہٹ عری سے تنگ آ چکا تھا اور اب تک اس نے ماروی اور مراد کے سلسلے میں۔۔۔ کوئی خاطر خواہ کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا۔

جھلیس۔۔۔۔۔۔ لاما گیٹورا کا اور اس کے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں عنقریب ہونے والے عبرت ناک انجام سے مایوس ہونے کے بعد کوئی اور چال چلنا چاہتا تھا۔ اس نے عذر باد سے رابطہ کیا اور اسے چند خاص ہدایات دیں۔ وہ پہلے ہی ایک دوسرے ناسک پر مصروف کار تھا، جس کے مطابق اس نے لا را کے ذریعے ریاست ارض اسلام میں داخل ہونا تھا۔ لا را کو اپنے تابع کرنے کے بعد اس کا کام فقط اتنا رہ گیا تھا کہ اس نے لا را کو اپنی اصل حالت میں دانش کے قریب لانا تھا لیکن جھلیس کا یہ نیا مشن سامنے آنے پر اسے کچھ جھلاہٹ سی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے اس کے لیے ہامی تارا کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنے روبرو حاضر کرنے کے بعد بولا۔

”تبت کا مشن بری طرح ناکامی سے دو چار ہو رہا ہے اور اس کی وجہ وہی آفت کی پرکالہ ماروی ہے۔۔۔۔۔۔ تم اسی وقت لہاسا کے اس برف زار علاقے میں جاؤ اور ان کا ٹھکانا معلوم کر کے مراد اور ماروی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔“

ہامی تارا جانتی تھی کہ یہ مشن آسان نہ تھا، اول تو گالان کے غار کو ابھی تک کوئی بھی نہیں تلاش کر سکا تھا، مراد اور ماروی کو ختم کرنا تو دور کی بات تھی مگر دانش کی صورت میں ایک امید بھی گالان غار تک پہنچنے کی۔۔۔۔۔۔ مگر دانش کے سلسلے میں وہ عذر باد سے ایک عدد تھپڑ کھا چکی تھی، اس لیے وہ اس کے پاس دوبارہ جانے سے ذرا گھبرار ہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”جہیں معلوم ہے کہ یہ مشن کتنا مشکل ہے مگر میرے پاس اسے حل کرنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دانش۔۔۔۔۔۔“

”تم دانش کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو؟“ عذر باد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں دانش کو ماں بن کر دھوکا دیتی رہوں گی، تاوقتیکہ میں اپنے تبت والے مشن میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔“

پاکیزہ

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی فروری 2017ء کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے باکرے سے بک کر واپس

فروری 2017ء

209

سپینس ڈائجسٹ

ہامی تارا اپنے ہونٹ پیچھے کچھ دیر سوچتی رہی۔
عذر باد اسے مسلسل مایوس کیے جا رہا تھا۔ وہ اپنی دھن میں
مگن تھا اور ہامی تارا کو مشن سے زیادہ اس کی قربت
کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے
اپنے ہر مشن میں ساتھ رکھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے
تین ایک معرکہ سر کیا اور جہلیس نے اسے عذر باد کے ساتھ
ہمیشہ کے لیے رہنے کی اجازت بہ طور انعام کے طور پر دی
تھی مگر..... عذر باد نے اسے سخت مایوس کیا تھا، اسے اب
اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عذر باد کی نظروں میں بھی محض ایک
کنڈل داسی کے سوائے کچھ نہیں، جبکہ وہ اس کی محبوبہ کی
حیثیت سے رہنا چاہتی تھی مگر وہ اسے ایک ماتحت کی طرح
ڈیل کر رہا تھا، اس پر حکم چلا رہا تھا۔ وہ جہلیس کا سچا پیروکار اور
جانشین بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ہامی تارا نے سوچا کہ
اگر داسی بنتا ہے تو جہلیس سے بہتر اور کون اس لائق تھا جس
کی وہ داسی بن کر رہتی، جبکہ عذر باد بھی یہی چاہتا تھا۔

بات کچھ بھی تھی..... مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ عذر باد
کی طرف سے ہامی تارا کے دل میں ایک بال سا آگیا تھا۔
اگرچہ وہ اب بھی خود کو جہلیس کی چیلی ہی سمجھتی تھی، مگر
جانتی تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنے ساتھ نہ لے کر کے زیادہ دیر نہیں
رکھتا، اس کا کہنا تھا کہ اس کے شیطانی خیالات اپنائے
رکھو، سمجھو میرے ساتھ ہو۔ لہذا ہامی تارا نے سوچا کہ اگر
اسے شیطانی معبد خانے میں اپنی ساکھ اور اہمیت قائم
رکھنا تھی تو اسے خود کو عذر باد کے برابر والی سطح پر لانا تھا، ورنہ
ایک عام چیلی کی حیثیت سے اگر زیادہ دن رہی تو پھر اس
کا حشر بھی انہی سا بھ چیلوں جیسا ہو جائے گا، جیسا جہلیس
نے عذر باد کے ذریعے سے کاہن، لارا، طاغوتا اور آبنوس کا
کیا تھا۔ یعنی انہیں ناکارہ بنا کر چارے کے طور پر ہر دشمنوں
کے آگے ڈال دیا گیا تھا اور عذر باد جب چاہتا چھٹی بجا کر
دیک اپ (جاگو) کہتا، وہ اس کے ”معمول“ بن جاتے
جبکہ ہامی تارا نہیں چاہتی تھی کہ ایسا کچھ ہو.....

لہذا وہ سوچنے لگی کہ یہی موقع ہے کہ کارنامہ دکھانے کا۔
کسی طرح وہ لہاسا کے برف زار جا کر مراد اور ماروی کو
موت کے گھاٹ اتار دے اور اس کا بہترین ذریعہ دانش
سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے یہ معمم ارادہ کر لیا کہ عذر باد کی پروا
کیے بغیر وہ اپنا مشن جاری رکھے گی اگرچہ اسے عذر باد کا تھپڑ
بھی یاد تھا، اس نے سوچا کہ عذر باد اپنے مشن کی راہ ہموار
کرنے کی خاطر اس کی چال کو خراب قرار اسی لیے دے رہا

ہے کہ وہ خود اپنے مشن کے لیے دانش کو استعمال کرنا
چاہتا تھا۔

”ہرگز نہیں، دانش میرا شکار ہے اور عذر باد کو اپنے
مشن کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔“ ساری بات
کھنے کے بعد ہامی تارا غصے سے خود کلامیہ بڑبڑاتی تھی۔

”میرا مشن اس سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ وہ
ارض اسلام میں داخل ہو کر اس کی جڑیں کھوکھلی تب ہی کر سکتا
ہے جب مراد اور ماروی زندہ نہ رہیں۔“ اس نے دانش کی
ماں بن کر اسے ”ثریب“ کرنے کا مشن جاری رکھنے کا فیصلہ
کر لیا، اس ارادے کے ساتھ کہ اگر عذر باد بھی اس کے
سامنے آیا تو وہ اس سے ذرا بھی خائف نہیں ہوگی۔

یہاں یہ سب وہ سوچ رہی تھی اور مستقبل کے
ارادے باندھ رہی تھی، ادھر تاریک دنیا کے شیطانی معبد
خانے میں جہلیس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ انسانوں کو ہی نہیں
بلکہ اپنے چیلوں کو بھی آپس میں لڑوا کر خوش ہوتا تھا، اسی
طرح وہ دنیا میں برائی پھیلاتا اور برائی کو برائی سے جنم
دیتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ جب ہامی تارا دانش کو اس کی ماں
کا جھانسا کامیابی کے ساتھ دے آئی تھی تو وہ خوش ہوا تھا اور
عذر باد نے اس کے کام میں ستم نکالا تھا تو تب بھی اس نے
غیر اطمینانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

جہلیس انسانوں اور چیلوں کے درمیان تفرقہ
چاہتا تھا تاکہ مقابلہ بازی کی فضا پیدا ہو اور اس کے چیلے
زیادہ تن وہی کے ساتھ اپنے ”کام“ کی انجام دہی میں
پوری طرح ”فعال“ رہیں۔

اب وہ اپنے مقرب خاص کارپرداز چیلے عذر باد اور
اپنی محبوبہ نما داسی کے درمیان مقابلے کی اس سطح
کو پیدا کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ کون کیسا کام کامیابی کے
ساتھ سرانجام دیتا ہے؟

☆☆☆

دانش اور لارا..... ماں بیٹے کی اس معصومیت کے
پیچھے جو شیطانی ادارے کام کر رہے تھے اور اس معصومیت
سے روشن دنیا کے خلاف کوئی شیطانی گل کھلانے کی مذموم
سازش میں مصروف کار تھے، ان میں ایک شیطانی
ادارہ..... ”دی کچر“ سر فہرست تھا۔ اس کے سربراہ راجر
بارڈی کے بھی مراد وغیرہ کے خلاف وہی جذبات تھے جو
جہلیس اور عذر باد کے تھے۔ اسی سبب عذر باد اور بارڈی کا
آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ قائم ہو چکا تھا۔ یہ شیطانی ادارے، کئی

ملکوں میں مراد کا جینا حرام کر سکتے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا انہی میں سے ایک ادارے کا نام ”دی کچر“ تھا۔ اس کا سربراہ راجر ہارڈی بہت ہی مکار اور شاطر تھا۔ اس نے عذرباد سے کہا تھا.....

”لارا جب بن زیان کے زیر اثر رہتی تھی تب ہی سے وہ میری نظروں میں ہے۔ اب میں اس کی ٹیلی ٹیجی سے قائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے میری طرف مائل کر دو۔“

جواب میں عذرباد نے کہا تھا۔

”تمہیں بہت رازداری سے مراد کے مقابلے پر رہنا ہے۔ نہ اپنی صورت دکھانی ہے نہ اپنی آواز اور لب و لہجہ سنانا ہے۔ ہم لارا اور دانش کے ذریعے بہت بڑا ٹیم کھیل رہے ہیں۔ ایسے وقت ماروی اپنی صلاحیتوں سے معلوم کر لے گی کہ لارا اور پردہ تم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں بہت محتاط رہنا چاہتے ہیں۔“

”بے شک محتاط رہو۔ لارا پر ایسا تنوعی عمل کرو کہ میرا نام میری شخصیت اس کے ذہن سے مٹتی رہے۔ وہ میرے اندر آکر خیال خوانی کرنا بھول جائے۔ صرف میری ضرورت کے مطابق دوسروں کے دماغوں میں جایا کرے۔“

وہ قائل ہو کر بولا۔ ”تم لارا کی خیال خوانی سے بہت قائدہ اٹھا سکو گے۔ میں اسے تمہاری طرف مائل کر رہا ہوں۔ محتاط رہنا۔“

اس کا اہل طریقہ یہی نکالا گیا تھا کہ راجر کی اصلیت کو عذرباد نے اپنے شیطانی عمل سے منظر عام سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ عمومی آدمیوں کو ”یوزو“ کرتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ راجر ہارڈی کی بھی ڈھنڈ یا پڑی ہوئی تھی، مگر خلیس کے اس شیطانی حیلے نے اسے اپنے طاغوتی عمل کے ذریعے منظر عام سے ہٹا رکھا تھا۔

لہذا ایک باہمی گٹھ جوڑ کی پیش آئندہ سازش کے مطابق..... لارا کو مسز ہارڈی بنا دیا گیا تھا۔ اسے مرد کی ضرورت تھی اور وہ ”مرد“ اسے فراہم کیا جا چکا تھا، وہ اب ایک طرف ہارڈی کی بیوی بن کر تو دوسری طرف عذرباد کی معمول بن کر ان دونوں ہی کی تابع بن چکی تھی، بلکہ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا کہ وہ..... کھلونا بن چکی تھی، اب نہ وہ اپنی ہوش مندی میں شیطان کی چلی تھی نہ ہی روشن دنیا کی دشمن..... گویا نہ تین میں تھی نہ تیرہ میں.....

راجر ہارڈی درحقیقت اپنی محل نما رہائش گاہ آئرلینڈ کے ”وائٹ ہیلز“ میں مقیم تھا۔

لاما کیسوراکا..... کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ماروی نے اس کے خلاف کس قدر خطرناک چال چلی تھی۔ وہ اپنے شیطانی معبد خانے میں بیٹھا ان دونوں ”عام“ افراد (موسی گا اور رونڈا) کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر ہو گئی، تو اس کی پاک گاڑی لوٹی۔ وہ خوش ہو گیا کہ ”مہمان“ آگئے لیکن جب بوڑھے کو چبانے نے اسے حقیقت بتائی کہ ان پر راستے میں خونخوار بھیڑیوں کے غول کے غول حملہ آور ہو گئے تھے تو اس کی بیویوں پر سکون انداز میں سکڑ گئیں۔

”تمہارے راستے میں تو کوئی ایسا علاقہ نہیں آتا، جہاں ان خونخوار بھیڑیوں کی اس قدر تعداد میں موجودگی ہو؟“

بوڑھا کیا جواب دیتا وہ تو اس وقت ماروی کے تنوعی حکم کے زیر اثر تھا۔ اب وہ اپنی جون میں آیا تو اسے خود بھی اس بات پر شدید حیرت ہونے لگی کہ یہ ہوا کیا تھا؟ لہذا بڑے گونگو سے لہجے میں بولا۔ ”میں خود حیران ہوں جناب! میں تو اچھا بھلا اپنی پاک گاڑی میں ان دونوں مہمانوں کو ساتھ لارہا تھا کہ جانے کہاں اور کدھر سے بھیڑیوں کے غول کے غول اٹھ آئے۔ اگرچہ ان دونوں مہمانوں کے پاس اسلحہ بھی تھا، بڑا جدید قسم کا..... اور انہوں نے خونخوار بھیڑیوں پر اپنی طاقت ور گنوں سے گولیاں بھی برسائیں لیکن..... وہ زیادہ دیر ان شکاری بھیڑیوں کے آگے نہیں ٹک سکے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑیوں نے ان دونوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ میں خود ہتا نہیں کس طرح خالی پاک گاڑی دوڑاتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔“

”کیا ان بھیڑیوں نے اتنی بڑی پاک گاڑی الٹ دی تھی؟“ لاما کیسوراکا نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی.....

”بھیڑیوں نے پاک گاڑی نہیں الٹی تھی، وہ..... وہ.....“

یہاں وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا، کیونکہ اس کا دماغ اس وقت ماروی کے تابع تھا، تاہم اندازے کی بنیاد پر بھی اس نے صحیح بات کہی، آگے بولا.....

”بھیڑیوں کے چیختے اور غراتے غول درغول سے گاڑی میں جتے دونوں پاک بری طرح بدحواس ہو گئے تھے۔ وہ بھوکے، خونخوار اور دوڑتے بھیڑیے شاید ان دونوں انسانوں کے ساتھ ان موٹے تازے پاکوں کو بھی ہڑپ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خود میں بھی شاید..... بوکھلا گیا تھا۔ پاک سرپٹ دوڑ پڑے اور پھر پاک گاڑی کا پہیہ..... شاید کسی ٹھوس برقیے چوڑے پر پٹا اور گاڑی

الٹ گئی۔“
”ذرا ٹھہرو..... یہ تم اپنی ہر بات میں بار بار شاید..... کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو؟ کیا تمہیں اس حادثے کا یقین نہیں ہے؟“ لاما کیٹورا کا نے چونک کر اس سے پوچھا اور اپنی بھوئیں سیکنڈ کر رہے غور اس کے چہرے کا جائزہ بھی لیا۔ شاید وہ کچھ ”اخذ“ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بوڑھا کو چپان جوابا اسی لہجہ میں بولا۔
”ہاں..... میں خود حیران ہوں، مجھے ابھی تک اتنے بڑے حادثے کا یقین نہیں ہو رہا ہے کہ یہ ہو کیسے گیا؟“
لاما کیٹورا کا مجھے کا شکار ہو گیا۔
”کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔“ وہ اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ پلٹا اور اس میز کی طرف آیا جہاں کرشل بال پڑا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ماں ماتوراما..... سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا اور صلاح و مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر ٹیبل کے قریب آیا تو چونک پڑا۔ وہاں کرشل بال موجود ہی نہ تھا۔
”دھت تیرے کی.....“ اس نے جھلا کر اپنی تنگ بیٹھائی پر ہاتھ مارا۔
”میں نے تو غصے میں آکر گریٹ مدر کا وہ کرشل بال ہی نیچے پھینک کر توڑ ڈالا ہے، میں بھلا اب اپنی گریٹ مام سے کیونکر رابطہ کر سکتا ہوں؟“ اسے اپنی اس عصبی حرکت پر خود ہی غصہ آنے لگا۔ وہ مارے بے بسی کے بری طرح تملانے لگا، کمرے میں ٹھہلتے ہوئے سوچنے لگا۔
”جھلیس ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ وہ دونوں دشمن میری ناک کے نیچے موجود ہیں اور میں ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہوں..... ان دو مہمانوں (موسیٰ گا اور رونڈا) کی وساطت سے کامیابی کے قریب پہنچنے کی کوئی سبیل پیدا ہوئی تو یہ حادثہ رونما ہو گیا، پتا نہیں یہ واقعی اتفاقی حادثہ تھا یا پھر دانستہ کسی کی شرارت تھی؟ کون تھا وہ پھر؟ ماروی تو اپنے ادھ مرے باپ کی زندہ قبر پر بیٹھی ہے اور تیسرا کوئی دشمن یہاں موجود نہیں۔ مجھے جھلیس سے مدد دینی چاہیے۔ اونہہ..... بھلا جھلیس کے ساتھ میرا کیا مقابلہ؟ وہ تو خود بے بس اور میرا محتاج ہے۔“

☆ ☆ ☆
اعلیٰ حکام اور دیگر مسلم دشمن قوتوں کے اکابرین نے ایک اعلیٰ سطح کی بین الجماعتی میٹنگ میں کریگ ہوسٹن اور بن زیان کی اس بات پر صاف کیا تھا کہ ارض اسلام اس وقت اپنے کمزور ترین دور سے گزر رہا ہے۔ عابی کو ختم کر دیا گیا، مراد قریب المرگ ہو کر لہاسا کے برف زار پہنچا دیا گیا اور ماروی بھی منظر سے غائب ہے، لہذا اس وقت ریاست ارض اسلام پر دھاوا بولنا ہی سب سے اہم اور فیصلہ کن قدم ہوگا۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ اس نتیجے پر کہ ریڈ آرمی اور دیگر اتحادیوں کی افواج ریاست ارض اسلام پر جنگ کا بلگ بجا کر رہے گی۔

اللہ تعالیٰ..... اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ ایک طرف اس کی ایمانی قوتوں کو جلا ملتی رہے اور دوسری جانب حیات انسانی کا یہ مدد و جذبہ بھی قائم رہے۔
اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دشمنوں نے بہت بروقت و بر محل ریاست ارض اسلام پر لشکر کشی اور دھاوا بولنے کا اپنے تئیں بالکل صحیح وقت چنا تھا.....

عابد علی منگی جیسے مرد آہن کی موت اور مراد کی قریب المرگ ہیبت کڈائی کے بعد روشن دنیا کے باسیوں کو ایک بار پھر اپنے دشمنوں کی طرف سے کڑی آزمائش کا وقت آن پڑا تھا.....

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایک دن اور بیت گیا، وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا مگر ریڈ آرمی اور اس کے اتحادیوں کی فوج ضرور اس تک پہنچ گئی۔ اسے حیرت و تشویش کا ایک بار پھر ملا جھلا لگا مگر تب تک وقت بیت چکا تھا۔ اس کے معبد خانے پر چڑھائی

فروری 2017ء

نہیں۔ میں اسے ہر دو سال بعد پڑھتی ہوں لیکن اس برس اس ناول کی پاری نہیں تھی بلکہ میں اس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ پڑھ رہی تھی۔

وہ ایک بہت ہی خوب صورت دن تھا۔ بارش کے قطرے پورچ کی چھت سے ٹکرا کر جلتنگ جیسی آواز پیدا کر رہے تھے۔ میرے اپارٹمنٹ کے بائیں جانب واقع چرچ کی نیلے اور سرخ شیشوں والی کھڑکیاں اس ابر آلود موسم میں تاریک نظر آرہی تھیں۔ میں نے بلوں اور پمفلٹ پر سرسری

میں اپنے گھر کے پورچ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی جب ڈاکیا ڈاک لے کر آیا۔ اس میں کچھ ٹیل، ایک مقامی بار کا پمفلٹ اور کیپ سے میں ہونے والی ایک تقریب کا دعوت نامہ تھا۔ اس کہانی کا آغاز اسی دعوت نامے سے ہوتا ہے۔ اگر میں لوئیسا سے ایلکوٹ کو نہ پڑھ رہی ہوتی تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ یہ دعوت نامہ کس نے بھیجا ہے۔ اس وقت میں اس کا شہرہ آفاق ناول لٹل ویمین، نہیں پڑھ رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ مجھے یہ شاندار ناول پسند

نایاب سودا

شیر عباس

مغربی دنیا بھی عجیب دنیا ہے... جہاں کی نہ صرف برائیاں بلکہ اچھائیاں بھی الگ ہیں بلکہ الگ انداز میں کی جاتی ہیں... اگرچہ اس کا بھی براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا مگر وہ پھر بھی ان معاملات میں کود پڑی جو کسی بھی قوم کے لیے باعث افتخار ہوتے ہیں اور وہ بھی اسے اپنی میراث سمجھتے ہوئے ان معاملات میں اپنے حصے کا حق ادا کرنے نکل پڑی تھی۔ اس کے نزدیک یہ بہت نایاب سودا تھا جسے وہ گنوا نا نہیں چاہتی تھی۔

لحہ بہ لحہ سنسنی خیز حالات پر مشتمل ایک دلچسپ تحریر

ۛ



WWW.PAKSOCIETY.COM

نظر ڈالی اور انہیں میز پر رکھ دیا پھر دعوت نامے کو دیکھنے لگی۔ میرا دل چاہا کہ اسے کھول کر دیکھوں لیکن مطالعہ جاری رکھنے کی خواہش اس پر غالب آگئی کیونکہ کہانی ایک سنسنی خیز موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار سیسل اپنی نوجوان کزن کے محل میں داخل ہوتا ہے جس کی وہاں موجودگی سے وہ اپنے چچا کی جائداد سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی اور کشش سے متاثر ہو گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر اعتبار کرنے سے انکسار کرتا تھا۔

اس نازک موڑ پر پہنچ کر مجھے وقفہ لینا پڑ گیا کیونکہ ہیزا گرم کرنا اور سلاد بنانا تھی۔ اس کام کے بعد بھی کہانی کا بقیہ حصہ پڑھ سکتی تھی۔ میں یہ کہانی پہلے بھی پڑھ چکی تھی لیکن یہ تین سال پرانی بات تھی میں دوبارہ کسی کہانی کو پڑھنے میں جان بوجھ کر وقفہ دیتی ہوں جس سے اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ لویسا نے پیسے کمانے کے لیے درجنوں کے حساب سے ڈرافٹوں اور پراسرار کہانیاں لکھی تھیں تاکہ اپنے گھروالوں کی مدد کر سکے۔

میں نے ہیزا اوون میں رکھا اور دعوت نامے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کو پڑھتے ہی میری دلچسپی بڑھ گئی۔ مجھے کسی عام تقریب میں نہیں لویسا۔ ہیلکوٹ ایوننگ میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب صرف چار دن بعد اتوار کی شام منعقد ہونے والی تھی۔ تھکنین نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرا کوئی دوست، بوائے فرینڈ یا ساتھی زندگی نہیں اور اتوار کو میری کوئی مصروفیت نہیں ہوتی، حالانکہ اس روز میں فارغ تھی لیکن میں نے اسے اپنی بے عزتی محسوس کیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ اس تقریب میں ایک اسکالر، ایلکوٹ کے مسودوں، ان کی اشاعت اور ان کے حوالوں کے بارے میں پیکر دے گا اور اس نے جو وقت کیپ سے میں گزارا، اس کے بارے میں بتائے گا۔ میں بھی یہی جانتا چاہتی تھی کیونکہ میں خود بھی ایلکوٹ پر ایک کتاب لکھنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس میں اپنی علمیت نہیں بھگارتا تھی بلکہ صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ دو سو سال گزر جانے کے باوجود اب بھی عورتیں اس سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ یہ تقریب ایلکوٹ ہوٹل کے نزدیک واقع ایک گھر میں منعقد ہونا تھی جہاں لویسا اپنے گھروالوں کے ہمراہ قیام کیا کرتی تھی۔

میں نے اس تقریب میں شرکت کی فیس پڑھی تو چونک اٹھی۔ میں ابھی اس اپارٹمنٹ کی مرمت کے اخراجات ادا کر رہی تھی جو انٹی میرے لیے چھوڑ گئی تھیں۔ مجھے ایک نیا چولہا اور فرنیچر خریدنے کے علاوہ ایسوسی ایشن کو

اپنے حصے کی رقم بھی ادا کرنا تھی جو اس ایک سو ساٹھ سالہ عمارت پر نئی چھت ڈالنے کے لیے جمع کی جا رہی تھی۔ ان اخراجات سے تنگ آ کر ایک مرحلے پر تو میں اس اپارٹمنٹ کو بیچنے کے بارے میں سوچنے لگی لیکن اس کے محل وقوع کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ عمارت اندرون شہر سے صرف تین بلاک کے فاصلے پر تھی اور ساحل بھی یہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ اس کے علاوہ لویسا بھی کیپ سے ہی میں چھٹیاں گزارا کرتی تھی لہذا میں نے اس تقریب میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اوون سے ہیزا نکالا اور اسے کانٹے کے لیے چھری تلاش کر رہی تھی کہ میری نظر پچن کی کھڑکی سے باہر گئی۔ جنگل کے مانند پہلے ہوئے میدان میں تعمیراتی مزدور ہتھوڑے برسارہے تھے۔ میں نے اپنا پیزا اور لویسا کی کہانیوں والی کتاب اٹھائی اور پورچ کی طرف چل دی جہاں ہتھوڑوں کی آواز سے میرے گھانے اور پڑھنے میں کوئی خلل نہ پڑتا۔

مجھے ان آوازوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میرے اپارٹمنٹ کے عقب میں واقع یہ مکان انیسویں صدی کے اوائل میں تعمیر کیا گیا تھا۔ شروع میں یہاں ایک دولت مند خاندان رہا کرتا تھا پھر اسے کسی اور نے خرید لیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ مکان ایک بار پھر فروخت ہو گیا۔ جب میں نے سنا کہ کسی باذوق شخص نے یہ مکان خرید لیا ہے اور اسے اصلی شکل میں بحال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ اسے پرانی شکل میں واپس لایا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ ویکس اور پالش لگانے کے بعد اس کے وکٹورین فرش کی چمک لوٹ آئی تھی۔ میں تھوڑا بہت جانتی تھی کہ وکٹورین ہاؤس کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔

لہذا میں نے ہیزا ختم کیا اور کتاب پڑھنے لگی۔ سیسل نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی کزن کی تصویر بنائے گا جس کی طرف وہ تیزی سے جھک رہا تھا۔ کزن نے تصویر بنوانے کے لیے بزرگوں کا لباس پہننے پر اصرار کیا جس کے نچلے حصے پر جھالرا اور جوتوں میں چاندی کے بگل لگے ہوتے تھے۔ وہ ایک طوفانی رات میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے ایک پرانے چھپر کی طرف چلا گیا جہاں اس نے ایک بوڑھی عورت ایلیزبتھ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ سیسل کی اصل حقیقت ظاہر کر دے گی اگر اس نے اسے جائداد کی آمدنی میں سے حصہ نہیں دیا۔

میں نے ایک بار پھر دعوت نامے کو غور سے دیکھا اور

لفافے میں ایک چپک رکھ کر اس پر نکت لگا دیا پھر پیدل چلتی ہوئی قریبی پوسٹ آفس تک گئی اور وہ لفافہ ڈاک کے سپرد کر دیا۔ وہاں سے واپس آکر میں نے اپنی پلیٹ اور گلاس اٹھایا اور انہیں دھونے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور مزدور کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ سوائے ان کے سپروائزر کے جو ہمیشہ آخر میں جایا کرتا تھا۔

میں نے برتن دھو کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مجھے زیر تعمیر مکان کی اوپری منزل والی کھڑکی سے روشنی باہر آتی نظر آئی پھر غائب ہو گئی۔ ایک لمحے بعد وہ ٹھلی منزل کی کھڑکی سے دوبارہ نظر آئی۔ میں نے بے اختیار سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ شاید مجھے پولیس کو فون کرنے کی ضرورت پیش آجائے پھر مکان کا عقبی دروازہ کھلا اور میں نے اس میں سے سپروائزر کو باہر آتے دیکھا۔ اس نے دروازہ مقفل کیا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کوئی چور نہیں تھا۔ مجھے پہلے ہی دیکھ لینا چاہیے تھا کہ اس مکان میں ابھی بجلی کا کنکشن بحال نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ واقعہ میرے ذہن سے نکل گیا جب تک ایلکوٹ کی تقریب منعقد نہیں ہوئی۔ وہ شام میری توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ لوئیس کے روپ میں سیسلیا ایڈورڈ نے اس کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور حاضرین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ اس نے رالف والڈو ایمرسن کا ذکر کیا جو اسے بچپن میں پڑھانے آیا کرتا تھا اور وہ اس پر مبنی تھی پھر اس نے اپنی نوجوانی کے دنوں میں بتایا جب خاندان کی کفالت کے لیے اس نے گورنس کے طور پر ملازمت بھی کی۔ اس نے چار لوٹ بروئی کے بارے میں بھی بتایا جو اسی کی طرح اپنے گھروالوں کی کفالت کے لیے محنت کر رہا تھا۔ سیسلیا نے اس موڑ پر اپنا بیان روک دیا جب لوئیس نے خانہ جنگی کے دوران واشنگٹن ڈی سی میں نرس کے طور پر کام کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں مزید تقریبات کا انعقاد کرے گی جس میں لوئیس کے تخلیق کردہ کرداروں کو پیش کیا جائے گا۔ اس طرح اس نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں اگلی دو تقریبات میں شرکت کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اس کے بعد ایلکوٹ کے اسکالر کلائڈ لوریل کی باری تھی۔ اس نے لوئیس کی آخری مختصر کہانیوں کے بارے میں گفتگو کی جو بہت سے حاضرین کے لیے باعثِ تعجب تھی لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں پہلے سے ان کہانیوں کے بارے میں جانتی تھی۔ البتہ اس وقت میں سیدھی ہو کر

بیٹھ گئی جب اس نے کیپ سے لوئیس کے گزارے ہوئے ایام کا ذکر کیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ایک ہوٹل میں قیام کیا جو اب ایلکوٹ ہوٹل کہلاتا ہے بلکہ اس کی ریسرچ کے مطابق وہ ایک دوست کے مکان میں بھی ٹھہری تھی۔ اس نے اس مکان کا محل وقوع بتاتے ہوئے کہا کہ اسے حال ہی میں خریدا گیا ہے اور اب اس کی مرمت ہو رہی ہے۔

میری نبض بتدریج تیز ہونے لگی اور میں تصورات کی دنیا میں پھنسنے لگی۔ لوئیس میرے عقب میں واقع مکان میں ٹھہری تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے سپروائزر اور اس کی نارچ نہ دیکھی ہو اور لوئیس کو ایک موم بتی لیے کام ختم کرنے کے بعد اپنے بستر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ پڑوسیوں سے ملنے آئی ہو اور میرے پورچ کے سامنے ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔ ایسے کئی تصورات میرے ذہن میں آ رہے تھے جنہیں میں دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

حاضرین میں مسٹر پال اینڈریوز بھی تھے جنہوں نے اپنا تعارف ایلکوٹ کی یادگار تصانیف کو جمع کرنے والے کے طور پر کروایا۔ ان کے پاس پبلشرز کی مرتب کردہ اس کی مختصر کہانیوں کی فہرست تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس مکان میں لوئیس کی کچھ یادگار تصانیف کی موجودگی کا امکان ہو سکتا ہے۔ ”مجھے اس بارے میں ٹھوس معلومات نہیں ہیں لیکن بہر حال کئی سالوں سے یہ افواہ گردش کر رہی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور وہ یہ کہ اس مکان میں مصنفہ کے کسی نایاب مسودے کی موجودگی کا امکان ہے۔ جب سے اس مکان میں تعمیراتی کام دوبارہ شروع ہوا ہے، اس افواہ میں بھی شدت آگئی ہے..... ممکن ہے کہ یہ محض افواہ ہی ہو لیکن لوئیس اپنے دوستوں کو خطوط اور مختلف تحریریں بھی بھیجا کرتی تھی اور وہ انہیں اس کی نشانی کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا کرتے تھے۔ بہر حال وہ ایک مصنفہ کی حیثیت سے اپنا نام بنا رہی تھی۔ ہزاروں مسودوں میں اس طرح کی تحریر یا خط کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی لیکن بہر حال اسے ایک دریافت ضرور سمجھا جائے گا۔ یہاں سے جاتے وقت اس گھر کے کمینوں نے ایسے خطوط ضائع کر دیے ہوں گے یا اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ خاندان پھر بھی اس مکان میں واپس نہیں آیا۔“ یہ کہہ کر وہ لوریل کی طرف مڑا اور پوچھنے لگا۔ ”کیا وہ اس مکان کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔“

لوریل کچھ ناراض نظر آنے لگا جیسے کسی نے لوئیس کے حوالے سے اس کی معلومات کو چیلنج کیا ہو۔ وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر بولا۔ ”بالکل مسٹر اینڈریوز! کچھ بھی ممکن ہے

لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے کہ لوئیساکا کوئی خط یا تحریر اس مکان میں رہ گئی ہو۔“

اینڈریوز اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ ”اس مکان کی تلاشی لینی چاہیے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اس کے لیے مالک مکان کی اجازت درکار ہوگی۔ ابھی تک اس نے کسی کو یہ مسودے تلاش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔“ اس نے لوریل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”شاید وہ واپس آکر خود یہ کام کرنا چاہتا ہے۔“

مجھے اس سپردانہ کا خیال آیا جو ہاتھ میں نارنج لیے مکان میں گھوم رہا تھا۔ یقیناً اس نے بھی یہ افواہ سنی ہوگی۔ جب وہ گیا تو اس کے ہاتھ خالی تھے لیکن وہ اپنی جیبوں میں بھی کچھ رکھ سکتا تھا۔

میں نے مقررین سے پوچھا کہ کیا ان میں سے کبھی کسی نے اس مکان میں یہ مسودے تلاش کرنے کی کوشش کی؟ ڈاکٹر لوریل کا کہنا تھا کہ اس کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مسٹر اینڈریوز نے اس سے اتفاق کیا اور بولے کہ اگر ایسی کوئی چیز دریافت ہوئی تو وہ موجودہ مالکان کی ملکیت ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔

میرے عقب میں بیٹھی ہوئی ایک لمبے قد کی عمر رسیدہ عورت اچانک ہی میری کرسی سے ٹکرائی۔ اس نے مجھے مڑ کر دیکھا اور پلٹ کر جھپکائی۔ وہ انتہائی خباثت سے لوریل اور اینڈریوز کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکی اور میرے برابر والی کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑ لی، مجھے جھرجھری آگئی۔ اس کی انگلیوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے جوڑوں پر کھال لپیٹ دی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹالیں۔

تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ لوگ ایک ایک کر کے جانا شروع ہو گئے۔ میں کچھ دیر اپنے تصورات میں گم بیٹھی رہی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لوئیساکا بذات خود میرے پورچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے مکان میں بھی گئی ہو اور پڑوسیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے آنے والی خانہ جنگی پر تبادلہ خیال کیا ہو۔

پھر میں اپنی جگہ سے اٹھی اور عقبی دروازے کی طرف مڑ گئی۔ میرے عقب میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت اب دروازے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دراز قد اور دہلی پتلی عورت تھی اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ کبھی وہ بہت خوب صورت ہوگی لیکن اب ایک کھنڈر نما عمارت نظر آرہی تھی تاہم اب بھی اس کا انداز حکمانہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ

چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے اور کس کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی تک اس کی آنکھوں سے خباثت کیوں جھلک رہی تھی۔

دوسرے روز میں کئی مرتبہ اس مکان کے سامنے سے گزری جسے اب میں ایلکوٹ ہاؤس سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنے تصورات کو کھلا چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ لوئیساکا پورچ میں بیٹھی اور باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو مزید نہ روک سکی۔ میں جانا چاہ رہی تھی کہ لوئیساکا ایلکوٹ ہاؤس کے عقبی باغ سے میرا مکان کس طرح نظر آتا ہوگا۔ لہذا میں نے زیر تعمیر مکان کے گرد لگی ہوئی رسی پھلا گئی اور ڈرائیوے میں چلی گئی۔ کئی مزدور اپنا کام چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے چلایا۔ میں ہسپانوی زبان نہیں بولتی لیکن اس کی بات کا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”باہر جاؤ۔ یہاں کام ہو رہا ہے۔“

”یہاں کوئی ہے جو انگریزی بول سکتا ہو؟“ میں نے پوچھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا پھر ان میں سے ایک دوسری منزل کی جانب منہ کر کے چلایا۔ ”رائمن!“

ایک خوش شکل شخص جس کی صورت کلاڑی کی طرح مل رہی تھی، کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور مجھے پر نظریں جماتے ہوئے غصے سے بولا۔ ”تم مداخلت نہیں کر سکتیں۔“

”میں اس مکان کے عقب میں رہتی ہوں اور اسے صرف ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ایک منٹ۔“ وہ چلاتے ہوئے بولا اور چند لمحوں میں وہ نیچے اتر کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور میزمری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم جیسی خوب صورت خاتون کے لیے میں اپنے اصولوں میں رعایت کر سکتا ہوں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے چھوٹی لڑکی؟“

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ میں چالیس کی ہو چکی ہوں اور کوئی مجھے اس طرح کا لقب دے کر بے وقوف نہیں بنا سکتا لیکن یہ بھی عورت کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کم عمر کہلوانا پسند کرتی ہے۔ اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ ناراض نظر آنے لگا اور اس نے مجھے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(مثنوی رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پائے پیاؤں کیلئے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرمشاں (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیو II ایسٹیشن ڈیفنس باؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ میں نے صورتِ حال کی
نزاکت کو بھانپتے ہوئے جلدی سے کہا۔
”اسکار لیٹ اوہارا۔“

وہ حیران نظر آنے لگا۔ میں عقبی باغ کی طرف
بڑھی۔ میں نے دیکھا کہ لوئیس ابھی یہاں بیٹھا کرتی ہوگی اور
یہاں سے اسے میرے کچن کی کھڑکی بالکل صاف نظر آتی
ہوگی۔ میں مڑی اور مکان کے عقبی حصے کی جانب دیکھنے لگی۔
”وہ بڑی کھڑکیاں.....“ میں نے دوسری منزل کی کھڑکیوں
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپروائزر سے کہا۔ ”کیا انہیں
جدید بنایا گیا ہے یا یہ اپنی اصلی حالت میں ہیں؟“
”تم یہ کیوں جانتا چاہتی ہو چھوٹی لڑکی؟“

”کیونکہ اس مکان کے عقب میں صرف میرا
اپارٹمنٹ ہی نہیں بلکہ میں کیپ سے ہوم اونر ایسوسی ایشن
کے لیے بھی کام کرتی ہوں۔“ میں نے بڑی صفائی سے
جھوٹ بولا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”ہم پہلے ہی نقشہ
منظور کروا چکے ہیں پھر تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“
”صرف اپنا اطمینان کرنے کے لیے۔ یہی میرا کام
ہے۔ صرف میرے سوال کا جواب دے دو اور میں یہاں
سے چلی جاؤں گی۔ کیا یہ کھڑکیاں اوپر والے بیڈروم میں
کھلتی ہیں؟“

”ہاں۔“ سپروائزر نے کہا۔ ”تم وہ تمام کاغذات دیکھ
سکتی ہو جو ہم نے جمع کروائے ہیں..... اور کچھ پوچھنا ہے؟“
”نہیں۔“ میں نے کہا اور سڑک کی طرف واپس چل
دی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں میری کمر میں
سوراخ کر رہی تھیں لیکن مجھے وہ معلوم ہو گیا جو میں جانتا چاہ
رہی تھی۔ اگر لوئیس نے اس گھر میں قیام کے دوران کچھ لکھا
ہوگا تو وہ انہی کمروں میں سے کسی ایک میں کھڑکی کے پاس
بیٹھ کر کام کرتی ہوگی جہاں سے اسے میرا مکان بھی نظر آتا
ہوگا۔ اس تصور سے ہی میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ
گئی اور میں نے کسی اچھے ریسٹوران میں لنچ کرنے کا فیصلہ
کر لیا۔

میں کھانا کھانے میں مصروف تھی کہ میں نے دو
افراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک کو میں
نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ڈاکٹر کلائیڈ لوریل تھا۔ اس نے نیلے
رنگ کا سوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ بظاہر وہ
کھانا کھانے کے لیے ہی تیار ہو کر آیا تھا لیکن مطمئن نظر
آنے کے بجائے کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

سپنس ڈائجسٹ 2017ء

کرواتے ہوئے بولی۔

”ایمنڈا مورگن۔ میں لوئیس ایلکوٹ کی پرستار ہوں۔“ میں نے اسے بتایا کہ اس شام اس کی گنگو سے بہت لطف اندوز ہوئی اور لوئیس سے متعلق کسی ایسے مواد کا انتظار کر رہی ہوں جو وہ یا کوئی اور میرے عقب میں واقع مکان میں تلاش کر سکے۔

لوریل کرسی کی پشت سے لگ گیا اور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ کسی کو وہاں سے کچھ مل سکے گا اور امید ہے کہ ایلکوٹ کے پرستار اور محقق محض اینڈریوز کے اندازوں کی بنیاد پر اس کے مکان میں جانے یا اس بارے میں افواہیں پھیلانے سے گریز کریں گے۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ میں نے جل کر کہا اور وہاں سے چل دی۔ شاید میں اسے متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن مجھ سے پہلے سیسلیا بھی ناکام ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوریل کا مسئلہ کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک اسکالر تھا اور اس خیال سے خوف محسوس کر رہا تھا کہ ہم جیسے ایلکوٹ کے پرستار اس کے خطوط اور مسودوں کی تلاش میں اس مکان کے چکر لگانا شروع نہ کریں جن کا کوئی وجود نہیں ہے یا وہ خود اپنے طور پر یہ مواد دریافت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ سیسلیا کے ذہن میں کیا بات ہے؟ کیا وہ لوریل کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی مکان پر جا کر سپردائز کو اپنے ساتھ ملا لے۔ کیوں نہ اس سے پہلے میں یہ کوشش کروں؟

میں نے گھر واپس آنے کا فیصلہ کیا لیکن وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے میں پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔ میں جیفرسن اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی بائیں جانب کولمبیا اسٹریٹ پر مڑ گئی اور سڑک پار کرنے لگی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایلکوٹ ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا سامنا سپردائز سے ہو۔

تب میں نے ایک آدمی کو سڑک کی دوسری جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ سے بیس فٹ آگے چل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایلکوٹ ہاؤس سے دس فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ چلنا شروع کیا پھر رک کر اس ڈرائیوے کی جانب دیکھنے لگا جو مکان کے عقبی صحن کی طرف جاتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایلکوٹ ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس کا سراو پر

اس کے ہمراہ ایک خوب صورت عورت تھی جس کے سیاہ بال پشت کی جانب پڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کا خوب صورت چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ لگا کیونکہ اس وقت اس نے ایلکوٹ کا روپ نہیں دھار رکھا تھا۔ وہ سیسلیا تھی۔

ان دونوں نے جس میز کا انتخاب کیا، وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ میں اگر ذرا سادائیں جانب جھکتی تو اپنے نصف وجود کو ستون کے پیچھے چھپا کر انہیں یہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ میری دلچسپی اس لیے بھی بڑھ گئی کہ مجھے اس عورت کے سرد چہرے اور مسکراہٹ میں کوئی مطابقت نظر نہیں آرہی تھی۔ لوریل نے اپنے لیے کافی اور سیسلیا کے لیے مشروب منگوایا۔ وہ مشروب کی چمکیاں لینے کے ساتھ ساتھ بڑی توجہ سے لوریل کی باتیں سنتی اور مسکراتی رہی۔ میں جو کچھ دیکھ رہی تھی اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، یہ انداز انہیں سوئس کی فلمی اداکاراؤں جیسا تھا۔ اس نے اپنی نظریں لوریل پر جمائی ہوئی تھیں۔

اسی طرح مجھے لوریل کو دیکھ کر بھی حیرانی ہو رہی تھی۔ وہ کلارک کیمبل یا فریڈ میگورے کی طرح خوش شکل اور جاذب نظر نہیں تھا۔ البتہ اسے خوش لباس ضرور کہا جاسکتا تھا اور مجھے ایسے ہی لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مجھے شبہ تھا کہ سیسلیا کو اس کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس ہوئی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ محض اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر ایلکوٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہی ہو۔ اس کے لیے میں اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔

میں دوبارہ اپنے کھانے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ابھی میں ایک اور بیئر منگوانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سیسلیا نے دوبارہ میری توجہ حاصل کر لی۔ وہ اچانک ہی اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھی، اس نے ایک نظر لوریل پر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ریستوران سے باہر چلی گئی۔ لوریل کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر ہال کا جائزہ لیا کہ کسی نے یہ منظر دیکھا تو نہیں پھر اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں اور میں نے اس کے چہرے پر شناسائی کی جھلک دیکھی۔

میں نے آہستہ سے سر ہلایا تو اس نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا پھر وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میری بیئر ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے اٹھتے ہوئے دیکھا تو ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور اس کی میز کے پاس پہنچ کر اپنا تعارف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



کی جانب تھا جیسے مکان کی بالائی منزل کا معائنہ کر رہا ہو۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کے بدن پر وہی جیکٹ تھی جو اس نے تقریب میں پہن رکھی تھی۔ وہ پال اینڈریوز تھا۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ لوریل، اینڈریوز اور سیسلیا ضرور کوئی ایسی بات جانتے ہیں جو مجھے معلوم نہیں یا کم از کم وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کچھ معلوم ہے۔ لیکن مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا جانتے ہیں۔ یہی کہ لوئیس کے لکھے ہوئے خطوط اور تحریریں اس مکان میں موجود ہیں یا نہیں کیا ان میں سے کوئی ایک اس مالک کے بارے میں جانتا ہے جسے یہاں سے کچھ ملا ہو؟ نہیں، میں جانتی تھی کہ مالک یہ مکان آرکیٹکٹ کے حوالے کر کے لندن چلا گیا تھا اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اس بارے میں ایسوسی ایشن کے پاس مصدقہ معلومات تھیں گوکہ میں اس ایسوسی ایشن کی باقاعدہ ممبر نہیں تھی لیکن اس کی میٹنگوں میں شریک رہتی تھی۔

مجھے لگا کہ وہاں کچھ خاص ہو رہا تھا۔ میں واپس اپنے پورچ میں چلی گئی اور سوچنے لگی کہ میں ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں کس طرح جان پاؤں گی۔ یہ ایسی بات نہیں تھی کہ میں صرف ایک فون کال کر کے ان سے کچھ معلوم کر سکتی۔ چنانچہ میں نے ایلیکٹ ہاؤس کی نگرانی کا فیصلہ کر لیا۔ خاص طور پر شام کے اوقات میں جب مزدور اپنا کام ختم کر کے چلے جاتے تھے۔ اگر اس کے بعد بھی مجھے وہاں ٹارچ کی روشنی نظر آتی تو خود جا کر دیکھ سکتی تھی۔ شاید میں اتنی بہادر نہ ہوں لیکن کم از کم اس پر نظر تو رکھ سکتی تھی۔ لہذا میں اوپر گئی اور الماری سے دو عدد دوربینیں نکالیں جو میں آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ ان میں سے ایک میں نے اپنے سونے کے کمرے میں اور دوسری نیچے پکٹن میں رکھ دی۔

ان تیار یوں کو دیکھ کر مجھے ایک فلم یاد آگئی جس میں جاسوس ہی جاسوسوں کی جاسوسی کرتا ہے۔ میں نے اپنا مورچا پکٹن میں بنایا اور دوربین ایسی جگہ رکھ دی تاکہ فوری استعمال کے لیے میرے کام آسکے۔ کافی پاٹ بھر کر رکھ لیا تاکہ نیند بھگا سکوں۔ کمرے کی بیٹری بھی پوری طرح چارج کر لی۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر کوئی مذموم حرکت دیکھوں تو اسے کمرے میں محفوظ کر لیا جائے۔ میں نے اپنے آپ کو اجنبی اور پُر جوش محسوس کیا۔ میں جو کچھ کر رہی تھی، اس کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں ایلیکٹ کی یادگاروں کی نگرانی کر رہی ہوں اور انہیں لوریل، اینڈریوز یا سیسلیا کے قبضے میں

جانے سے بچانا چاہتی ہوں۔

اندھیرا ہونے پر میں اپنی کرسی سے اٹھی تاکہ کافی کا ایک اور پاٹ بنالوں۔ اسی وقت میں نے ٹارچ کی روشنی دیکھی۔ میں تیزی سے اوپر والے کمرے میں گئی۔ لچہ بھر کے لیے رک کر عقبی مکان کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے کوئی شخص کسی چیز کی تلاش میں ہے۔ وہ سپردائز ہی ہو سکتا تھا۔ اسی کے پاس بیرونی دروازے کی چابی ہوتی تھی۔ گوکہ دوسرے دروازوں اور کھڑکیوں کی حالت بھی اتنی خستہ تھی کہ ان کے ذریعے کوئی بھی شخص بہ آسانی اندر آ سکتا تھا۔

میں نے دوربین کے ذریعے دیکھنے کی کوشش کی۔ میں اوپر کے کمرے میں روشنی کر سکتی تھی لیکن اتنی دیر میں تلاشی لینے والا کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اپنا ارادہ ملتوی کر دیا پھر خیال آیا کہ لوریل یا اینڈریوز کو فون کروں لیکن وہ بھی میری نظر میں مشکوک تھے۔ اس لیے میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ میں جانتا چاہ رہی تھی کہ تلاشی لینے والا اب کیا کرتا ہے۔

میں نے ایک منٹ کے لیے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور انہیں ملنے لگی پھر میں نے دوربین میں دیکھا تو میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں یا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک سائے کو عقبی پورچ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اس نے ایک بڑی سی برساتی پہن رکھی تھی جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور دور کہیں سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ سایہ چند لمحوں تک عقبی دروازے کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا اور اندر آنے کے بعد اسے بند کر دیا۔

ایک بار پھر میں نے پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچا۔ اوپر والی کھڑکی سے میں نے ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سپردائز ہی ہے پھر وہ مطالعے کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ اچانک ہی اس کی ٹارچ کی روشنی ایک دائرے کی شکل میں گھومی اور غائب ہو گئی۔

دوسرے روز مجھے پولیس کو بتانے میں بہت مشکل پیش آئی کہ میں نے کیا دیکھا یا کیا سنا۔ میں حلفیہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے واقعہ نگاری پر عبور حاصل ہے لیکن اتنا معلوم تھا کہ روشنی غائب ہونے کے چند لمحوں بعد میں نے کیا سنا تھا۔ وہ ایک ضرب کی آواز تھی لیکن دھماکا نہیں تھا پھر ایسی کئی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد گرج جگ شروع ہو گئی۔

شاید یہ آواز ضربوں سے پہلے آئی تھی۔ مجھے اس بارے میں یقین نہیں تھا۔ پھر ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کہیں گولی چلی ہو۔ اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔

میں فوراً ہی فون تک پہنچی اور پولیس کو اطلاع دی۔ ممکن ہے کہ مجھے چند لمحوں کی تاخیر ہو گئی ہو کیونکہ میں کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ پر جم رہی تھی۔ میں نے پولیس کو بتایا کہ غالباً کسی کو گولی لگی ہے۔ میں نے انہیں محل وقوع سے بھی آگاہ کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ جب میں ان سے بات کر رہی تھی تو میں نے مزید کچھ آوازیں سنیں، جہاں تک کر دیکھا تو کوئی شخص سیاہ برساتی پٹے ہوئے عقیقی پورچ سے نمودار ہوا اور میرے گھر کے برابر سے گزرتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ میرے کانوں میں دور کہیں سے سائرن بجنے کی آواز آرہی تھی۔

اس طرح کی خطرناک صورت حال میں ہر بات دھندلی اور غیر واضح معلوم ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جانتی ہوں کہ پولیس میرے فون کرنے پر دوڑی چلی آئی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے انہیں گولی چلنے کے بارے میں بتا دیا۔ جس پولیس والے سے میری بات ہوئی، اس کا چہرہ بھی الجھا ہوا تھا، جانتی ہوں کہ ان کے کہنے پر میں کچن میں ہی ٹھہری رہی۔ میری نظریں کھڑکی سے باہر جمی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ایسبویٹس آئی اور اس میں سے لوگ اتر کر مکان کے اندر گئے اور کسی کو اسٹرینچر پر ڈال کر باہر لے آئے۔

اب سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ میں اپنے گھر میں ہی موجود رہی اور پولیس کو وہ تمام تفصیلات بتا دیں جو مجھے معلوم تھیں۔ میں نے انہیں اس سائے کے بارے میں بتایا اور سپروائزر کا حلیہ بھی بیان کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس مکان میں کسی قیمتی چیز کی موجودگی کا امکان ہے۔ پولیس والوں نے میری بات توجہ سے سنی گو کہ میں اس وقت خود بھی تھوڑی سی مکر رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ گولی چلنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور جسے میں گولی کی آواز سمجھ رہی تھی وہ غالباً کسی ٹرانسفارمر کے پھٹنے کی آواز ہوگی۔ انہیں وہاں سے سیزمیںوں کے نیچے پڑی ہوئی ایک آدمی کی لاش بھی ملی جس کے سر پر شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ غالباً یہ کوئی حادثہ تھا لیکن ابھی اس کا تعین نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں۔

میں انہیں کیا بتاتی کہ ان دنوں لوئیس ایلکٹوٹ پر ہی کام کر رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس موضوع پر کتاب لکھ

سکوں گی کہ ہم عورتیں اس سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ لہذا میں اس معاملے میں مہم عزم تھی اور میرا لودیل یا اینڈریوز سے مقابلہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میں یقیناً اس گھر کی نگرانی کرنا چاہ رہی تھی۔ شام تک اس خبر کی تصدیق ہو گئی کہ مرنے والا سپروائزر راکمن پر بلا ہی تھا اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ سپروائزر نے بھی اس مکان میں کسی قیمتی چیز کی موجودگی کی افواہ سنی ہوگی اور وہ اس کی تلاش میں آیا ہوگا اور وہ 'سایہ' بھی اسی لیے وہاں آیا ہوگا لیکن ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ درحقیقت وہاں کیا واقعہ پیش آیا۔

رات کو اندھیرا پھیلتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنا مورچا سنبھال لیا گو کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ کچھ دیکھ سکوں گی۔ کم از کم اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ لہذا جودماغ میں آیا وہی کیا۔ میں نے پہلی چیز جودیکھی وہ روشنی کی چمک تھی۔ گھاس میں پڑی ہوئی کسی چیز پر چاندنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ کوئی جگنو نہ ہو لیکن فوراً ہی اسے مسترد کر دیا کیونکہ جگنو عموماً اس وقت روشنی دیتے ہیں جب وہ فضا میں پرواز کر رہے ہوں۔ لہذا میں نے اپنی بڑی دور بین نکالی اور اس شے کا معائنہ کرنے لگی۔ یقیناً وہ کوئی جگنو یا روشنی کا کیڑا نہیں تھا اور نہ ہی میں نے گزشتہ شب ایسی کوئی چیز دیکھی تھی اور جب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کیا ہے تو میری سانس گویا رک گئی۔ پھر میں نے اپنی آنکھوں سے دور بین ہٹائی اور اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے یہی خیال آیا کہ یہ کوئی بکسوا (Buckle) ہے۔ کیونکہ میں نے حال ہی میں لوئیس کی ایک کہانی ختم کی تھی جس کے عنوان میں بھی یہ لفظ موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر دور بین آنکھوں سے لگائی اور دوبارہ اس چیز کا معائنہ کرنے لگی لیکن اپنے آپ کو یقین دلانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں قریب جا کر اسے دیکھوں۔ میں نے دور بین میز پر رکھی۔ ایک نارچ اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گئی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی باڑ عبور کی اور ایلکٹوٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ جسک کردہ چیز اٹھائی۔ وہ واقعی ایک چاندی کا بکسوا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ضرور اس بڑی برساتی سے گرا ہوگا جو اس سائے نے پہن رکھی تھی۔ ایک بار پھر مجھے لوئیس کی کہانی کا خیال آیا اور میرے دل میں مزید جاننے کی خواہش ابھری۔

میں پولیس کے لگائے ہوئے زرد فیتے کے نیچے سے

عزم

ادھیڑ عمر بیوہ پڑوس کے نوجوان سے کہہ رہی تھی۔ ”پیسہ پیسا جوڑ کر میں نے دو ہزار روپے جمع کیے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری تدفین کے اخراجات ان ہی روپوں سے ہوں۔ وہ روپے میرے صندوق میں رکھے ہیں۔“

نوجوان نے تردد سے کہا۔ ”خالہ! نکاح کر لیتیں تو اچھا تھا۔ کوئی دکھ سکھ کا سا بھی تو ہوتا۔ کریم بخش بھی رنڈوا ہے، پریشان حال ہے۔ تم سے کوئی دس سال ہی چھوٹا ہوگا۔ کہو تو اس سے بات کروں؟“

”جیسی تمہاری مرضی بیٹے۔ تم ہی میرے خیر خواہ ہو۔“ بیوہ نے لمبی سرد آہ بھر کر کہا۔

نوجوان بولا۔ ”لیکن خالہ!..... اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ تمہاری رقم نکاح پر اٹھ جائے گی جو تم نے کفن دفن کے لیے جمع کر رکھی ہے۔“

”تو کیا ہوا بیٹا۔ میں اور جمع کر لوں گی۔“

بیوہ نے ایک نئے عزم سے کہا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

مزدوروں کو کام کے بارے میں ہدایات دے سکے۔ بہر حال اس نے غلط وقت پر غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میں نے آتش دان پر نظریں جمادیں اور سوچنے لگی کہ شاید سپروائزر کو مطلوبہ چیز مل گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ناکامی ہوئی ہو۔ یہ امکان بھی تھا کہ جس کسی نے اس کے سر پر ضرب لگائی، اس کے پاس وہ چیز ہو۔ میں بیچوں کے بل چلتی ہوئی آتش دان تک گئی اور جھک کر ٹارچ نیچے کر دی۔ میں نے ان میں سے ایک ٹائل کو کھینچا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ میں نے لکڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھایا اور اس سے آہستہ آہستہ چند دوسرے ٹائلوں پر ضرب لگائی اور صبح جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے اس کے نیچے خلا ہے۔ میں نے اسے انگلی سے اٹھانے کی کوشش کی جہاں سے سینٹ جھڑ چکا تھا۔ ٹائل نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور مزید چند ٹائل ہٹا دیے اور مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی لیکن وہ چیز مجھے مل گئی تھی۔

میں نے اسے بڑی احتیاط سے باہر نکالا۔ کاغذ بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن تحریر اب بھی واضح تھی۔ ”آسیب زندہ ہوٹل“

مگر کرپورچ تک پہنچی اور عقی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میری توقع کے مطابق وہ زیادہ دور نہیں تھا اور نہ ہی اسے مقفل کیا گیا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہلایا لیکن کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ دوسری بار کوشش کرنے پر وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا۔ میں نے ایک بار پھر اسے دھکیلا، اس میں ہلکی سی چرچاہٹ پیدا ہوئی اور وہ تھوڑا سا کھل گیا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں بیک وقت خوف، جوش اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ان میں سے کوئی بات بھی ترتیب میں نہیں تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے فیصلہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی پھر اسے بند کر دیا۔ چند لمحوں کھڑی سوچتی رہی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ چند گہری سانس لینے کے بعد میں نے اس کا جواز تلاش کر لیا۔ ٹارچ روشن کی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ایک کونے میں کاٹھ کباڑ کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے کونے میں فرش پر اوزار بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے میں صرف ہتھوڑوں اور ڈرل کو ہی پہچان سکی۔ دوسرے اوزاروں کے بارے میں مجھے معلومات نہیں تھیں۔ دو تین جگہوں پر دیوار کا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آرہی تھیں۔ لکڑی کا فرش جس پر میں کھڑی ہوئی تھی، ٹھوس اور تیار لگ رہا تھا۔ میں ایک دوسرے دروازے سے گزر کر عقی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں مزید کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ پھر میں سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ سپروائزر کی لاش اسی جگہ سے ملی تھی۔ میں یہ شرط لگانے کے لیے تیار تھی کہ کسی نے عقب سے اس پر لکڑی یا ہتھوڑے سے بھاری ضرب لگائی تھی اور اسے ان سیڑھیوں سے دھکا دے دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس شخص کو جانتی ہوں جس نے یہ قتل کیا تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اس کمرے تک پہنچی جس کی کھڑکیاں میرے گھر سے نظر آتی تھیں۔ میں نے ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے ایک آتش دان نظر آیا جس کی بیرونی دیواروں پر دو کٹورین طرز کے ٹائلز لگے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ ابھی تک کام کرنے والے مزدوروں نے اس کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔ البتہ ایک کونے میں کچھ کاٹھ کبائڑ پڑا ہوا تھا۔ بے چارہ سپروائزر۔ شاید وہ اس کمرے میں ایلکٹوٹ کے مسودوں کی تلاش میں آیا ہو یا اس نے صرف کمرے کا معائنہ کیا ہوتا کہ

از لوئیسائے ایلکوٹ۔ میں نے احتیاط سے مسودہ نیچے رکھا اور بولی۔

”کہاں ہے؟“

”کونے میں۔ کھڑکی کے پاس۔“

میں نے لپک کر پستول اٹھایا اور کھڑے ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ یہاں سے چھلانگ لگانے کی صورت میں مجھے شدید چوٹ لگ سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ میں نیچے پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر پر گر جاتی۔ ایسی صورت میں میری موت واقع ہو سکتی تھی۔ ورنہ اتنی زخمی ضرور ہو جاتی کہ سیسلیا کو مسودہ اٹھانے اور نیچے آ کر میرے سر پر ضرب لگانے کا موقع مل جاتا۔ لہذا میں نے چھلانگ لگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سیسلیا کے پاس سے گزرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

لوریل نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہیں اس چاندی کے بکسل سے یہ سراغ ملا۔ تم جانتی تھیں کہ سیسلیا نے یہ کہانی پڑھ رکھی تھی؟“

”یہ تو بالکل واضح ہے۔ اس تقریب میں اس نے کہانی کے جس مرکزی کردار کا روپ دھارا، وہ چاندی کے بکسل لگے جوتے پہنتی تھی، لہذا اس نے بھی وہی جوتے پہنے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس مکان میں لوئیسائے کا کوئی مسودہ ہے تو وہ اسی جگہ چھپایا گیا ہوگا جہاں کہانی میں بوڑھی عورت مرکزی کردار کو بلیک میل کرنے کے لیے چھپاتی ہے لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ لوئیسائے کو مسودہ چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔“ لوریل نے کہا۔ ”میری ریسرچ کے مطابق اس نے آسیب زدہ ہوٹل کا مسودہ اس خاندان کی لڑکی کے لیے تحریر کیا تھا جن کے ساتھ وہ قیام پزیر تھی۔ اس نے وہ مسودہ اس لڑکی کو دے دیا تھا لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔“

”مگر اس سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ یہ مسودہ آتش دان میں کیوں چھپایا گیا؟“

”اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جب خاندان کے سربراہ کو کاروبار میں نقصان ہونے لگا تو وہ افراتفری میں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ارادہ واپس آنے کا تھا۔ لہذا اس لڑکی نے اس ڈر سے کہ کہیں خالی مکان میں چور نہ آجائیں، وہ مسودہ آتش دان میں چھپا دیا۔ بہر حال وہ خاندان کبھی واپس نہیں آیا۔ وہ لڑکی نمونیا میں مبتلا ہو کر مر گئی اور باپ دوا لیا ہو گیا۔“

میں ابھی تک حیرانی کی وجہ سے جھکی ہوئی تھی کہ میں نے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ میں نے بڑی احتیاط اور تیزی سے وہ مسودہ اسی جگہ رکھا۔ کھڑی ہوئی اور مڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے سیسلیا ایڈورڈ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا پستول اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ میں نے اپنی نظریں پستول پر جمادیں۔

”یہ مسودہ مجھے دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”آہستہ سے اٹھاؤ اور اپنے سامنے فرش پر رکھ دو۔ پھر کھڑکی کی طرف منہ کر لو۔“

میں جانتی تھی کہ اس کے دماغ میں کیا ہے۔ اس کا پستول استعمال کرنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ اس نے بھی میری طرح لوئیسائے کی کہانی Betrayed by a buckle پڑھ رکھی تھی۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر کھڑکی کے قریب گئی تو وہ کسی بھی طرح میری کھوپڑی پر لکڑی سے ضرب لگا کر مجھے کھڑکی سے باہر دھکا دے دے گی۔ جیسے اس نے سپر وائر کے سر پر ضرب لگائی تھی یا لوئیسائے کی کہانی کا کردار کھڑکی سے گر کر مر گیا تھا۔

”جلدی کرو۔“ وہ خرائی۔

میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن میں کچھ وقت لینا چاہ رہی تھی تاکہ کوئی ترکیب سوچ سکوں۔ میں نے آہستہ سے نیچے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بوسیدہ حالت میں ہے۔“

میں مسودہ اٹھانے کے لیے مڑی اور نکلے ہوئے ٹائل کو دیکھنے لگی۔ شاید میں یہ سیسلیا پر پھینک دیتی۔ میں نے اپنی پشت اس طرح رکھی کہ میرے بازو نظر نہ آسکیں۔ مسودہ ٹائل پر رکھا اور آہستہ سے کھڑی ہو گئی۔ میں ایک ہاتھ سے مسودہ نہیں پکڑنا چاہ رہی تھی کیونکہ اس طرح بوسیدہ کاغذات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے دوسرے ہاتھ سے ٹائل پکڑنا تھا۔

میں آہستہ سے مڑی اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ ایک سیاہ سایہ بڑی احتیاط سے سیسلیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے اسے دیکھتی رہی۔ مجھے پوری امید تھی کہ سیسلیا کو پستول استعمال کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس نے سیسلیا کو گردن سے پکڑ لیا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر بڑا۔ میں گھٹنوں کے بل جھک گئی پھر مجھے ایک چیخ سنائی دی۔

”پستول اٹھاؤ۔“ لوریل نے چلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

اس مکان سے زندہ واپس نہ آتے اور تمہاری لاش بھی کلاڑیوں کے ساتھ ہی ملتی۔“

”لیکن کیا ہم جانتے ہیں کہ اسی نے سپروائزر کو قتل کیا اور کیوں؟“

”اگر تم نے آج شام کی خبریں سنی ہوں جن میں میڈیکل ایگزامینر کی رپورٹ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جس کے مطابق سیزچوں سے گرنے سے پہلے ہی اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ شاید ہم کبھی نہ جان سکیں کہ سیسلیا نے اس کے سر پر شدید ضرب کیوں لگائی تھی۔ شاید وہ آتش دان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا اور وہ اس گھر میں اس کی موجودگی سے پریشان ہو گئی تھی۔ وہ خود یہ مسودہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔“

لوریل نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس رات وہ مسودہ اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئی؟“

”عین اسی وقت ٹرانسفارمر پھٹ گیا اور میں نے پولیس کو فون کر دیا جو فوراً ہی آ گئی۔ سیسلیا کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ مطلوبہ ٹائل کو تلاش کر کے مسودہ نکال سکے۔“

لوریل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مکان کے مالک نے یہ مسودہ یونیورسٹی کو عطیہ کر دیا ہے۔ جتنی جلدی ہم اس کے تحفظ کے لیے کام کر سکیں، بہتر ہوگا۔ البتہ تین دن کے اندر میں تمہارے ساتھ ڈنر ضرور کروں گا۔ معاف کرنا۔ اس وقت میں چائے کے لیے نہیں رک سکتا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد ہم اسی پورچ میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔ اس دوران میں کچھ ضروری کام نمٹا لوں۔“

”مثلاً؟“ لوریل نے پوچھا۔

”ابھی مجھے ایکلوٹ کی پانچ کہانیاں اور پڑھنا ہیں۔ کون جانے ان میں سے بھی کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“

لوریل کے جانے کے بعد میں اپنے بیڈروم میں گئی۔ لوئیس کی کہانیوں کا مجموعہ اٹھایا۔ ایک نظر ایکلوٹ ہاؤس کی کھڑکی پر ڈالی اور واپس پورچ میں آ کر اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے کتاب کھولی اور اپنی محبوب مصنفہ کی اگلی کہانی پڑھنے لگی۔ اسے خراج تحسین پیش کرنے کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہو سکتا تھا کہ میں اس کے نایاب مسودے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”ہونہ۔“ میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک اور سوال کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس تقریب میں میرے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت سیسلیا کی ماں تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی تعلق ان لوگوں سے رہا جو جن کے پاس لوئیس نے قیام کیا تھا؟“

لوریل حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”اس سے پہلے کہ تمہیں بتاؤں، میں ایک سوال اور پوچھنا چاہوں گی۔ کیا سیسلیا کے آباؤ اجداد میں سے کوئی اس خاندان کے لیے کام کیا کرتا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ اس بوڑھی عورت کی پردادی.....“ لوریل نے کہا۔

”نہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ اس چھپے ہوئے مسودے کی افواہ اسی خاندان کے کسی فرد نے پھیلائی ہوگی جو یہاں کے دوسرے رہائشیوں کی طرح سیسلیا کی ماں نے بھی سنی اور جب اس مکان کی مرمت کا کام شروع ہوا تو اس افواہ کو ایک نئی زندگی مل گئی۔“

”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ لوریل نے پوچھا۔

”اوہ مجھے یاد آ گیا۔ اس کہانی میں وہ بوڑھی عورت اس خاندان میں کام کرتی ہے۔ میں یہ حصہ بھول گیا تھا۔“

میں مسکرائی۔ ”لیکن تمہیں یہ یاد رہا کہ وہ مسودہ آتش دان میں چھپایا گیا تھا۔ اسی لیے تم اس رات اس گھر میں آئے۔ میں کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ اگر تم نہ آتے تو آج کلاڑیوں کے ساتھ میرے ساتھ ہوتا اور میں اسے کھڑکی سے اسی طرح دھکا دیتی جیسا کہ کہانی میں بتایا گیا ہے۔“

”کلاڑیوں کے؟“

”میں سپروائزر رائنمن کی بات کر رہی ہوں۔ اس کی شکل کلاڑیوں کے ساتھ بہت ملتی تھی۔“

”مجھے یاد تھا کہ کہانی میں مسودہ کہاں چھپایا گیا تھا۔ میں سیسلیا سے پہلے اسے حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر اس نے پوری کوشش کی کہ مجھے اپنے ساتھ لے کر وہ اس مکان میں آئے۔“

”کیوں؟“

”میرا خیال ہے کہ اسے شک ہو گیا تھا کہ میں اس مسودے کے بارے میں جانتا ہوں۔ میرے انکار کے باوجود بھی وہ باز نہیں آئی۔“

”اگر تم اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ چلے جاتے تو وہ تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیتی اور شاید تم

جب جب انسان رب کائنات کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے تجسس کی ابتدا شاید اپنی ہی ذات سے ہوتی ہے کیونکہ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق ہوئی اور انسان کو کائنات کی سب سے معتبر حیثیت سے نوازا گیا... لیکن تمام انسانوں میں اسے محبوب وہی بندے ہیں جو اس کے اطاعت گزار اور برگزیدہ ہیں... غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی انہی خاص اور مقرب بندوں میں ہوتا ہے جن کی کوئی بات باری تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ سبحان اللہ۔ اگرچہ ان رستوں میں شیطان قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتا ہے مگر بندگی کا اصل مزہ ہی ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں ہے۔

حضرت عبدالقادر جیلانی کی زندگی کے ایمان افروز واقعات



دوسرا اور آخری حصہ

حضرت محبوب سبحانی

غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء نسیم بلگرامی



ایک قاری آپ کے سامنے قرأت کر رہا تھا۔ آواز کے سوز اور دلکش لحن نے حاضرین کو اپنے آپ میں نہیں رہنے دیا تھا۔ آپ بھی ایک خاص کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ جب قاری نے لمن الملک الیوم (آج ملک کس کے واسطے ہے) پڑھا تو آپ کو حال آگیا اور وجد کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور نہایت پُر جوش لہجے میں پوچھا۔ ”من یقول الملک لی (کوئی ہے جو کہے کہ ملک میرے واسطے ہے)“

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروری 2017ء

225

سپینس ڈائجسٹ

حاضرین مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ ہر کوئی دم بخود تھا۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہنے کی ہمت کر سکتا کہ میں کہتا ہوں، یہ ملک میرے واسطے ہے۔

آپ نے حاضرین پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر وہی سوال کیا۔ ”کوئی ہے جو یہ کہنے کی ہمت کرے کہ ملک میرے واسطے ہے؟“

شیخ احمد نامی ایک شخص کھڑا ہوا اور نہایت جرأت اور دلیری سے کہا۔ ”یہ میں کہتا ہوں کہ یہ ملک میرا ہے کیونکہ خدا میرا ہے اس لیے اس کا ملک بھی میرا ہے۔“

آپ نے عالم وجد میں نہایت پرجوش لہجے میں کہا۔ ”اے نادان انسان! جب تک تو خود اس کا نہ ہو جائے، یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ وہ تیرا ہے اور جب تو اس کا نہیں تو ملک تیرا کیونکر ہو سکتا ہے؟“

اس جواب نے شیخ احمد کو پاگل کر دیا، اس کا دماغی توازن جاتا رہا اور وہ کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا۔

☆☆☆

شیخ مظفر بن منصور بن مبارک واسطی عین عالم شباب میں آپ سے ملاقات کرنے گئے۔ شیخ مظفر نہایت عالم و فاضل شخص تھے۔ انہیں علوم روحانیہ اور فلسفے سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ان کے پاس ایک ایسی کتاب ہر وقت رہتی تھی جس میں علوم روحانیہ اور مسائل فلسفہ پر بحث کی گئی تھی۔ انہیں یہ کتاب بے حد پسند تھی چنانچہ یہ جس وقت حضرت عبدالقادر کی خدمت میں پہنچے، اس وقت مذکورہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے شیخ مظفر سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں یہ کوئی کتاب ہے اور اس میں کن مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ آپ نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! یہ کتاب جو تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہاری اچھی رفیق نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کو دھو ڈالو۔“

شیخ مظفر کو جہاں یہ کتاب بہت عزیز تھی تو وہیں آپ کی صحبت اور دوستی بھی بہت عزیز تھی۔ ذرا سے غور و فکر کے بعد شیخ مظفر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو فی الحال کہیں چھپا دیا جائے۔ اس کتاب کے بعض مسائل انہیں ازبر ہو گئے تھے اور وہ انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ وہ اس کتاب کو کہیں چھپا دینے کی نیت سے اٹھے، آپ نے شیخ مظفر کو بڑی توجہ سے دیکھا۔ ان نظروں نے غضب ہی کر دیا۔ شیخ مظفر اٹھنا چاہتے تھے مگر نہیں اٹھ سکے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں کسی نے باندھ کر ڈال دیا ہے۔

ایسی حالت میں آپ نے پوچھا۔ ”وہ کتاب کہاں ہے؟“

شیخ مظفر نے کہا۔ ”حضرت! حاضر کرتا ہوں۔“

لیکن یہ کتاب ان کے حوالے کرتے ہوئے انہیں شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔

آپ نے شیخ مظفر سے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں، وہ کتاب کہاں ہے؟“

شیخ مظفر نے بہ آواز بلند کہا۔ ”وہ کتاب حاضر ہے، ملاحظہ فرمائیں اور کوئی حکم ہو تو مطلع فرمائیں۔ اللہ نے چاہا تو بے ریا، مخلص اور متفق انسان ٹھہروں گا۔“

آپ نے کتاب ہاتھ میں لی اور فرمایا۔ ”اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے، وہ مسائل فلسفہ پر ہے۔“ آپ نے کتاب ہاتھ میں لے کر فوراً ہی واپس کر دی اور فرمایا۔ ”یہ کتاب تو بہت اچھی ہے، اس کا کیا کہنا۔ واہ واہ سبحان اللہ۔“

شیخ مظفر نے یہ کتاب دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کو الٹ پلٹ کر جو دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے اوراق سادہ تھے۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

شیخ مظفر نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ نے اس کتاب کو دھو ڈالا، خوب! اب یہ میرے کسی کام کی؟“

آپ نے سادہ کتاب دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس پر اپنا داہنا ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ ”شیخ! یہ کتاب تم ہی رکھ لو اپنے پاس..... بڑی عمدہ کتاب ہے۔ ابن ضریس کی فضائل القرآن۔ اس کو اپنے زمانے کے بہترین خوش نویس نے لکھا ہے۔“

آپ کچھ دیر شیخ مظفر کی صورت دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ ”شیخ! جو بات تمہاری زبان پر نہیں، ابھی دل ہی میں ہے اور تم اس سے توبہ بھی کرنا چاہتے ہو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

شیخ مظفر نے جواب دیا۔ ”بیشک حضرت! میں اس سے توبہ کرنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اچھا شیخ! اٹھو۔“

شیخ مظفر اٹھے اور پوچھا۔ ”فرمائیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم نے اپنی فلسفے والی کتاب میں جو کچھ پڑھا تھا، تمہارا بہت تویا د ہو گا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سپنس ڈائجسٹ فروری 2017ء

شیخ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں یاد کیوں نہیں۔ تھوڑا بہت کیا سنی، کتاب کا بیشتر حصہ یاد ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس کا کچھ حصہ سناؤ۔“

شیخ نے کہا۔ ”بہتر ہے سنا تا ہوں۔“

اس کے بعد شیخ نے بڑی کوشش کی کہ اسے جو کچھ یاد ہے، سنادے لیکن شیخ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو جو کچھ بھی یاد تھا، دل و دماغ پر سے حرف غلط کی طرح محو ہو چکا تھا۔

آپ نے فرمایا۔ ”شیخ! سوچ کیا رہے ہو، کتاب کی طرح ہر بات ذہن اور حافظے سے بھی محو ہو چکی ہے۔“

شیخ مظفر کو چکر آ گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔

شیخ مظفر کچھ عرصہ آپ کی صحبت میں رہے اور پھر کچھ عرصے کے لیے سیر و سیاحت کو نکل گئے۔ گھوم پھر کر جب دوبارہ

آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ ”شیخ! کہاں گھوم پھر آئے؟“

شیخ مظفر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری سیر و سیاحت کی داستان تو لمبی بھی ہے اور عجیب بھی مگر یہیں قریب ہی میری

ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو خود کو روحانیت میں بہت پہنچا ہوا سمجھتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”وہ شخص خود کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے؟ کیا کہتا ہے؟“

شیخ مظفر نے کہا۔ ”وہ شخص کہتا ہے کہ میں حضرت یونسؑ سے زیادہ بلند مرتبہ ہوں (توبہ استغفار)۔ معلوم نہیں وہ ایسا

دعویٰ کیوں اور کس بنیاد پر کرتا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس شخص کو میں ذاتی طور پر تو نہیں جانتا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس شخص کی زندگی کے دن

پورے ہو چکے ہیں اور وہ عنقریب اس دنیائے آب و گل سے پیچھا چھڑا لے گا۔“

شیخ مظفر یہ سنتے ہی اس بزرگ کی طرف بھاگ کر پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے در پر آنے والوں کا سو گوار

ہجوم تھا۔ وہ لوگ رو رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ وصال پا چکے ہیں۔

☆☆☆

آپ لبو و لعب کے خلاف تقریر فرما رہے تھے۔ مجمع کا حال بے قابو تھا۔ کسی کو بھی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ تقریر کرتے

کرتے آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا۔ ”میں تم لوگوں سے زیادہ نہیں صرف

سودینار مانتا ہوں۔“

آپ کی زبان سے یہ مطالبہ نکلا ہی تھا کہ بہت سارے لوگ سودینار لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے

ان میں سے ایک سے سودینار لے لیے اور بقیہ سے نہیں لیے۔

لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی۔ ایک صاحب سے رہا نہیں گیا۔ آگے بڑھ کر پوچھ ہی لیا، بولے۔ ”جناب! ایک بات اپنی

سمجھ میں نہیں آئی۔ جب آپ نے سودینار طلب کیے تھے تو ایک سے سودینار لے کر بقیہ کو واپس کر دینا عجیب سا لگتا ہے۔“

آپ نے اپنے خادم ابوالرضا کو آواز دی اور کہا۔ ”تو اسی وقت مقبرہ شونیز یہ پر چلا جا۔ وہاں ایک بوڑھا شخص بیٹھا

بربط بجا رہا ہوگا۔ تو یہ سودینار اس مستحق کو دے دے جا کر۔“

خادم ابوالرضا نے پوچھا۔ ”بس، یا کوئی اور حکم؟“

آپ نے فرمایا۔ ”تو اس بربط نواز کو میرے پاس ضرور لائے گا۔“

خادم نے عرض کیا۔ ”اور اگر اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تب پھر میں کیا کروں گا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر اس نے آنے سے انکار کر دیا تو جو کچھ بھی کرنا ہوگا میں کروں گا، تم کیوں کرو گے؟“

خادم ابوالرضا سودینار لے کر مقبرہ شونیز یہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ مقبرے پر پہنچا تو اس نے دیکھا، ایک بوڑھا

شخص مقبرے کے قریب زمین پر بیٹھا بربط بجا رہا ہے۔ خادم ابوالرضا نے بربط نواز کو مخاطب کیا۔ ”دیکھو، ادھر آؤ میرے

پاس۔ خدا نے تمہیں کئی خوبیاں دی ہیں۔ ہمارے شیخ عبدالقادر بہت ہی بلند مرتبہ شخص ہیں۔ یہ سودینار انہوں نے آپ کو بھیجے

ہیں براہ کرم انہیں وصول فرما لیجیے۔“

خادم ابوالرضا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے عرض کیا۔ ”یا شیخ گرامی قدر! اب میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“

کسی نے خادم کی یہ آواز سن لی، اس نے پوچھا۔ ”یہ شیخ گرامی قدر سے تیری کیا مراد ہے؟“

خادم نے جواب دیا۔ ”شیخ گرامی قدر سے مراد ہے شیخ عبدالقادر جیلانی۔“

سوال کرنے والے نے کہا۔ ”لیکن تو ان کے پاس کیوں جائے گا؟“

خادم ابو الرضا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”ارے احمق! میں ان کا خادم ہوں۔“ اس کے بعد انہوں نے بربط نواز سے

کہا۔ ”جناب! آپ کو ذرا زحمت تو ضرور ہوگی مگر میں کیا کروں، مجھے کو جو حکم ملا ہے میں وہ بجالاؤں گا۔“

بربط نواز کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا، بولا۔ ”واللہ، میری یہ دلی خواہش تھی کہ مجھے شیخ عبدالقادر جیلانی کا

دیدار اور ذرا سی دیر کے لیے صحبت میسر آ جائے چنانچہ میری خواہش پوری ہو چکی۔ اب شاید میری کوئی خواہش نہیں۔“

بربط نواز نے بربط کا ندھے پر رکھا اور خادم ابو الرضا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جس وقت یہ دونوں آپ کی مجلس میں پہنچے

آپ وعظ بیان فرما رہے تھے۔

آپ نے کچھ دیر کے لیے وعظ کو روک دیا اور فرمایا۔ ”افسوس کہ میں آج اس بوڑھے بربط نواز کو اپنی محفل میں اس منبر

پر بلوار ہوں جہاں آج سے پہلے کوئی معمولی حسب نسب کا انسان نہیں پہنچ سکا۔“

لوگوں نے نعرے بلند کیے اور آپ نے بربط نواز کو اپنے پاس کھڑا کر کے اس کو حکم دیا۔ ”بربط نواز! ان لوگوں کو اپنی وہ

داستان سنا دے جس کا سودینار سے گہرا تعلق ہے۔“

بربط نواز نے بتانا شروع کیا۔ ”صاحبان! میں اپنی صغریٰ ہی سے بربط نوازی کا شوق پورا کر رہا ہوں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے

رک گیا اور پھر بولنا شروع کر دیا۔ ”جب میرے گانے کا اعلان ہوتا تھا تو ہر طرف سے اٹھ اٹھ کر لوگ آ جاتے تھے لیکن جب میں

کبریتی کو پہنچا تو لوگوں کا مجھ پر دیاؤ کم ہو گیا اور انہوں نے مجھ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں

یہ دکھ نہیں جھیل سکتا۔ میں نے یہ قسم کھائی کہ اب میں ان لوگوں کو گام کر نہیں سناؤں گا اور اب میرے گانوں سے کبریت حضرات خود ہی

بایس اور دل برداشتہ ہو جایا کریں گے۔ اب میری اچھی اور پیاری دھنیں صرف مُردے ہی سن سکیں گے۔“

وہ بولتا رہا۔ ”اس عہد کے بعد میں شہر سے نکل گیا اور مُردوں کی بستی میں ان کا دل بہلانے لگا۔ میں مُردوں کی قبروں

کے سر ہانے کھڑے ہو کر آواز لگایا کرتا تھا۔“ ہے کوئی جو مجھے کام کا انسان بنا دے۔“

اتنے میں ایک قبر میں سے ایک ہاتھ نکلا اور پھر سر نمودار ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اے شخص! تو مجھ کو کہاں تک اپنے

گانے سنائے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اب تم خدا کے بن جاؤ اور پھر دیکھو اس کی شان کبریائی کا مزہ۔ اے شخص! یہاں سے

چلا جا اور کوشش کر کہ تو اپنا گانا خدا کو سنائے۔ اس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ جب میں بیدار ہوا تو میری زبان پر یہ اشعار تھے۔

الہی قیامت کے دن کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔

بجز اس کے کہ زبان سے تیری حمد و ثنا کرتا ہوں اور دل سے امید مغفرت رکھتا ہوں۔

کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امید وار کل تیری درگاہ سے قاتل المرام ہوں گے۔

ان حالات میں اگر میں محروم رہ جاؤں تو میں اپنی بد قسمتی پر سخت افسوس کروں گا۔

خدا یا! اگر صرف نیک لوگ ہی تیری بخشش کے مستحق ہوئے

تو پھر گناہ گار کہاں جائیں گے۔ انہیں کون پناہ دے گا۔

کل قیامت کے دن میرا بڑھاپا میرا شفیع بن جائے گا۔

کیونکہ تو بڑھاپے کا خیال کر کے دوزخ سے بچا لے گا۔

میں یہ اشعار پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کے خادم نے مجھے سودینار دیے۔ اب میں گانے بجانے سے تائب ہو کر اپنے رب

کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے اپنا بربط توڑ دیا اور گانے بجانے سے تائب ہو گیا۔

گانے والا تو چپ ہو گیا مگر آپ نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ ”لوگو! اس شخص نے لہو و لعب میں راست بازی اور سچائی اختیار

کی تو خدا نے بھی اس کا ساتھ دیا اور منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ لوگو! سوچو اور بتاؤ کہ جو شخص اپنے تمام حال و احوال

میں سچائی سے کام لے، اس کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم بات کہو تو انصاف کی یعنی سچ بولا کرو۔“

جن لوگوں کو سودینار واپس دیے گئے تھے، انہوں نے وہ دینار کیجا کر کے تائب گانے والے کو دے دیے۔

ابوالفرح ابن البہا ہی جب آپ کی باتیں دوسروں کی زبانی سنتے تو بعض باتیں ان کی سمجھ میں ہرگز نہ آتیں۔ سوچتے، اگر کبھی شیخ سے ملاقات ہوگئی تو بالمشافہ بات کر کے شبہات دور کر لیں گے۔

کچھ عرصے بعد ابوالفرح بغداد کے ایک محلہ باب الازج گئے۔ جب وہ وہاں سے واپس ہوئے تو ان کا گزر آپ کے مدرسے کے قریب سے ہوا۔ اس وقت آپ کی مسجد میں عصر کی تکبیر کی جارہی تھی۔ ابوالفرح نے سوچا کیوں نہ عصر کی نماز اس مسجد میں ادا کر لی جائے اور یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ یہاں آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور ابوالفرح انہیں سلام بھی کر سکیں گے۔ ابوالفرح مسجد میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا جماعت کھڑی ہو چکی ہے۔ ابوالفرح جماعت میں شامل ہو گئے اور نماز عصر ادا کی۔

نماز اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ابوالفرح کو اشارے سے اپنے پاس بلا یا۔ جب یہ آپ کے پاس پہنچ گئے تو آپ نے فرمایا۔ ”فرزند من! اگر تم میرے پاس اپنا کام لے کر آتے تو میں تمہارا کام پورا کر دیتا۔ میں دیکھتا ہوں تم پر نیاں بہت غالب ہے۔ تم نے اس وقت بھولے سے بے وضو نماز پڑھ ڈالی۔“

ابوالفرح کو یاد آیا کہ واقعی ان سے یہ غلطی سرزد ہو چکی ہے، ان پر آپ کی دہشت غالب آگئی۔ ابوالفرح نے آپ سے درخواست کی۔ ”میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”رہو..... بشوق رہو۔“

☆☆☆

کسی نے شیخ حماد سے پوچھا۔ ”عبد القادر کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟“

شیخ حماد نے کہا۔ ”میں نے ان کے سر پر دو جھنڈے دیکھے ہیں جو زمین سے ملکوتِ اعلیٰ تک پہنچے ہوئے ہیں اور اربع اعلیٰ میں ان کے نام کی دھوم مچی ہے۔“

ایک دن شیخ حماد کی مجلس میں آپ تشریف لے گئے۔ شیخ حماد اپنے شاگرد کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ ”مرحباً بالجبل الراجح ولطود المصیف لا تحرك“ (ایسے مضبوط اور بلند پہاڑ کا آنا مبارک ہو جو کسی بھی طرح جنبش نہیں کر سکتا)

استاد نے شاگرد کو اپنے دائیں طرف بٹھالیا اور پوچھا۔ ”عبد القادر! حدیث اور کلام میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”حدیث وہ ہے جس کی خواہش کی جائے جیسا کہ سوال جواب میں ہوتا ہے اور کلام وہ ہے جو دل پر چوٹ لگائے۔ دل کا بیدار ہونے کی خواہش سے بے قرار ہونا تمام اعمال سے افضل ہے۔“

شیخ حماد آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے، فرمایا۔ ”تم سید العارفین ہو۔ تمہارا عدل و انصاف اور چرچا مشرق سے مغرب تک پہنچے گا۔ تمہارے پاؤں تلے اولیائے زمانہ اپنی گردنیں جھکا دیں گے۔ تمہارا درجہ عالی ہوگا۔ تم اپنے اقران و امثال سے فائق و ممتاز ہو گے۔“

آپ نے شیخ حماد کی مجلس میں ایک لمبی اور عجیب سی تقریر کی۔ شیخ حماد اسے بغور سنتے رہے پھر فرمایا۔ ”عبد القادر! تم عجیب تقریر کرتے ہو، کیا تمہیں یہ خوف نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کسی بات پر تم سے مواخذہ کر بیٹھے۔“

آپ نے اپنا دایاں ہاتھ شیخ حماد کے سینے پر رکھ دیا اور کہا۔ ”حضرت! آپ نورِ قلب سے ملاحظہ فرما کر یہ بتائیں کہ میری ہتھیلی پر کیا لکھا ہے؟“

تھوڑی دیر بعد جب آپ نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو شیخ حماد نے فرمایا۔ ”عبد القادر! کیا عرض کروں کہ میں نے تمہاری ہتھیلی پر کیا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہتھیلی پر لکھا ہوا ہے کہ پروردگارِ عالم نے عبد القادر سے عہد کیا ہے کہ وہ ان سے ستر مرتبہ عہد کر چکا ہے کہ وہ عبد القادر سے مواخذہ نہیں کرے گا۔“ اس کے بعد شیخ حماد نے فرمایا۔ ”پھر تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے نواز دے کیونکہ وہ اپنے فضل و کرم کا مالک ہے۔“

ایک بار آپ دورانِ سیاحت ایک ایسے جنگل میں جا پہنچے جہاں آب و دانے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آپ کو پیاس نے ستانا شروع کیا۔ اچانک اوپر بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ وہ آپ کے سر پر آگیا اور اس میں سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگے۔ آپ نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ اسی لمحے آسمان پر ایک منور چہرہ دکھائی دیا۔ اس منور چہرے نے آفاق کو روشن کر دیا۔ آپ حیرت سے اس روشنی کو دیکھ رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”عبد القادر! میں تمہارا رب ہوں میں نے تمام حرام باتیں تم پر حلال کر دی ہیں۔“

آپ نے فوراً تہ آواز بلند کہا۔ ”اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔“

اس کے بعد آپ نے روشنی کی طرف پھونک ماری تو وہ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک دھندلے دھوئیں جیسی شکل نظر آنے لگی۔ اس دھندلی شکل نے کہا۔ ”عبدالقادر! تم اپنے علم اور اللہ کے حکم سے میرے مکر سے بچ گئے ورنہ میں اپنے اس مکر سے ستر صاحب طریقت کو گمراہ کر چکا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”بے شک میرے رب کا فضل و کرم میرے شامل حال ہے۔“
لوگوں نے جب یہ واقعہ سنا تو کسی نے آپ سے پوچھا۔ ”عبدالقادر! تم نے شیطان کو کس طرح پہچانا؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”اس کے قول سے۔ اس نے کہا تھا عبدالقادر! میں نے تم پر تمام حرام چیزیں حلال کر دی ہیں، جبکہ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بخش باتوں کا کسی کو بھی حکم نہیں دیتا۔“
آپ نے ایک دن رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ اس وقت آپ کسی چیز پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی کسی چیز پر سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ کے بائیں جانب حضرت موسیٰ تھے۔ رسول اللہ نے آپ سے معاف کیا اور ایک خلعت بھی مرحمت فرمایا اور فرمایا۔ ”عبدالقادر! میں نے تمہیں خلعت قطیبت عطا کر دی ہے۔“

☆☆☆

ان دنوں دجلہ طغیانی پر تھا۔ بغداد والے خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ طغیانی ان کی آبادی میں نہ داخل ہو جائے۔ اہل بغداد آپ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی۔ ”حضور والا! آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں، کہاں جائیں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”پریشان یا خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دجلہ کو اس حد کا پابند کردوں گا جہاں تک وہ بہتا ہے۔ اس سے آگے بہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“
اس کے بعد آپ اپنا عصا لے کر دجلہ کے کنارے پہنچ گئے اور اپنا عصا ایک جگہ گاڑ دیا اور دجلہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”دجلہ! یہ تیری حد ہے۔ تو اس سے آگے نہیں بڑھے گا اور میں تجھ کو اس حد کا پابند کرتا ہوں۔“

دجلہ کی طغیانی جاتی رہی اور وہ سنسنے لگا، یہاں تک کہ وہ اپنی حد میں بہنے لگا۔
شیخ ابوالفتح محمد بن وشمس بس بھی دعا مانگتے رہتے تھے کہ اللہ مجھے کسی رجال الغیب سے ملا دے۔
اسی دوران شیخ نے خواب میں دیکھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کے مزار کی زیارت فرما رہے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے بزرگ بھی موجود تھے۔ انہیں شبہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی انہیں تلاش ہے اور یہ رجال الغیب ہے۔ اسی دوران ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ بیدار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دل میں خواہش کی کہ خدایا میں انہیں حالت بیداری میں دیکھوں۔ اس خیال اور خواہش کو لیے ہوئے یہ امام احمد بن حنبل کے مزار پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ پڑھنے کے دوران ہی ان کی نظر ایک دوسرے شخص پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ وہی شخص تھا جس کو وہ کچھ دیر قبل حالت خواب میں دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ زیارت مزار سے جلد از جلد فراغت حاصل کر کے ان بزرگ کی خدمت میں حاضری دوں مگر وہ بزرگ ان سے پہلے ہی فارغ ہو گئے۔ شیخ ابوالفتح محمد بن حنبل ان بزرگ کے پیچھے چلے، یہاں تک کہ دونوں دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ وہ بزرگ دجلہ کو اس طرح عبور کر گئے گویا خشکی پر چل رہے ہوں۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی اور بہ آواز بلند ان بزرگ کو مخاطب کیا۔ ”حضرت! میں آپ کے بارے میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟“

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”میں مسلمان ہوں اور امام اعظم ابوحنیفہ کا پیرو۔ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔“
شیخ ابوالفتح محمد واپس لوٹے اور راہ میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس واقعے کا ذکر شیخ عبدالقادر جیلانی سے ضرور کریں گے۔ یہ آپ کے مدرسے کے اندر داخل ہوئے اور یہاں آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ابھی انہوں نے اپنی آمد کی خبر بھی نہیں کی تھی کہ آپ نے اندر سے بہ آواز بلند پکار کر انہیں مطلع کیا۔ ”ابوالفتحی محمد! آج مشرق سے مغرب تک پوری روئے زمین پر ان کے سوا حنیف المذہب ولی اللہ اور کوئی نہیں۔“
شیخ ابوالفتحی محمد کو آپ کے اس کشف نے لرزہ بر اندام کر دیا۔

☆☆☆

شیخ عبداللہ موصوف آپ کی زیارت اور ملاقات کو حاضر ہوئے تو انہوں نے یہاں مشاقان دید کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتے دیکھا۔ یہ سب ایک مسافر خانے کے مسافران تھے پڑے ہوئے تھے اور آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ کچھ دیر

سینپنس ڈائجسٹ فروری 2017ء

بعد اچانک دروازہ کھلا اور اندر سے آپ نمودار ہوئے۔ آپ مسافر خانے کے سائبان تلے سے تزر کر ایک کھلی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے اور زور زور سے اعلان کرنے لگے۔ ”لوگو! جتنی جلدی ممکن ہو میرے پاس آ جاؤ کیونکہ تم وہ نہیں دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسافر خانے کی چھت غائب ہے اور تم سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے ہو۔“ لوگوں نے آپ کو دیکھا اور یہ آواز سنی تو بھاگ کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور پھر جیسے ہی مسافر خانہ خالی ہوا، مسافر خانے کی چھت زمیں میں بوس ہو گئی۔

آپ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا۔ ”کیا تم لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں پاگل ہوں جو تم سب کو بے گھر کر دوں گا۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے، میں نے گھر میں بیٹھے بیٹھے اچانک ایک آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ عبدالقادر! مسافر خانے کی چھت فوراً ہی خالی کرادو کیونکہ اس کی عمر پوری ہو چکی ہے چنانچہ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کر دیا کہ مسافر خانے کی چھت غائب ہو چکی ہے اور تم سب سے مسافر خانہ خالی کرادیا۔“

ایک دن آپ نے ایک نادار کو دیکھا جو بہت دل شکستہ اور آزرده تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ”اے شخص! تیرا کیا حال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مگر ایک مصیبت آن پڑی ہے مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”میں جانتا ہوں۔ میں تیرے مسئلے سے واقف ہوں۔ کیا تو دجلہ کے دوسرے کنارے پر نہیں پہنچنا چاہتا؟“ اس نے جواب دیا۔ ”بیشک میں دوسرے کنارے پر پہنچنا چاہتا ہوں مگر تہی دستی میں کسکی کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور کسکی والے نے رقم لیے بغیر دوسری طرف پہنچانے سے انکار کر دیا ہے۔“

انہی باتوں کے دوران ایک شخص آپ کے پاس آیا اور تیس دینار دیتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! یہ آپ کی نذر ہیں۔“ آپ نے یہ تیس دینار اس نادار شخص کو دے دیے اور فرمایا۔ ”جاؤ یہ تیس دینار ملاح کو دے دو اور اس سے کہہ دو کہ آئندہ کسی نادار یا تہی دستی سے کرایہ لینے کی ضرورت نہیں۔“

آپ نے مزید فرمایا۔ ”جب سب کچھ تو ملاح کو دے دے گا تو تیرے پاس کیا بچے گا؟“ وہ شخص آپ کی صورت دیکھنے لگا اور آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے بجا فرمایا۔ میں بالکل تہی دستی انسان ہوں۔“ آپ نے اپنی قمیض اتار کر اس کے حوالے کر دی اور فرمایا۔ ”تو اس قمیض کو میرے ہاتھ فروخت کر دے۔“ اس نے ایسا ہی کیا۔ قمیض آپ سے لے لی اور اس کو آپ ہی کے ہاتھ میں دینار میں فروخت کر دیا پھر یہ شخص آپ کے پاس سے جدا ہو کر دجلہ کے کنارے پہنچا اور تیس دینار ملاح کو دے کر آپ کا فرمان اس کے گوش گزار کر دیا۔ ملاح بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ ”آئندہ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

عباسی خلیفہ ہر ماہ آپ کی خدمت میں ایک خلعت بھیجا کرتا تھا۔ آپ اس خلعت کو ابوالفتح الطحان کے پاس بھجوا دیتے تھے کیونکہ انہی کے پاس سے مسافروں اور بے نواؤں کے لیے کھانے پینے کا سامان آیا کرتا تھا۔ آپ امراء و رؤسا اور وزراء کے پاس بھی بھیجتے جاتے۔

ایک دن کسی نے آپ کو مطلع کیا۔ ”حضرت! آپ کی خدمت میں ایک رئیس آنے والا ہے، دو پہر تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”یہ رئیس میرے پاس کیوں آئے گا؟“ جواب ملا۔ ”زیارت کی خاطر..... اور چونکہ بہت ہی معزز اور رئیس شخص ہے اس لیے یہ جدھر سے بھی گزرتا ہے لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

آپ اسی وقت اٹھ کر اندر چلے گئے اور اس وقت تک باہر نہیں نکلے جب تک وہ رئیس آ نہیں گیا۔ جب اندر آپ کو مطلع کیا گیا کہ باہر رئیس آپ کی زیارت و دید کے شوق میں مجسم انتظار بنا بیٹھا ہے۔ آپ باہر تشریف لائے اور جب تک آپ بیٹھ نہیں گئے وہ شخص کھڑا ہی رہا۔

آپ نے اسے دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔ رئیس کے چلے جانے کے بعد کسی نے ڈرتے ڈرتے آپ سے پوچھا۔ ”حضرت! ابھی ابھی آپ نے اس رئیس کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، وہ ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کون سا رویہ؟“

جواب ملا۔ ”یہ کہ پہلے تو آپ اندر چلے گئے، اس کے بعد جب وہ رئیس آگیا تو آپ اندر سے باہر تشریف لائے اور اس سے سرسری باتیں کر کے اس کو رخصت کر دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ہم اس سے کیا سمجھیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! یہ نکتہ سمجھ لے۔ جب تو نے مجھے یہ بتایا کہ یہ رئیس نہایت محترم اور عزت والا ہے، لوگ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں نے سوچا کہ کسی دنیا دار کی میں نے اتنی عزت نہیں کی، پھر اس کی کیوں کی جائے؟ اور جب وہ رئیس میرے پاس آئے گا تو مجھ کو اس کے احترام میں اٹھنا پڑے گا چنانچہ میں اٹھ کر اندر چلا گیا کہ نہ میں یہاں ہوں گا اور نہ مجھے اس کے احترام میں اٹھنا پڑے گا۔ چنانچہ جب وہ رئیس آگیا اور مجھے اندر مطلع کیا گیا تو جب میں باہر نکلا تو وہ رئیس میرے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔“

یہی سخت روئے آپ کا خلیفہ وقت کے ساتھ بھی تھا۔ جب آپ خلیفہ کو کسی وجہ سے کوئی خط لکھتے تو وہ اس طرح شروع ہوتا۔ ”عبدالقادر تجھے حکم دیتا ہے۔“ یا پھر اس طرح کہ ”تجھ پر یہ حکم نافذ کیا جاتا ہے۔ تجھ پر واجب ہے کہ اس کی اطاعت کر کیونکہ میں تیرا پیشوا ہوں اور تجھ پر حجت ہوں۔“

جب یہ نامہ خلیفہ وقت کے پاس پہنچتا تو وہ اس کو چومتا اور آنکھوں سے لگا لیتا اور کہتا۔ ”شیخ نے جو کچھ بھی فرمایا، بجا فرمایا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔“

ایک دن عباسی خلیفہ المقتدی نے اپنے وزیر سے شکایت کی، کہا۔ ”ابن ہبیرہ! کیا تم کبھی شیخ عبدالقادر کے پاس گئے ہو؟“

وزیر نے جواب دیا۔ ”میں وہاں کئی بار جا چکا ہوں۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”ان کے مہمان خانے میں کوئی کھجور کا درخت بھی لگا ہوا ہے کیا؟“

ابن ہبیرہ نے حافظے پر زور دیا اور کہا۔ ”ہاں۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”کیا تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عبدالقادر نے اس درخت کو کئی بار خلیفہ وقت فرض کر کے ایسے کلمات ادا کیے ہیں کہ وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔“

وزیر نے پوچھا۔ ”امیر المومنین! میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اگر معاملہ مکمل کر سامنے آجائے تو مجھے بات کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”عبدالقادر کھجور کے اس درخت کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ اسے کھجور کے درخت! تو سرکشی نہ کر ورنہ میں تیرا سراڑا دوں گا۔“

وزیر نے پوچھا۔ ”لیکن اس سے یہ کس طرح سمجھ لیا جائے کہ اس میں آپ کو مخاطب کر کے کچھ کہا گیا ہے؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”مجھے میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ عبدالقادر کھجور کو نہیں، مجھ کو مخاطب کر کے ایسی بات کرتے ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں خلیفہ ہوں، انہیں ایسی بات دوسروں کے سامنے نہیں کہنی چاہیے۔“

وزیر نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! عبدالقادر جلالی آدمی ہیں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے کہنے سے وہ باز آجائیں گے؟“

خلیفہ نے کہا۔ ”انہیں باز آ جانا چاہیے۔ میں ایسی اہانت برداشت نہیں کر سکتا۔“

وزیر نے دبی زبان میں کہا۔ ”امیر المومنین! میرا خیال ہے وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ کسی کے رعب میں آجائیں۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”تم جا کر کہو تو ان سے، میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔“

وزیر نے پوچھا۔ ”میں ان سے بات کس طرح کروں؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”تم جاؤ اور ان سے میری طرف سے تنہائی میں کہو کہ خلیفہ سے آپ کا تعرض کرنا مناسب نہیں ہے اور خاص کر ان حالات میں کہ آپ عالم ہیں اور آپ کو خلافت کے حقوق کا علم ہے۔“

وزیر نے کہا۔ ”امیر المومنین! میں ان کے پاس جا تو رہا ہوں مگر مجھے امید نہیں کہ میں ان باتوں سے انہیں قائل یا مرعوب کر لوں گا۔“

ابن ہبیرہ آپ کے پاس پہنچ گئے تو دیکھا وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ یہ ایک طرف بیٹھ کر خلوت و تنہائی کا انتظار کرنے لگے۔

آپ نے ابن ہبیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”یشک میں اس کا سراڑا دوں گا۔ میں خلافت کے حقوق سمجھتا ہوں اور فرائض بھی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ لوگوں کے حقوق کیا ہیں۔ جس کو بھی خلیفہ سے دلچسپی ہو وہ جا کر بتا دے کہ حقوق یا

سپینس ڈائجسٹ فروری 2017ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM

ابن ہبیرہ نے سمجھ لیا کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، ان کے لیے کہا گیا ہے۔ اب ان کا مزید بیٹھنا فضول تھا۔ وہ سلام کر کے اٹھ کر واپس چلے آئے اور خلیفہ کے پاس جا کر سب کچھ صاف صاف بتا دیا، کہا: ”امیر المومنین! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شیخ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ حقوق اور فرائض یکطرفہ نہیں ہوتے۔ کچھ خلیفہ کے حقوق لوگوں پر ہیں اور کچھ لوگوں کے حقوق خلیفہ پر واجب ہیں۔ اسی طرح کچھ فرائض امیر المومنین پر واجب ہیں اور کچھ فرائض لوگوں پر واجب ہیں اور شیخ نے اپنی گفتگو میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔“

خلیفہ نے کہا: ”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

وزیر نے جواب دیا: ”میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ ہمیں شیخ کی خدمت میں حاضری دینا چاہیے اور ان سے معافی مانگنا چاہیے۔“ چنانچہ ان دونوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور دونوں مودب بیٹھ گئے۔ آپ نے خلیفہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: ”خلیفہ! تیرے اعمال اور کارگزاریوں کو کچھ کرتے ہیں ان کے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دہ بھی تو ہے۔ تجھ کو انسانوں کا حاکم نہیں، امین بنایا گیا ہے اور اگر کوئی امین امانت میں خیانت کرنے لگے تو خود ہی جانتا ہوگا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔“ دونوں آپ کی باتیں سن کر زار و قطار رونے لگے۔ اب آپ نے ان دونوں کو نہایت نرمی اور شفقت سے سمجھانا شروع کیا۔

☆☆☆

خلیفہ المقتضیٰ کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا مستجد برسر اقتدار آیا۔ ایک رات اندھیرے میں مستجد نے آپ کی خدمت میں حاضری دی، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے ان لوگوں سے پوچھا: ”کہو کیسے آنا ہوا؟“

خلیفہ نے عرض کیا: ”حضرت! میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ نصیحتیں کریں۔“

آپ نے پوچھا: ”اگر میں نصیحتیں کروں گا تو تمہیں حاصل کیا ہوگا؟“

خلیفہ نے جواب دیا: ”اچھی باتیں..... نیک باتیں.....“

آپ نے فرمایا: ”اللہ کے غضب سے ڈر اور خاص کر ان حالات میں جبکہ تیرے اعمال بھی غضب کے لائق ہیں۔“ خلیفہ اپنے ساتھ اشرفیوں سے بھری ہوئی دس تھیلیاں بھی لایا تھا۔ یہ ساری تھیلیاں آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ آپ کو یہ تھیلیاں نہایت احترام اور عقیدت سے پیش کی گئی تھیں لیکن آپ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، بولے: ”میں انہیں لے کر کیا کروں گا؟ یہ میرے کس کام کی؟“

خلیفہ نے اصرار کیا: ”حضرت! یہ آپ کو قبول کرنا ہی پڑیں گی ورنہ میری دل شکنی ہوگی۔“

آپ نے دس میں سے دو تھیلیاں نکال لیں۔ ان میں سے ایک کو سیدھے ہاتھ میں لے لیا اور دوسری کو اٹھائے ہاتھ میں۔ اس کے بعد آپ نے ان تھیلیوں کو زور سے دبا کر نچوڑا۔ ان تھیلیوں میں سے تازہ تازہ خون بہنے لگا۔ آپ نے خلیفہ سے فرمایا: ”مستجد! تم خدا سے نہیں شرماتے، لوگوں کا خون کر کے ان کا مال تم میرے پاس لے آئے ہو۔ شرم کرو..... شرم کرو۔“ خلیفہ یہ دیکھ کر غش کھا کر گر گیا۔

آپ نے بے ہوش خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: ”مستجد! اگر تو رسول اللہ ﷺ کا ہم نسب نہ ہوتا اور مجھے یہ خاندانی حرمت عزیز نہ ہوتی، تو میں اس خون کو تیرے محللات تک بہا دیتا۔“

☆☆☆

اس عہد کے ایک مشہور صوفی شیخ عبداللہ جبائی ایک کتاب حلیۃ الاولیاء پڑھ رہے تھے۔ کتاب کا مضمون ایسا تھا کہ یہ برداشت نہ کر سکے اور زار و قطار رونے لگے۔ رونے کے دوران انہیں خیال آیا کہ مخلوق سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لینی چاہیے اور زندگی عبادت کے لیے وقف کر دینی چاہیے۔

وہ یہ سوچ کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے صوفی عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت فرمایا: ”کیا تم مخلوق سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہو؟“

صوفی عبداللہ نے جواب دیا: ”ہاں، کیونکہ میں حلیۃ الاولیاء پڑھ کر دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں۔“

آپ نے فرمایا: ”نہیں..... ایسا نہ کرنا کیونکہ اس کا بھی وقت نہیں آیا۔ ہر دست تم علم حاصل کرو۔ مشائخ طریقت کی

خدمت کرو، ان کی صحبت میں رہو۔ ان سے ادب و سلوک سیکو۔ جب یہ سب کچھ کر چکو تو تعلق سے قطع تعلق بھی کر لینا۔ علم حاصل کرنے سے پہلے اگر تم نے گوشہ نشینی اختیار کی تو جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“
صوفی عبداللہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں نہیں جانتا اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“
آپ نے فرمایا۔ ”اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ تو بے پر کے مرغ کی طرح رہ جائے گا۔ جب بھی تجھے دینی معاملات میں کوئی دشواری اور مشکل پیش آئے گی تو اس کا علم حاصل کرنے کے لیے تمہیں دوسروں کے پاس جانا پڑے گا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے باہر نکلنا پڑے گا۔ گوشہ نشینی ایسے شخص کو اختیار کرنا چاہیے جو شمع کی طرح روشن ہوتا کہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکیں۔“

☆☆☆

آپ جامع مسجد منصوری تشریف لے گئے، واپسی میں آپ نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر میں پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ دوران سفر بار بار آپ کے چہرے پر ہلکا سا کرب پیدا ہوا اور جاتا رہا۔ گھر واپس آتے ہی آپ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اپنی پیشانی پر سے ایک بچھو پکڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ یہ بچھو بھاگنے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا۔ ”موتی باذن اللہ“ (اللہ کے حکم سے مرجا) بچھو اسی وقت مر گیا۔
آپ کے ایک خادم نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا بات تھی؟ یہ بچھو کیسا؟“
آپ نے فرمایا۔ ”اس بچھو نے مجھ کو جامع منصوری سے ٹھٹھک ساٹھ بار ڈنک مارے۔ آخر کار میں نے باہر الٹی اس کو ہلاک کر دیا۔“
شیخ ابوالحسن نامی ایک صوفی آپ کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے۔ انہیں آپ سے اتنی زیادہ عقیدت اور محبت تھی کہ اکثر رات کو بھی آپ ہی کے پاس رہ جاتے اور جب بھی رات کو آپ کے پاس رہتے، رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ اگر رات کے کسی حصے میں آپ کو ان کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ پریشان نہ ہوں۔
شیخ ابوالحسن گھر کے باہر مدرسے کے ایک حصے میں پڑ رہے تھے۔ ایک رات انہوں نے دیکھا، آپ گھر سے باہر آئے ہوئے ہیں۔ ابوالحسن آفتاب لے کر ان کی طرف بڑھے مگر آپ نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ ابوالحسن کو جاننے ہی نہیں۔ آپ سیدھے مدرسے میں آئے۔ مدرسے کا باہری دروازہ اپنے آپ ہی کھل گیا۔ آپ مدرسے سے باہر نکل گئے۔ ابوالحسن نے غفلت سے کام لیا اور آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آپ پیدل چل رہے تھے۔ ابوالحسن نے دیکھا، ذرا دیر بعد ہی بغداد کا دروازہ سامنے آ گیا اور آپ کے پیچھے ہی یہ دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ آپ اس دروازے سے بھی نکل گئے۔ ان کے ساتھ ہی ابوالحسن بھی شہر کے باہر پہنچ گئے۔ دروازہ خود بخود دوبارہ بند ہو گیا۔ ابوالحسن کا خیال تھا، اب دریا بنے دجلہ ان کے سامنے آ جائے گا لیکن خلاف توقع اب وہ جس شہر میں داخل ہو چکے تھے وہ بالکل نیا اور اجنبی تھا۔ ابوالحسن نے پہلے کبھی اس شہر کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ایک مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس مکان کا صدر دروازہ حسب سابق خود بخود کھل گیا اور آپ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے بعد فوراً ہی ابوالحسن بھی اس مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ یہ مکان آپ کے مسافر خانے سے مشابہ تھا۔ یہاں چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب نے آپ کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ آپ جواب دے کر اور آگے بڑھ گئے۔ ابوالحسن کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ یہیں ایک ستون کے پاس رک کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں کسی کے کراہنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ آواز اچانک بند ہو گئی اور ایک شخص اس طرف گیا جہاں سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد کراہنے والی آواز کی سمت ایک اور شخص گیا اور وہاں سے ایک دوسرے آدمی کو اپنے کاندھے پر اٹھالایا۔ ان دونوں کے بعد ایک اور شخص برہنہ پا چہرے پر بڑی بڑی موچیں ان کے پاس آ گیا۔ یہ شخص آپ کے روبرو مودب بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تو کلمہ پڑھ سکتا ہے؟“

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”اچھا کلمہ پڑھ۔“

آپ نے اس کو کلمہ سکھایا تین دفعہ..... اس کی بڑی بڑی موچیں ترشوا دیں اور اس کو ٹوپی پہنا کر فرمایا۔ ”اے شخص! اب آج سے تیرا نام محمد رکھا جاتا ہے۔“ اس کے بعد آپ نے بقیہ اشخاص سے فرمایا۔ ”مجھے حکم ملا ہے کہ اس شخص کو موتی کا تاجم مقام بنا کر یہاں سے چلا جاؤں۔“
ان لوگوں نے فرمایا۔ ”سر و چشم۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ ان لوگوں سے فارغ ہو کر اس مکان سے باہر نکلے۔ ابھی انہیں نکلتے اور چلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بغداد کا دروازہ ان کے سامنے آگیا اور حسب سابق وہ کھل بھی گیا۔ دونوں حضرات اس میں داخل ہوئے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد در سے کا دروازہ سامنے اور قریب آگیا اور حسب سابق وہ کھل بھی گیا۔ آپ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ابوالحسن تھے، یہ بھی اندر داخل ہو گئے۔ ابوالحسن کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ صبح جب آپ کا ابوالحسن سے سامنا ہوا تو ابوالحسن نے آپ سے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کو اپنے رب کی قسم۔ یہ کل رات کو کیا معاملہ تھا؟ یہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟“

آپ نے ابوالحسن کو حیرت سے دیکھا مگر خاموش رہے۔ ابوالحسن نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں سوچتا ہوں آپ کو کس کی قسم کھانے پر آمادہ کروں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”کل رات میں نے کچھ غور نہیں کیا لیکن یہ اندازہ ضرور تھا کہ کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے۔“ آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔ ”اب تم قسم کھاؤ کہ جب تک میں زندہ ہوں، تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے۔“ ابوالحسن نے فوراً قسم کھالی۔

آپ نے فرمایا۔ ”کل رات تم میرے ساتھ جس شہر میں گئے تھے، اس کا نام نہاوند ہے۔ نہاوند یہاں سے بہت دور ہے اور وہ چھ شخص جو وہاں موجود تھے، ابدال اور نجباء میں سے تھے اور ساتواں وہ شخص جس کی گراہٹ سنائی دیتی تھی، یہ بھی انہی میں سے تھا۔ یہ ساتواں شخص وفات پانے والا تھا۔ اسی سلسلے میں میں وہاں گیا تھا۔ جس شخص کو میں نے کلمہ پڑھایا تھا۔ وہ نصرانی ہے اور قسطنطنیہ اس کا وطن ہے۔ یہی شخص وفات پانے والے شخص کا قائم مقام ہوگا۔ اسی لیے وہ میرے پاس لایا گیا تھا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور وہ شخص جو دوسرے شخص کو اپنے کاندھے پر اٹھالایا تھا، حضرت خضر تھے۔ آپ اس کو خود سے لے کر آئے تھے۔“

ایک دن ایک شخص گردوغبار میں اٹا ہوا آپ کے پاس آیا اور رورور کر کہنے لگا۔ ”حضرت! میں اصفہان کا رہنے والا ہوں۔ میری بیوی آسیب زدہ ہے۔ اس پر اس کثرت سے دورے پڑتے ہیں کہ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور میں بھی اپنی موت کی دعا مانگنے لگتا ہوں۔“ آپ نے پوچھا۔ ”پھر تم کسی سے رجوع کیوں نہیں ہوئے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے دعا کی بھی اور دوسروں سے بھی دعا کرائی تھی مگر وہ سب اکارت گئیں اور شاید یہ آخری بار بھی اکارت ہی جائے۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ بیابان سراندیپ کا ایک سرکش جن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام خانس ہے۔ اب جب کبھی وہ آئے تو اپنی زوجہ کے کان میں کہہ دینا کہ اے خانس! عبدالقادر جو بغداد میں رہتے ہیں، انہوں نے تجھ سے کہا ہے کہ تو سرکشی نہ کر۔ آج سے اگر اب تو پھر بھی آیا تو، تو ہلاک کر دیا جائے گا۔“

وہ شخص یہ چٹکلا لے کر اصفہان واپس گیا اور تقریباً دس سال بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ آپ نے اس کو دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”ابھی تک تو کہاں تھا۔ میں نے تجھ کو بہت تلاش کیا تو نہیں ملا۔ یہ تو بتا تیری بیوی جو آسیب زدہ تھی، اس کا کیا حال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا تھا میں نے وہ سب زبانی یاد کر کے اپنی بیوی کے کان میں کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ میری بیوی پر نہیں آیا۔ اب ہم نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔“

☆☆☆

آپ کی شہرت اور مقبولیت نے بہتوں کو حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس مرض میں بڑے بڑے فقہا مبتلا ہو چکے تھے۔ ان سب نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ عبدالقادر کا امتحان لینا چاہیے۔

تقریباً ایک سو فقہا نے اس معاملے میں اتفاق کر لیا اور ان میں طے یہ پایا کہ ان میں کا ہر شخص..... علوم و فنون میں سے کسی ایک مسئلے پر آپ سے سوال کرے گا۔ یہ تمام فقہا آپ کی مجلس میں تشریف لے گئے۔

آپ نے ان سبھوں کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ”کون ہے جو میرا امتحان لے گا؟“

اس کے بعد آپ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلا۔ اس نورانی شعلے کو کوئی تو دیکھ سکا اور کوئی نہیں دیکھ سکا۔ یہ شعلہ باری باری تمام فقہاء کے سینے پر سے گزر گیا۔ سارے فقہاء حیران و پریشان چیختے چلانے لگے۔ انہوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر کے بال نوچنے لگے۔ پھر باری باری آپ کے پاس گئے اور اپنا سر آپ کے قدموں میں جھکانے لگے۔ مجلس میں ایسا شور برپا تھا جس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ پورا بغداد دل رہا ہے۔

آپ نے ہر فقیہ کو اٹھایا اور سینے سے لگا کر جھوڑ دیا۔ جب سب کو سینے سے لگا چکے تو ان میں سے ایک سے کہا۔ ”تمہارے سوال کا یہ جواب ہے۔“

اسی طرح باری باری آپ نے ہر فقیہ سے یہی بات کہی۔ جب ہر فقیہ سے یہ بات کہی جا چکی تو آپ نے مجلس برخاست کر دی۔ اب جملہ فقیہ بھی اپنے ہوش و حواس میں آ چکے تھے۔

کسی شخص نے ایک فقیہ سے پوچھا۔ ”اس وقت آپ لوگوں کا کیا حال تھا؟“

فقیہ نے جواب دیا۔ ”جب ہم لوگ آپ کی مجلس میں بیٹھے تو آپ کے منہ سے نکلنے والے نورانی شعلے نے ہمارے سارے علم کو سلب کر لیا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہم لوگ جاہل مطلق ہو کر رہ گئے تھے لیکن جب عبدالقادر نے ہمیں اپنے سینے سے لگایا تو ہمارا علم ہمیں پھر مل گیا۔“

اس کے بعد آپ نے فقہاء کے سامنے ایسی شاندار تقریر کی کہ وہ دنگ رہ گئے۔

☆☆☆

بغداد کے محلہ حلبہ میں آپ... ایک بہت بڑی مجلس سے خطاب کرنے والے تھے۔ اس مجلس میں مشائخ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اپنے عہد کے مشہور ترین مشائخ کرام۔

آپ نہایت پر جوش تقریر فرما رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے آپ نے ایک دم فرمایا۔ ”قَدْ مَيِّ هَذِهِ عَلَى رَقَبِهِ كَلِّ وَلِيِّ اللَّهِ (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے)۔“

یہ سنتے ہی مشہور زمانہ ولی شیخ علی بن ابیہتی اٹھے اور آپ کے تحت کے پاس جا کر آپ کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا اور فرمایا۔ ”بے شک بے شک، آپ درست فرماتے ہیں۔“

ان کے بعد وہاں جتنے ولی موجود تھے، ہر کسی نے اپنی گردن پر آپ کے پاؤں رکھ لیے۔

کہتے ہیں اس روز روئے زمین کے تین سو تیرہ اولیائے کرام نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔

ایک شتر بان مکہ جا رہا تھا۔ دورانِ حج اس کی ملاقات ایک جیلانی باشندے سے ہو گئی۔ شتر بان کا نام ابو بکر التیمی تھا۔ جیلانی باشندے کی ابو بکر التیمی سے بے دوستی ہو گئی۔ وہ کچھ بیمار تھا۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ یہاں تک کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس نے ابو بکر التیمی سے کہا۔ ”دوست! مجھے ایسا لگتا ہے گویا میری سانس پوری ہو چکی ہیں۔ میں تمہیں ایک چادر، کچھ کپڑے اور دس دینار دیتا ہوں۔ انہیں تم عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں پہنچا دینا اور ان سے درخواست کرنا کہ وہ میرے حق میں دعا فرمائیں۔“

چند دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ابو بکر التیمی پر حرص و ہوانے غلبہ پایا اور ساری چیزیں یہ سوچ کر رکھ لیں کہ اس کا کسی اور کو تو علم ہے نہیں، آپ کو کیا پتا چلے گا۔ مرنے والا تو مر گیا۔

ایک دن بغداد کے ایک بازار میں آپ کا سامنا ہو گیا۔ ابو بکر التیمی نے آپ کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے فرمایا۔ ”ابو بکر! تم کو خدا کا خوف نہیں آیا جو ایک نبی کی امانت اپنے پاس رکھ لی؟“

ابو بکر التیمی کو غش آ گیا۔ جب کافی دیر بعد ہوش آیا تو انہوں نے ساری چیزیں آپ کو پہنچا دیں۔

ایک دن آپ نے عہد شکنی کرنے والوں کی یوں مذمت کی۔

”ہم نے تمہیں حق کی دعوت دی مگر تم نے اسے قبول نہیں کیا۔ ہم نے تمہیں منع کیا مگر تم باز نہیں آئے۔ ہم نے تمہیں ڈرایا مگر تم ڈرانہ شرمائے۔ ہم نے تمہیں مہلت دی اور خوش خبریاں سنائیں مگر ہم سے تمہاری نفرت ہے کہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ تم نے ہم سے معاہدہ کر کے توڑ ڈالا۔ اگر ہم تمہیں رو کر دیں، تم سے بیزار ہو کر تمہارا کوئی عذر نہ مانیں، تمہیں اپنے پاس نہ آنے دیں تو تمہارا کیا حال ہو۔ تمہیں یاد نہیں کہ تم کیسی عاجزی اور انکساری سے ہمارے پاس آئے تھے اور اب تم ہم سے منحرف ہو گئے۔“

”برادر من! تمہیں جو بڑا بھاری سفر در پیش ہے اس کی تیاریاں کر رکھو۔ اپنی عمر کی زیادتی اور مال و دولت اور جاہ و عزت کے

دھوکے میں نہ ہو۔ فرصت کو قیمت جانو۔ یاد رکھو۔ یہ دنیا تمہیں اپنے سر میں چسپائے بغیر نہ رہے گی۔ تم اس غدار سے بچنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے سر پر تگوار لیے کھڑی ہے۔ یہ موقع پاتے ہی تم پر بھرپور وار کر دے گی کیونکہ تم جیسے بہتوں کو یہ اپنے کمر میں پھنسا چکی ہے مگر ابھی تک اس کی طمع نہیں مٹی اور نہ آئندہ مٹے گی۔ سو چو جب اس کا وار چل جائے گا اور تم قبر میں اتار دیے جاؤ گے تو پھر تم قبر میں یا میدان حشر میں کتنا ہی حسرت ناک و اویلا کرو گے اور آنسوؤں کی جگہ خون روؤ گے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔

آپ نے ایک بار محتاجوں اور مہمانوں کی بابت فرمایا:

”مجھے فرائض کے بعد مہمانوں اور محتاجوں کو کھانا کھلانے اور عام و خاص کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنے کے سوا کوئی بہتر کام نہیں معلوم ہوتا۔ اگر مجھ کو ساری دنیا کی دولت مل جائے تو میں وہ ساری دولت بھوکوں اور محتاجوں پر خرچ کر دوں۔“

ایک بار فرمایا۔ ”لوگو! تم اپنے دل کے دربان بن جاؤ۔ جس کے آنے کا حکم خدا دے اس کو اپنے دل میں آنے دو، جس کو منع کرے اس کو روک دو۔ دلوں کی خواہشوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ کسی حال اور مقام پر بھروسہ کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس پر ہمیشہ قائم رہو گے۔ یاد رکھو، تغیر اور تبدل لازمی ہے۔“

ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ”کسی سے محبت یا عداوت اور نفرت کرنے میں غفلت سے کام نہ لو۔ اس کو پہلے قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نفس کی شرارت سے کسی پر خواہ مخواہ بدگمانی کر بیٹھو، یہ بدترین گناہ ہے۔“

ایک اور موقع پر فرمایا۔ ”جو خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے مانگتا ہے اس نے خدا کے رتبے اور درجے کو نہیں پہچانا۔ مومن کی علامت یہ ہے کہ یہ حلال روزی کی تلاش میں رہتا ہے۔ قسمت پر تکیہ کر کے بیکار نہیں بیٹھتا۔ اگر یہ تلاش میں کامیاب رہتا ہے تو اسے روزی بھی ملتی ہے اور تلاش کا ثواب بھی۔ دوسری صورت میں تلاش کا ثواب تو ضرور ہی حاصل کر لیتا ہے۔“

کسی نے پوچھا۔ ”حسن خلق کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ تو عرفان حق میں ایسا سرشار ہو کہ کسی کے ظلم اور سختی کا رنج اور اثر نہ محسوس کرے۔“

کسی طرف سے آواز آئی۔ ”یہ بکا کیا چیز ہے؟“

جواب دیا۔ ”بقا، بقائے رب ہے اور حجاب نفس کی دوری کے بغیر نہیں حاصل ہوتا اور نفس کا حجاب اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک کہ باہر کی دید سے نگاہ نہ اٹھائی جائے، اپنے نفس کی دید میں مصروف رہو۔“

پھر کی بابت فرمایا۔ ”جس پیر میں یہ پانچ صفات نہ ہوں، وہ پیر نہیں دجال ہے۔ ایک تو یہ کہ پیر ظاہری شریعت کا عالم ہو، دوسرے علم حقیقت کا جانتا بہت ضروری ہے۔ تیسرے یہ کہ اپنے پاس آنے والوں سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ان سے اچھا برتاؤ کرے۔ مسافروں کو کھانا کھلائے۔ چوتھے یہ کہ غربا اور بے حیثیت آدمیوں کے ساتھ قولاً و فعلاً عاجزی اور انکساری سے پیش آئے۔ پانچویں یہ کہ مریدین کی باطنی تعلیم و تربیت کی لیاقت رکھتا ہو اور خود ریا، حسد، طمع، خود بینی، غفلت اور عیش طلبی سے پاک ہو۔“

آپ کی یہی وہ تعلیمات تھیں جن سے ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ ایک بار آپ کی ملاقات ایک ایسے مریض سے ہوئی جو جاں بلب اور نحیف و نزار ہو رہا تھا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”مجھے اٹھا کر بٹھا لو۔“

آپ سلام کا جواب دے کر اس کے پاس گئے اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ اچانک صحت مند ہونے لگا۔ آپ کو اس سے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے آپ سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھ کو جانتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

اس نے کہا۔ ”میں دین اسلام ہوں۔“

آپ اس کو وہیں چھوڑ کر جامع مسجد تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شخص آپ کو ملا اور آپ کو ’یا سیدی محی الدین‘ کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر آپ نماز میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت آپ اپنے گرد و پیش سے ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ ’یا محی الدین یا محی الدین‘، (اے دین کے زندہ کرنے والے، اے دین کے زندہ کرنے والے)۔

اس کے بعد محی الدین آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا۔

ایک بار آپ نے دنیا کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں لے لو۔ یعنی دنیا کماؤ، دولت حاصل کرو مگر یہ دولت تمہارے ہاتھ ہی میں رہے، دل پر قبضہ نہ کرنے پائے۔“

جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا، انہوں نے آپ کا علیہ یوں بتایا ہے۔

قد درمیانہ، رنگ گندم بوں، سینہ چوڑا، ڈاڑھی نجان اور لمبی، ابرو بیاہم ملے ہوئے، آواز بھاری۔ آپ جب کلام فرماتے تھے تو پوری مجلس گونج جاتی تھی۔ آپ کی آنکھوں میں سحر سا تھا جس شخص یا ہجوم کو ایک بار دیکھ لیتے، وہ آپ کا مطیع و غلام بن جاتا۔ طبیعت نفاست پسند اور مزاج از حد لطیف تھا۔

جب آپ کی عمر اکیانوے یا بانوے سال ہو گئی تو آپ نے محسوس فرمایا کہ بہت جلد آخری سفر درپیش ہونے والا ہے۔ آپ کے صاحبزادے عبدالوہاب نے بھی یہ سمجھ لیا کہ والد بزرگوار اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ انہوں نے .. یہ چشم نم پوچھا۔ ”باو جان! کوئی وصیت فرمائیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تقویٰ اور خدا کی اطاعت اختیار کرو۔ کسی چیز سے مت ڈرو۔ کسی غیر خدا سے کوئی توقع نہ رکھو، سوائے خدا کے کسی پر بھروسہ نہ کرو۔ سوائے توحید کے کسی پر اعتماد نہ رکھو کہ توحید ہی وہ چیز ہے جس پر سب کو اتفاق ہے۔“

جب آپ کا آخری وقت آ گیا تو آپ نے فرمایا۔ ”میں مدد مانگتا ہوں اس خدا سے جس کا کوئی شریک نہیں، جو زندہ ہے اور کبھی نہیں مرتا۔ نہ کسی سے ڈرتا ہے، وہ پاک ہے۔ بندوں پر موت طاری کرنے کا غلبہ اور قدرت بھی اسی کو حاصل ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ بے شک اس کے رسول ہیں۔“

ان کلمات کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ربیع الآخر کی نو، کسی نے لیارہ، کسی نے تیرہ اور کسی نے سترہ روایت کی ہے مگر سترہ پر زیادہ متفق ہیں۔ سن ہجری 561 تھا۔

آپ کے جنازے میں آنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ محلہ علیہ کی سڑکیں بھر گئی تھیں اور دن کو رسم چہیز و تحفین پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ کی تدفین رات کو عمل میں آئی۔ آپ کی آخری رسوم میں شریک ہونے والے اسی ملک کے باشندے نہیں تھے، بہت دور دور سے آئے تھے۔ آپ کو آپ ہی کے مدرسے کے ساتھیان تلے دفن کیا گیا۔ صبح تک مدرسے کا دروازہ بند رکھا تھا اور جب صبح کھولا گیا تو ہجوم کی یلغار نے سارا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا اور لوگ جوق در جوق آتے جاتے رہے۔

آپ کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔

غنیۃ الطالبین: اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل پر شہدار بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فرقوں کے درمیان جو اختلافی مسائل پائے جاتے ہیں، ان کا بڑا پر مغز تجربہ کیا گیا ہے۔

فتوح الغیب: یہ علم تصوف اور معرفت پر محرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کے مضامین ... معارف قرآن اور اسرار طریقت سے معمور ہیں۔ اس میں اشہر و عظیم ہیں۔ یورپ کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولتھ نے ان مواعظ کو نہایت پُر تاثیر لکھا ہے حالانکہ مارگولتھ یہودی تھا۔

فتح ربانی: اس کتاب کا پورا نام فتح ربانی والفیض الرحمانی۔ اس میں آپ کے تریسٹھ خطبات شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ڈبلیو براؤن فری یونیورسٹی برلن نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے سیدھے سادے اسلوب کو نہایت پُر اثر بتایا ہے۔

مکتوبات قطب صدانی: یہ آپ کے فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان خطوط میں بھی معرفت و طریقت کے اسرار و رموز نہایت لطیف طریقے سے بتائے اور سمجھائے گئے ہیں۔

قصیدہ غوثیہ: یہ چودہ قصائد کا مجموعہ ہے۔ ان کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہیں۔ یہ قصائد آپ نے اپنے متعلق لکھے ہیں۔ آپ نے چار شادیاں کیں اور یہ سب عمر کے پچاس سال کے بعد کی گئیں۔ سیدہ بی بی مدینہ بنت سید میر محمد، سیدہ بی بی صادقہ بنت سید محمد شفیع، سیدہ بی بی مومنہ اور سیدہ بی بی محبوبہ۔

ان بیویوں سے آپ کے دس صاحبزادے پیدا ہوئے:

شیخ سیف الدین عبدالوہاب، شیخ تاج الدین عبدالرزاق، شیخ شرف الدین عیسیٰ، شیخ ابواسحاق ابراہیم، شیخ ابوبکر عبدالعزیز، شیخ ابوذر کریم، شیخ عبدالجبار، شیخ ابوالنور موسیٰ، شیخ ابوالفضل محمد۔

ماخذات

اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی۔ حیات جاودانی، عقیف الدین حسین۔ حقیقۃ الاولیاء۔ مفتی غلام سرور لاہوری۔ مشائخ قادریہ، محمد دین کلیم قادری۔ انوار الاولیاء، رئیس احمد جعفری۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دھوپ

عسلی اختر

تاریخ گواہ ہے کہ والدین کی طرف سے بچوں سے متعلق کم سنی میں کیے جانے والے فیصلوں نے کبھی اچھا نتیجہ نہ دیا۔ اسے بھی اسی سولی پر لٹکا دیا گیا تھا مگر افسوس... شعور کی منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کے پیر لہولہاں ہو چکے تھے مگر آبلہ پائی کا یہ سفر اسے ہر حال میں جاری رکھنا تھا۔

رسم و رواج کے بھیا تک قار میں گرنے والوں کی دیدہ دلیری



لفظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ وہ کیا مانگنے آئی تھی۔ یہاں آ کر وہ دعا بھی بھول گئی تھی۔ اس نے اپنا ماتھا مزار کی چار دیواری کے ایک طرف لگی سنگ مرمر کی موٹی جالی کے ساتھ ٹکا دیا۔

دعا کیں اگر تتلیاں ہوتیں تو وہ مستجاب ہو کر اس کے گورے چٹے کنوارے ہاتھوں کی پٹکھڑیوں پر اسی لمحے آ بیٹھتیں جب اس نے سائیں سکے شاہ کے مزار پر آ کر ہاتھوں کو اٹھایا تھا۔ وہ یہاں آئی تو اسے پہلی بار یوں لگا جیسے

کر دیں، ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“
اس نے مشکلوں سے اپنے سارے بکھرے لفظوں کو
سمیٹ کر ترتیب دی تو اس کی آنکھوں کے دریاؤں سے
بڑی تیزی کے ساتھ آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

واقعات اس قدر تیزی سے پلٹا کھا جائیں گے اس
نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا۔ تھوڑا عرصہ پہلے تک اس کی
سوچیں اپنے آپ دھنک رنگ ہونے لگی تھیں۔ من میں چپے
ان دیکھے چور نے اسے یہ احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ
اب وہ بچپن کی حدوں کو پیچھے کہیں چھوڑ آئی ہے..... بھی.....
اس روز وہ انٹر کے امتحان کا نتیجہ سن کر کس قدر خوش خوش گھر
پہنچی تھی۔

”اماں..... اماں..... میں امتحان میں بڑے اچھے
نمبروں سے کامیاب ہو گئی ہوں۔“ اس نے جوش بھرے
لہجے میں کہا۔

”ہوں..... چلو اچھا ہوا..... اب پڑھائی چھوڑ.....
اور گھر کے کام کاج پر توجہ دے.....“ اس کی والدہ نے دھکی
لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن اماں! میں آگے پڑھوں گی۔“ اس نے ضد کی۔
”فضول ہے بیٹی..... وہ لوگ نہیں مانیں گے۔“ اس
کی والدہ نے مایوس لہجے میں کہا۔

”وہ کون.....؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔
”اوہ..... جہاں کون کے لا تیزی تقدیر دامالک بنا
دیا گیا سی.....!“ (وہ جن کو بچپن میں تمہاری تقدیر کا مالک
بنا دیا گیا تھا) اس کی والدہ نے دھکی دل سے جواب دیا۔

”لیکن وہ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے.....!“
اس نے ضدی لہجے میں استفسار کیا۔

پھر اس کی والدہ نے جو بات اسے بتائی اسے سن کر
اسے یک لخت یوں لگا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے
زمین کھینچ لی ہو..... اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ہونے کا
افسوس تھا..... اسے لگنے لگا تھا جیسے اسے ننگے پاؤں زندگی
کے تپتے صحرا میں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا ہو۔ اسے
بڑوں کے فیصلے کا بڑی شدت سے احساس ہونے لگا تھا.....
اور اب تو یہ احساس اس کی سوچوں کے بدن سے بوٹیاں
نوچنے لگا تھا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا..... جب وہ اکیلی
ایک روز بازار سے گزر رہی تھی کہ کسی جانب سے اس پر فقرہ
اچھا لگ گیا تھا۔

”بہوں سونڈیں ایں.....!“ (بہت خوب صورت ہو)
اس نے فقرہ اچھا لے والی آواز کی طرف دیکھا۔

اس کے قریب دوسری جگہ لگی جالی پر عورتوں نے اپنی
منت پوری ہونے کے لیے مختلف رنگوں کے دھاگے
باندھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے یہ جالی تقریباً ڈھائی ہڈی
تھی۔ لفظ اس کے حلق سے نکلتے ہوئے اس قدر خوف زدہ
کیوں ہیں..... کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے دعا ہی مانگنی نہ آتی
ہو..... حالانکہ ان لفظوں نے اس کے اندر کھرام مچایا ہوا
تھا..... وہ کتنے دنوں سے اس کے سن کے اندر دھمالیں ڈال
رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے سائیں کے شاہ کے مزار
پر موجود منگ ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالتے ہیں۔

چھپا ہوا خوف..... اس کی ہر ہڈی ایسی موٹی
آنکھوں سے ہویدا تھا اور زبان ہتھر ہو کر رہ گئی تھی۔
کھیلے..... کچھ منگ لھن..... ایسے اللہ سو ہنڑے

دیاں رحماں چیکہ یاں پھر دیاں نہیں..... (کھیلے کچھ مانگ
لے۔ یہاں اللہ سائیں کی رحمتیں کو کتنی پھرتی ہیں)
ایک عورت نے اس کے کان میں سرگوشی کی..... اس

نے اپنی ڈبڈبائی نظروں سے کہنے والی کی طرف دیکھا۔ گویا
پوچھ رہی ہو..... کیا مانگوں.....؟
”آپڑے پراندے دا ہک دھاگا کڈھ کے اس

جالی تل نہہ دے.....! فیرو دیکھیں..... دعا کنج قبول ہوندی
پئے!“ (اپنے پراندے سے ایک دھاگا نکال کر اس جالی
سے باندھ دو۔ پھر دیکھنا دعا کیسے مستجاب ہوتی ہے)

اس نے فوراً اپنے لمبے بالوں کی پچھلی جانب
ہاتھ پھیرا۔
پراندہ..... اب کون پہنتا ہے.....! اس کا ہاتھ

شرمندہ سا ہو کر پلٹ آیا۔
”بھیڑیے..... اپنے بھوچن نالوں لیر لہ کے ای نہہ
دے.....!“ (بھیڑیے..... اپنے دوپٹے کی کترن اتار کر

ہی باندھ دے)
کہنے والی نے اسے نئی راہ سمجھائی۔
تب اس نے اپنے دوپٹے کے ایک کونے سے

باریک کترن اتار کر جالی کے سوراخوں میں باندھ دی اور
اٹھے ہاتھوں سے منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔
”سائیں وڈھے..... توں تاں جان دا ہائیں.....

چٹ پوشوں دا مڑ کٹھ ہو رہیا پئے۔“ (سائیں جی..... آپ
جانتے ہیں۔ بڑے اور منصف لوگوں کی دوبارہ پنچایت ہو
رہی ہے)

”یقیناً وہ سارے میرے خلاف ہی فیصلہ دیں
گے..... کوئی ایسا سبب بنا دے کہ وہ یہ فیصلہ میرے حق میں
سینس ڈائجسٹ 240 فروری 2017ء

وہ اسی کے محلے کا ایک آوارہ لڑکا وحید خاں تھا۔ ممکن ہے وہ اس کے اس فقرے کو اہمیت دیے بغیر گزر جاتی۔ جب دوسری آواز نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔
 ”اس نی اماں وی آپڑے زمانے اج بہوں سوڑی ہائی!“ (اس کی والدہ بھی اپنے زمانے میں بہت خوب صورت تھی)

وحید خاں کے دوست جمال خاں نے تبصرہ کیا جو عمر میں وحید خاں سے بڑا تھا۔

وہ ان فقروں کے جال سے ابھی نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ کندھروں کے ایک نیزے نے تو اسے بری طرح چھید ڈالا تھا۔ ”اس نا خاندان خونی پیے۔۔۔۔۔ تے ایہہ خونی وی دی پیے ا“ (اس کا خاندان قاتل ہے اور یہ خونی کی بیٹی ہے)
 ”تاں ونی آکھونا۔۔۔۔۔!“ (تب تو یہ ونی ہوئی نا) وحید خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے گزر جانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ مگر ان لوگوں کے بے ہنگم تہقے ابھی تک اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ تند و تیز باتوں کی کٹیلی بوندوں سے چھلتی ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ گھر آتے ہی اپنے بستر پر گر پڑی۔ جب اس کا اپنی والدہ سے سامنا ہوا تو اس کا پہلا سوال یہی تھا۔
 ”یہ قتل کس طرح ہوا۔۔۔۔۔ اور اب اس کی حیثیت کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

اس کی والدہ پہلی بار سر ہیوڑائے کسی مجرم کی طرح اس کے سامنے شرمسار بیٹھی تھی۔

”تم اس وقت۔۔۔۔۔ شاید ایک یا ڈیڑھ سال کی تھیں۔۔۔۔۔ جب ایک جھگڑے میں تمہارے والد رشید خاں سے ایک قتل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اس قتل میں تمہارے والد کے علاوہ تین لوگ اور نامزد تھے۔ پولیس نے مقتول پارٹی کے کہنے پر پرچہ درج کر کے سارے مجرموں کو گرفتار کر لیا۔ کتنی دیر عدالتوں میں کیس چلا پھر مضبوط گواہیوں کے سبب تینوں مجرموں کو عدالت نے سزائے موت سنا دی۔“

اس کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا اور کچھ دیر سانس لینے کو رکی۔ وہ بڑی خاموشی اور حیرانی سے یہ سب سن رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

”موت کی سزا سنائے جانے کے بعد قاتل پارٹی نے مقتول پارٹی سے صلا (صلح) کے لیے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔۔۔۔۔ یوں چٹ پوشوں (منصف لوگوں) کا کٹہ (پنچایت) مخصوص جگہ ملے عام ہوئی۔ صلح کی

رو سے قاتل پارٹی نے ”بدلے دے شرم“ (بدلے میں دی جانے والی لڑکیاں) بطور ونی مقتول پارٹی کو دینے کا وعدہ کیا۔ جن کی تعداد بارہ تھی، چنانچہ سات لڑکیوں کی اسی وقت تین کپڑوں میں رخصتی کر دی گئی۔ جو آج بھی مقتول پارٹی کے خاندان میں اپنے دن گزار رہی ہیں مگر پانچ لڑکیاں۔۔۔۔۔ جو اس وقت کم سن تھیں اور ان کی عمریں ایک سال سے آٹھ سال کے درمیان تھیں۔۔۔۔۔ ان کے شرعی نکاح تو کر دیے گئے مگر ان کی رخصتی بالغ ہونے پر طے پائی اور تم۔۔۔۔۔ تم ناہید۔۔۔۔۔ ان لڑکیوں میں سے ایک ہو جن کی رخصتی بالغ ہونے پر کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس طرح تمہارے بدلے۔۔۔۔۔ تمہارا والد۔۔۔۔۔ اور دوسرے لوگ آزاد پھر رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز میں نے تمہیں آگے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ تم نے اس روز مجھے اپنے کامیاب ہونے کی خوشخبری سنائی لیکن میں اندر سے کانپ گئی تھی۔ آنے والے طوفان سے ڈر گئی تھی۔ تم بھی میرا سر درو یہ دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔ تمہیں اس کا حق پہنچتا تھا مگر میں کیا کرتی۔۔۔۔۔ آنے والے لمحوں کا ڈر اور خوف مجھے دھلا گیا تھا۔۔۔۔۔ اور ہوا بھی یہی۔۔۔۔۔ اس سے اگلے روز ہی مقتول پارٹی کی طرف سے یہ پیغام مل گیا تھا کہ اب جلد تمہاری رخصتی کر دی جائے۔“ اس کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا۔
 ”لیکن اماں! یہ سراسر ظلم ہے۔۔۔۔۔ زیادتی ہے۔“ اپنی والدہ کے ساتھ وہ بھی رونے لگی تھی۔

”میں جانتی ہوں مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ یہ سب یہاں کا دستور ہے۔ روایات ہیں اس علاقے کی۔۔۔۔۔ جس میں ہم رہ رہے ہیں اور ان سے روگردانی اس لیے بھی ممکن نہیں کہ یہ برسوں سے ایسے ہی چل رہا ہے اور پھر تم بھی شرعی لحاظ سے پابند کر دی گئی ہو۔ تمہارا نکاح حبیب خاں سے ہو چکا ہے۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا۔

”مگر اماں! میں اپنی خواہشوں کے گلے میں خود اپنے ہاتھوں پھانسی کا پھندا نہیں ڈال سکتی۔ میری اپنی خوشیاں ہیں، میرے اپنے جذبات ہیں۔“ ناہید نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”میری بچی۔۔۔۔۔ اس کے سوا چارہ کار بھی تو نہیں۔“ اس کی والدہ نے بتایا۔

اس رات وہ بالکل نہ سو سکی تھی۔ وہ جب بھی اپنی آنکھیں بند کرتی تو اسے یوں لگتا جیسے فرسودہ رسم و رواج کی بھیا تک چڑیلیں بے ہنگم تاج، شور و غل مچا رہی ہوں۔ کیا اس معاشرے میں جہاں وہ سانس لے رہی ہے عورت ہونا

واقعی جرم ہے۔ کیا اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جائیں گے..... سہنوں کے شیش محل..... اور وہ سارے خوب صورت لمحے جو ایک عرصے سے اس کے من میں بچے تھے، روایات کے ایک ہی وار سے ختم ہو جائیں گے..... اور وہ حسین یادیں..... کبھی نہ بھولنے والی زندگی کی خوشگوار ساعتیں..... اب ساری زندگی کا روگ بن کر رہ جائیں گی..... سوچوں کے بھنور پھیلنے چلے جا رہے تھے۔

اس کے گھر والوں نے آج تک اس سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی..... اگر اسی طرح..... اسے کسی نہ کسی دن..... ان روایات کے عفریت کے سامنے اسی بے دردی سے پھینک دینا تھا تو اسے شہور کی روشنی کیوں دی گئی تھی..... اسے بھی ان لڑکیوں کی طرح ان پڑھ رہنے دیا ہوتا..... جو اپنی قربانی پر آنکھیں بند کر کے خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے احساس کی کسی بڑی حویلی میں بند کر کے زبردستی سارے دروازوں کو تالا لگا دیا گیا ہو اور ان کی چابیاں..... ان فرسودہ روایات کے ٹھیکیداروں کے حوالے کر دی گئی ہوں..... سوچیں اسے کہاں دم لینے دیتی تھیں..... پھر ان ہی سوچوں کے عقب میں وہ خوب صورت لمحے..... ٹھنڈے میٹھے ہوا کے خوشبو بھرے جھونکے بن کر اس کی زندگی میں کس طرح شامل ہوئے تھے..... وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اس بات کا علم تھا کہ ان لمحوں کو اس کی زندگی تک لانے والا جواد تھا۔

جواد سے اس کی ملاقات کالج کے ایک فنکشن میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ تقریب کی فوٹو گرافی کرنے آیا تھا..... وہ تصاویر اتار تار ہا اور اس دوران دو چار مرتبہ اس کا سامنا بھی ہوا..... تو اس کی ساتھی لڑکیوں نے پوچھا۔

”ہمیں یہ تصاویر کہاں سے ملیں گی؟“

”یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ تصاویر یہاں سے آپ لے سکتی ہیں۔“ جواد نے مسکراتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ ان سب میں بانٹتے ہوئے کہا۔

پھر اس فنکشن کے تیسرے روز ہی وہ اس پتے پر پہنچ گئیں۔

”آپ.....“ اس نے ناہید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ناہید.....“ اس نے اپنا نام بتایا۔

”آپ کا چہرہ بڑا (فوٹو جیک) فوٹو گرافی کے معیار کے مطابق ہے۔“ اس نے تصاویر اسے دیتے ہوئے کہا تو وہ اپنے متعلق اس کے تاثرات سن کر بہت خوش ہوئی۔

”اگر ان میں سے کوئی زیادہ اچھی لگے تو اسے بڑا

کر دیا جاسکتا ہے۔“ اس نے رائے دی۔

”ہوں.....!“ اس نے سرسری طور پر تصاویر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی تصاویر سب نے پسند کی تھیں۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اس میں سے دو ایک کو بڑا کر دیا جائے۔

چنانچہ اگلے روز ہی وہ دوبارہ جواد کے پاس پہنچ گئی۔ اس بار وہ اکیلی تھی۔ جواد کے ساتھ یہی ملاقات اس کی اگلی ملاقاتوں کا سبب بن گئی..... ایک روز جواد نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

”تم بہت خوب صورت بلا ہو.....!“

”تب تو میں تجھے کھا جاؤں گی.....“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لمبے لمبے خوب صورت ناخنوں والے ہاتھوں سے اسے ڈرایا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

خوب صورت لمحے بھی خوابوں کی طرح ہوتے ہیں جو لمحہ بھر کو آخر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یہ خوب صورت اور حسین گھڑیاں بھی جلد ہی ختم ہو گئیں۔ امتحانات قریب آئے تو وہ اس میں مشغول ہو گئی۔

اب جواد سے اس کی ملاقاتیں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ امتحانات سے فارغ ہوئی تو دونوں ایک بار پھر آپس میں ملنے لگے۔

”تم اپنے گھر والوں سے کہو نا کہ وہ مجھے مانگ لیں.....!“ ایک روز ناہید نے اس سے کہا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

ڈالا تھا۔ تبھی وہ جواد سے ملی۔ اس روز..... زیادہ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

”پہلے یہ کم سوئی ہیں، جو رو کر ان کا حجم اور بڑھا رہی ہو..... اور خدا کی پناہ اوپر سے ظلم کہ ان میں سرخ سرخ ڈوروں نے اور بھی قیامت برپا کر ڈالی ہے۔“ جواد نے حسب معمول اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں خودکشی کر لوں گی جواد.....!“ اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”خدا خیر کرے..... کیا کوئی زیادہ پریشانی کی بات ہے.....!“ جواد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

تب اس نے روتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے ساری بات بتادی۔

”بس..... یہ کام اب تو مشکل نہیں رہا..... پریشانی انہیں ہے جنہیں راہ نہیں ملتی.....“ اس نے حوصلہ دیا۔

”تو میں کیا کروں.....؟“ اس نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

پھر اس نے جواد کے مشورے پر عمل کر ڈالا۔ اب اسے امید تھی کہ جلد اس کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔

جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، متول پارٹی کے تقاضے اب بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر روز ان کی طرف سے دھمکی آمیز پیغامات مل رہے تھے۔

”اب کیا جواز ہے، انہیں اپنی بیٹی کو روکنے کا.....!“ یہ متول پارٹی کی طرف سے انہیں پیغام ملا تھا۔

”لگتا ہے ان کی نیت خراب ہو گئی ہے۔“ اڑنے والی دوسری افواہ ان تک پہنچی۔

تبھی اس رات اس کے والدین خاصی دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ جب کتنی دیر تک ان کی باتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ بھی اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔ وہ دونوں سر جھکائے باتیں کر رہے تھے۔

”اب ہمارے پاس ناہید کو روکنے کا کوئی بہانہ نہیں رہ جاتا۔“ اس کی والدہ نے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ان کی اتنی مہربانی کیا کم ہے کہ انہوں نے ہمیں اتنا موقع دیا۔ ورنہ یہ تو ان کا شرعی حق بھی ہے۔ وہ جس وقت چاہیں طاقت سے بھی اپنا حق لے جاسکتے ہیں۔“ اس کے والد نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”اور اگر میں اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟“ ناہید نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور اگر میں اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟“ ناہید نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور اگر میں اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟“ ناہید نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

قدر

بڑی چیز حاصل ہو جانے سے چھوٹی چیز کو بھی نہ بھولو کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں کموار کام نہیں کرتی۔

☆☆☆

بندھن

قطرہ قطرہ جب آپس میں ملاپ کے بندھن سے بندھ جاتے ہیں تو دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دانہ دانہ مل کر تسبیح بن جاتی ہے اور جب لوگ آپس میں ایمان و محبت اور بھائی چارے کے جذبے میں بندھ جائیں اور سچائی کو اپنالیں، ذاتی صفات کو بالائے طاق رکھ کر نیک مقادات کو پانے کی جستجو میں لگ جائیں تو معاشرتی امن قائم ہو جاتا ہے اور وہاں نعمتوں اور رحمتوں کی برسات ہوتی ہے۔

☆☆☆

دھکا

ایک بحری جہاز جا رہا تھا کہ ایک بڑھیا سمندر میں گر گئی۔ اسے نکالنے کے لیے کسی کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ایک سردار چھلانگ لگا کر بڑھیا کو بحفاظت نکال لایا۔

گمشدہ نے جان بچانے پر سردار کو انعام دینا چاہا تو وہ غصے سے بولا۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے سمندر میں دھکا کس نے دیا تھا۔“

مرسلہ۔ عبدالبہار رومی انصاری
چوہنگ سٹی، لاہور

نعمت خداوندی

ایک مریض نے ڈاکٹر سے اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے عجیب و غریب مرض ہے۔“

میری بیوی جب بولنا شروع کر دیتی ہے تو مجھے اس کا ایک لفظ بھی سنانی نہیں دیتا۔“

یہ سن کر ڈاکٹر بولا۔ ”جناب! اسے بیماری نہ سمجھیں بلکہ یہ نعمت خداوندی ہے جو آپ کو عطا ہوئی ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، نعل ہزارہ

فروری 2017ء

24

سپیس ڈائجسٹ

”یہ کس طرح ممکن ہے..... اگر تم ایسا کرتی ہو تو اس سے ہماری بدنامی کے علاوہ خود تم بھی ساری عمر طعنوں کی سولی پر لٹکتی رہو گی۔“ اس کی والدہ نے سمجھایا۔

”اس طرح بھی تو میں سولی پر لٹک رہی ہوں۔ روز روز مرنے سے بہتر ہے کہ میں ایک بار ہی زہر کا پیالہ پی لوں۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ ”یہ میری زندگی ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے بھی ہے۔“ روتے روتے تاجید نے کہا۔

”بیٹی..... تمہارے دنی ہونے سے تمہارے باپ کی زندگی کی سائیس بڑھی تھیں۔ اب تم چاہتی ہو تو انہیں دوبارہ چھین لو.....“ اس کی والدہ بھی اسی کے ساتھ رونے لگی تھی۔

”مگر اماں..... تم خود سوچو..... میں حبیب خاں سے..... جو عمر میں مجھ سے.....!“ روتے ہوئے ناہید کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی والدہ دوبارہ بولی۔

”میں مانتی ہوں..... حبیب خاں کی عمر تمہارے والد سے بھی زیادہ ہے اور اس کے بیٹے بیٹیاں عمر میں تم سے بڑے ہیں لیکن یہاں ایسے ہی چلتا ہے..... سب اسی طرح..... یہ رسم و رواج ہیں یہاں کے..... جن سے بچنا بہت مشکل ہے.....“

”اس قدر بھی مشکل نہیں..... جس قدر آپ لوگوں نے اسے بتا رکھا ہے.....!“ ناہید نے روتے ہوئے حوصلے سے کہا۔

”تو کیا.....“ اس کے والد نے پوچھا۔
 ”ہاں..... میری طرف سے انکار کر دیں۔“ ناہید
 نے جرات سے جواب دیا۔

تب اگلے روز ان کا انکار مقتول پارٹی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اک قیامت تھی جو برپا ہو چکی تھی۔ اک طوفان تھا..... جس نے نئے سرے سے سراٹھالیا تھا۔ اب ہر طرف یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

”رشید خاں کی بیٹی نے وئی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔“
اب تو یہ آوازیں ہر وقت اس کا پیچھا کرنے لگی
تھیں..... اس روز بھی جب وہ بازار سے گزر رہی تھی تو
مقتول پارٹی کا ایک لڑکا جواد کے ساتھ جاتے ہوئے اسے
ملا۔ وہ جن مشکلات کا سامنا کر رہی تھی، ایسے میں جواد کا اس
کے ساتھ ہونا ایک بہت بڑا سہارا تھا۔

وہ تیزی کے ساتھ جواد کی طرف بڑھی..... اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر جواد بھی ذرا دیر کو رکھا..... تبھی اس کا سامنی لڑکا تاہید کو دیکھ کر تیزی سے ہولا۔

”تم قاتل کی بیٹی ہو۔۔۔ تمہارا خاندان خون
 ہے۔۔۔!“
 ”جہیں ایسی باتیں کرتے حیا نہیں آتی۔“ اس نے
 بڑی جرأت سے جواب دیا۔

”تمہارے باپ نے ہمارا گھر تباہ کیا ہے۔ تم ہمارے دشمن کی بیٹی ہو۔ ہم تمہیں جلا جلا کر ماریں گے.....“ وہ چاہتی تھی کہ جواد اس کے طعنوں کا جواب دے مگر وہ حیرانی سے انہیں دیکھے اور ان کی گفتگو سنے جا رہا تھا۔

پھر اس لڑکے نے جو ادکا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ موم کے سٹکے کی طرح اس کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس لڑکے نے جاتے جاتے ناہید کو دوبارہ دھمکی دی۔

”ختم ہمارے دشمن کی اولاد ہو۔ ہم تم سے بدلہ لیں گے۔“

اس رات ایک بار پھر اس کے والدین سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔
 ”انہوں نے چٹ پوشوں کا کٹھ بلایا ہے.....!“ اس
 کے والد نے رو ہانسی آواز میں کہا۔

”کب.....؟“ اس کی والدہ نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”ابھی تاریخ طے نہیں ہوئی۔“ اس کے والد نے
 ادا سی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ان کی گھنگو نے اسے اور بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔
اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بھرے پرے معاشرے میں بالکل
اکیلی رہ گئی ہو۔ اس نے جواد کے کہنے پر جو قدم اٹھایا تھا،
ابھی تک اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔

تب اسے اپنی ایک سہیلی کا مشورہ یاد آیا.....
 سائیں نئے شاہ کے مزار پر مانگی دعائیں بہت جلد قبول
 ہوتی ہیں۔ اسے پہلی بار یوں لگ رہا تھا جیسے اگر وہ وہاں نہ
 گئی تو اس کی کامیابی کے سارے راستے مسدود ہو جائیں
 گے۔ تاچار اس روز وہ سائیں نئے شاہ کے مزار پر منّت
 ماننے کو چلی آئی۔ وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے اپنے
 مسائل کا حل نکالنے اور شتیں ماننے یہاں آتا تھا۔ ان میں
 حالات کی ستائی عورتیں بھی تھیں جو اپنی طرف کھلنے والی
 کھڑکی کی جالی سے لگی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ کچھ جالی
 کے ساتھ اپنے دوپٹوں کی کترنیں..... پراندوں کے
 دھاگے بھی باندھ رہی تھیں۔

تیزی سے بولا۔
تھا۔ پھر کسی نے اسے دھاگہ یاد دہانے کی کمرن

مشورہ دیا۔

اس نے مشورہ مانتے ہوئے اپنے دو بچے کی کترن وہاں باندھی اور پھر بڑی کوششوں سے اپنے کم شدہ لفظوں کو اکٹھا کر کے دعا بھی مانگ ڈالی..... اسی شام اسے گھر آ کر پتا چلا کہ چٹ پوشوں نے کٹھ کی تاریخ رکھ لی ہے۔ آج سے دو دن بعد شام کو ایک مخصوص جگہ ان کا کٹھ ہو رہا ہے۔

یہ سن کر اسے لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو..... جو اب بھی اب اسے ملنے سے کترا رہا تھا۔ اس نے اسے کئی جگہوں پر خود بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے موبائل پر پیغام بھی دینے کی کوشش کی مگر وہ بھی بند پڑا تھا۔ اب اسے پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ وہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے اور اس کے ارد گرد طعنوں کے تیز کیلے نیزے سنبھالے رسم و رواج کی چڑیلیں وحشیانہ رقص کرتی ہوئی اس پر کسی وقت بھی بھرپور حملہ کر سکتی ہیں۔

جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا..... اس کی سوچیں اور وہ خود ٹوٹتی جا رہی تھی۔

اور پھر وہ دن بھی آپہنچا..... جب چٹ پوشوں کا کٹھ ہونے والا تھا۔ وہ نڈھال سی اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس کی حالت اب سزائے موت کے اس قیدی کی طرح تھی جس کو کسی وقت بھی موت کے گھاٹ تک لے جایا جانے والا تھا۔ چٹ پوشوں نے اس کے والد کو بھی کٹھ میں بلا لیا تھا۔

کٹھ میں وہ لوگ اپنی دلیلیں دے رہے تھے۔ جب ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کٹھ کے بڑے کے کان میں کچھ کہا۔ وہ پریشانی میں اٹھ کر چلا گیا..... کٹھ دوبارہ شروع ہوا پھر اچانک..... ایک کھلی میچ گئی۔ بتانے والے نے اسے بتایا کہ پولیس کٹھ کرنے والوں اور اس کے والد کو پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔ لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی تو کیا..... اس نے جو کیا تھا اس کا نتیجہ عین وقت پر نکل آیا تھا.....؟ وہ تو مایوس ہو چکی تھی، اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد اسے بھی پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا۔

”میں قطرہ قطرہ ساری زندگی نہیں مر سکتی۔ مجھے مارتا ہے تو ایک ہی بار مار دیا جائے۔“ ناہید نے روتے ہوئے کہا۔

”یہ جو آپ کے قریب بیٹھا ہے..... حبیب خاں..... اس کے بچے بھی مجھ سے بڑے ہیں اور جب مجھے شعور نہیں تھا تو میرا اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ محض اس لیے کہ میرے والد سے اتفاقاً ایک نسل ہو گیا تھا..... اور صلا (صلاح) کے عوض ہم سے انہوں نے بدلے کی بارہ شرمونی کے طور پر

لیں۔ جن میں سے سات آج بھی ان کے خاندان میں
ناکردہ ناگناہوں کی مزا بھگت رہی ہیں۔ وہ وہاں ہر روز جیتی
اور ہر روز مرتی ہیں۔ اس وقت ہم نابالغ تھیں۔ اس لیے
ہمارے نکاح تو کر دیے گئے مگر ہمیں بالغ ہونے تک دوبارہ
والدین کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں اب بالغ ہوں مگر میرے
اندر کا خوف مجھے بے موت مارے دے رہا ہے۔ میں
حالات کی کڑی دھوپ پہنچے پھر رہی ہوں اور اس کی سختی کو
اپنے بدن پر برداشت کر رہی ہوں۔ یہ لوگ مجھے دوبارہ
اپنے پاس لے جانے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں جو مجھے
منظور نہیں۔ اگر آج میں ہار گئی تو رسم درواج کی بھیا تک
اور گھرے غار سے مجھ ایسی ہزاروں ناتواں مگرنے والیاں
کبھی نکل نہ پائیں گی۔“

تاہم اپنا بیان ریکارڈ کرا کے باہر نکلی تو علاقے کے لوگ اس کے اس قبیلے سے بے حد مشتعل دکھائی دے رہے تھے..... تھانے کے باہر جم غفیر جمع تھا لیکن حکومتی آرڈر کے سامنے وہ بے بس تھے۔ لوگ چٹ پوشوں کے بڑے کے خلاف بھی نعرے لگا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اسے پہلے سے پولیس کی کارروائی کا علم تھا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے ان سے بیچتے بچاتے گھر کی طرف آنے لگی تو اچانک وہ اس کے سامنے آگیا۔

اس کی سفید خشخاش ڈاڑھی ستوا تر رونے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی سی چادر میں چھپا رکھا تھا..... وہ ڈر گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کی چیخ نکلتی..... اس نے اپنا چہرہ عیاں کر دیا۔ وہ حیرانی سے رک گئی..... اس نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

”بیٹی..... میں ہمیشہ ان چٹ پوشوں کا بڑا راہا ہوں۔ جس روز یہ کٹھ ہوا، میں بھی وہاں موجود تھا کہ کسی نے آکر مجھے بتایا کہ میرے بڑے بیٹے کا جھگڑا ہو گیا ہے اور مخالف شدید زخمی ہو کر اسپتال جا چکا ہے۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ آیا..... پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ میں بھاگتا ہوا اسپتال پہنچا..... تو وہ زخمی مر چکا تھا..... میں نہیں جانتا..... اب آگے کیا ہوگا مگر میرے اندر ایک خوف بیٹھ گیا ہے۔ تم بڑی بہادر لڑکی ہو..... مجھے بھی کوئی راستہ دکھاؤ۔“

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ جا رہے تھے۔

”یہ راہ تم ہی مجھے دکھا سکتی ہو۔ میری بیٹیاں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔“

عکس

منظر امام

اکثر ماضی کا تسلسل کئی زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور یہاں بھی یہی ہوا... جو عکس کل کسی کا حال تھا آج وہ ماضی بن کر کسی کا مستقبل سنوارنے کی جستجو میں مبتلا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ جذبوں کا احترام ہمیشہ رشتوں کو مضبوط کرتا ہے۔

ایک بھولے سرے چہرے میں اپنائیت کا پرتو دیکھنے والی دوشیزہ کا ماجرا

وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔ فیاض کے برابر یا اس سے کچھ چھوٹا لیکن حالات نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ ویسے فیاض تو خود بھی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کے قویٰ، مضبوط تھے جبکہ نظر آنے والا اجنبی بہت کمزور تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔ جانے کیوں فیاض کو اس سے کچھ ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ چلنے والے ملازمین سے کہا۔ ”ذرا معلوم تو کرو کون ہے یہ؟“



”بڑی مہربانی جناب۔“

فیاض کے ملازمین کے لیے بھی یہ ایک نئی بات تھی کہ فیاض کسی پر اتنا مہربان ہو رہا تھا کہ اپنی حویلی میں لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ ورنہ وہ تو کسی کو ایک ہی منٹ میں بھگادیتا تھا۔

اس اجنبی ناظم کو حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے لیے ایک کمر مخصوص کر دیا گیا اور ایک اچھا سا بستر لگا دیا گیا۔ فیاض کے منیجر نے اس سے سوال کیا۔ ”سرکار! میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے اس شخص کو اتنی عزت کیوں بخشی ہے؟“

فیاض مسکرا دیا۔ وہ منیجر اس کا منہ چڑھا تھا۔ وہ کبھی کبھی فیاض سے ایسی باتیں بھی کر جاتا جو اس کو ناگوار گزر جاتیں۔ لیکن وہ صرف اس لیے برداشت کر لیتا تھا کہ منیجر ایک ہوشیار انسان تھا۔ اس نے فیاض کے سارے معاملات بہت خوبی سے سنہال رکھے تھے۔

”یہ تم نہیں سمجھو گے۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ وہ ایک استاد ہے اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”جو مرضی ہو سرکار..... ویسے میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔“

”اتنا کافی ہے کہ میری نیلماں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“ فیاض نے کہا۔

نیلماں فیاض کی نوای تھی۔ اس کی بیٹی راشدہ کی نشانی۔ فیاض کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک حادثے نے دونوں کی جان لے لی تھی۔ نیلماں اس وقت پندرہ سولہ برس کی تھی۔ فیاض نے اپنی نوای کو اپنے گھر ہی میں رکھ لیا تھا۔

وہ پرائیویٹ تعلیم حاصل کر رہی تھی لیکن اسے اس بستی میں پڑھانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ ایک دو تھے بھی تو وہ جوان تھے اور فیاض اس سلسلے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے کسی بھی نو جوان سے نیلماں کو تعلیم دلوانے کے بجائے یہی بہتر سمجھا تھا کہ وہ خود سے امتحانات کی تیاری کرتی رہے۔

اور اب اس اجنبی ناظم کی صورت میں ایک استاد ہاتھ آ گیا تھا۔ منیجر کی سمجھ میں اس کی یہ بات آگئی تھی۔

دوسری صبح فیاض خود ناظم کے کمرے میں پہنچ گیا۔

ناظم اس وقت ناشتے سے فارغ ہو کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے فیاض کا استقبال

اس دوران میں وہ اجنبی تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ چکا تھا۔ فیاض دور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ دور دور تک اس کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہر صبح سیر کے لیے لکھتا تو کئی ملازمین اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ راستے میں ملنے والے کسانوں کو ڈانٹتا پھنکارتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا۔

اس علاقے کے کسان اس کی صورت دیکھ کر کانپ اٹھتے تھے۔ بے رحمی اس کے مزاج میں شامل تھی۔ وہ کہا کرتا میں نے جس دن ان پر رحم کیا، اسی دن یہ میرے سروں پر سوار ہو جائیں گے۔ اس کے ملازمین اس اجنبی کی خبر لے کر واپس آچکے تھے۔

”سرکار! وہ اس علاقے میں پہلی بار آیا ہے۔“ ملازمین نے بتایا۔ ”وہ مدنا پور جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے بس پر حملہ کر دیا۔ وہ موقع پا کر کسی طرح بھاگ نکلا۔“

”ہاں سنا تو میں نے بھی ہے کہ آج کسی بس پر حملہ ہوا ہے۔“ فیاض نے کہا۔ ”تو اب یہ کہاں جا رہا ہے؟“

”اس کو خود بھی کچھ نہیں معلوم سرکار کہ یہ جگہ کون سی ہے اور وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بھوکا بھی ہے۔“

”اس کو حویلی لے چلو۔“ فیاض نے کہا۔ ”اس سے وہیں بات کریں گے۔“

دو ملازم پھر اس بوڑھے کے پاس دوڑے چلے گئے۔ انہوں نے اس اجنبی کو سہارا دے کر اٹھایا اور فیاض کے پاس لے کر آگئے۔ فیاض بہت غور سے اسے دیکھتا رہا

تھا۔ ”ہاں تو..... کیا نام ہے تمہارا؟“

”جناب! میرا نام ناظم علی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میں مدنا پور جا رہا تھا کہ راستے میں ایک حادثہ ہو گیا۔“

”اور کہاں سے جا رہے تھے؟“

”شہر سے جا رہا تھا جناب۔ مدنا پور میں میرا ایک شاگرد ہے۔ اس کو اسکول کے زمانے میں پڑھا چکا ہوں

لیکن وہ مجھے بھولا نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا۔ بس وہیں جا رہا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ اب تو میں بہت تھک چکا ہوں۔ عمر بھی ایسی نہیں رہی۔“

”شادی کب ہے؟“ فیاض نے پوچھا۔

”ابھی تو ایک ہفتہ ہے۔ اس نے پہلے بلایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ہمارے یہاں آ کر آرام کریں۔“ ناظم نے کہا۔

”ابھی تو بہت وقت ہے۔ تم ہماری حویلی چلو۔ ہمارے آدمی تمہیں مدنا پور پہنچا دیں گے۔“ فیاض نے کہا۔

گاڑی تمہیں مدنا پور پہنچا دے گی اور واپس بھی لے آئے گی۔“

☆☆☆

ناظم کچھ دنوں کے بعد واپس آ گیا تھا۔
فیاض کی نو اسی نیلماں نے شور سا مچا دیا تھا۔ ”نہیں
نانو! میں اس آدمی سے نہیں پڑھوں گی۔“

”بیٹا! وہ بہت قابل آدمی ہے۔“ فیاض نے سمجھانے
کی کوشش کی۔

”نانو! اسے آپ نے زبردستی رکھ لیا ہے تو اس کا
دل کیا لگے گا۔“ نیلماں نے کہا۔ ”وہ تو مجبوری میں
پڑھائے گا۔“

”بیٹا! تم دیکھ لینا۔“ فیاض نے کہا۔ ”ورنہ دو چار
دنوں کے بعد روانہ کر دیں گے اس کو۔۔۔۔۔۔“

لیکن جب وہ نیلماں کو پڑھانے بیٹھا تو نیلماں کو مزہ
آنے لگا۔ ناظم نے پہلے ہی دن اسے حیران کر دیا تھا۔ اس
نے مشکل ترین سبکیٹ کو بھی آسان بنا دیا تھا۔ اس کے
سمجھانے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ نیلماں نے سوچا بھی نہیں
ہوگا کہ ایک عام سا انسان اتنا قابل بھی ہو سکتا ہے۔

اس پڑھائی کے لیے فیاض نے جو کمر مخصوص کیا
تھا، وہ کسی زمانے میں نیلماں کی ماں، فیاض کی بیٹی راشدہ
کا تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔ نیلماں اس
کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بہت غور سے ناظم کو دیکھے جا
رہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹا۔۔۔۔۔۔ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“
”پتا نہیں کیوں، یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا آدمی کسی
کو پڑھا بھی سکتا ہے۔“ نیلماں نے کہا۔
”کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ کی آواز اور لہجے میں بہت نرمی اور
محاس ہے۔ میں نے تو بستی کے استادوں کو دیکھا ہے۔ ایسا
لگتا ہے جیسے کوئی جلا دسر پر آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔“
”کیا تم کسی اور سے بھی پڑھ چکی ہو؟“

”نہیں۔“ نیلماں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں
سنتی ہوں۔ اس بستی میں میری دو چار دوست ہیں۔ وہ
بتاتی ہیں۔“

”ہر استاد ایسا نہیں ہوتا بیٹا۔ ہر ایک کا طریقہ الگ
ہوتا ہے اور تم پر تو میں سختی کر بھی نہیں سکتا۔“
”وہ کیوں؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ اس لیے کہ تم بہت اچھی ہو۔“ ناظم نے

کیا۔ ”جناب! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے میرا
اتنا خیال رکھا۔ اب میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔
پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہوں۔ جو کمزوری تھی، وہ اب
دور ہو گئی ہے۔“

”لیکن میں تو تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں
گا۔“ فیاض نے کہا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟“
”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اب کہیں نہیں جاؤ۔“ فیاض
نے کہا۔ ”اس حوالی میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”کیوں مذاق کر رہے ہیں جناب۔۔۔۔۔۔ میں تو ایک
مسافر ہوں۔ میرا گھر ہے، میرے معاملات ہیں۔ میں
یہاں کیسے رہ سکتا ہوں؟“

”تم اپنے گھر والوں کو بھی یہی دلائو۔“

”گھر والے۔“ ناظم کے چہرے پر دکھ کے سائے
لہرا گئے۔ ”نہیں جناب! میرے کوئی گھر والے نہیں ہیں۔
میں ایک اکیلا انسان ہوں۔“

”پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے۔“ فیاض نے کہا۔ ”جو
وہاں کے معاملات ہیں، وہ ایسے تو نہیں ہوں گے کہ تم واپس
نہ جاؤ تو سب تباہ ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ تھوڑی بہت
ذمے داریاں ہوں گی، وہ ادا کر دی جائیں گی۔“

”جناب! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کیوں
ایسا چاہتے ہیں؟“

”تم ایک استاد ہونا۔۔۔۔۔۔ تو میں تمہاری خدمات حاصل
کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے نیلماں کے بارے میں بتاتے
ہوئے کہا۔ ”مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ اس کی ضد ہے کہ
وہ تعلیم حاصل کرے۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی
بھروسے کا آدمی اس کو پڑھا دیا کرے۔“

”جناب! وہ اگر آپ کی نو اسی ہے تو مجھے بھی اسے
تعلیم دینے میں خوشی محسوس ہوگی۔“ ناظم نے کہا۔
”لیکن۔۔۔۔۔۔“

”اب۔۔۔۔۔۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہاں سب کچھ
ہے۔ تمہیں ساری سہولیات ملیں گی۔ اس کے علاوہ جو تنخواہ
چاہو گے، وہ ملے گی۔“

”جناب! بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے
سامنے پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پڑھنا پڑھانا میرا
شوق ہے۔ اسی لیے میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن مجھے شادی
میں شریک ہونا ہے۔ اس کے بعد ہی آسکوں گا۔“

”ہاں ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میری

”وعدہ ہے۔“
”بیٹا! وہ سہیل فاروقی میں ہی ہوں۔“ ناظم نے بتایا۔
”کیا؟“

”ہاں بیٹا! اب میں نے اپنا راز تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ اب تم اس کی حفاظت کرنا۔“
”یہ سب کیا ہے؟ میں تو آپ کا نام اپنے بچپن سے سنتی چلی آرہی ہوں۔“ نیلماں نے بتایا۔
”کون لیتا تھا میرا نام؟“

”میری امی..... انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ بلکہ ایک دن میں نے ان کی ڈائری پڑھ لی تھی۔ وہ آپ کے تذکروں سے بھری ہوئی تھی۔ امی میری دوست بھی تھیں۔ میں نے جب انہیں کرید کر لیا تو انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتا دیا۔ وہ ابو سے بھی خوش نہیں رہیں۔ نہ جانے کیوں نانا نے ان کی شادی ابو جیسے سخت اور بے رحم انسان سے کر دی تھی۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے امی کہا کرتی تھیں کہ مجھے بچنے والا صرف ایک ہی شخص ہے اور وہ ہے سہیل.....“
ناظم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نیلماں بھی رو رہی تھی۔ اپنی ماں کو یاد کر کے۔

”بیٹا! یہ بتاؤ تمہارے نانا تمہارے ساتھ کیسے ہیں..... میرا مطلب ہے کہ ان کا کیا رویہ ہے؟“
”بہت اچھا۔ بہت مہربان۔ امی کی موت کے بعد جیسے وہ بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کے مزاج میں پہلے والی سختی بھی نہیں رہی۔ اس کی مثال خود آپ ہیں۔ نانا آپ کو یہاں لے کر آئے، اپنی حویلی میں رکھا اور مجھے تعلیم دینے کی ذمہ داری دے دی۔ اگر پہلے والی بات ہوتی تو پھر نہ جانے کیا ہوتا۔“

”بیٹا! میں اور راشدہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے کیونکہ تمہاری نانی بھی ہمارے حق میں تھیں لیکن تمہارے نانا دیوار بن گئے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اب اس کا ذکر بے کار ہے۔ اس ملک اور اس معاشرے میں ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں ہوں گی جہاں غریبوں کو محبت کا بھی حق نہیں ہے۔ میرے دل میں نفرتیں پروان چڑھتی چلی گئیں۔ میں نے سوچ لیا کہ تمہارے نانا سے اس..... کا بدلہ ضرور لوں گا۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ پتا چلا کہ راشدہ کی شادی ہو گئی ہے۔

نیلماں کے لیے اس کی بات حیران کن تھی۔ اسی دن نیلماں کے پاس کاغذ ختم ہو گئے۔ ناظم نوٹس لکھوا رہا تھا۔ ”سر!“ نیلماں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کاغذ ختم ہو گئے ہیں۔ میں کسی سے منگواتی ہوں۔ دس منٹ میں آجائیں گے۔“
”تم ایسا کرو، وہ سامنے والی کینٹ کھول لو۔ اس کی پھلی دراز میں کاغذ پڑے ہوں گے۔“
”آپ کو کیسے معلوم سر؟“

”بس..... بس یوں ہی۔ میرا اندازہ ہے۔“ ناظم نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے مل ہی جائیں۔“
نیلماں نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں کینٹ کھولی۔ بے شمار الٹی سیدھی چیزیں بھری ہوئی تھیں اور کاغذات کا ایک بڑا پلندا بھی تھا۔ نیلماں حیران رہ گئی تھی۔ ”سر! یہ صرف آپ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”بات کچھ اور ہے، بتائیں آپ کیسے جانتے ہیں؟“
”تمہارا کام ہو گیا نا۔ بس اب لکھنا شروع کرو۔“
”نہیں سر! مجھے بتائیں..... میں اس طرح نہیں لکھوں گی۔ جب تک آپ مجھے مطمئن نہیں کر دیں گے۔“ نیلماں نے ضد شروع کر دی تھی۔
”خدا کی قسم..... بالکل اپنی ماں کی طرح ضدی ہو۔“ ناظم نے کہا۔

”اب تو آپ کو بتانا ہی پڑے گا سر۔“ وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں امی کو؟“
”بیٹا! میرا خیال یہ ہے کہ پوری دنیا میں تمہاری امی کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔“ ناظم نے ایک گہری سانس لی۔

”کیا.....“ نیلماں حیران رہ گئی تھی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کا امی سے کیا تعلق ہے اور ایک بات بتاؤں..... امی کو جاننے کا دعویٰ کرنے والا دنیا میں ایک ہی شخص ہے اور اس کا نام ہے سہیل..... سہیل فاروقی.....“
”بیٹا! اب اگر میں تم سے کچھ کہوں تو کیا تم اس راز کو راز رکھ سکو گی۔ ورنہ میری زندگی کو خطرہ ہو جائے گا۔ میں مار دیا جاؤں گا۔“

”خدا یا آپ کتنی بھیانک باتیں کر رہے ہیں سر۔ کون مارے گا آپ کو؟“
”پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔“
”ٹھیک ہے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ میرا

”ایک بات بتائیں۔ کیا آپ کو میری ماں سے محبت تھی؟“
 ”بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“
 ”فرض کریں..... امی سے آپ کی شادی ہو جاتی تو
 میں آپ کی کون ہوتی؟“

”ظاہر ہے، تم میری بیٹی ہوتیں۔“
 ”تو کیا آپ اپنی بیٹی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟“
 ناظم اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بہت دنوں کے
 بعد ایک نئی زنجیر اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ بہت
 پہلے راشدہ نے بھی یہی کہا تھا۔ کیا آپ مجھے چھوڑ کر چلے
 جائیں گے؟

”اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔“ نیلماں
 نے کہا۔

”ہاں بتاؤ۔“
 ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ نانا بے وقوف ہیں؟“
 ”کیا مطلب؟“
 ”تو پھر سن لیں کہ نانا کو معلوم ہے کہ آپ کون
 ہیں۔“ نیلماں نے بتایا۔

”کیا.....؟“
 ”ہاں، انہوں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اسی لیے
 انہوں نے آپ کو آفریدی کہ آپ مجھے پڑھا گئیں۔“
 ”کیوں..... اتنی مہربانی کیوں؟“

”صرف اس لیے کہ میری زندگی کا وہ خلا پورا ہو سکے
 جو باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔“ نیلماں نے
 کہا۔ ”کیا آپ مجھے یہاں رہ کر ایک باپ کی شفقت نہیں
 دے سکتے؟“

”بیٹا! وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں رہوں گا تو تمہاری
 ماں یاد آتی رہے گی۔“

”ماں تو مجھے بھی یاد آتی ہے نا..... لیکن میں تو یہیں رہ
 رہی ہوں۔ یادوں کے تعاقب میں دور تک نہیں چلے
 جاتے۔ وہیں رہ کر زندگی گزارتے ہیں اور اب تو میں جان
 چکی ہوں کہ آپ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ آپ یوں ہی ادھر
 ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ لہذا اب تو میں آپ کو کہیں نہیں جانے
 دوں گی۔“

ناظم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی راشدہ
 اب ایک دوسرے روپ میں سامنے آگئی تھی۔ پہلے محبت کی
 ذمے داری تھی اور اب ایک بیٹی کی ذمے داری اس کے
 سامنے تھی۔

وہ خوش نہیں ہے۔ اس کے بعد پتا چلا کہ اس کی ایک بیٹی
 بھی ہو گئی ہے جس کا نام نیلماں رکھا گیا ہے۔ پھر اس کی
 اور تمہارے باپ کی موت کی خبر بھی ملی۔ میں اور زیادہ
 جنونی ہوتا چلا گیا۔ پھر میں ایک فیصلہ کر کے اس طرف
 آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں تم کو تمہارے نانا کے خلاف
 بھڑکاؤں گا کیونکہ میں ان کے مزاج سے واقف تھا۔ میں
 سمجھتا تھا کہ جس طرح وہ راشدہ کے لیے سخت تھے، اسی
 طرح تمہارے لیے بھی ہوں گے لیکن پتا چلا کہ وہ تم سے
 بے پناہ محبت کرتے ہیں۔“

”تو کیا آپ کا انتقام صرف اتنا ہی ہوتا کہ آپ مجھے
 نانا کے خلاف بھڑکا کر چلے جاتے؟“

”ظاہر ہے۔ میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔
 میں تو پہلے بھی بے بس اور کمزور تھا اور آج بھی ہوں۔“ ناظم
 نے کہا۔ ”لیکن اب مجھے کچھ نہیں کرنا کیونکہ تمہیں نانا کی
 پوری محبت مل رہی ہے۔“

”جی ہاں۔ نانو کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ ان کو اس
 بات کا بچھڑاوا بھی ہے کہ انہوں نے میری امی یعنی اپنی بیٹی
 کے ارماتوں کا خون کر کے بہت برا کیا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ ناظم نے ایک گہری سانس
 لی۔ ”بیٹا! اب میرا یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ اب میں چلا
 جاؤں گا۔“

”میں سمجھی نہیں۔ کہاں جائیں گے اور کس کام کی
 طرف آپ کا اشارہ تھا؟“ نیلماں نے پوچھا۔

”بیٹا! تمہاری ماں سے جدا ہونے کے بعد مجھ پر جو
 گزری، وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں
 جاؤں گا۔“ ناظم نے کہا۔ ”میں سہیل فاروقی سے ناظم بن
 گیا۔ صرف تمہارے نانا کے خوف سے..... کیونکہ انہوں
 نے میرے پیچھے غنڈے لگا دیے تھے۔ جو ہر حال میں مجھے
 مارنا چاہتے تھے۔“

”میرے خدا! یہ سب تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“
 نیلماں نے کہا۔

”ظاہر ہے، یہ سب تمہیں کون بتاتا۔“
 ”بتائیں تو پھر کیا ہوا؟“

”اس کے بعد کیا ہوتا تھا۔ میرے دل میں تمہارے
 نانا کے خلاف نفرت پروان چڑھتی چلی گئی۔ میں نے فیصلہ کر
 لیا کہ ہر حال میں اپنا اور اپنی محبت کا بدلہ لے کر رہوں گا۔
 اسی لیے میں نے اپنی شناخت بدل لی۔ سہیل سے ناظم ہو گیا
 اور کئی طرح سے یہاں آ گیا اور اب جا رہا ہوں۔“

چھپر چھائوں

محمد زبیر سلیمانی

کائنات بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا حسن بڑھانے کے لیے اس میں بسنے والے جوڑے بنائے... نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کے بھی... تاکہ زندگی کو سہل کر کے جیا جاسکے۔ ورنہ تنہائی کا زہر شاید ہر جاندار کو مار دیتا لیکن... افسوس عہد حاضر میں یہ جوڑ بن جانے کے بعد انسان جانے کس جوڑ توڑ میں لگ جاتا ہے کہ زندگی کا سارا حسن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور جب توازن کا بگاڑ پیروں تلے سے زمین کھسکا دیتا ہے تو یہی نادان انسان اس وقت قدم چمانے کے لیے ادھر ادھر سہارے تلاش کرتا ہے مگر... یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کو سہارا میسر بھی آجائے۔ البتہ جسے مل جائے وہ واقعی خوش نصیب ہوتا ہے۔ اسے بھی دنیا کی دھکم پیل میں جب جگہ نہ ملی تو ماضی کے درپکڑنے پر مجبور ہو گئی تاکہ زندگی کی ڈور ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے... لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب زندگی رنگین تتلی کے مانند اس کے گرد طواف کر رہی تھی تو وہ اس وقت اس کی قدر کرتی... شاید زندگی کا حسن اسے حسن سلوک کی پوشاک میں چھپائے ہمیشہ کے لیے معتبر کر دیتا اور وہ ذلت اور نفرت کی دلدل میں گرنے سے بچ جاتی، جس میں اس کے گھمنڈ نے دھکیل دیا تھا... جبکہ سچ بھی یہی ہے کہ شادی شدہ زندگی کی گاڑی توازن مانگتی ہے ورنہ کوئی نہ کوئی گڑھا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔



Downloaded From
Paksociety.com



تھا۔ یہ وہ گانا تھا جس میں محبوب اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ تمہاری بے نیازی سے مجھے کیا لینا، میں تو ہر حال میں خوش رہتا ہوں۔

کمرے میں بے مقصد آنے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور کچن میں چائے بنانے لگا۔

☆☆☆

وال کلاک رات کے تین بج رہا تھا۔ جمال کا ہاتھ بار بار ریوٹ کی جانب جاتا، چینل تبدیل کرتا پھر ریوٹ رکھ دیتا۔ اگلے ہی لمحے ریوٹ سے کوئی اور پروگرام لگا دیتا تھا۔ پچھلے پانچ منٹوں میں وہ تیس چینل آزما چکا تھا پھر اس نے قریب لگنی ہوئی حنا کو دیکھا جو آڑی ترچھی لیٹی ہوئی انتہائی سکون کی نیند سو رہی تھی۔ پوریت، غصہ، جھنجھلاہٹ، اور اداسی کے باعث اس کا ذہن مختلف کیفیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ جمال نے پاس رکھی، سگریٹ کی ڈبیا کو کھولا، اس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ پھر اس نے سلپر میں پاؤں ڈالے اور سگریٹ لینے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے کھلے آسمان کو دیکھا۔ ادھورے چاند کی تاریکی میں لپٹی ہوئی چاندنی ماحول کو اور بھی اداس بنا رہی تھی۔ سارا شہر سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے جیب کو ٹٹولا۔ بٹو تو وہ کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے سگریٹ کا ایک ٹوٹا ایش ٹری سے نکالا۔ اس کے تین چار کش لگ سکتے تھے۔ ماچس سے اس کو سلگایا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلے سے استعمال شدہ سگریٹ کا کش لگاتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ حنا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی پھر کروٹ بدل کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”جاگ رہی ہو تو ایک کپ چائے بنا دو۔“ جمال نے گویا صلح نامے پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

حنانے وال کلاک دیکھا پھر سو گئی۔

”یہ کون سا ٹائم ہے چائے کا۔ سو جاؤ۔“ جمال نے زیر لب پہلے اپنے نصیب کو پھر حنا کو کوسا اور بٹو اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن کی آواز سے گیٹ پر بیٹھا ہوا چوکیدار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ساتھ رکھی ہوئی کلاشکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جمال کو دیکھتے ہی نارمل ہو گیا۔ اس نے ایک طویل جماعتی لی اور گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے قریب آ کر جمال نے گاڑی روکی اور چوکیدار سے مخاطب ہوا۔

”تم سو رہے تھے کیا؟“

”بس جی تھوڑی دیر پہلے آنکھ لگی تھی مگر میری نیند

جمال نے موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے اپنی گاڑی ایک چھوٹے سے ریٹورنٹ کے سامنے کھڑی کی اور خود اندر داخل ہو گیا۔ پھر وہ واش بیسن کی طرف آیا، آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ بڑی ہوئی شیو، آنکھوں میں رت جگا اور ذہنی تناؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ منہ پر پانی کے پھینٹے مارنے کے بعد وہ ٹیبل پر آیا۔ اگلے ہی لمحے ویٹر اس کے سامنے آ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ناشتے میں کیا ہے؟“ جمال نے جماعتی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”انڈا فرائی، پائے، چھوٹے ٹھلوا پوری۔“ ویٹر مشینی انداز میں بولا۔

”ایک پرائیڈ اور انڈا فرائی، ساتھ چائے، چینی کم پتی زیادہ۔“ یہ کہہ کر جمال میز پر رکھے ہوئے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ہیڈ لائنز کو دیکھنے کے بعد اس نے اخبار کے صفحات پلٹے اور سرسری طور پر دیکھنے لگا مگر اخبار پر دھیان دینے کے باوجود اس کے ذہن کی سوئی حنا پر لگی ہوئی تھی۔ حنا اس کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کو تین سال مکمل ہو چکے تھے مگر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی بات لگتی کا باعث بن جاتی تھی۔ جمال کو اس کی اتنا پرستی اور بے پروا طبیعت سے شکایت تھی۔ وہ خود ایک کم گو اور سیدھا سادہ انسان تھا۔ آج صبح ہونے والی لگتی کے باعث نہ تو حنانے ناشتا بنایا، نہ اس نے طلب کیا اور اب آفس جاتے ہوئے وہ اس چھوٹے سے ریٹورنٹ میں بیٹھا اندر ہی اندر تھملا رہا تھا۔ ناشتا کر کے وہ آفس روانہ ہو گیا۔

شام پانچ بجے جب وہ اپنے گھر آیا تو کافی تھکا ہوا تھا۔ گھر آتے ہی وہ بیڈروم میں جا گھسا اور جوتوں سمیت بستر پر اوندھے منہ دراز ہو گیا۔ حنا دوسرے کمرے میں... ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جمال کا خیال تھا کہ صبح ہونے والی لگتی اب ختم ہو چکی ہوگی۔ ابھی حنا کمرے میں داخل ہوگی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر پوچھے گی..... چائے بناؤں آپ کے لیے۔ مگر ایک گھنٹا پڑے رہنے کے باوجود ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی ذہنی تھکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور حنا کے کمرے میں جا گھسا۔ حنا نے ایک نظر دیکھا پھر ڈراما دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔ جمال کا دل چاہا کہ وہ اینٹ کی ایک ضرب سے ٹی وی کی اسکرین توڑ دے مگر وہ ایسا نہ کر سکا، اندر ہی اندر تھملا تا رہا مگر خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے ایک گانے کی دھن پر بیٹھ بجا رہا

ایسی ہوتی ہے کہ ایک کھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔“ پھر اس نے کٹائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں ٹائم دیکھا پھر حیرت سے سوال کیا۔ ”صاحب جی! رات کے ساڑھے تین بجے آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”بس نیند نہیں آرہی، سگریٹ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر سگریٹ مل جائے گی؟“

”آپ گھر میں رہیں، میں سگریٹ لے آتا ہوں صاحب۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ چوکیدار گاڑی کے قریب آتے ہوئے بولا۔

جمال مسکرا دیا۔ ”تم بھی تو میری طرح انسان ہو، شہر کے حالات تو تمہارے لیے کبھی ٹھیک نہیں ہیں حاکم علی۔“

”صاحب جی! میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ کوئی گولی لگ بھی گئی تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا، آپ کو دوسرا چوکیدار مل جائے گا مگر آپ تو صاحب لوگ ہیں۔“

چوکیدار کی بات سن کر جمال نے ایک اور سوال کیا۔ ”حاکم علی! فرض کرو میں تمہیں بیچ دوں اور تم خدا نخواستہ کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ تو تمہاری بیوی کتنی اداس ہوگی؟“

”صاحب جی! اداس کیا ہوگی، وہ تو میرے بغیر دو دن بھی زندہ نہیں رہے گی۔“

”پھر تو تم مجھ سے زیادہ قیمتی آدمی ہو۔ تم آرام کرو، مجھے جانے دو۔ میں ذرا ٹینشن میں ہوں۔ کچھ ڈرائیونگ کروں گا، چائے شائے پیوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے حاکم علی کو خالی نظروں سے دیکھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اب وہ

خالی سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ چوکیدار کی باتوں نے اسے اور بھی غمگین کر دیا تھا۔ تین چار گلو میٹر کے بعد اس کو ریلوے اسٹیشن کے باہر دو تین ریٹورنٹ کھلے ہوئے نظر آئے۔ اس نے اپنی گاڑی روکی اور باہر رکھی ہوئی کرسی پر

جا بیٹھا۔ ویٹر نے فوراً وہاں پانی کا جگ رکھا اور مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”اسٹرائنگ سی چائے لاؤ۔“ جمال نے آرڈر دیا۔ ویٹر سر ہلا کر واپس چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد بھاپ

اڑاتی چائے اس کے سامنے تھی۔

”کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔“ جمال چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد درمیانے سائز کا ایک کیک اس کے آگے رکھ دیا گیا۔ جمال نے کیک کھانے کے

دوران ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

”جی!“ وہ سامنے آکر بولا۔ جمال نے سوکا ایک نوٹ اس کے آگے کر دیا۔ ”ایک ڈبی مارون کی لے آؤ۔“

ویٹر نے پیسے لیے اور کچھ دیر بعد سگریٹ لے آیا۔ جمال نے بقایا جات میں سے بیس روپے اس کو دیے پھر چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد سگریٹ سلگا کر اس کے مرغولے فضا میں چھوڑنے لگا۔

اندر کی تنہائی باہر کے ہجوم سے نہیں بھل رہی تھی۔ سگریٹ ختم ہو جانے کے بعد اس نے بل ادا کیا اور بوجھل قدموں سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ونڈ اسکرین سے اس

نے فٹ پاتھ پر سونے والوں کو دیکھا۔ حیرت ہے اتنی مفلسی اور اتنی گہری نیند۔ شاید ان کے پاس حنا جیسی بیوی نہیں ورنہ یہ خودکشی کر چکے ہوتے۔ یہ سوچ کر اس نے انجن بیدار کیا اور گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

جب وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا تو صبح کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آیا۔ حنا ابھی تک سکون کی نیند سو رہی تھی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے آڑی

ترچھی لیٹی ہوئی حنا کو دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا۔ صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”ساری رات آپ کہاں رہے؟“ آنکھ کھلتے ہی ایک تلخ اور زہر میں بجھا ہوا سوال اس کی سماعتوں سے

نکل آیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوہ کھلی آنکھوں سے حنا کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر ابھی تک لپ اسٹک کی تھکی ہوئی تھی۔

جمال نے کچھ دیر سوچا پھر جواب دیے بغیر دوبارہ لیٹ گیا۔ ”جمال! اب آپ کنوارے نہیں رہے۔ ایک شادی

شدہ اور ڈمے دار انسان ہیں۔ یوں آدمی رات کو آوارہ گردی کرنا اور صبح واپس آنا تمہارے کنوارے وقتوں کا

مشغلہ ضرور رہا ہوگا مگر اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ حنا کی آواز میں بدستور تلخی کھلی ہوئی تھی۔

”تم نے چین کی نیند کر لی نا۔“ جمال نے سوال کیا۔

”آپ گئے کہاں تھے؟“ پھر سوال ہوا۔

”سگریٹ ختم ہو گئے تھے، وہ لینے گیا تھا۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ساتھ کوئی سکون والی گولی بھی لے آتے۔“ حنا نے اس کو دیکھے بغیر کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ تم جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے سکون آور گولی کی واقعی ضرورت ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے تکیے سے منڈھانپ لیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں نے تمہیں بے سکون کیا ہوا ہے؟“ حنا گویا لڑنے کے موڈ میں تھی۔ جمال نے تکیے

ایک طرف رکھا اور حنا کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

”یار خدا کے لیے مجھے ایک گھنٹا آرام کرنے دو۔
نوبے میں نے دفتر بھی جانا ہے۔“

”جمال! تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو۔ تم خود تو نفسیاتی مریض ہو، مجھے کیوں نفسیاتی مریض بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے شادی کر کے پشیمان ہو اور اب تمہیں میرا وجود کاٹنے کی طرح کھٹکتا ہے۔“

جمال نے خود پر ضبط کیا پھر نرم لہجے میں بولا۔

”حنا! میں شادی سے پہلے ایک خوش مزاج انسان تھا۔ میں واقعی اب ایک نفسیاتی مریض بننا جا رہا ہوں اور مجھے تم نفسیاتی مریض بنا رہی ہو۔ تمہاری بے نیازی گھر سے عدم دلچسپی، میری ذات سے لاتعلقی یہ سب مل کر مجھے ذہنی مریض بنا رہے ہیں تم نے اگر شادی نہیں کرنی تھی تو انکار کر دیا ہوتا، میری زندگی میں زہر گھولنے کا اختیار تم نے کیوں اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تم اگر چاہتی ہو کہ میں راتوں کو باہر نہ رہوں تو خود کو بدلو۔ بیوی بن کر ہو، الٹروڈیٹھ یا مجھ کو بننے کی کوشش مت کرو اور اگر تمہیں میرے اس طرح کے رویے پر گلہ ہے تو اس کا سبب بھی پوچھ لیا کرو۔ تم اگر خود کو نہیں بدلو گی تو میرا رویہ اور زیادہ خراب ہوتا جائے گا۔ رات جب میں جا رہا تھا تو تم جاگ رہی تھیں، اگر مجھے روک لیتیں تو میں کبھی نہ جاتا۔ کبھی مجھ سے پوچھ لیا کرو کہ ساری ساری رات کروٹیں کیوں بدلتا رہتا ہوں، سگریٹ پہ سگریٹ کیوں پھونکتا رہتا ہوں۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ حنا کے چہرے پر اپنی باتوں کا رد عمل تلاش کیا مگر وہاں سکون اور طمانیت کا راج تھا۔ حنا کی زبان ضرور شعلے اگل رہی تھی مگر ان شعلوں کی تپش اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ اس بات سے جمال کا دل مزید کرجی کر پچی ہو گیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بات بگڑنے کا سوچ کر خاموش ہو گیا۔ گھر میں برپا ہونے والا یہ پہلا ہنگامہ نہیں تھا۔ تین سالہ ازدواجی زندگی میں کئی بار اس قسم کا تصادم ہو چکا تھا۔ حنا نے سر پر پٹی باندھی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ جمال بھی کروٹ بدل کر سو گیا۔

صبح آٹھ بجے وہ بستر سے اٹھا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ نہانے سے فارغ ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا مگر ناشتے کے آثار نظر نہ آئے۔ کچن سے بھی ایسی کوئی آواز نہیں آرہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ خود کچن میں گیا۔ چائے بنائی، انڈا فراکی کیا اور فریج سے ڈیل روٹی اٹھا کر ٹیبل پر آگیا۔ ناشتے

کے بعد وہ کمرے میں گیا۔ کمرے میں حنا اپنی وارڈروب میں سے کپڑے نکال کر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ جمال نے کھٹکھٹا کر اپنے وجود کا احساس دلایا مگر وہ اپنے کام میں مگن رہی۔

”میں نے اپنا ناشتا خود بنایا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرے ناشتے کا ٹائم ہے۔“ مگر وہ خاموش رہی۔ جمال نے کچھ سوچا پھر اس کے قریب آگیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے سوال کیا۔

”جب تمہیں پتا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں تو پھر اس سوال کی کیا ضرورت ہے۔“ حنا بے پروائی سے بولی۔

”ناشتا کیوں نہیں بنایا؟“ وہ پیار سے بولا۔

”یہ کام بیویاں کرتی ہیں۔ جب تم مجھے بیوی سمجھنے لگو گے تو ناشتا بھی بنا دوں گی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ اس نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

”امی کے پاس جا رہی ہوں۔ تم میری وجہ سے نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہو پھر میرا یہاں کیا کام۔۔۔۔۔ جب میری ضرورت محسوس کرو تو آکر لے جانا۔“

”ابھی دو دن پہلے پورے تین دن گزار کے آئی ہو۔ پلیز مت جاؤ۔ تمہارے بنا یہ گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“ وہ منانے والے انداز میں بولا۔ ”اچھا جانے بھی دو۔ آئندہ رات کو گھر سے باہر نہیں جاؤں گا، وعدہ۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”امی نے بلایا ہے، مجھے جانے دو۔“ وہ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

”تمہاری امی تمہارا گھر اجاڑ کے رہیں گی۔ تم میرے روکنے کے باوجود جانے پر بعد ہو تو شوق سے جاؤ مگر یاد رکھو کہ میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا کیونکہ تم میری مرضی سے نہیں جا رہی ہو۔“ جمال آواز بلند کرتے ہوئے بولا۔

”میں اپنی مرضی سے نہیں جا رہی بلکہ تم وہ حالات پیدا کر دیتے ہو جس سے میرا دل اس گھر سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔“

”حنا! دراصل شادی کے پہلے ہفتے سے ہی تمہارا دل اس گھر میں نہیں لگا۔ جسم یہاں ہوتا ہے تو تمہاری روح میکے میں ہوتی ہے۔ گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی رجتے ہیں مگر یہ مناسب نہیں کہ ہر تیسرے دن معمولی باتوں کو جواز بنا کر تم اماں کے پہلو میں جا بیٹھو۔ کوئی بات نہ ہو تو معمولی باتوں کو جواز بنا کر شاندار قسم کا فساد برپا کر کے چلی جاتی ہو، یہی تمہارا وہ لائف اسٹائل ہے جس سے میرا خون

چارپائی اور کلچر

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی۔ بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کر کے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مجلسی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر بہت سے سہانے منظر ابھر آتے ہیں..... اجلی اجلی ٹھنڈی چادریں، خس کے ٹکسے، کچی مٹی کی سن سن کرتی کوری صراحیوں، چھڑکاؤ سے بھکی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں..... اور ان کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یاری کی پھڑ جھی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنالی گئی۔ ذرا غور سے دیکھیے تو یہ وہی چارپائی ہے۔ ن کی سیڑھی بنا کر سکھڑ بھوپاں کڑی کے جالے اور چلبے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت بیٹوں سے بانس باندھ کر اسٹرینچر بنا لیتے ہیں اور بھوک پڑ جاتے تو انہی بانسوں سے ایک دوسرے کو اسٹرینچر کے قائل بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار موخر الذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں اور جب ساون میں اودی اودی گٹھائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب بھی کے ذریعے اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی پر نو مولود بچے غاؤں غاؤں کرتے، چند حیاتی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب چراغِ سبیل سے اقتباس

مرسلہ: امتیاز احمد، کراچی

کھوتا ہے۔ آخری بار کہہ رہا ہوں، مت جاؤ ورنہ یہ چھوٹی موتی جدائیاں کسی لمبی جدائی کا پیش خیمہ بن جائیں گی۔ میں صبح جاتا ہوں شام کو واپس آتا ہوں، رات کو تم آرام کی نیند سوتی ہو۔ یہی چند گھنٹے ہماری رفاقت کے ہوتے ہیں۔ تم اگر کوشش کرو تو یہ چند گھنٹے بہت خوشگوار بھی ہو سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر جمال خاموش ہو گیا مگر حنا کے ارادے میں تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

”سنو.....“ وہ پکارا۔

”کیا ہے؟“ وہ چلتے چلتے رک گئی۔

”کافی سوٹ لے کر جا رہی ہو، لگتا ہے اس بار لمبا پروگرام ہے تمہارا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بہت مسکرا رہے ہو۔ لگتا ہے میرے جانے کی دل ہی دل میں خوشی منا رہے ہو۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

”میرا کھانا اور ناشتا کون بنائے گا؟ کپڑے کون استری کرے گا؟“ اس نے سوال کیا۔

”اپنی اماں کو لے آنا، ان کے سینے میں بھی ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ وہ تمہارا کھانا بھی بنا دیں گی اور کپڑے بھی استری کر دیں گی۔ ان کے آنے سے پھر نئے نئے پروگرام بنانا۔ وہ ویسے بھی مجھے طلاق دلوانا چاہتی ہیں..... لے آنا ان کی مرضی کی بہو۔“ جمال اس کے قریب آ گیا اور بولا۔

”ان کو حمیدہ جیسی فرشتہ سیرت بہو ملی ہوئی ہے جو دو دو ماہ تک میکے نہیں جاتی۔ تمہاری ہی خواہش پر میں نے اپنی جنت چھوڑ کر تمہیں الگ گھر میں رکھا ہوا ہے..... اور ہاں کان کھول کر سن لو، مجھے اپنے باپ جیسا مت سمجھنا جس نے ساری عمر بیوی کی غلامی میں گزار دی۔ ہماری سرشت میں بیوی کا غلام بننا نہیں ہے۔ تم لاکھ کوشش کرو مگر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ زن مریدی والا چکر تمہارے میکے میں ہوتا ہے، یہاں کبھی نہیں ہوگا۔“

حنانے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

”خبردار جو آئندہ میرے ماں باپ کے خلاف کوئی بکواس کی ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

یہ بات سن کر جمال کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے ایک زنانے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ ”یہ تھپڑ تمہیں کافی عرصے تک یہ بات یاد دلاتا رہے گا کہ زبان دراز عورت کا یہی علاج ہے۔“

حنانے خونخوار نظروں سے اس کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بھی بادل ناخواستہ اپنا

بریف کیس اٹھایا اور دفتر کی راہ لی۔

دن ڈھلے جب وہ واپس گھر پہنچا تو گھر پر ویرانی کا

راج تھا۔ وہ تمام کمروں سے ہوتا ہوا چٹن میں آیا۔ اس کو ایک خفیف سی امید تھی کہ شاید اس کی غیر موجودگی میں حنا واپس آگئی ہو مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ وہ تمام کمروں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آکر صوفے پر ڈھیر ہو گیا نہ جانے کب تک یونہی بیٹھا رہا۔ شام کی اذان کانوں میں پڑی تو وہ وضو کرنے کے لیے ہاتھ روم میں جا گھسا۔

نماز سے فراغت کے بعد اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور صوفے پر بیٹھ کر پینے لگا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا کہ حنا کے جانے کے بعد وہ شدت کے ساتھ اس کی کمی محسوس کرتا تھا اسی لیے حنا کے جانے میں جمال کی رضامندی شامل نہیں ہوتی تھی۔ آج تو تین سال میں پہلی بار جمال نے اس پر ہاتھ بھی اٹھالیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شوہر پر حکمرانی کرنے اور اپنی بیٹی کو حاکم بنانے والی اس کی ساس اس ٹھنڈی کبھی نہیں بھولے گی۔ اس بار حنا کافی مدت کے لیے میکے میں رہے گی۔ وہ اس آس پر حنا کو بٹھائیں گے کہ جمال آکر اپنے رویے کی معافی مانگے گا مگر جمال کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے بھی دل پر پتھر رکھ کر حنا کی جدائی کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے لیے اس نے اپنی بانیگ نکالی اور کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ بازار میں آتے ہی اس کا دل بہل گیا۔ کافی رونق اور چہل پہل تھی۔ وہ بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا پھر ایک معقول سے ریسٹورنٹ کے سامنے بانیگ روکی اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔

کھانا یا تو واقعی لذیذ تھا یا پھر اس کو زیادہ بھوک لگی تھی۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور سگریٹ سلگا کر بھی سگریٹ کا دھواں اڑانے لگا اور کبھی چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ جب وہ ریسٹورنٹ سے نکلا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے اپنے ایک جگری یا رکوفون کر کے گھر پر بلالیا کیونکہ گھر کی تنہائی اسے کانٹے کو دوڑتی تھی۔ ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ رضوان آن دھمکا۔ آتے ہی اس نے چائے کی فرمائش کر دی۔

”وہ سامنے بچن ہے جہاں چائے کے تمام لوازمات موجود ہیں۔“ جمال نے اس کو بچن کا دروازہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک کپ اپنے لیے اور آدھا کپ میرے لیے بنانا۔“ یہ کہہ کر جمال بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ جب بھی حنا

میکے جاتی تھی تو جمال اپنے کسی نہ کسی دوست کو اپنے پاس ٹھہرا لیتا تھا۔

”یار! یہ بھابی کی اور تیری آنکھ چھوٹی کب تک جاری رہے گی؟ مسئلہ کیا ہے تم دونوں کے ساتھ؟“ رضوان صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ چائے کا کپ اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

”سب سے بڑا مسئلہ اس کی ماں ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”وہ اپنے شوہر جیسا داماد چاہتی ہے جو کہ میں نہیں بن سکتا اور دوسرے یہ کہ سارا سارا دن ماں بیٹی موبائل فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میرے لیے تو اس کے پاس دس منٹ نہیں ہوتے۔ یار! یہ ماں بیٹیاں اگر ایک دوسرے کی سہیلیوں کی طرح رہیں تو شوہر کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر جمال چائے پینے لگا۔

”تو یہ بات ہے۔“ رضوان نے جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تو گھر والی کو گھر تک رکھ اپنے لیے باہر والی ڈھونڈ یار۔ یہ جو بیویاں ہوتی ہیں نا ان کے ساتھ جتنا اچھا سلوک کرو یہ اتنا ہی سر کو کھاتی ہیں۔ میں نے دور مکی ہوئی ہیں، مطلب باہر کی دو۔ گھر میں کوئی جج جج نہیں ہوتی۔ تو کہے تو ایک تجھے بھی دے دیتا ہوں، زبردست چیز ہے۔“ رضوان ایک آنکھ بند کرتے ہوئے بولا۔

جمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شادی سے پہلے وہ کافی دوستیاں کر چکا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اپنی فون بک سے نہ صرف تمام نمبر صاف کر دیے بلکہ سم بھی تبدیل کر لی۔ اس کو اپنی کسی گرل فرینڈ کا فون نمبر یاد نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر اس کو یاد آیا کہ اپنی خاص دوست کا نمبر اس نے ڈکشنری کے اندرونی صفحات میں لکھ رکھا تھا تا کہ ”بہ وقت ضرورت“ کام آسکے اور آج اس نمبر کی اس کو شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نمبر ماورا کا تھا۔ ماورا اس سے کسی زمانے میں بہت محبت کرتی تھی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور یوں رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اسی شہر میں رہتی تھی۔ جمال نے ڈکشنری نکالی اور ایک ایک کر کے اس کے ورق الٹنے لگا۔

”یہ رات گئے تمہیں ڈکشنری پڑھنے کا خیال کیسے آ گیا؟“ رضوان بوریت محسوس کرتے ہوئے بولا۔

جمال نے کوئی جواب نہیں دیا، بس ورق گردانی کرتا رہا۔ تقریباً آدھی ڈکشنری کے اوراق دیکھ لینے کے بعد اس کو نمبر مل گیا۔ اس نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور اپنی شناخت کے ساتھ ایک ٹیکسٹ سینڈ کر دیا۔

دونوں دوستوں کی محفل رات تین بجے تک جاری رہا۔

”وہ سامنے بچن ہے جہاں چائے کے تمام لوازمات موجود ہیں۔“ جمال نے اس کو بچن کا دروازہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک کپ اپنے لیے اور آدھا کپ میرے لیے بنانا۔“ یہ کہہ کر جمال بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ جب بھی حنا

میکے جاتی تھی تو جمال اپنے کسی نہ کسی دوست کو اپنے پاس ٹھہرا لیتا تھا۔

”یار! یہ بھابی کی اور تیری آنکھ چھوٹی کب تک جاری رہے گی؟ مسئلہ کیا ہے تم دونوں کے ساتھ؟“ رضوان صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ چائے کا کپ اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

”سب سے بڑا مسئلہ اس کی ماں ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”وہ اپنے شوہر جیسا داماد چاہتی ہے جو کہ میں نہیں بن سکتا اور دوسرے یہ کہ سارا سارا دن ماں بیٹی موبائل فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میرے لیے تو اس کے پاس دس منٹ نہیں ہوتے۔ یار! یہ ماں بیٹیاں اگر ایک دوسرے کی سہیلیوں کی طرح رہیں تو شوہر کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر جمال چائے پینے لگا۔

”تو یہ بات ہے۔“ رضوان نے جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تو گھر والی کو گھر تک رکھ اپنے لیے باہر والی ڈھونڈ یار۔ یہ جو بیویاں ہوتی ہیں نا ان کے ساتھ جتنا اچھا سلوک کرو یہ اتنا ہی سر کو کھاتی ہیں۔ میں نے دور مکی ہوئی ہیں، مطلب باہر کی دو۔ گھر میں کوئی جج جج نہیں ہوتی۔ تو کہے تو ایک تجھے بھی دے دیتا ہوں، زبردست چیز ہے۔“ رضوان ایک آنکھ بند کرتے ہوئے بولا۔

جمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شادی سے پہلے وہ کافی دوستیاں کر چکا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اپنی فون بک سے نہ صرف تمام نمبر صاف کر دیے بلکہ سم بھی تبدیل کر لی۔ اس کو اپنی کسی گرل فرینڈ کا فون نمبر یاد نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر اس کو یاد آیا کہ اپنی خاص دوست کا نمبر اس نے ڈکشنری کے اندرونی صفحات میں لکھ رکھا تھا تا کہ ”بہ وقت ضرورت“ کام آسکے اور آج اس نمبر کی اس کو شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نمبر ماورا کا تھا۔ ماورا اس سے کسی زمانے میں بہت محبت کرتی تھی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور یوں رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اسی شہر میں رہتی تھی۔ جمال نے ڈکشنری نکالی اور ایک ایک کر کے اس کے ورق الٹنے لگا۔

”یہ رات گئے تمہیں ڈکشنری پڑھنے کا خیال کیسے آ گیا؟“ رضوان بوریت محسوس کرتے ہوئے بولا۔

جمال نے کوئی جواب نہیں دیا، بس ورق گردانی کرتا رہا۔ تقریباً آدھی ڈکشنری کے اوراق دیکھ لینے کے بعد اس کو نمبر مل گیا۔ اس نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور اپنی شناخت کے ساتھ ایک ٹیکسٹ سینڈ کر دیا۔

دونوں دوستوں کی محفل رات تین بجے تک جاری رہا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”ہماری بیٹی ہم پر بوجھ نہیں ہے۔“ حتا کی ماں ہاتھ نکالتے ہوئے بولی۔ ”جب تک وہ ہمارے گھر آکر اپنے گئے کی معافی نہیں مانگے گا حتا یہاں سے نہیں جائے گی۔۔۔۔۔ سن لیا آپ نے۔“

حتا کا باپ خاموش ہو کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

”آج ہم پورے پانچ سال بعد مل رہے ہیں۔“ ماورا ریسٹورنٹ کی گونے والی ٹیبل کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ جمال بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”کافی موٹی ہو گئی ہو اور خوب صورت بھی۔“ جمال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اپنی یہ گندی نظریں ہٹاؤ اور گندے مردوں کی طرح کھا جانے والی نظروں سے مت دیکھو۔“

”بے فکر رہو، یہ میرا گھر نہیں ہے ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں تم بالکل ”محفوظ“ ہو۔ کیا حال ہے تمہارے امریکن شوہر کا؟“ جمال نے سوال کیا۔

”وہ تو شادی کے دو ماہ بعد ہی امریکا واپس چلا گیا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔ دو ہفتے بھی نہیں رہتا اور امریکا امریکا کی رٹ لگانا شروع کر دیتا ہے۔ میں تو بس تنہا ہی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہارے حالات مجھے معلوم ہوتے رہتے ہیں۔“ وہ تھکی پر شوژی ٹکا کر بولی۔

”وہ کیسے؟“ جمال نے حیرت سے سوال کیا۔

”جناب! حتا کے پڑوس میں میری خالہ زاد کا گھر ہے۔ میرا مطلب ہے حتا کی ماں کے گھر کے ساتھ۔ وہ لوگ کافی عجیب سے ہیں۔ تمہاری ساس بہت تیز عورت ہے۔ تمہاری بیوی بھی اس پر گئی ہے۔ تمہاری ساس نے بھی شوہر کو نوکر بنا کے رکھا تھا، حتا بھی تمہیں ویسا ہی دیکھنا چاہتی ہے جیسا اس کا باپ ہے۔“

”تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟“ جمال نے سوال کیا۔

”تھیاری ڈال دو۔ ہفتے میں دو بار واشنگ مشین پر کپڑے دھو لیا کرو، کبھی کبھی برتن بھی مانجنے میں کوئی حرج نہیں۔ ساس کی خدمت اقدس میں بھی ہر دوسرے تیسرے دن حاضری دے دیا کرو۔ حتا پھر تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ یہ کہہ کر ماورا مسکرا دی۔

”تمہاری مسکراہٹ آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔“ جمال اس کی طرف بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہٹاؤ یہ آنکھیں۔۔۔۔۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔“ وہ اس کے چہرے کو دوسری طرف کرتے ہوئے

رہی پھر دونوں سو گئے۔ آٹھ بجے تاجتے کے بعد رضوان نے اپنے گھر کی راہ لی اور جمال اپنے آفس روانہ ہو گیا۔ آفس میں وہ ماورا کے جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کرتا رہا اور تقریباً گیارہ بجے اس کا جواب آ گیا۔

☆☆☆

حتا اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ آج اس کو اپنا گھر چھوڑے تیسرا دن تھا۔ وہ آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے اس کی چھوٹی بہن نادیا کی آواز سنائی دی۔

”ہائے یہ انتظار بھی کیا چیز ہے۔ اگر اتنی ہی شدت سے اس کا انتظار ہے تو پھر ذرا حوصلے سے کام لیا کریں باجی۔ اب دیکھیں نا جمال بھائی کی اور آپ کی اناجھت کے درمیان دیوار بن کے کھڑی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ حتا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، میں ایسے تو نہیں چلی جاؤں گی۔ آج ہاتھ اٹھایا ہے، کل تشدد کرے گا۔ اچی کہاں ہیں؟“

”امی تو بازار گئی ہیں۔“ نادیا نے جواب دیا۔

”ویسے ایک الجھن سی میرے ذہن میں موجود ہے باجی۔ یہ بتائیں کہ جمال بھائی جیسے شخصہ جے مزاج کے آدمی نے آپ کو تھپڑ کیوں مارا؟ آپ نے یقیناً کچھ نہ کچھ کیا ہوگا یا کوئی نامناسب بات کی ہوگی۔“

حتا نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا تم ہر وقت جمال کی سامنے لیتی رہتی ہو۔ میری بہن ہو میرا ساتھ دو اور خبردار بھی اس کے سامنے ایسی بات نہ کرنا ورنہ وہ اور بھی شیر ہو جائے گا۔“

”میں نے تو یونہی آپ کے سامنے ایک بات کی ہے باجی ورنہ میں ان کے سامنے ایسی بات کیوں کروں گی۔ آپ کا گھر ہے آپ جانیں اور جمال بھائی جانیں مگر ایک سبق میں نے ضرور سیکھا ہے۔“

”وہ کیا؟“ حتا نے سوال کیا۔

”وہ یہ کہ گھر کو جنت یا جہنم بنانا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ شوہر کو اگر بیوی کا میکے میں بار بار جانا پسند نہیں تو بیوی کو نہیں جانا چاہیے۔“ نادیا بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

”جب تمہاری شادی ہوگی تو پتا چل جائے گا۔“ یہ کہہ کر حتا وہاں سے چلی گئی۔

شام کو کھانے کی ٹیبل پر حتا کے باپ نے جمال کا ذکر چھیڑ دیا۔ ساتھ ہی اس نے حتا کو دبے دبے الفاظ میں گھر جانے کا مشورہ بھی دے دیا۔

”ہاں کپڑے استری کر دیتی ہے، کھانا بھی مل جاتا ہے۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تمہاری صحت تو ٹھیک ہے نا۔“ جمال ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”صحت بالکل ٹھیک ہے بس تیری طرف سے فکرمند رہتی ہوں۔ تو میری ایک بات مان۔“ ماں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”جی اماں کیا بات ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔

”میں آج حنا کو لے آتی ہوں۔ تو ذرا صبر سے کام لے، میں بھی اس کو سمجھا دوں گی۔ ماں باپ کی لاڈلی ہے۔ تو اس کے میکے جانے پر اعتراض نہ کیا کر۔ کب تک جائے گی۔ جیسے ہی بھائی کی شادی ہوگی اس کا جانا کم ہو جائے گا۔ باقی تجھے اس سے جو شکایتیں ہیں تو اس کا اظہار نہ کیا کر بس صبر سے اس کے اچھے ہونے کا انتظار کر۔“

”اماں! بعض دکھ ایسے بھی ملتے ہیں جو کسی کو بتائے نہیں جاسکتے۔ کوئی ایسا لفظ نہیں ہوتا جس سے دوسرے کو اپنے درد کی وضاحت کی جاسکے۔ اس کا میکے جانا بھی میں برداشت کر لوں گا مگر میری ذات سے اس کی لاتعلقی میری برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ تم ابھی مت جاؤ..... اس کو کچھ دن گزار لینے دو، میں ابھی ذرا ذہنی سکون میں ہوں۔“

”یہ ذہنی سکون نہیں ہے۔ ذہنی سکون جیون سادھی کی موجودگی سے ہوتا ہے نادان۔“ ماں نے صبح کے دانوں کو گراتے ہوئے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی اماں لیکن اس میں تھوڑی بہت تبدیلی لازمی ہے ورنہ میری اور اس کی آنکھ پھولی یونہی چلتی رہے گی۔“ پھر اماں نے جمال سے حنا کا موبائل نمبر لیا۔

ماں نے دو تین منٹ بات کی پھر اطمینان سے بولی۔

”بڑی فرماں بردار بچی ہے۔ کہنے لگی کہ آپ کا فون پر بلا لیتا ہی کافی ہے، میں خود شام تک آ جاؤں گی۔ حنا اتنی بری نہیں ہے بس اس کی ماں نے اس کو سر پر چڑھالیا ہے۔ تو حوصلے سے کام لے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ تو کچھ دن میرے پاس رہیں گی نا بے جمال نے سوال کیا۔

”میں دوپہر کا کھانا کھا کر چلی جاؤں گی۔ جائے نماز کدھر ہے، میں ذرا دقت پڑھ لوں۔“

جمال نے ماں کو جائے نماز پچھا کر دی اور خود سوچوں میں گم ہو گیا۔ حنا کے آنے کی بھی خوشی اپنی جگہ مگر ذہنی ہم آہنگی کا فقدان اس کی تشویش کا سبب تھا۔

شام کو حنا آگئی۔ جمال کی ماں دن کا کھانا کھا کر

آئیں۔“ وہ ماں کو راستہ دیتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا حال بنا رکھا ہے تو نے گھر کا۔ لگتا ہے جیسے کئی ماہ سے اس کی صفائی نہ ہوئی ہو اور کبھی خود کو بھی آئینے میں دیکھ لیا کر۔“ اس کی ماں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ارے اماں آپ بیٹھو، میں تمہارے لیے ناشا بنا تا ہوں۔“

”میں فجر کے بعد ہی ناشا کر لیتی ہوں۔ تو بیٹھ میں تیرے لیے بناتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے میں چائے اور دو سلاکس لے کر آگئیں۔

”رات مجھے حنا نے فون کیا تھا۔ تیری شکایت کر رہی تھی کہ تو نے اس کو مارا ہے۔ بری بات ہے بیٹا، بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔“

”بس چھوڑیں امی جان! اس بات کو جانے دیں۔ میں کچھ کہوں گا تو آپ یقین نہیں کریں گی۔“

”بات کیا ہوئی ہے؟“ والدہ نے پوچھا۔

”کیا آپ کو نہیں معلوم، چھ مہینے تو ہم آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ سوچ کر بتائیں کہ وہ ان چھ ماہ میں کتنا عرصہ میرے ساتھ رہی اور کتنا عرصہ میکے میں۔ تمہیں یاد تو ہے نا۔ وہ آج بھی اسی ناظم ٹیبل پر عمل پیرا ہے۔ یعنی دو دن میرے پاس دو دن میکے میں اور چار دن میرے پاس ہوتی ہے، وہ بھی اکثر فون پر اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ ہی گزارتی ہے۔ تنگ آ گیا ہوں میں اس سے اور اب تو زبان بھی چلانے لگی ہے۔ تھپڑ بھی میں نے اس کی زبان درازی پر ہی مارا ہے۔“

ماں کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

جمال ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا پھر جب اس نے ماں کے گھٹنوں پر سر رکھا تو وہ پانچ سالہ جمال تھا۔ جس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے پھر اس نے سراٹھا کر ماں کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یاد ہے اماں! ایک بار میرے بابا نے آپ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا پھر انہوں نے آپ کے ہاتھ میں برقع پکڑ کر گھر سے نکلنے کو کہا تھا۔ تم نے کتنے وقار کے ساتھ برقع رکھتے ہوئے کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ آپ کے اس صبر اور اس جواب کے بعد مجھے یاد ہے، ابا تو جیسے آپ کے غلام بن گئے تھے وہ عورت کہاں ہے اماں جو صبر اور قناعت سے اپنے شوہر کے دل پر حکمرانی کرتی تھی۔“

”آج بھی اچھی بیویاں موجود ہیں۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”اور تو ذرا صبر سے کام لے، ہو سکتا ہے سب ٹھیک ہو جائے۔ تیرا خیال تو رکھتی ہے نا وہ؟“

سپینس ڈائجسٹ

چھت

مسجد کے امام صاحب نے ایک چھوٹے سے بچے کو مسجد کے محن میں روتے دیکھا تو اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ بچے نے اوپر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ابا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہاں چلے گئے ہیں۔“ امام صاحب کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور بولے۔ ”رنج نہ کرو میرے بچے..... وہ وہاں فرشتوں اور حوروں کے پاس آرام سے بیٹھے ہیں۔“

”ابا فرشتوں اور حوروں کے پاس نہیں گئے۔“

بچے نے کہا۔ ”وہ تو اوپر مسجد کی چھت دھور ہے ہیں۔“

سوال

حضرت خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا جو روشن شمع بے جا رہا تھا۔

میں نے اسے روک کر پوچھا۔ ”بیٹے تم بتا سکتے ہو یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟“ لڑکے نے میرا سوال سنتے ہی فوراً پھونک مار کر شمع بجھا دی اور کہا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روشنی کہاں چلی گئی ہے تو میں بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی۔“

خواجہ بصری کہتے ہیں کہ میں اس لڑکے کا جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔

درد مشترک

شوہر اور بیوی شاپنگ کے لیے نکلے، بیوی نے کہا۔ ”کتنی عجیب بات ہے میرے پاس پر فیوم کی شیشی ہے لیکن پر فیوم نہیں ساڑی کا بلاؤز ہے لیکن ساڑی نہیں۔ سیٹ کی انگوٹھی ہے ہار اور بندے نہیں۔“

یہ سن کر شوہر نے کہا۔ ”بیگم! میرا بھی یہی حال ہے..... جیب ہے لیکن پیسے نہیں ہیں۔“

ایک بار پھر...

ایک شخص شادی کے بارے میں مشورہ دینے والے ایک ادارے کے دفتر گیا لیکن دفتر بند تھا۔ اسے وہاں ایک نوٹس لگا دکھائی دیا۔ ”ایک بجے سے تین بجے تک دفتر بند رہتا ہے۔ آپ پھر تسلی سے سوچ لیں، بعد میں ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔“

مرسلہ وزیر محمد خان، نسل ہزارہ

جا چکی تھی۔ جمال اپنے گھر پر ہی تھا جب حنا اپنی ماں کے ساتھ آئی۔ جمال نے محض رسمی سلام دعا کی اور دونوں ماں بیٹیاں کمرے میں گھس گئیں۔

جمال ایک گھنٹے تک حنا کی راہ دیکھتا رہا پھر کسی بہانے سے ان کے پاس چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹیاں دبی دبی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ جمال کو دیکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔

”گلتا ہے کوئی ایسی بات ہو رہی تھی جو میرے سننے کے لائق نہیں تھی۔“ جمال نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

حنانے ناگواری سے جمال کو دیکھا مگر خاموش رہی۔ جمال واپس چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی ساس بھی روانہ ہو گئی پھر حنا کچن میں آگئی۔ کھانا تیار کیا اور ٹیبل پر رکھ کر خود منہ لپیٹ کر سو گئی۔

”تم نے امی کو کھانا کھلائے بغیر کیوں بھیجا؟“ جمال حنا کے قریب آ کر بولا۔

”آپ کے طنزیہ جملوں کے بعد بھی وہ آپ کا کھانا کھاتیں..... کمال ہے۔“ حنا نے دیکھے بغیر جواب دیا۔

”یار! دو بندے کھس پھس کر رہے ہوں اور تیسرے بندے کی آمد پر خاموش ہو جائیں تو یہی محسوس ہوتا ہے گویا اس بندے کے خلاف ہی کوئی بات ہو رہی ہے۔ میں نے تو بس یونہی بات کی تھی، تم تو خفا ہو گئیں۔“

”میں بہت صحتی ہوئی ہوں، مجھے سونے دیں۔ آپ کا کھانا میز پر رکھا ہے، کھا لیں۔“

جمال محض ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ پھر وہ دن شام میں ڈھل گیا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ جب حنا اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں داخل ہو گئی۔ جمال کہیں گیا ہوا تھا۔ حنا نے اپنے لیے کھانا تیار کیا اور وہیں کچن میں بیٹھ کر کھانے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد جمال آگیا۔

”تم ابھی تک سو رہی ہو، کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟“ جمال اس کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے آنکھیں کھول کر جمال کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”ٹھیک ہے جب بھوک لگے، کھا لیتا۔ مجھے اپنے ہاتھ کی چائے تو پلا دو۔“ وہ رومانٹک لہجے میں بولا تو حنا فوراً چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور چائے بنانے چل دی۔

وہ رات کافی خوشگوار انداز میں گزر گئی۔ اگلی صبح حنا کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ”ناشتے میں کیا لیں

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
اس کی مسکراہٹ سے جمال کا بگڑا ہوا موڈ کافی حد تک بہتر ہو گیا۔
”اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے بھرپور نظر اس پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
”تو پھر چلو، بایک پہ چلیں گے؟“ وہ اٹھلا کر بولی۔
”بایک پہ کیوں، گاڑی میں کیوں نہیں؟“ جمال نے سوال کیا۔

”بایک پر ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا، گاڑی میں ہم کافی فاصلے پر ہوتے ہیں۔ پھر جب بایک پہ میں تمہیں تمام کے ٹیٹھی ہوں تو مجھے صرف یہی احساس ہوتا ہے کہ تم صرف میرے ہو۔“
جمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا یا شاید حتا کی باتیں اس کے دل تک نہیں پہنچ سکی تھیں کیونکہ عملی زندگی میں اس کا طریقہ کار بہت مختلف ہوتا تھا۔
جب وہ گھر سے نکلے تو چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

”تم چپ کیوں ہو؟“ حتا اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے بولی۔
”میں چپ ضرور ہوں مگر بہت ساری سوچیں مجھ سے کافی سوالات کر رہی ہیں۔“ جمال نے جواب دیا۔
”مثلاً؟“ حتا بولی۔

”مثلاً یہ کہ ساری ساری رات ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ تم کئی کئی دن تک میرے بغیر رہ لیتی ہو، اس وقت تمہیں ملن اور جدائی کا خیال نہیں ہوتا۔ بایک پر چند منٹوں کے ملن کو تم اتنا اہم سمجھ رہی ہو کہ گاڑی میں تمہیں ہم دونوں کے درمیان فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔ کیا تمہارے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہے؟“

”کتنے ہوٹل گزر گئے ہیں بایک کہاں روکو گے؟“ حتا نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

”آج دریا کنارے والے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔ میں آج دریا کے اندر چودھویں کے چاند کا عکس دیکھوں گا۔ کافی عرصہ ہو گیا، یہ منظر نہیں دیکھا۔“ پھر اس نے سرگھا کر مسکراتی ہوئی حتا کو دیکھا اور دریا کی طرف جانے والی سڑک پر ہولیا۔

جب وہ دریا کنارے والے ریسٹورنٹ میں پہنچے تو چاند عین دریا کے اوپر جھللا رہا تھا۔ بچے پانی میں اس کا عکس بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ جمال بیٹھتے ہی محویت سے

گئے آپ؟“ وہ نرم لہجے میں بولی۔
”وہی روٹین والا ناشتا جو تمہاری موجودگی یا عدم موجودگی میں ہوتا ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔
وہ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر لے آئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”سچ سچ بتاؤ، میری عدم موجودگی میں کتنی گرل فرینڈز کو یہاں لاتے رہے ہو؟“ حتا کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تمہیں پتا ہے میں اپنی تمام غیر نصیبی سرگرمیوں سے تو بہ کر چکا ہوں لیکن.....“
”لیکن کیا؟“ حتا قدرے تشویش ناک انداز میں بولی۔
”اس لیکن کے بعد مجھے کچھ کہنے کی یوں ضرورت نہیں کہ تم سب سمجھ گئی ہو کہ اس لیکن کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”آج دن میں کیا کھائیں گے آپ؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”تمہارے اس خوشگوار موڈ کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا ہے کہ آج دن میں کچھ نہیں کھائیں گے۔ ویسے بھی میں آفس میں پکڑے سو سے وغیرہ کھا لیتا ہوں۔ شام پانچ بجے تو واپسی ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ آج رات کا کھانا کسی شاندار ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔“
حتا مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور آفس کی راہ لی۔

شام پانچ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ گھر میں آتے ہی اس نے حتا کو آواز دی مگر تین چار بار آواز دینے کے باوجود کوئی رد عمل نہ آیا تو اس نے حتا کا نمبر ملایا۔

”کہاں ہو تم..... میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“ وہ تشویش ناک انداز میں بولا۔

”وہ جی ای نے کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی، وہ آگئی تھیں۔ دراصل میرے بغیر وہ شاپنگ کرنے جاتی نہیں، بس میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔“

”یار پوچھ کر نہ سہی بتا کر جانے میں کیا حرج ہے۔ ایک ایس ایم ایس ہی کر دیا ہوتا۔“ وہ قدرے غصے سے بولا۔ حتا نے جواب دیے بغیر بات ختم کر دی اور جمال دل ہی دل میں تھملا کر رہ گیا۔

شام سات بجے کے قریب حتا آگئی۔ آتے ہی اس نے خوب صورت سا سوٹ پہنا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سچ دھج کر جمال کے روبرو کھڑی تھی۔

چاند اور اس کے عکس کو دیکھنے لگا۔

”خیر تو ہے، اتنی خوبصورتی سے دیکھ رہے ہو کیا پہلے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا؟“ حنا نے سوال کیا۔

”شادی کے بعد آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔“ جمال نے جواب دیا پھر اس نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا۔

”لگتا ہے کوئی بہت پرانی یادداشت ہے اس چاند سے۔“ حنا شرارتی لہجے میں بولی۔

”حنا! چودھویں کے چاند کو دیکھ کر معلوم نہیں کیوں اداسی میں لپٹی ہوئی ایک طمانیت سی میرے ذہن و دل میں پھیل جاتی ہے پھر کوئی کمی سی، کوئی خلش سی جاگ جاتی ہے۔“ حنا نے کوئی تبصرہ نہ کیا، بس اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”حنا!“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سچتا ہوں کہ صدیوں پرانا یہ چاند بات کیوں نہیں کرتا۔ اپنے راز شیئر کیوں نہیں کرتا۔ مسکراتا کیوں نہیں۔ روتا کیوں نہیں۔ یہ کب سے ہے۔ جب یہ یہاں نہیں تھا تو پھر کہاں تھا۔“

”بس بس اتنا کافی ہے۔ کالج میں ریاضی کا پیریڈ اتنا مشکل نہیں لگتا تھا جتنی مشکل باتیں تم کرنے لگے ہو۔ ہمیں کیا کہ یہ کب سے ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ میں زیادہ خوب صورت ہوں یا چاند؟“ حنا رومانٹک لہجے میں بولی۔

”چاند اگر ایک گھنٹا میک اپ کرے تو تم سے زیادہ حسین ہو سکتا ہے۔“ جمال اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک سوال کروں؟“

”ہاں کرو۔“ حنا بولی۔

”کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ جمال نے یہ سوال پہلی بار کیا تھا۔ دراصل یہ اس کا سوال نہیں تھا، بہت پرانا وسوسہ تھا۔

”یہ سوال تم اپنے دل سے کرو اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوگی تو مجھے بھی لازمی ہوگی۔“ حنا نے جواب دیا۔

”میں جو سوال کر رہا ہوں، اس کا سیدھا سا ایک جواب ہے، ہاں یا نہیں۔ مجھے وہ جواب چاہیے۔“ جمال پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں آنکھیں پڑھنا نہیں آتیں؟ کیا ضروری ہے کہ ہر جذبے کو ہر بات کو الفاظ میں ڈھالا جائے۔“ حنا نے جواب دیا۔

”ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔ دل کے اندیشوں کو الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خود جب محبت اور نفرت کا اظہار الفاظ سے کر دیتا ہوں تو میری بھی خواہش ہے کہ

میرے لیے بھی الفاظ ہوں۔“

”اگر میں تم سے محبت نہ کرتی تو ایک دن بھی تمہارے ساتھ نہ رہتی۔“

”تو پھر تم اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کرتی ہو۔ گھر میں تو اس طرح رہتی ہو جیسے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہو۔ آج تمہیں گھر سے باہر لے آیا تو تمہارا ایک اور ہی روپ میرے سامنے ہے۔“

حنا نے ہتھیلی پر اپنا چہرہ نکایا اور آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔

”اف جمال! تم اتنے الفاظ کہاں سے لے آتے ہو؟“

”ہاں، یہی الفاظ جو میں تمہارے لیے ڈھونڈ کے لاتا ہوں اسی قسم کے چند الفاظ تم بھی بول لیا کرو، کیا جائے گا تمہارا۔“ جمال نے برجستہ کہا۔

”مثلاً کون سے الفاظ؟“ وہ چائے کا خالی کپ میز پر گھماتے ہوئے بولی۔

”مثلاً کیا حال ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے، چائے بنا دوں، دفتر میں دیر کیوں ہو گئی..... بس۔“ جمال مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ وہ بحث کرنے والے انداز میں بولی۔

”اس سے میں جی اشوں گا۔ راتوں کو جاگنا ختم ہو جائے گا۔“ وہ رومانٹک لہجے میں بولا۔

”میرے خیال میں تمہیں وقت پر کھانا مل جاتا ہے۔ وارڈ روپ میں تمہارے مہینے بھر کے سوٹ موجود رہتے ہیں، ایک مرد کو اور کیا چاہیے۔“ وہ یہ کہہ کر مسکرا دی۔ جمال نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میرے خیال میں چلنا چاہیے۔ تم یا تو سمجھتا نہیں چاہتی ہو یا پھر مجھے ذہنی اذیت دے کر دل میں کچھ تسکین سی محسوس کرتی ہو۔ حنا! اگر تمہیں شادی کا شوق نہیں تھا تو تمہیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔ یوں کسی مرد کی زندگی میں زہر گھولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔“

”آپ مجھے گھمانے کے لیے لائے ہیں یا لڑنے کے لیے؟“ وہ قدرے نفلی سے بولی۔

”چلو اٹھو چلتے ہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حنا بھی بنا کچھ کہے کھڑی ہو گئی۔ بانیٹک پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے جمال کو چھونے سے گریزاں ہو۔ ان کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی اور یوں آدھے گھنٹے کا یہ راستہ دونوں جانب سے سرد مہری میں گزر گیا۔ گھر آ کر

دونوں جب بیڈ پر لیٹے تو یہاں بھی کافی فاصلہ رہا۔ دونوں کے چہرے مخالف سمتوں میں رہے اور یوں رات گزر گئی۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو حنا بچن میں مصروف تھی۔ کام کے دوران وہ سوچتی رہی کہ ابھی جمال بچن میں داخل ہو کر اس کو پیچھے سے بازوؤں میں لے کر منائے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ ناشتے کو ٹیبل پر رکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جمال ہاتھ روم سے نکلا تو ناشتا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے بے دلی سے معدے میں انڈیلا اور بریف کیس اٹھا کر کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ حنا ابھی آئے گی اور رات والے واقعے پر معذرت کر لے گی۔ یوں اس کا دل صاف ہو جائے گا پھر وہ اس کو دروازے تک چھوڑنے آئے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ کچھ کہے بنا آفس نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر خود ہی اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”میں آج ذرا دیر سے آؤں گا۔“ اس نے یونہی کہہ دیا۔

”اچھا!“ حنا نے دیکھے بغیر جواب دیا۔

”حنا! اگر ہمارے درمیان بحث و تکرار کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو ایک دیوار سی ہم دونوں کے درمیان آجائے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔“

”یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ مگر آپ کو شاید معلوم نہیں۔“ وہ پھر دیکھے بنا بولی۔

”تم ہر بات پر بحث کیوں کرتی ہو..... تسلیم و رضا والی عادت کیوں نہیں ہے تم میں؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”آپ کو ایک گونگی لڑکی کی ضرورت تھی جو آپ کی ہر بات پر خاموش رہتی اور یوں آپ کی انا کو تسکین مل جاتی۔ میں ایک روشن خیال گھر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہوں اور اس بات سے باخبر ہوں کہ میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پیپے ہیں جو آگے پیچھے نہیں بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔“

جمال کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے آفس جانے میں ہی عافیت سمجھی اور دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس رات کے بعد ان کے گھر کی زندگی ایک بار پھر رنگوں سے خالی ہو کر بلیک اینڈ وائٹ سی ہو گئی۔ اگلے چھ سات دن تک ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ پانچ بجے گھر پہنچتا۔ کچھ دیر آرام کر کے باہر چلا جاتا۔ رات گئے واپس آتا تو فرنج میں سے کھانا نکال کے خود گرم کرتا اور صوفے پر ہی سو جاتا۔

آٹھویں دن اس نے کچھ روز اپنی ماں کے گھر میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اتوار کا دن تھا جب دس بجے کے قریب وہ نہادھو کر کپڑے پہن کر تیار ہوا اور سوئی ہوئی حنا کو

آواز دی۔

”میں کچھ دنوں کے لیے امی کے گھر جا رہا ہوں۔ تمہاری مرضی ہے چاہے یہاں رہو چاہے اپنی ماں کے گھر۔ جب واپس آؤں گا تو تمہیں بتا دوں گا۔“ حنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں نے ابھی کچھ بکواس کی ہے، کیا تم نے سن لی یا نہیں؟“ وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”میں نے سن لیا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

جمال کو اس سے اسی قسم کی بے پروائی کی توقع تھی مگر اس نے اس امید پر اپنی بات دہرائی تھی کہ شاید حنا اس کو جانے سے روک لے۔ وہ بھی تو میکے جاتی ہوئی حنا کو کئی بار پیار سے روک چکا تھا۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی اور وہ بیگ اٹھا کر چل دیا۔ اس کو پتا نہ چلا کہ گھر سے لاری اڑے تک وہ کس طرح پہنچا۔ ماں کا گھر کوئی چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

جب وہ ماں کے ہاں پہنچا تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماں تو بہت خوش تھی، دونوں بھتیجے بھی۔ چچا کی آمد پر نہال تھے۔ بھابی حمیدہ بھی کافی مسرور نظر آرہی تھیں۔

”حنا کو ساتھ نہیں لائے؟“ بھابی نے سوال کیا۔

”کوئی اور بات کریں بھابی..... میں اس عورت کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ گھر اب میرے لیے جہنم بن چکا ہے۔ میں جہنم سے فرار ہو کر کچھ دنوں کے لیے یہاں آیا ہوں تاکہ تھوڑا ریلیکس ہو سکوں۔“ جمال چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تو کیا وہ لڑکی ویسی کی ویسی ہے جیسے یہاں اس نے چھ ماہ گزارے؟“ بھابی نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

”جی بھابی! شادی کے پہلے ہفتے سے آج تک ویسی کی ویسی۔“

”تم اس کو سمجھاؤ۔“ بھابی کمال نے کہا۔

”آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھابی حمیدہ سے آپ اتنے خوش ہیں، کیا آپ نے انہیں بھی سمجھایا جو یہ اتنی اچھی ہیں۔ یہ تو ہر عورت کی اپنی عادت ہوتی ہے جو فطرت سی بن جاتی ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔

”اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی جمال۔“ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”گزر ہی رہی ہے اماں۔ حنا کے کئی روپ ہیں۔“

کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ کافی دیر دوسری طرف تیل بجتی رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔
”مجھے حنا سے بات کرنی ہے۔“ اس کو معلوم نہ ہوا کہ حنا کا فون اٹھانے والا اس کا باپ ہے یا بھائی ہے۔
”جی کیا بات کرنی ہے، جو بات ہے آپ مجھ سے کہیں..... میں اس کا بھائی بول رہا ہوں۔“
جمال کا پارہ چڑھ گیا مگر اس نے خود کو سنبھال کر شائستہ لہجے میں کہا۔

”دیکھیے وہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ پلیز میری اس سے بات کر ادیں۔“

”وہ میری بہن بھی ہے۔ آپ نے جو بات کرنی ہے یہاں آکر کریں، اوکے۔“ فون بند ہو گیا۔

حنانے میرا فون خود کیوں نہیں سنا؟ موبائل بھائی کو کیوں تھما دیا؟ کیا اس کو میری کال کا انتظار نہیں تھا؟ یہ سوچ کر اس کے ذہنی سکون میں مزید کمی سی آگئی۔ اس نے فون رکھ دیا۔

وہ رات سگریٹ پھونکتے ہوئے اور کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔

اگلی صبح وہ شید کے بغیر آفس روانہ ہو گیا۔ آفس میں ہی اس نے ناشتا منگوا یا اور بے دلی سے تھوڑا سا کھا کر باقی ایک سائڈ پر رکھ دیا۔

اس کے سامنے تین راستے تھے جو بار بار اس کے ذہن میں پھیل سی چھا دیتے تھے۔ پہلا راستہ یہ تھا کہ وہ اطمینان سے دوسری شادی کر لے۔ دوسرا یہ کہ حنا کو طلاق دے کر قصہ ہی ختم کر دے اور تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ حنا کو واپس لے آئے اور شہر کے ستر فیصد مردوں کی طرح ہتھیار پیچک دے۔ اس طرح زندگی بڑے آرام سے گزر جائے گی۔ بیوی کی بے اعتنائی پر چلنے اور کڑھنے کے بجائے حالات سے سمجھوتا کر لے۔ سارا دن دفتر میں وہ خود سے جنگ کرتا رہا پھر بالآخر اس نے تیسرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

چھٹی کے بعد وہ اپنے گھر جانے کے بجائے سسرال چلا گیا۔

سسرال والے نے اس کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود باہر چلے گئے۔ جمال حنا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جوں جوں ٹائم گزرتا جا رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہر لمحے اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تھوڑی دیر تک نہ آئی تو اس کی سانس بند ہو جائے گی۔ اس

اپنے ٹیکے میں وہ اور طرح سے ہوتی ہے۔ آپ کے سامنے فرماں بردار بیوی نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ گھر میں وہ یوں رہتی ہے جیسے قیدی جیل میں۔ گھمانے پھرانے لے جاؤں اور ہوٹلوں کے کھانے کھاؤں تو اس وقت اس کا روپ انتہائی شاندار ہوتا ہے۔ ہر صبح اس سوچ کے ساتھ بیدار ہوتا ہوں کہ آج اس کے ساتھ اس طرح رہوں کہ یہ خود کو میرے مطابق ڈھال لے مگر نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ تین سال میں نے پلاننگ کرتے ہوئے گزار دیے۔ آخر کب تک میں اس طرح زندگی گزاروں گا۔ اماں پلیز، اب مجھ پر رحم کریں اور مجھے مزید صبر کی تلقین نہ کریں۔“

اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے کی لاتعداد شکنوں میں دو تین اور شکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

”اچھا اب کچھ دن آرام سے یہاں رہ۔ اس کا خیال ذہن سے نکال دے۔“ اماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

جواب میں جمال کچھ اس طرح مسکرایا کہ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ وہ تین چار دن وہاں رہا۔ اس کی خوب آؤ بھگت کی مٹی مگر دل و دماغ کی بے چینی اپنی جگہ موجود رہی۔ تیسرے دن وہ وہاں سے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اماں نے سمجھایا۔

”کیا واپس اپنے گھر جاؤ گے؟ وہ تو وہاں نہیں ہوگی۔ اکیلے کس طرح رہو گے؟ تمہارے کھانے پینے کا مسئلہ ہوگا۔“ اماں نے شفیق لہجے میں کہا۔

”ارے اماں ہوٹل میں نا اور ویسے بھی میں خود کافی اچھا کھانا بنا لیتا ہوں، بس مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ جمال اماں کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا۔

”میری دعائیں سائے کی طرح تیرے ساتھ ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ تجھے گھر کا سکون ضرور ملے گا۔“ اماں نے جواب دیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ وہاں سے چل دیا۔ گھر آکر اس نے چائے بنائی اور آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں غور کرنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچتا جاتا، اس کا ذہن مزید الجھتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ حنا ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ بظاہر خود کو مطمئن سمجھنے والا جمال اپنی بیوی کے بغیر خود کو بہت ادھورا سمجھتا تھا۔ وہ ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ حنا سے وہ نفرت کرتا ہے یا محبت۔ موبائل پر بجنے والی ہر گھنٹی پر وہ اس امید پر متوجہ ہوتا کہ شاید وہ حنا کا فون ہو۔

پھر اگلے روز اس نے خود حنا سے فون پر بات کرنے

لحے اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو حنا سے شدید محبت کرتا ہے۔
تقریباً بیس منٹ کے بعد حنا اپنے باپ اور بھائی کے
بمراہ اندر داخل ہوئی اور سلام کر کے اس کے سامنے والے
صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں پچھلے تمام واقعات بھلا کر تمہیں لینے آیا
ہوں۔“ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بولا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ
بات سنتے ہی حنا کے چہرے پر خوشی کی لہریں آجائے گی مگر
ایسا کچھ نہ ہوا۔

”تم نے سنا نہیں۔“ جمال خود پر ضبط کر کے بولا۔
مگر حنا کے بجائے اس کا باپ بول پڑا۔
”بیٹا یہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہارا حق ہے اس کو لے جانے
کا۔ چلو بیٹا تمہارا شوہر تمہیں لینے آ گیا ہے۔ بس یہ کافی ہے۔“
”ایسے کیسے بھیج دوں میں اپنی بیٹی کو۔“ جمال کی
ساس اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”ذرا اس کی صحت تو
دیکھیں، کیا شادی سے پہلے یہ ایسی ہوتی تھی۔“ وہ تقریباً
چلا تے ہوئے بولی۔

”آنتی صحت تو میری بھی ایسی نہیں تھی جیسی اب ہے۔
گھر میں چھوٹے موٹے اختلافات تو ہوتے رہتے ہیں، اس
کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کو ہر دوسرے تیسرے دن بلا کر
یہاں بٹھالیا کریں۔“ پھر وہ حنا سے مخاطب ہوا۔ ”حنا تم
کیوں خاموش ہو؟ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں دل کو صاف
کر کے تمہیں لینے آیا ہوں؟“
”میں کیا کہوں۔“ وہ جمال کو دیکھے بنا بولی۔ ”جو
میرے گھر والے چاہیں گے میں وہی کروں گی۔“
”دیکھو جمال! ہمیں تم پر بھروسا یوں نہیں ہے کہ تم
اب اس پر روزانہ تشدد کرتے ہو اور.....“

”روزانہ؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”تین سال کے
عرصے میں ایک بار اس کو تھپڑ مارا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ
میں روزانہ تشدد کرتا ہوں۔ حنا تم خاموش کیوں ہو۔ بتاؤ نا
ان کو کہ میں نے کب تم پر روزانہ تشدد کیا ہے۔ وہ اونچی آواز
میں بولا۔“ مگر حنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”جمال بیٹا!“ ساس اس سے قدرے مختلف انداز
میں مخاطب ہوئی۔ ”یہ اُس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ ہم لوگ بھی
نہیں چاہتے کہ تم دونوں کے درمیان اختلافات اتنے
شدت اختیار کر جائیں کہ خدا نخواستہ علیحدگی کی نوبت
آجائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنا گھر کرائے پر دے کر
یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ اوپر والا پورشن خالی پڑا ہے۔ تم بھی
ندیم کی طرح ہمارے بیٹے ہو۔ یہاں رہو گے تو تم دونوں

کے درمیان کوئی ناچاقی نہیں ہوا کرے گی۔ یہ بھی تو تمہارا
گھر ہے۔“

جمال اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس
کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپس کی پوری
مشاورت کے بعد یہ فیصلہ سنایا جائے گا۔ حنا کے رویے سے
بھی لگ رہا تھا کہ وہ بھی یہی چاہتی ہے۔ جمال نے اپنی
ساس کو بغور دیکھا پھر سر سے مخاطب ہوا۔

”انکل! انسان کو شریف ضرور ہونا چاہیے مگر اتنی
شرافت بھی نہیں ہونی چاہیے جو کمزوری بن جائے۔ مجھے
حیرت ہے کہ گھر کے بڑے آپ ہیں اور بات کوئی اور کر رہا
ہے۔“ پھر اس نے روئے سخن بیوی کی طرف کیا۔ ”جی حنا
صاحبہ! ویسے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ آپ
کی ماں کی اس خواہش میں آپ کی رضامندی مکمل طور پر
شامل ہے پھر بھی میں آپ کی رائے لینا پسند کروں گا کہ آپ
چاہیں گی کہ آپ کا غیرت مند شوہر گھر بھائی بن جائے۔ گھر
جنوائی..... جس کے بارے میں ایک مشہور مقولہ بھی ہے کہ
بہن کے گھر میں بھائی کتا اور سسرال میں جنوائی کتا۔ کیا
کہیں گی آپ؟“

”دیکھو جمال۔“ وہ اپنا روئے سخن جمال کی طرف
کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب گئے دنوں کی باتیں ہیں۔
میرے خیال میں یہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کوئی
مفت میں تو نہیں رہیں گے، ماشاء اللہ اچھی خاصی انکم ہے
آپ کی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہاں رہنے میں کوئی حرج
نہیں ہے۔ اوپر تین چار کمرے ہیں۔ اٹالین کچن ہے اور
سب سے بڑی بات کہ آپ کا آفس یہاں سے تین کلومیٹر
کے فاصلے پر ہے۔ ساس سسر بھی ماں باپ کی طرح ہوتے
ہیں۔ مجھے تو یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“
جمال اپنی جگہ سے گھڑا ہو گیا۔

”او کے میں سوچ کر بتاؤں گا۔ چلتا ہوں۔“
”بیٹھو بیٹے، کھانا کھا کر جاؤ۔“ ساس شفیق لہجے میں
بولی، جس کی شفقت میں میکاری کا عنصر بھی شامل تھا۔
”ٹھیکس آنتی، پھر کبھی سہی۔ میں ایک ہفتے کے اندر
آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے دل کی
حالت کافی ابتر تھی۔ رہ رہ کے اسے حنا کے اجنبی سے رویے
پر دکھ ہو رہا تھا۔ اب اس کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی
تھی کہ حنا کے سرد رویے کی کیا وجہ تھی۔ وہ کافی عرصے سے
اپنی ماں کے گھر میں رہنے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر اس کو

اس اثنا میں ویٹران کے سامنے دو کولڈ ڈرنک رکھ کر چلا گیا۔

”میری ازدواجی زندگی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ حنا کی سرکشی کے باوجود میں نے کئی بار کپڑا مارتا کیا مگر کل اس نے اور اس کی ماں نے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی جو مجھ جیسے آدمی کے لیے قابل قبول نہیں۔“

”کیسی شرط؟“ ماورا کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

”حنا کئی دن سے میکے میں ہے۔ کل میں خود اس کو لینے چلا گیا۔ ان لوگوں سے بات ہوئی۔ میں حنا کو واپس لانا چاہتا تھا مگر اس کی ماں نے کہا کہ یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں ہمارے گھر میں رہنا ہوگا۔“

”یعنی گھر داماد بن کر؟“ ماورا نے سوال کیا۔

”جی گھر داماد بن کر۔“ جمال نے جواب دیا۔

”اس بارے میں حنا کا کیا خیال ہے؟“ ماورا نے پوچھا۔

”وہ تو مکمل اپنی ماں کی ہمنوا لگ رہی تھی۔ مجھے تو

ایک پل کے لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ میری بیوی ہے۔“

جمال نے جواب دیا۔

”تو تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے ان سے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ ماورا!

میں بچپن میں ٹوٹے ہوئے گھر کا عذاب سہہ چکا ہوں اس لیے اپنا گھر نہیں توڑنا چاہتا لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا تھا

کہ حالات مجھے اس مقام پر لا کھڑا کریں گے جہاں مجھے گھر

بچانے کے لیے اپنی خودداری کو قربان کرنا پڑے گا۔ اب تم

بتاؤ میں کیا کروں؟ ایک خیال آتا ہے کہ طلاق دے کر جان

چھڑالوں مگر یہ میرے بس میں نہیں۔ مجھے پلیز گاؤ کرو اور

بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

ماورا نے بالوں کو سیٹ کیا اور آرام سے بولی۔ ”بن

جاؤ گھر داماد۔ سالی پہ بھی آنکھ رکھو، کچھ عرصے بعد ان کے

بیٹے کی شادی ہو جائے گی۔ اس کی بیوی کو بھی پٹاؤ تاکہ

تمہاری زوجہ محترمہ کو آلے دال کا بھلا معلوم ہو۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ جمال بولا۔

”ہاں تو میں بھی سیریس ہوں۔ جمال! گھر داماد بن

کر رہنے میں کوئی زیادہ قباحہ نہیں ہے مگر تم جیسے خوددار

انسانوں کے لیے واقعی مشکل کام ہے۔ یا راہ تمہاری بیوی

میری سمجھ سے تو باہر ہے اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا کہ

اس موقع پر تمہیں کیا مشورہ دوں۔ اپنی ماں اور بھائی سے

یہ بات کہنے کی جرأت کبھی نہ ہو سکی تھی آج اس کی ماں نے یہ بات کہہ کر حنا کے عزائم سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ذہنی صدمے کے باعث وہ تین بار ایکسیڈنٹ سے بچا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گھر داماد بن کر رہنے کا فیصلہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ بیوی کے ساتھ معاملات سیٹ ہوں اور رہائش کا مسئلہ ہو تو اور بات ہے مگر وہ شوہر کی کمزوری بھانپ کر اس کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے پر مجبور کرے تو غیرت مند شوہر کافی مشکل کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر آ کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ کافی تھکا ہوا تھا اس لیے سو گیا۔ رات کے آخری پہر بھوک کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ڈبل روٹی کے چند سلائس کھائے اور چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ چائے پی کر اس نے اپنا موبائل دیکھا۔ ماورا کے تین چار میسجز آئے ہوئے تھے۔ اس نے اس کے نمبر پر ایک مسڈ کال کی۔ تھوڑی دیر بعد ماورا نے اس کو کال کر دی۔

”جاگ رہی نہیں کیا؟“ جمال نے سوال کیا۔

”ہاں طبیعت ناساز تھی۔ سرشام سو گئی تھی ایک گھنٹا

پہلے آنکھ کھلی۔ تمہیں میسج کیے مگر تم سو رہے تھے۔ یہ رات کے

تین بجے تم کیوں جاگ رہے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”کل پھر اسی ریٹورنٹ میں ملو، تم سے ایک ضروری

مشورہ لینا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گی..... کس وقت؟“

”پانچ بجے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

”کیسی ہو؟“ وہ ریٹورنٹ کی کونے والی میز کے

سامنے بیٹھتے ہوئے بولا جہاں پر ماورا پہلے سے موجود تھی۔

”بہت بُرے ہو تم جمال۔ پورے آدھا گھنٹا لیٹ

ہو گئے ہو۔“ وہ غصے سے بولی۔

”بس ذرا آفس سے دیر ہو گئی۔ آج تو بہت شاندار لگ

رہی ہو۔“ جمال اس کے سر پا کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ محض مسکرا دی۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ

اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”ماورا! میں زندگی کے عجیب دورا ہے پر آ گیا

ہوں۔ ٹوٹتے ہوئے گھر کو بچاتے بچاتے میں خود ٹوٹ

پھوٹ گیا ہوں۔ اب ایک سنجیدہ معاملے پر تم سے مشورہ

ذرا کر رہے۔ تم سن رہی ہونا؟“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم بات جاری رکھو، میں سن رہی ہوں۔“ ماورا فیمل

پر رکھے ہوئے گلاس کو گھماتے ہوئے بولی۔

”کافی کمزور لگ رہے ہو، لگتا ہے ہماری بھابی تمہاری خوراک کا خیال نہیں رکھتیں۔“ رشید بغل گیر ہونے کے بعد بولا۔

”بس ذرا آفس کے کاموں کا کافی بوجھ ہوتا ہے۔ تو بتائی اور بھابی کیسی ہیں؟“ جمال نے سوال کیا۔

”تم خود ان کو دیکھ لیتا، آؤ بیٹھو۔“ رشید گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا اور جمال اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ان کی گاڑی شہر سے نکل کر مضائقہ میں داخل ہوئی۔ دس منٹ کی مزید ڈرائیو کے بعد رشید کا گھر آ گیا۔ دو کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا وہ گھر کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب نے بھرپور استقبال کیا۔ آخری بار وہ شادی سے ایک سال پہلے آیا تھا۔ رشید اس کے گھریلو حالات سے کافی باخبر تھا۔ دونوں مہینے میں دو چار بار فون پر لمبی گفتگو کیا کرتے تھے۔ رشید اس کو کمرے میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد رشید کی بہن اور بیوی کمرے میں آ گئیں۔

”بھابی کو بھی ساتھ لے آتے۔“ رشید کی بیوی نرمس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”حتا کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے اس کو نہ لاسکا پھر کبھی لے آؤں گا۔ آپ سنا میں آپ کیسی ہیں؟“ وہ دونوں سے مخاطب ہوا۔

”بس جی ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ نرمس سادگی سے بولی۔ ”بھائی! آپ نہالیں تاکہ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے کپڑے استری کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر نرمس نے بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ رشید کی بہن بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جمال باتھ روم میں مہس گیا۔ جب دس منٹ بعد نہا کر باہر نکلا تو سلیپے سے استری کیا ہوا سوٹ بیڈ پر پڑا تھا اور اس کے جوتے بھی پالش سے چمک رہے تھے۔

یہ جوتے کس نے پالش کیے؟“ اس نے رشید سے سوال کیا۔

”تمہاری بھابی نے اور کس نے۔“ رشید نے جواب دیا۔ جمال رشید کی ازدواجی زندگی سے بہت متاثر تھا۔ اس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ رشید کی بیوی ایک خاموش طبع عورت تھی اور وہ رشید کا اس طرح خیال رکھتی جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو۔ رشید کی ہر بات اس کے لیے حرفِ آخر ہوتی تھی۔ اس دس سالہ ازدواجی رفاقت میں ان کے درمیان کوئی سنگین جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اس گھر میں جمال

بات کرو وہ کیا کہتے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے یہ بات سن کر بھائی کیا مشورہ دے گا۔ وہ فوراً کہے گا کہ اس بیوی کو دفع کرو اور دوسری شادی کرو۔“ جمال نے جواب دیا۔

”یہ تو کافی معقول مشورہ ہے۔ تمہاری بیوی فسادِ ذہن رکھنے والی عورت ہے۔ ایسی عورت کا علاج صرف دوسری شادی ہے۔ مجھے تو قسم سے تمہاری بے بسی پر رحم آ رہا ہے اور تمہاری بیوی پر شدید غصہ آ رہا ہے۔ پہلے تم سے تمہاری ماں کا گھر چھڑوایا، اب تم سے تمہارا گھر چھڑوانا چاہتی ہے۔ بار عجیب لڑکی ہے۔ یہ آئیڈیل لائف ہے۔ ساس تندوں کے جھگڑوں سے دور خوب صورت گھر ملا ہوا ہے مگر اس کو وہاں چین ہی نہیں آتا۔ یہ عورت تمہیں اپنی ماں کے گھر میں بھی سکون مہیا نہیں کرے گی۔ اپنے کسی قابل دوست سے مشورہ کرو، میں تو تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔“

”پھر بھی کچھ تو کہو۔“ جمال بے تابی سے بولا۔

ماورا نے آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑا اور بولی۔

”بن جاؤ گھر داماد۔ یہ کر کے بھی دیکھ لو۔“

”ہوں۔“ جمال لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ تمہارا مشورہ ہے؟“

”نہیں، ایک بات ہے۔ اس کو مشورہ بھی سمجھ سکتے ہو۔ اب تم مجھ سے ہر حال میں مشورہ لینا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں یہی کہوں گی کہ ان کی یہ بات بھی مان کے دیکھ لو۔“

”ٹھیک ہے، میں اس بارے میں مزید سوچوں گا۔ کیا خیال ہے چلیں؟“

”چلو۔“

پھر دونوں وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلے روز جمال نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ وہ اس ماحول سے کچھ دنوں کے لیے دور جانا چاہتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان، میں اس کا ایک پرانا دوست رہتا تھا، رشید نام تھا اس کا۔ اپنے علاقے کا معقول زمیندار تھا اور جمال کا بے تکلف دوست بھی۔ جمال کچھ دنوں کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا۔ رشید کئی بار فون پر اس کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ رشید کے گھر وہ پہلے بھی دو تین بار جا چکا تھا۔ وہاں اس کو سب اپنے گھر کا فرد ہی سمجھتے تھے۔ اس نے بیگ میں دو تین جوڑے ڈالے، کچھ اور ضروری سامان رکھا اور ڈیرہ غازی خان جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

چند گھنٹے بعد وہ ڈیرہ غازی خان کے اڈے پر تھا جہاں پر رشید اس کے انتظار میں موجود تھا۔ دونوں دوست

جب بھی آتا تھا تو زمرس اپنے سگے بھائیوں کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔

”چل میرے یار! اب ہم پیدل گھومیں گے۔ یہاں تیر کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔“ اور جمال خاموشی سے اس کے ہمراہ چل دیا۔

وہ کافی دیر تک شکار کرتے رہے۔ رشید پانچ تیتروں کا شکار کر چکا تھا۔ جب سورج ڈھلنے کے قریب ہوا تو دونوں نے واپسی کی راہ لی۔

”تھک تو نہیں گئے؟“ رشید نے جمال سے سوال کیا۔
”ارے نہیں یار! میں تو پہلے سے زیادہ تازہ دم ہو گیا ہوں۔“ جمال نے جواب دیا۔

”اپنا بخشو کافی اچھا شیف ہے۔ تم اس کے ہاتھ کا پکا ہوا تیترا کھا کے دیکھنا، مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی ایسا لذیذ کھانا تمہیں نہیں ملے گا۔“

جب وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچے تو ٹینٹ نصب ہو چکا تھا اور سورج مغرب کی آغوش میں چھپنے جا رہا تھا۔
”کیا سوچ رہے ہو یار؟“ رشید نے جمال سے سوال کیا۔

”میں فطرت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ جمال نے ٹینٹ کے اندر داخل ہو کر کہا جہاں پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور بچکے بھی موجود تھے۔

”کیا مطلب؟“ رشید نے سوال کیا۔
اس اثنا میں بخشو خیمے میں داخل ہوا۔ رشید نے شکار کیے ہوئے تمام تیترا اس کے حوالے کر دیے۔

”ابھی پکاؤں یا تھوڑی دیر بعد؟“ بخشو نے مودبانہ انداز میں سوال کیا۔

”ابے اوگھاڑ! یہ جمال شہری بابو ہے۔ دیر سے کھانا کھاتا ہے۔ پہلے تو ہمیں گرم گرم چائے پلا، کھانا رات آٹھ بجے بنانا۔ اب تم جاؤ۔“

بخشو جی اچھا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ رشید نے سوالیہ انداز میں جمال کو دیکھا جیسے اس کو بات جاری رکھنے کا کہہ رہا ہو۔

”یار رشید! ہم شہری لوگوں نے خود کو فطرت سے دور کر کے خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اب دیکھو یہ پرندے، یہ جانور جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھے آج بھی ویسی ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تنکوں سے گھر بناتے ہیں۔ کوئی لالچ کوئی حرص، کوئی طمع نہیں ہوتا ان کو۔ آج کھایا اس کے بعد بے فکر ہو گئے۔ ذرا بڑے شہروں کے لوگوں کی زندگی دیکھو۔

اب میں لاہور میں رہتا ہوں جہاں سڑکوں پر ایک طوفان بدتمیزی برپا ہے۔ ٹریفک جام، شاندار رہائشی مکان اور پھر دوسرا مکان بنانے کا لالچ پھر تیسرا مکان۔ شادی ہالوں میں

جمال کو وہاں رہتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ دونوں آدمی آدمی رات تک گئے دنوں کی باتیں کرتے تھے اور زمرس ہر گھنٹے بعد ان کے لیے چائے بنا کے لاتی تھی۔ کیا مجال جو اس کے ماتھے پر جمال نے کبھی کوئی حکمن دیکھی ہو۔

ایک دن رشید نے اس کو اپنے ساتھ شکار پور لے جانے کا پروگرام بنایا۔ رشید کے پاس روسی ساختہ دو ٹال والی رائفل تھی جو کافی پرانی تھی۔ اس روز بھی رشید وہ بندوق اٹھالایا اور اس کو تیل دینا شروع کر دیا۔

”تم اپنا شکار والا مشغلہ بھولے نہیں ہو۔“ جمال اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”او نہیں یار! شکار کا شوق جس کو لگ جائے وہ عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔ اپنا ٹینٹ ساتھ لے جائیں گے۔ رات وہیں گزاریں گے۔ تم کسی زمانے میں واپس بجایا کرتے تھے، کیا اب بھی بجاتے ہو؟“ رشید نے سوال کیا۔

”اتنی فرصت کہاں رہتی یار۔“ جمال انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ اس اثنا میں زمرس کھانا لے کر آگئی اور فرشی نشست پر کھانا رکھ کر چلی گئی۔ دونوں نے کھانا کھایا پھر چائے سگریٹ سے فارغ ہو کر باہر آ گئے۔

”سگریٹ میں نے خرید لیے ہیں۔ جہاں ہم جائیں گے وہاں تمہارے برانڈ والے سگریٹ نہیں ملتے، وہاں تو بس جنگل ہی جنگل ہے۔“ رشید گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ڈکی میں چھوٹا سا ٹینٹ بھی پڑا ہے اور بقیہ ضروری سامان بھی۔ بس آج کی رات وہاں بسر کریں گے، کل واپسی ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان کی گاڑی گھر سے نکل کر پکی سڑک پر آگئی۔ دس بارہ کلومیٹر کے بعد پکی سڑک ختم ہو گئی۔ اب کچا راستہ شروع ہو گیا تھا۔

کچھ دیر تک آس پاس کے کھیت دکھائی دیتے رہے پھر جنگل شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ گاڑی سے نکلے اور رشید نے ایک مناسب جگہ پر اپنا ٹینٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رشید کا ایک مزارع بھی موجود تھا۔
”یہ جگہ ٹھیک رہے گی نا بخشو؟“ رشید نے پیچھے مڑ کر اپنے پچاس سالہ مزارع بخشو کو دیکھا۔

”جی جناب! بس یہی جگہ ٹینٹ لگانے کے لیے مناسب ہے۔“ بخشو نے آس پاس دیکھتے ہوئے جواب دیا اور جمال اور رشید گاڑی سے باہر نکل آئے۔ رشید نے اپنی رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور کارٹوس کا ڈبا سنبھال کر جمال

ہزاروں لاکھوں روپے برباد کرنا، امراء کی بیگمات کی بے تحاشا شاپنگ، ایک میراٹھن ریس ہے شہروں میں جو کئی سالوں سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے اور ظلم یہ ہے کہ آگے سے آگے بڑھنے کی اس میراٹھن ریس میں وہ بھی شامل ہونے پر مجبور ہے جس میں دو قدم چلنے کی بھی سکت نہیں۔ اب دیکھو اس جنگل میں کتنا سکون ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح نشے میں مبتلا ہو کر انسان اس نشے سے جان نہیں چھڑا سکتا، اسی طرح آج کا ترقی یافتہ انسان آگے سے آگے بڑھنے کے نشے میں مبتلا ہے۔ شاندار گاڑی میں بیٹھا ہے مگر چہرے پر بے سکونی چھائی ہے۔ شاندار کھانے میز پر موجود ہیں مگر یا تو بھوک نہیں یا پھر ڈاکٹر نے منع کیا ہوا ہے۔ بس یار! میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسی طرح کے کسی جنگل میں ایک خیمہ لگا کے بقیہ زندگی گزار دوں۔“

رشید نے بنور اس کی طرف دیکھا۔

”یار جمال! یہ آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اتنی مایوسی کیوں ہے تیرے اندر اور میں دو تین دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تو کھو یا کھو یا سار ہوتا ہے۔ پھر میں نے تجھے گھر والوں کو فون کرتے بھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی بھابی کا فون آتا ہے۔ خیریت تو ہے نا۔“

جمال نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر گویا ہوا۔

”رشید! تجھے معلوم تو ہے کہ تیری بھابی سے میری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ وہ ایک انتہائی انا پرست عورت ہے۔“ پھر اس نے رشید کو تمام حال کہہ سنایا۔

”تو پھر تو نے کیا سوچا، سسرال میں رہنے کے بارے میں؟“ رشید بولا۔

”میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تو میری جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟“ جمال نے اناس سے سوال کر دیا۔

”تیری جگہ میں ہوتا تو شادی کے دو ماہ کے اندر اس قسم کی بیوی کو طلاق دے کر فارغ کر چکا ہوتا۔ سسرال میں رہنا تو دور کی بات ہے۔“ رشید نے جواب دیا۔

بخشو چائے کے دو کپ لے کر اندر داخل ہوا۔

”اوجھر رکھ دو اور کچھ ہی دیر میں کھانا تیار کر دو۔“

رشید اس سے بولا۔

دونوں دوست چائے پینے میں مشغول ہو گئے، چائے پی کر دونوں خیمے سے باہر نکلے۔ آسمان پر بادلوں کی اوٹ سے لٹکا اور اوٹ میں چھپتا ادھورا چاند ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری کیے ہوئے تھا۔ دونوں چلتے ہوئے کچھ دور نکل گئے اور چلتے چلتے رک گئے۔ رشید نے جمال کے

کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولا۔

”جو انسان تمہیں ذہنی تکلیف پہنچائے، اس سے دور رہو اپنا نو بہی اصول ہے۔ تیری بیوی کو تیری اچھائی اور تیری محبت کی ضرورت نہیں ہے تو، تو کیوں خود کو خوار کر رہا ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور نو جوانی تو سردیوں کی دھوپ کی طرح ہوتی ہے۔ ابھی تھی، ابھی غائب۔ یا تو مکمل طور پر ہتھیار ڈال دے جیسے عام مرد ہوتے ہیں، بیوی سے صرف جسمانی تعلق۔ اس نے جو پکایا کھالیا۔ وہ جو بھی کر رہی ہے اس کو نہیں روکنا۔ اس طرح مرد کافی سیٹ رہتا ہے لیکن اگر تو اس سے کچھ جائز خواہشات رکھتا ہے جو کہ وہ پوری کر سکتی ہے اور نہیں کر رہی تو پھر ایسی عورت سے جان چھڑانا بہتر ہے۔ خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ تو خود کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح کھا رہا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں خوش بیٹھی ہے۔ تجھ جیسے بے ضرر انسان کو اس حال میں دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے۔ آؤ واپس چلتے ہیں اور موضوع بھی بدلتے ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔

”یار اس جنگل میں درندے تو نہیں ہوتے نا؟“ جمال نے سوال کیا۔

”اب وہ جنگل کہاں رہے یار..... ہر دو تین کلومیٹر کے بعد کوئی نہ کوئی گھریا چھوٹا موٹا گاؤں موجود ہے۔ کچھ سال پہلے تک یہاں دو تین بھیڑیے دیکھے گئے تھے۔ جو شکاریوں نے مار دیے بس صرف گیدڑ موجود ہیں۔“

”کتنی دیر باقی ہے کھانا کپتنے میں؟“ رشید نے بخشو سے پوچھا جو سالن پکانے میں مصروف تھا۔ چولہے میں جنگل کی خشک لکڑیاں جل رہی تھیں۔

”بس جی پانچ، دس منٹ اور باقی ہیں، اس کے بعد روٹیاں بناؤں گا۔“ بخشو دور سے بولا اور اس کی بات سن کر دونوں اپنے خیمے کے اندر چلے گئے۔ سالن کی مہک ان کے نتھنوں سے مگرارہی تھی جس سے دونوں کی بھوک بھی چمک اٹھی۔ خیمے میں آ کر دونوں گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگا دیا گیا۔ تینوں نے مل کر خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر بخشو قبوہ بنانے چلا گیا۔ ان کی یہ محفل رات دو بجے تک جمی رہی۔ صبح جب جمال جاگا تو سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ بخشو ناشتا لے کر آ گیا۔ ناشتے کے بعد واپس جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔

جمال وہاں پر مزید تین دن رہا اور چھ دن گزارنے کے بعد واپس اپنے شہر آ گیا لیکن اپنے شہر میں داخل ہونے

چیب جھاؤں

اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دریا کی لہروں سے ٹکرا کر آنے والی ہوا میں کافی خشکی تھی۔ اوپر آسمان پر اکیلا اور خاموش چاند جیسے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔
”کل اپنی امی کے ساتھ میرے گھر چلی جانا اور اپنا سامان اٹھوالینا۔“

”ہاں میرے جینز کا سامان تو وہیں پر رکھا ہے۔ کل اٹھالوں گی اور تم شام سے کھوئے کھوئے سے ہو۔ بس اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”اب مجھے بھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”میرا دوست رضوان کہتا ہے کہ بیویاں موسموں کی طرح ہوتی ہیں۔ کچھ بیویاں گرمی کے موسم کی طرح ہوتی ہیں، کچھ سردی کے موسم جیسی ہوتی ہیں۔ مرد کو چاہیے کہ جس طرح موسم کے مطابق زندگی گزارتا ہے، وہ بھی اپنی بیوی کے مطابق زندگی گزار دے مگر میں کہتا ہوں کہ بیوی کو سردیوں کے موسم میں دھوپ جیسا اور گرمیوں کی دوپہر میں درخت کی ٹھنڈی چھاؤں جیسا ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے تمہیں میرے خیال سے اتفاق نہ ہو کیونکہ تم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔ تمہارا اپنا نقطہ نظر ہو سکتا ہے مگر میں اپنے اس خیال سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ تم نے بھی وائٹن کی تاروں میں سے ٹپکتی ہوئی جھنکار سنی ہے؟“ جمال نے سوال کیا۔

”میں سازوں کے بارے میں کم جانتی ہوں۔“ حنا نے جواب دیا۔

”حنا! میں نے وائٹن کی کپکپاتی تاروں میں سے ہمیشہ محبت کو آنسو بہاتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ جب وائٹن بچتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محبت اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہو۔“

”یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو جمال..... دیکھو کتنا سہانا موسم ہے۔ کوئی رومانٹک بات کرو نا۔ اگر میری جگہ ماورا ہوتی تو تم کتنا چپک رہے ہوتے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”تم تو خوش ہونا۔“ جمال نے سوال کیا۔

”ہاں، میں بہت خوش ہوں۔“ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا اور دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک آگئی۔

سے پہلے وہ مکمل طور پر ایک فیصلہ کر چکا تھا۔
اگلے دن وہ اپنے آفس سے چھٹی کے بعد سسرال چلا گیا۔ حنا نے خلاف توقع اس کی خوب آؤ بھگت کی۔
”اوپر والا پورشن دکھاؤ۔“ جمال بولا۔

حنا اس کو بالائی منزل پر لے گئی، ایک ایک کونا دکھایا۔ تمام پورشن دیکھ لینے کے بعد جمال کمرے میں آیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق یہاں رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آج چودھویں کا چاند ہوگا۔ تم تیاری کرو، اسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں اور نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تمہارے حق میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں یہاں خوش رکھے اور تم میرے حق میں دعا کرنا کہ میں بھی یہاں خوش رہ سکوں۔ چائے پلاؤ۔“ حنا فوراً کچن میں جا گئی اور چائے بنا کے لے آئی۔ جمال خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران حنا ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی جن کا جواب جمال ہوں ہاں میں دیتا رہا اور خالی کپ ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔

”میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں، رات آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔“

حنا نے مسکرا کر اس کو الوداع کہا اور جمال سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ رات نو بجے وہ اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ ایک خالی ٹیبل سنبھالنے کے بعد جمال نے پچھلی کا آرڈر دیا اور خاموشی سے حنا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”کل سے تمہیں بہت خوش دیکھ رہا ہوں۔“ جمال نے جواب دیا۔

”تو کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے؟“ حنا نے سوال کیا۔

”ضرور ہونا چاہیے۔“ جمال بولا۔ ”ہر انسان کو خوش رہنے کا حق ہے، حیرت اس لیے ہوئی کہ میں نے اپنے گھر میں تمہیں بھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ کل بالائی منزل والا پورشن دکھاتے ہوئے تم چپک رہی تھیں کیونکہ تین سال بعد تم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ میں نے مرد ہو کر اپنے بھائی اور

ماں کو چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اپنی ہر خوشی تم سے وابستہ کر لی تھی۔ تم نے عورت ہو کر شادی کے بعد بھی ہزار جتن کیے کہ تمہیں تمہارے میکے میں رہنے کی جگہ مل جائے جبکہ عورت تو بچپن ہی سے ذہنی طور پر اپنے ماں باپ کے گھر میں خود کو مہمان سمجھتی ہے۔“

”ہاں، میں بہت خوش ہوں۔“ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا اور دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک آگئی۔

”میں آج کیسی لگ رہی ہوں؟“ حنا شوخ لہجے میں بولی۔
”تمہارا چہرہ بہت خوب صورت ہے۔“ جمال نے مختصر تبصرہ کیا۔

”وہ تو ہے، مطلب آج اس وقت اس بلیک سوٹ میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے پھر سوال کیا۔
”چھوڑو ان فضول باتوں کو یہ بتاؤ کھانا کیسا تھا۔ اس ریستورنٹ کی فرائی مچھلی بہت لاجواب ہوتی ہے۔“ جمال ٹشو سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”تم کافی بدلے بدلے سے لگ رہے ہو۔ لگتا ہے امی کے گھر میں رہنے کا فیصلہ تمہیں پسند نہیں آیا۔“
”بات پسندنا پسند کی نہیں، درمیانی راستے کی ہے۔ اپنے گھر میں بھی تو میں ہر وقت سولی پہ لٹکا ہوتا تھا۔ اگر میں کہہ بھی دوں کہ نہیں جی میں تو سسرال میں نہیں رہتا، تمہیں میرے ساتھ وہیں پہ رہنا ہوگا، تو اس سے کیا ہوگا؟ پھر تمہاری بے پروائی اور میری بے سکونی شروع ہو جائے گی۔ چھینے کا درمیانی راستہ تو مل گیا نا، بس ایک دکھ یہی ہے کہ کاش تم نے مجھے سسرال میں رہنے پر مجبور نہ کیا ہوتا۔“

”اب آپ ان باتوں کو چھوڑ کر نئی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتے۔“ حنا اکتا کر بولی۔
”میری ہر بات پر تم جلدی اکتا جاتی ہو۔ بس وعدہ آج کے بعد اس موضوع پر پھر کبھی بات نہیں ہوگی..... چلیں؟“
”ہاں چلو۔“

☆☆☆

اگلے دو دنوں میں شفٹنگ کا کام مکمل ہو گیا۔ حنا تو اپنے جہیز کا سارا فرنیچر اور دیگر سامان اپنی ماں کے گھر میں شفٹ کر چکی تھی۔ جمال نے صرف اپنے کپڑے وہاں سے اٹھائے، باقی سامان رہنے دیا۔ حنا کو اس نے یہ کہا کہ جیسے ہی کوئی اچھے سے کرائے دار مل گئے، میں اپنا بقیہ سامان اٹھا لوں گا۔

حنانے تمام سامان اپنے نئے ٹھکانے پر شفٹ کر دیا۔ جمال دفتر سے آکر تھوڑا سا آرام کرتا پھر باہر چلا جاتا پھر رات گئے آتا اور کھانا کھاتے ہی سو جاتا۔ حنا خود بھی جلدی سو جانے کی عادی تھی اس لیے وہ اس کی اس تبدیلی پر معترض نہیں تھی۔ جمال حنا کے ماں باپ سے بس واجبی سا تعلق رکھے ہوئے تھا چونکہ اس کو ان کے پورشن سے ہو کر آنا پڑتا تھا اس لیے سلام دعا تو لازمی تھی۔

تقریباً ایک ہفتے تک جمال کی یہی روٹین رہی۔ ایک دن حنانے آخر وہ بات کہہ دی جو اس کی ماں کئی دن پہلے اس

کے کان میں ڈال چکی تھی۔
”جمال! آپ میرے والدین سے کچھ کچھ کچھ سے رہتے ہیں، کبھی ان کے ساتھ نہیں بیٹھتے۔ کبھی کوئی اسپتال ٹائم نہیں دیا بس گزرتے ہوئے سلام دعا کرنا تو کافی نہیں ہوتا نا۔“

”تو آپ کی امی صاحبہ نے ایک نیا محاذ کھڑا کر دیا۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”کیا ضرورت تھی ان کو یہ بات کہنے کی، یہاں رہتے ہوئے یہ میرے فرائض میں تو شامل نہیں ہے نا کہ میں ان کی محفلوں میں بھی شرکت کروں۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہوں۔“
”آپ سے تو کوئی بات کرنا ہی گناہ ہے۔“ یہ کہہ کر حنا پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان پھر ایک ان دیشی سی دیوار بن گئی۔ اب ہوتا یوں تھا کہ جمال جب بھی دفتر سے گھر آتا تو اوپر جا کر اس کو بہت دیر تک حنا کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ تو اس کو آواز دے کر بلانا پڑتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنی جھنجھلاہٹ ظاہر کر دی۔
”حنا! کم سے کم اتنا تو کیا کرو کہ جب میں یہاں آؤں تو تم اپنے ہی پورشن میں ملو۔ اب تو میں جب بھی آؤں جہاں سے بھی آؤں تم نیچے موجود ہوتی ہو۔“
”ہاں تو میں آتی تو پھر تمہارے پاس ہوں نا۔ اس میں اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ حنا بے پروائی سے بولی۔

”ضرورت ہے۔“ وہ چلایا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جب میں آفس سے تھکا ہوا یہاں آؤں تو تم مجھے اپنی منتظر ملو۔ اگر میری یہ خواہش ناجائز ہے تو پھر تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اوپر رہنے کی۔ جاؤ نیچے جا کر رہو۔“

حنانے غصے بھری نظروں سے ایک نظر اس کو دیکھا پھر نیچے چلی گئی۔ جمال رات دس بجے تک اس کا منتظر رہا۔ وہ ساڑھے دس بجے آئی اور جمال سے کوئی بات کیے بنا چپ کر کے سو گئی۔ اگلی صبح دونوں کے بیچ تناؤ کی کیفیت موجود تھی۔ حنانے ناشامیز پر رکھا اور جانے ہی والی تھی کہ جمال کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”سنو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔
”جی۔“ اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

”حنا! میں اب اس ٹینشن زدہ ماحول میں مزید نہیں رہ سکتا۔ تمہیں تمہاری ماں کی اور بہن بھائی کی رفاقت درکار تھی سول گئی۔ میری ضرورت نہ تمہیں پہلے بھی تھی اور نہ آج

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



میں مصروف تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چل دیا۔

اب جمال روزانہ چالیس کلومیٹر کا سفر کر کے آفس جاتا اور واپس اپنی ماں والے گھر میں چلا جاتا۔ اس کا کمرہ اس کی جائے پناہ بن گیا تھا۔ ماورا اور رشید کو وہ تمام داستان سنا چکا تھا۔ دونوں نے اس کو یہی کہا کہ جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ماں کو باقاعدہ لڑکی دیکھنے کا کہہ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بے شک کوئی بیوہ ہو مگر بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہونی چاہیے، بس زیادہ سے زیادہ گریجویٹ ہو اور اس کی ماں نے بھی اس کی دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ البتہ حنا کو طلاق دینے کی مخالفت کی تھی مگر جمال دوسری شادی کے ساتھ ساتھ طلاق پر بھی غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

آج جمال کو حنا سے جدا ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران حنا نے ایک بار اس کو فون کیا تھا مگر نمبر بندل رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے پورشن میں بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے؟“ حنا کی ماں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”جمال کے لیے پریشان ہو تو بے فکر ہو، آجائے گا۔ تمہارے بیٹا وہ نہیں رہ سکتا۔“

”امی! ان کا نمبر بندل رہا ہے۔ لگتا ہے انہوں نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟“ وہ فکر مند لہجے میں بولی۔

”ہوگی کوئی وجہ۔ ہو سکتا ہے نیٹ ورک خراب ہو۔ حنا! وہ تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چند دن اور صبر کر۔ اگر اسی طرح تو نے بے صبری دکھائی تو وہ اپنی سن مانیاں شروع کر دے گا۔ مکان تو اس نے کرائے پر دے دیا ہے پھر لے جائے گا وہ تجھ کو شہر سے دور اپنی اماں کے گھر میں۔ مرد کو قابو کرنا بہت آسان کام ہے لیکن یہ بے قابو ہو جائے تو پھر عورت کی ایک نہیں چلتی۔“

حنا خاموش رہی۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

”تیرے بھائی کے سسرال والے شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم نے حج پر جانا ہے جب تک بیٹی کا فرض نہیں نبھائیں گے حج پر نہیں جائیں گے۔ آج وہاں جانا ہے، شادی کی تاریخ طے کرنی ہے۔ تو بھی اچھے سے کپڑے پہن لینا اور اپنا حلیہ بھی ٹھیک کر۔۔۔۔۔ میں ذرا کچن تک جاتی ہوں، سالن جل نہ جائے۔“ یہ کہہ کر ماں کمرے سے نکل گئی۔

ہے۔ میں صرف اپنے کپڑے لے کر آیا تھا، باقی سامان بھی لانا تھا مگر لگتا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔“ جمال اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حنا مزید کوئی بات نہ بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جمال کا خیال تھا کہ حنا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ وہ سوری کر کے بات ختم کر دے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا، جمال نے کچھ دیر تک اس کا انتظار کیا پھر آفس روانہ ہو گیا۔ آفس میں سارا دن اس کے ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں۔ اپنی خودداری کی قربانی بھی اس کے کام نہ آئی تھی۔ اس نے فارغ اوقات میں اپنے ہر اقدام کا جائزہ لیا۔ ہو سکتا ہے حنا اتنی قصور وار نہ ہو، وہ خود حالات بگاڑنے کا ذمہ دار ہو مگر اپنا جائزہ لینے کے بعد اس نے خود کو بری الذمہ پایا پھر اس نے حنا سے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ آفس سے پھٹی ہوتے ہی وہ گھر پہنچا۔ حنا کہیں بھی نہیں تھی۔ جمال نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئی پھر اس نے بیگ میں اپنے کپڑے ڈالے اور نیچے اتر گیا۔ نیچے والے پورشن میں کسی سے اس کا ٹکراؤ نہ ہوا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ اب اس نے حنا کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنی والدہ کے گھر روانہ ہو گیا۔

شام ڈھلے وہ والدہ کے گھر پہنچا۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت اور ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیگ نے اس کی ماں کو ساری کہانی بیان کر دی۔

”بس اماں اب اور میری قوت برداشت سے باہر ہے میں نے گھر کو بچانے کے لیے ہر قدم اٹھایا، اپنی خودداری کو کچلا مگر یہ عورت شاید میرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اب پلیز مجھے یہ مت کہیے گا کہ صبر کر، دو ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ ٹھیک نہیں ہو سکے گی کیونکہ وہ خود کو غلط سمجھتی ہی نہیں۔“

بھائی نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ بھائی نے دل جوئی کی۔ تب کہیں جا کر اس کی طبیعت کو تھوڑا سا قرار آیا۔

”میرا کمرہ سیٹ کر دیں۔ میں یہاں رہوں گا اور ہاں اب میں حنا کو طلاق دوں یا دوسری شادی کروں، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ تمام آداب ملحوظ رکھتے ہوئے بولا۔

”تم اپنی خوشی کے لیے جو چاہو کرو، میں درمیان میں نہیں بولوں گی۔“ ماں نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نازل ہو گیا۔ اب وہ گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپوں

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ گھنٹے دنوں میں اور دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ جمال کو گئے ہوئے تین ماہ گزر گئے تھے۔ اس کا کوئی میسج یا کوئی فون نہیں آیا تھا جبکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ جمال چند دنوں سے زیادہ اس کے بغیر رہ پایا ہو۔ حنا کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ انجانے خدشات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ایک دن وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر جمال کے آفس چلی گئی۔ ریسپشن پر آکر اس نے استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ وہ جمال سے ملنا چاہتی ہے۔

”کیا کام ہے جی آپ کو ان سے؟“ کلرک نے روایتی سوال کیا۔

”میں ان کی مسز ہوں۔“ حنا نے جواب دیا۔

کلرک نے فون پر جمال کو آگاہ کیا پھر جمال کی بات سن کر وہ حنا سے مخاطب ہوا۔

”جی وہ بڑی ہیں، آپ سے نہیں مل سکتے۔“

”کیا مطلب؟“ حنا غرائی۔ ”میں ان کی بیوی ہوں، ملاقاتی نہیں ہوں۔ مجھے ان کا کمراد کھائیے۔“ کلرک نے حنا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جب وہ باز نہ آئی تو کلرک نے پھر جمال کو فون کیا۔ جمال نے آنے کی اجازت دے دی۔

”جائیے جی، وہ سامنے والا کمران کا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اگلے ملاقاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حنا اپنی جگہ سے اٹھی اور جمال کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جمال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں سے گزر رہی تھی سو چاہتا ہوں کہ حال پوچھتی جاؤں۔“ وہ تھوک نلگتے ہوئے بولی پھر سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جمال دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ حنا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے پہلو بدلنا شروع کر دیا۔ جمال کی طرف سے اس کو اتنی اجنبیت کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ اپنے لہجے کے کھوکھلے پن سمیت دوبارہ بولی۔

”آپ نے نہ کوئی میسج کیا نہ فون۔ گھر میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ وہ میں..... دراصل..... آپ خاموش کیوں ہیں؟“

جمال نے انٹرکام پر اپنے ایک ماتحت کو بلایا۔ اگلے ہی لمحے وہ جمال کے آفس میں تھا۔

”بیٹھے!“ جمال نے اس کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آفس سپرنٹنڈنٹ سلیم شکر یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ جمال ایک فائل اٹھنے پلٹنے لگا پھر فائل بند کر کے سلیم سے مخاطب ہوا۔

”یہ فائل میں نے دیکھ لی ہے۔ اس میں کچھ ضروری کاغذات نہیں ہیں۔ ان کے بغیر تو یہ پروجیکٹ مکمل نہیں

ہو سکتا۔ آپ فوراً صدیقی صاحب کو آگاہ کیجیے اور بتائیے کہ کون کون سے کاغذات مزید لکھنے ہیں اور جتنی جلدی ممکن ہو یہ فائل مکمل کر کے میرے حوالے کیجیے۔ چائے کا موڈ ہے تو بیٹھیے ورنہ آپ کو اجازت ہے۔“ جمال نے مسکرا کر سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ سر! میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ سلیم واپس چلا گیا۔

جمال اب حنا سے مخاطب ہوا۔

”تو حنا صاحبہ! آپ یہاں سے گزر رہی تھیں اور آپ نے سوچا کہ پتا کرتی جاؤں کہ جمال زندہ ہے یا مر گیا ہے۔“ جمال جی سے مسکرایا۔

”خدا نہ کرے، ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں آپ؟“ حنا نے جواب دیا۔

”کیا امی سے کوئی نیا ٹوٹکا پوچھ کر پھر سے مجھے ذہنی ٹینشن دینے آئی ہیں آپ؟“ وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔

”بس جانے دیجیے، آج آفس کے بعد سیدھا گھر آجائیے۔ مجھے آپ کی کئی محسوس ہوتی ہے۔“ حنا ہارے ہوئے جواری کی طرح بولی۔

”اوہ تو آپ کو بھی میری کئی محسوس ہوئی اور آپ مجھے دوبارہ اسی جہنم زدہ زندگی میں لے جانے کے لیے آگئی ہیں۔“ جمال نے طنز کیا۔

”ایسی بات نہیں ہے، مجھے واقعی آپ کی کئی محسوس ہوتی ہے۔“ حنا نظریں جھکا کر بولی۔

جمال کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ بولا۔

”حنا صاحبہ! آپ کی اتنا بھی تنک باقی ہے۔ میری کشش تمہیں یہاں کھینچ لاتی مگر مجھے کہتی ہو کہ یہاں سے گزر رہی تھی، سو چاہتے ہیں دیکھتی جاؤں اور پھر تم مجھے واپس اپنی ماں کے گھر لے جانا چاہتی ہو۔ حنا! اگر تم اپنے ماضی پر پشیمان ہو گئیں اور اپنی انا پرست طبیعت کو چل چلی ہوئیں تو میرا لہجہ یہ نہ ہوتا جواب ہے۔ تم وہی حنا ہو، تم مجھے اپنی انا پرست اور بے پروا طبیعت کی وجہ سے ہمیشہ ذہنی تار چر کرتی رہی ہو۔ تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو۔ ہاں تنہائی سے اکتا کر وہی چو ہے بلی والا کھیل کھیلنے کے لیے پھر سے تازہ دم ہو کر آئی ہو۔ حنا، اب ہم دونوں کبھی ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ تم سارے شہر کو میری فٹیں کرانے کے لیے لے آؤ تب بھی میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اب تم جاسکتی ہو کیونکہ یہ میرا گھر نہیں ہے، آفس ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

حنا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا

واپس چلی گئی۔ وہ صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ آج وہ خود کو بہت شکستہ محسوس کر رہا تھا۔ دل کی سچی خوشی اس سے کافی دور تھی۔ آفس میں تھوڑا بہت دل لگ جاتا تھا مگر چھٹی کے بعد وہ گویا ایک ان دیکھے قید خانے میں چلا جاتا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سوچوں میں گم تھا کہ ماں کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اماں طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے مگر آج کل دل پر ایک عجیب سا بوجھ ہے۔ دل کرتا ہے یہ شہر چھوڑ کر کسی جنگل میں نکل جاؤں یا کسی پہاڑ کے دامن میں ایک درخت کے نیچے چھوٹا سا خیمہ لگا کر.... زندگی گزار دوں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں تیرے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں۔ تو فکر نہ کر اچھی بیوی ملے گی تو تیرا دل لگ جائے گا۔ ابھی میں ساتھ والوں کے گھر سے آرہی ہوں۔ میاں بیوی جج پر جا رہے ہیں نا۔ کافی مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہاں پر ایک لڑکی دیکھی ہے۔ غریب لوگ ہیں اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ میری پانچ بیٹیاں ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں تیرا ذکر کر دیا تو انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔“ اس کی ماں تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے اماں۔ آپ ماں ہیں، میرے لیے جو بھی کریں گی اچھا ہی کریں گی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”کہاں جا رہے ہو، ابھی تو آفس سے آئے ہو؟“ ماں نے پوچھا۔

”میں کچھ دنوں کے لیے شہر سے دور جانا چاہتا ہوں۔ آٹھ دس دنوں کی چھٹی چاہیے اس کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنانا ہے۔“

”اب کہاں جاؤ گے؟ گھر سے زیادہ سکون اور کہاں ملے گا تمہیں؟“ ماں نے پوچھا۔

”گھر.....“ اس نے زہریلی مسکراہٹ سے زیر لب کہا اور ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”اماں! گھر کے جہم میں جتنا میں جلا ہوں، شاید آپ کو ابھی تک پتا بھی نہیں۔ میں بس ویسے ہی آؤٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن، اوٹ پٹانگ قسم کی موسیقی، بیہودہ ٹی وی چینل..... کیا ہے شہر میں سوائے ان فضولیات کے۔ ویسے بھی چند دنوں کے لیے

جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کچھ کہے بنا واپس لوٹ گئی۔ پھر دروازے پر رگ کر پلٹ کر جمال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اپنے آنسو اس نے ہتھیلی سے صاف کیے پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

”جمال اتم مجھے کتنا ہی برا بھلا کہو۔ میں ذرا بھی مائنڈ نہیں کروں گی اور ایک بات تمہیں آج بتائے دیتی ہوں جس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے بھیک مانگنے والے انداز میں جمال کو دیکھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جمال اس کے اعتراف محبت سے رتی بھر بھی متاثر نہ ہوا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تمام راستے حنا سے ہونے والی آج کی ملاقات اور اس کے انوکھے روپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی کے منہ سے اپنے لیے اعتراف محبت کے الفاظ سنے تھے لیکن اس نے یقین نہ کیا۔ وہ اس بات کو حنا کا نیا طریقہ واردات جان کر فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اب وہ کسی بھی صورت میں حنا کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی تین سالہ ازدواجی رفاقت میں جمال نے حنا کو ایک اچھی بیوی بنانے کے لیے تمام حربے استعمال کیے تھے۔ اب وہ مزید کوئی حربہ استعمال کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

گھر جاتے ہی وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنی بیوی سے کئی ماہ کی دوری کی وجہ سے وہ گھر کی روز روز کی فینشن سے تو ضرور بچ گیا تھا مگر اندر کی تنہائی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ بھائی اور بھائی کو خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھتا تو اس کے دل میں ایک غلش سی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی حنا کی یاد بھی اس کو بے چین کر دیتی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد ماں کو آواز دی۔ اس کی سچی کمرے میں داخل ہوئی۔

”چاچو جی دادی اماں تو ساتھ والوں کے گھر گئی ہیں۔ وہ لوگ حج پر جا رہے ہیں نا تو ان سے ملنے گئی ہیں۔“

”ایک گلاس پانی پلاؤ بیٹا۔“ جمال بوٹ اتارنے کے بعد موزے اتارتے ہوئے بولا۔

”شاجی اچھا کہتے ہوئے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی کا گلاس تھا مے اندر داخل ہوئی۔

”تھینک یو بیٹا۔“ جمال نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا اور پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے خالی گلاس ٹا کو تھمایا تو وہ

”اماں! میں ایک گھر توڑ کر نیا گھر بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے اس جیت سے نفرت ہے جس میں کسی کی شکست شامل ہو۔ حنا کو طلاق دینا میرے لیے بہت مشکل فیصلہ ہوگا۔ اس سے علیحدگی بھی ضروری ہے۔ میں اللہ سے وہ طاقت مانگتے جا رہا ہوں جو مجھے طلاق جیسے مشکل کام کی ہمت دے۔ آپ اس لڑکی کے بارے میں ضرور بات کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں جیسے ہی واپس آؤں، یہ دونوں کام ہو جائیں اور زندگی کا ایک نیا سفر شروع کر سکوں۔“

”جاؤ بیٹا! اللہ تمہارا مددگار ہو اور ہر قدم پر تمہیں سکون کی چھاؤں ملے۔“ ماں دعا دیتے ہوئے بولی۔

”آپ کی یہی دعائیں مجھے ڈوبنے نہیں دیتیں۔ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے ٹیکسی کی اور ریلوے اسٹیشن آگیا۔ اس کی مطلوبہ ٹرین اپنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ وہ اپنی ریزرو شدہ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹرین نے چلنا شروع کر دیا۔ گرجی جا رہی تھی۔ سردی آرہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کو نیند آگئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو ریل گاڑی اس وقت ملتان کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ رات کی سیاہی ایک پاکیزہ سی سحر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گاڑی اب مضائقے سے نکل کر شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ اولیاء کرام کا شہر اس کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ملتان کے خوب صورت اور پُر رونق ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ ہوتی بالآخر رگ گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی وہ دیگر مسافروں کے ہمراہ پلیٹ فارم پر اترا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ باہر جا کر ایک مناسب سے ریسٹورنٹ میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھو یا اور ناشتے کے لیے بیٹھ گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد اس نے ویٹر سے اخبار منگوایا اور وہیں پر پڑھنا شروع کر دیا۔ اخبار پڑھ کر اس نے ٹیکس پر رکھا اور باہر دیکھا سورج نکلے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس نے بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ اب اس کی منزل حضرت شاہ رکن عالم کا مزار تھا۔ اس نے رکشے والے کو آواز دی اور مطلوبہ جگہ جانے کو کہا۔ رکشے والے نے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو جمال بیٹھ گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ وسیع و عریض مزار کے احاطے میں تھا۔ یہاں پر کافی رونق تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مزار کے قریب گیا۔ دعا مانگی اور وہیں گھنٹوں میں سردے کر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے سر اٹھایا۔ آس پاس کا

جار ہا ہوں۔ آخر رہتا تو اسی شہر میں ہے۔ ایک ہفتے بعد آ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام تک اس نے ضروری کاغذات بنوائے اور ایڈمنسٹریشن آفیسر کے گھر دے دیے۔ ایڈمنسٹریشن آفیسر اس کا دوست بھی تھا اور پاس بھی۔ اس نے اس کی ایک ہفتے کی چھٹی منظور کر لی۔ گھر آ کر اس نے شو لڈر بیگ میں کپڑے اور ضروری سامان رکھنا شروع کر دیا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ اس کا بڑا بھائی کمرے داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”بھائی جان! ہو سکتا ہے رشید کے پاس چلا جاؤں یا پھر دو تین مزارات پر حاضری دوں۔ کچھ روحانی سکون کی تلاش میں جا رہا ہوں۔“ جمال اپنی دو تین کتابیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

”ہاں، اچھی بات ہے۔ ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔ دیے بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جب سے یہاں آئے ہو، کافی کھوئے کھوئے سے اور بے چین سے رہتے ہو۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ، جیسے ہی واپس آؤ گے ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔ آج ہی جا رہے ہو کیا؟“ بھائی نے سوال کیا۔

”جی رات دس بجے والی ٹرین سے جا رہا ہوں۔ رشید کو فون کیا تھا وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے۔ میرا ارادہ ملتان جانے کا ہے۔ وہاں پر اولیائے کرام کے بہت سے مزارات ہیں۔ دودن وہاں رہوں گا پھر وہاں سے بہاولپور جاؤں گا۔ وہاں کے ایک گاؤں میں بہت پتھچے ہوئے بزرگ کا مزار ہے۔ سنا ہے وہاں پر مانگی جانے والی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک دودن وہاں رہ کر رشید کے پاس جاؤں گا۔ اس نے پچھلی بار مجھے پرندوں کے شکار کی لذت سے اس طرح آشنا کیا کہ دل کرتا ہے وہیں جنگل میں ڈیرا ڈال دیا جائے۔ رشید چار دن بعد کراچی سے واپس آ جائے گا۔ آپ نے سنا نہیں سرفرویلہ ظفر۔“ جمال ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ تم کہو تو تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آتا ہوں۔“ بھائی نے پیشکش کی۔

”ارے نہیں بھائی جان..... ٹیکسی کس لیے ہے۔ آپ آرام کریں۔“ پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

”چلتا ہوں اماں۔“

”کھانا تو کھا لیتے۔“ ماں نے کہا۔

”بھوک نہیں ہے۔“ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور ماں کے گلے میں دونوں بازو ڈالتے ہوئے بولا۔

”جائے تو لے آؤ۔“ وہ موٹی عورت اس بزرگ سے مخاطب ہوئی۔ اس کا لہجہ ہنوز ہر میں بجھا ہوا تھا۔
”ابھی لایا جی۔“ وہ بزرگ اٹھتے ہوئے بولا پھر وہ جمال سے مخاطب ہوا۔

”آپ چائے پیس گے جی؟“
”نہیں شکریہ۔“ جمال مسکراتے ہوئے بولا۔
”کیا آپ چائے بالکل نہیں پیتے؟“ بزرگ نے سوال کیا۔

”جو چائے میں پیتا ہوں وہ یہاں پر تو ہرگز نہیں ملے گی، رہنے دیں۔“ جمال نے جواب دیا۔
وہ بزرگ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جب وہ پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو ایک چھوٹی سی ٹرے میں چار کپ..... اٹھارے تھے۔ دو کپ خواتین کو دے کر تیسرا کپ اس نے جمال کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”پی لیں جی۔ یہاں بڑی اچھی چائے ملتی ہے۔ جس کینٹین سے میں چائے لایا ہوں، اس کا باپ میرا بچپن کا دوست تھا۔ وہ تو مر گیا اب اس کا بیٹا یہ کینٹین سنبھالے ہوئے ہے۔ ماشاء اللہ چائے ویسی ہی بناتا ہے جیسی اس کا باپ بناتا تھا۔“ بزرگ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

جمال نے کپ لے کر اپنے قریب رکھ دیا۔ ”آپ نے تکلیف کی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اونیں بیٹا! اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ تیری شکل میرے بڑے بیٹے سرفراز سے ملتی جلتی ہے۔ سرفراز آج کل کینیڈا میں ہوتا ہے۔ وہاں پر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ بزرگ نے سوال کیا۔

”جی مجھے جمال کہتے ہیں..... جمال الدین۔“

”ماشاء اللہ بڑا پیارا نام ہے۔ میرا نام کریم داد ہے، میں بہاولپور کے ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ تھوڑی سی زمین اللہ نے دی ہوئی ہے۔ بیج ڈالتا ہوں، مالک بور یوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ بہت مہربان ہے میرا رب مجھ پر۔“ وہ بزرگ آنکھوں میں تشکر کے جذبات لاتے ہوئے بولا۔

جمال نے پہلی بار اس سفید ریش بزرگ کو بغور دیکھا جس کی باتوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ پھر وہ بزرگ دوبارہ جمال سے مخاطب ہوا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”بہاولپور سے آگے ایک گاؤں ہے، وہاں کسی اللہ والے کا مزار ہے۔ سنا ہے وہاں جو بھی جاتا ہے، من کی مراد پاتا ہے۔“ جمال چائے کا کھونٹ بھرتے ہوئے بولا جو واقعی اس کو پسند آئی تھی۔

جائزہ لیا اور مزار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ جمال نے وہ سارا دن ادھر ادھر گھومتے ہوئے اور نوافل پڑھتے ہوئے گزار دیا مگر اس کے دل کی بے کلی کم نہ ہوئی۔ ایک عجیب سی بے چینی جو اس کے شہر سے اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی۔ اس بے کلی کا وجود ابھی تک باقی تھا۔ شام کا سورج غروب ہوتے ہی اس نے وہاں سے روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ رات کا کھانا کھاتے ہی ریلوے اسٹیشن کی راہ لی۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ بہاولپور جانے والی ٹرین کچھ دیر پہلے روانہ ہوئی ہے۔ اگلی ٹرین رات کے دو بجے روانہ ہوگی۔ وہ ٹکٹ لے کر ویننگ روم میں چلا گیا۔ تھرڈ کلاس قسم کا ویننگ ہال تھا۔ بھانت بھانت کے لوگ وہاں موجود تھے۔ تمام نشستیں پر تھیں۔ اکثر لوگ بیٹھنے والی نشستوں پر لمبی تان کر سو رہے تھے۔ جمال نے آس پاس کا جائزہ لیا اور ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر وہاں پر ہونے والے اضافی شور سے اس کی توجہ بدلی تو اس کی نظر ایک فیملی پر پڑی جو چار افراد اور دو تین بچوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب اس کے قریب ہی چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ اس فیملی کی سب سے نمایاں چیز ایک سیاہ قام موٹی سی عورت تھی جو مسلسل مٹلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے جا رہی تھی۔

”یہ تم کہاں لے آئے شہباز کے ابا۔ یہاں پر تو بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ اچھلے بھلے اے سی والی گاڑی پر جا رہے تھے مگر تمہاری بہو کوٹرین سے جانے کا شوق جاگ اٹھا۔ اب مزے کرو، گاڑی بھی چار گھنٹے بعد آئے گی۔“ یہ کہہ کر وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

”اد کوئی بات نہیں فریدہ..... اگر ہماری بہو کو ریل گاڑی کا شوق ہے تو، تو زیادہ خود کو ہلکان مت کر۔“ ایک سفید ریش نورانی صورت ادھیڑ عمر کے آدمی نے ملاعت سے جواب دیا۔

”میں کیوں خود کو ہلکان کروں گی۔ خود ہی بھگتے گی جب چار گھنٹے یہاں انتظار کر کے گزارے گی۔ دیکھنا اس کے دونوں بچے ہماری ناک میں دم کر دیں گے۔ کیا جمال جو دو منٹ بھی آرام سے بیٹھیں۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

اس کی بہوان باتوں سے بے پروا آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جمال بڑی تحویت سے ان کا جائزہ لے رہا تھا جو کسی گاؤں کے کھاتے پیتے لوگ لگتے تھے۔ وہ سفید ریش بزرگ جمال کے قریب ہی آکر بیٹھ گیا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ دوبارہ سوال ہوا۔
”لاہور سے۔“

”معاف کرنا چاہتا، تم پڑھے لکھے اور شہری نو جوان ہو۔ جانتا ہوں شہری لوگ خاموشی کے عادی ہوتے ہیں بالخصوص کسی اجنبی سے اس طرح فری نہیں ہوتے۔ میں ذرا پینڈو ہوں اور ٹائم بھی پاس کرنا ہے اس لیے خفا نہ ہونا۔“
جمال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”چاچا جی! مجھے آپ کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔ میں کئی دنوں سے کسی سے بولنا چاہ رہا تھا۔ آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔ ویسے گھبراہٹ، میں پیدا تو شہر میں ہوا، تعلیم بھی وہاں حاصل کی، جاب بھی وہیں ہے مگر اندر سے میں بھی پینڈو ہی ہوں اور مجھے اپنے اندر کا پینڈو بہت پسند ہے۔“
کریم داد نے تجسس آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
اس موٹی عورت کی آواز پھر گونجی جو اپنے پوتوں سے مخاطب تھی۔

”اوائے اب آرام سے بیٹھتے ہو یا لگاؤں دو ہاتھ۔ شہباز کے ابا ان کو تو چپ کراؤ، میرا کان کھا گئے ہیں۔ ان کی ماں تو مزے سے سو رہی ہے۔“ وہ کریم داد سے مخاطب ہوئی جو غالباً اس کا شوہر تھا۔

کریم داد نے ہلکی سی ڈانٹ سے ان کو چپ کرایا اور سونے کا اشارہ کیا۔ دونوں بچے دبک کے سو گئے۔
جمال نے بزرگ کا جائزہ لیا جو اپنی نو جوانی میں خاصا وینڈسم رہا ہوگا۔ پھر اس کی کالی کٹوٹی اور بے ہنگم بیوی کو دیکھا جو عمر، ڈیل ڈول اور صورت و شکل میں اس کی ہم پلہ تو کیا اس کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔

دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ وہ موٹی عورت دو تین گھونٹ میں اپنی چائے ختم کر چکی تھی جبکہ اس کی بیوی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی کیونکہ وہ نیند کے مزے لے رہی تھی۔

”چائے کافی اچھی تھی۔ عام طور پر ریلوے اسٹیشن پر ایسی چائے نہیں ملتی۔“ جمال نے دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں جانتا تھا اس لیے تمہارے لیے بھی لے آیا۔ ایک بات پوچھوں؟“ بزرگ نے سوال کیا۔
”جی پوچھیے۔“ جمال نے جواب دیا۔
”ایسی کوئی دعا مانگتے جا رہے جو گھر میں مانگنے سے قبول نہیں ہو سکی؟“

”میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں لیکن خود میں

حوصلہ نہیں پاتا۔ اللہ سے اسی حوصلے کے لیے دعا مانگتی ہے پھر ایک نئی زندگی کی شروعات بھی کرتی ہے اس کے لیے بھی دعا مانگتی ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔

”کیا تمہاری بیوی بدکار عورت ہے جو اس کو طلاق دینا چاہتے ہو؟“ بزرگ نے سوال کیا۔

”نہیں، وہ مضبوط کردار کی مالک ہے۔“ جمال بولا۔
”اچھا تو پھر وہ تمہارے مال کی دشمن ہوگی یعنی تمہاری کمائی کو فضول میں اڑاتی ہوگی اور ساتھ ساتھ تمہارے والدین سے برا سلوک بھی کرتی ہوگی۔“ بزرگ نے کہا۔

”نہیں چاچا! ایسی بھی کوئی بات نہیں دراصل وہ میری چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں کا احترام بھی نہیں کرتی۔ بہت بے پروا اور انا پرست عورت ہے۔ میں دفتر سے آؤں تو اس کو پروا نہیں ہوتی۔ میں سر درد سے رڑھتا رہوں۔ اس کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ میرے گھر سے زیادہ اپنے باپ کے گھر رہتی ہے۔ تباہی میں اس کو طلاق نہ دوں تو کیا کروں۔ میری کسی بات، کسی احتجاج کا اس پر کوئی اثر تک نہیں ہوتا۔“ یہ کہہ کر جمال خاموش ہو گیا۔

کریم داد نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک سوال کیا۔
”کیا وہ خود بھی تم سے طلاق کی خواہش مند ہے؟“
”نہیں۔ وہ طلاق نہیں چاہتی، نہ ہی اس نے کبھی مطالبہ کیا ہے۔“ جمال نے جواب دیا۔

دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔
پھر اس خاموشی کو بزرگ نے توڑا۔ ”دوبارہ چائے کا موڈ ہے تو وہیں کینٹین پر چلتے ہیں۔ کینٹین کیا ہے بس پلیٹ فارم پر چھوٹا سا کاؤنٹر ہے۔“

اور وہ دونوں چائے پینے چل دیے۔ چائے پی کر واپس آئے تو کریم داد کی بیوی کسی تان کر سو رہی تھی۔ اس کے خراٹے کافی بلند آواز میں گونج رہے تھے۔ اس لمحے جمال کو وہ پرانے اسٹیم ریلوے انجن کی طرح محسوس ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ کریم داد جیسے خوب رو مرد نے ایک بد صورت اور زبان دراز عورت کے ساتھ زندگی کیسے بسر کر لی۔

”ٹائم کیا ہوا ہے؟“ کریم داد نے جمال سے سوال کیا۔
جمال نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا۔ ”گیارہ بجتے والے ہیں۔“ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد جمال نے پوچھا۔ ”آپ کی کتنی زمین ہے؟“

ضرورت تھی کسی غیر آدمی کو اپنے گھر دعوت دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”مجھے تو ذرا بھی غیر نہیں لگا۔ اپنا اپنا سا لگا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے پار دیکھنے لگا جہاں پر آس پاس کی عمارتوں کی روشنیاں پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ دو گھنٹے بعد وہ بہاولپور پہنچ گئے۔

☆☆☆

کریم داد کا گھر بہت خوب صورت تھا۔

یہاں اس کو سب نے یوں خوش آمدید کیا جیسے وہ اسی گھر کا فرد ہو۔ کریم داد نے اس کو اپنے ہی کمرے میں جگہ دے دی۔ جب وہ نیند سے جاگا تو اسے کریم داد جائے نماز پر نظر آیا جو اشراق کی نماز پڑھ رہا تھا۔ جمال اس کو بغور دیکھنے لگا۔ کریم داد بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ کافی دیر تک دعا مانگنے کے بعد وہ جمال کی طرف متوجہ ہوا۔

”جمال بیٹا نہالو پھر ناشا کرتے ہیں۔“ جمال اٹھ کر ہاتھ روم چلا گیا نہالنے کے بعد ناشا کیا اور سگریٹ سلکا کر اس کا دھواں فضا میں چھوڑنے لگا۔

”کافی بڑا گھر ہے۔“ جمال نے کریم داد کی طرف دیکھا۔

”ہاں چار کنال رقبے پر بنا ہوا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا شہباز تو کہتا ہے کہ شہر میں رہتے ہیں مگر جو مزہ دیہات میں ہے وہ شہر میں کہاں۔ ویسے بھی ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں یہاں پر ہیں۔ میرا اپنا بچپن اسی حویلی میں گزرا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ شادیاں کر لو پھر جہاں دل چاہے رہو۔“

”کتنے بیٹے ہیں آپ کے؟“ جمال نے سوال کیا۔

”تین بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ بڑا بیٹا سرفراز ہے جو کینیڈا میں رہتا ہے۔ وہاں پڑا کٹر ہے۔ اس سے چھوٹا جہانگیر ہے، اس نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔ بہاولپور کے ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اس کی چھٹیاں ٹیلیجنی جماعت والوں کے ساتھ گزرتی ہیں۔ تم اس کو دیکھو گے تو وہ تمہیں بالکل قرون وسطیٰ کے مسلمانوں جیسا لگے گا۔ سادہ لباس، سادہ غذا..... آج کل وہ اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے۔ سب سے چھوٹا شہباز ہے، میرے ساتھ ہی زمینداری کرتا ہے۔ بہت لائق بچے ہیں میرے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”آپ مجھے خود بھی کافی تعلیم یافتہ لگتے ہیں۔“ جمال نے سوال کیا۔

”میری کہاں جی اللہ کی زمین ہے بس آج کل میرے حصے میں ہے۔ اس سے پہلے میرے باپ کے پاس تھی۔ باپ سے پہلے دادا کے پاس اور میرے بعد میرے بیٹے وہیں پر اپنی ملکیت جتانے گئے پھر اس کے بیٹے۔ اصل میں تو یہ زمین ہے کسی کی بھی نہیں۔ ہم بس یونہی ساری عمر ملکیت کے خواب دیکھتے دیکھتے صرف چھ فٹ کی زمین میں جا کر سو جاتے ہیں، کبھی نہ جاگنے کے لیے۔“

”مجھے گاؤں کی لائف بہت پسند ہے۔“ جمال بولا۔

”گاؤں میں ابھی فطرت کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی ہے۔“ اس کی بات سن کر کریم داد نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور انتہائی خلوص و انکساری سے بولا۔

”تو پھر تم دو دن ہمارے مہمان بن کے رہو، تیسرے دن میں خود تمہیں اسی بزرگ کے مزار پر چھوڑ آؤں گا۔ تم سے مجھے اپنے بیٹے سرفراز کی خوشبو آتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ دو دن مزید تمہارے ساتھ گزریں۔“

”ٹھیک ہے جی! اگر اماں جی کو..... مطلب ہے کہ آپ کی بیوی کو اعتراض نہ ہو تو..... مجھے تو یہ بہت غصے والی لگتی ہیں۔ ورنہ تو دو دن آپ لوگوں کے ہمراہ بسر کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔“

”غصے کی تیز ہے۔ دل اس کا شیشے کی طرح ہے۔“ کریم داد محبت بھری نظر سے اپنی بیوی پر ڈالتے ہوئے بولا۔

جمال نے آنکھیں بند کر لیں اور ستون سے ٹیک لگالی۔

رات کے دو بج کر بیس منٹ پر ٹرین پہنچ گئی۔ کریم داد جاگ رہا تھا۔ اس نے سب کو جگایا اور سب گاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی چل پڑی۔ جمال آنکھیں موند کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر کریم داد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”میں نے کہا سرفراز کی ماں سو گئی ہو کیا؟“

”جاگ رہی ہوں، کیوں شور مچا رہے ہو؟“ وہ نیم وا آنکھوں سے بولی۔

”ذرا اس منڈے کو دکھ۔“ وہ سوئے ہوئے جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بالکل اپنے سرفراز جیسا ہے نا۔ وہی ناک نقشہ، بولتا بھی سرفراز کی طرح ہے۔ یہ بھی بہاولپور جا رہا ہے۔ گھر تو اس کا لاہور میں ہے۔ میں نے اس کو اپنے گھر میں دو تین دن رہنے کا کہا ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”تمہیں تو بہت شوق ہے مہمان پالنے کا۔ اب کیا

”میں نے ہسٹری میں ماسٹر ڈگری لی ہوئی ہے۔ بس

صدقہ بھی نہیں دیتے۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ جمال نے سوال کیا۔

”ہاں بیٹا پوچھو۔“ کریم داد نے جواب دیا۔

”کیا آپ اپنی بیوی سے خوش ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ بڑی لکھی بھی نہیں لگتی۔ ظاہری شخصیت بھی ایسی نہیں کہ کسی مرد کو متاثر کر سکے۔ کیا آپ کی شادی زبردستی ہوئی تھی؟“

جمال کی اس بات پر کریم داد نے قہقہہ لگایا۔

”اوپٹا! شادی کا فیصلہ آسمانوں پر ہوتا ہے۔

جوڑے تو میرا پروردگار بناتا ہے۔ اس نے بھی میرا جوڑا اس

کے ساتھ بنایا پھر میں اس کے فیصلے پر رونے پڑے والا اور

اس کو مسترد کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ اسی کا نام تسلیم و رضا

ہے کہ اپنے رب کے ہر فیصلے کو من و عن تسلیم کر لیا جائے۔

میرے دل نے بھی اس کو مسترد کر دیا تھا لیکن اپنے سلوک

اور اپنے الفاظ سے کبھی میں نے یہ احساس نہیں دلایا کہ تو

مجھے پسند نہیں ہے۔ بس گزار دی زندگی۔“ پھر اس نے ایک

طویل سانس لی اور اپنے ایک نوکر کو آواز دی۔

”جی صاحب جی۔“ نوکر قریب آ کر بولا۔

”شہباز کہاں ہے؟“ کریم داد نے سوال کیا۔

”وہ تو اپنے ایک دوست کے ساتھ بہاولنگر گئے ہیں

کہہ رہے تھے شام تک واپس آ جاؤں گا۔“

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ اب توجا۔“ نوکر واپس چلا گیا۔

”بڑا عجیب موسم ہے۔ دھوپ میں گرمی لگتی ہے اور

چھاؤں میں سردی۔ تو تھک تو نہیں گیا میری تقریروں

سے؟“ کریم داد جمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارے نہیں چاچا! میں کیوں تھکتے لگا۔ میں کوئی مل تو

نہیں چلا رہا۔“

کریم داد کھلکھلا کر ہنس دیا پھر جمال سے مخاطب

ہوا۔ ”ایک بات کروں، اگر تو مان جائے تو؟“

”ماننے والی ہوگی تو ضرور مانوں گا بولیں کیا بات

ہے؟“ جمال نے جواب دیا۔

”بیٹھ! وہ ایک چار پائی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے بولا جو کیکر کے درخت کے نیچے بچی ہوئی تھی۔ جمال

بیٹھ گیا۔

”اس موسم میں کیکر کے نیچے بیٹھا جاسکتا ہے۔ یہ بڑا

مفلس اور غریب درخت ہے۔ اس کی شاخوں کا رنگ بھی

کالا ہوتا ہے، اس پر پھل بھی نہیں آتا، اس کا سایہ بھی گھٹا

نہیں ہوتا۔ پرندوں کو بھی اس سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا۔

کڑوی پھلیاں اور کانٹے اس کا مقدر ہیں۔“ پھر اس نے

فروری 2017ء

جمال بیٹا! تعلیم ڈگریوں میں تو ہے نہیں، تعلیم کا تعلق تو اپنے اندر کی روشنی سے ہے۔ اندر روشنی ہے تو سمجھو تمہارے ذہن و دل پڑھے لکھے ہیں من میں اندھیرا ہے تو بڑی بڑی ڈگریاں بیکار ہیں۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔“

جمال اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کمرے سے نکل

گیا۔ سادہ انداز میں بنا ہوا یہ گھر اپنے مکینوں کی تعداد کے

لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ صحن بہت کشادہ تھا۔ ایک سائڈ پر لبا

سا برآمدہ تھا جہاں پر چھ سات بھینسیں اور گائیں کھڑی

تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے دو تین نوکر بھی موجود

تھے۔ ایک چھپر کے نیچے ٹریکٹر اور تھریش مشین موجود تھی۔

صحن میں ہر طرف بلند و بالا درخت لگے ہوئے تھے۔

”آپ نے درخت بہت زیادہ لگا رکھے ہیں۔“

جمال نے سوال کیا۔

”ہاں جمال بیٹا! میں نے واقعی بہت زیادہ درخت

لگائے ہیں۔ میری زمینوں پر بھی تمہیں بے تحاشا درخت نظر

آئیں گے۔“ کریم داد ایک جگہ پر رکتے ہوئے بولا۔ اس

نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ درخت بھی بڑے عجیب

ہوتے ہیں۔ سورج کی تپش کو اپنے اوپر لے کر زمین کو کیسی

ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتے ہیں، کیا جمال جو جون کی دوپہر

میں بھی ان کے سائے کی ٹھنڈک کم ہوتی ہو۔ گرمی کے

مارے ہوئے پرندے ان کی شاخوں پر جب سستانے کے

لیے بیٹھتے ہیں تو ان کی چھوٹی شاخیں کس طرح خوشی سے

جھومنے لگتی ہیں۔ ان کی چھاؤں سب کے لیے ایک جیسی

ہوتی ہے۔ جتنا طرف درخت میں ہوتا ہے اگر اتنا طرف کسی

انسان میں آجائے تو اس کی زندگی سنور جائے مگر انسان بڑا

کم طرف ہوتا ہے۔ ذرا سی تکلیف سے بلبلا اٹھتا ہے۔ ذرا

سی خوشی ملنے پر اپنے آپ میں نہیں رہتا۔“ پھر کریم داد

خاموش ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک بھینس کے قریب آیا اور اس کے

پٹھے پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگا۔ پھر وہ باری باری سب

بھینسوں اور گایوں کے قریب گیا اور سب کا حال

دریافت کیا۔

”کیا یہ آپ کی زبان سمجھ لیتی ہیں؟“ جمال نے

سوال کیا۔

”جمال بیٹا پیار کی زبان تو پتھر بھی سمجھتے ہیں یہ تو پھر

جانور ہے۔ پیار کی ضرورت ہر جاندار کو ہر وقت ہوتی ہے۔

پیار کیا ہے؟ بس دو بیٹھے بول ذرا مسکرا کر دیکھنا کوئی خرچ نہیں

آتا اس میں مگر ہم انسان مسکراہٹ اور دو بیٹھے بولوں کا

طویل سانس لی اور جمال کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”جمال بیٹا! تو ایک کام کر۔ تو اپنی بیوی کو ایک موقع اور دے۔ میرا خیال ہے اس کو کافی سزا مل چکی ہے۔ اس میں کوئی ایسا بڑا عیب نہیں ہے۔ تو بس اس کے لیے پھل دار اور گھٹا درخت بن جا۔ پھر دیکھ تیرے آنگن میں اللہ تعالیٰ کیسی کیسی نعمتیں اتارتا ہے۔ ضروری نہیں کہ نعمت صرف پیسے اور جائیداد کی شکل میں ہو۔ دل اور دماغ کا سچا اطمینان سب سے بڑی نعمت ہے۔ میں نے ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی کے پینتیس سال گزار دیے جو بیوی تو کیا نوکرانی بننے کے لائق بھی نہیں تھی۔ دیکھ میرے آنگن میں کیسی کیسی بہاریں اتری ہیں۔ ایسے ایسے کرم میرے رب نے کیے ہیں جو بتانے بیٹھوں تو شام ہو جائے۔ تو تو مجھے غیر مطمئن اور بے سکون لگا ہے۔ میرے خیال میں اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ اس کو طلاق دے دی جائے۔ تیری یہ بے اطمینانی بتاتی ہے کہ اس کو طلاق دینے کے لیے تیرا دل آمادہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ اتنا پرست ہوگی مگر تیری یہ خودداری بھی تو اتنا میں لپٹی ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کو چھوڑ کر تو ہمیشہ ناخوش رہے گا، چاہے ایک کیا چار بیویاں کیوں نہ لے آئے۔“

جمال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”چاچا! تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں اس کو چھوڑ کر خوش نہیں رہوں گا؟“

”ہا ہا ہا۔“ کریم داد ہنسا۔ ”بات یہ ہے کہ جس تعلق کو توڑنے کے لیے تو اللہ سے ہمت مانگتے اتنا لمبا سفر کر کے یہاں تک آیا ہے اس کا مطلب ہے کہ تیرا ضمیر ابھی جاگ رہا ہے اور صاحب ضمیر انسان اتنی سی بات پر گھر توڑنے کا فیصلہ کر لے اور اس پر عمل بھی کر لے تو ساری عمر اس کا ضمیر اس کو لعن طعن کرتا رہے گا۔ دراصل تو بھی دل میں یہ بات جانتا ہے کہ اس کی اتنی بڑی خطا نہیں جتنی اس کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے۔ جمال بیٹا! طلاق کی اجازت ضرور دی ہے میرے رب نے مگر اس کا حکم نہیں دیا۔ طلاق وہ مکروہ فعل ہے جس سے عرش کا نپ اٹھتا ہے۔ اس کے باوجود عدالتیں طلاقیں کے کیسوں سے بھری پڑی ہیں۔ معمولی باتوں پر بیوی خلع کے لیے عدالت پہنچ جاتی ہے اور گھر میں شوہر اپنا یہ اختیار استعمال کر کے اتنے قیمتی رشتے کو دھماکے کی طرح توڑ دیتا ہے۔ طلاق کے خواہش مند لوگ اگر اپنے معصوم بچوں کے جذبات سمجھ لیں تو کبھی طلاق کا سوچیں بھی نہیں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا، آس پاس کا جائزہ لیا۔

اور پھر بات شروع کر دی۔

”جمال بیٹا! آج میرے اس آنگن میں تجھے اللہ کی رحمتیں دکھائی دے رہی ہوں گی۔ میری دونوں بیٹیاں اپنے گھروں میں خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ تینوں بیٹے خوشحال ہیں اور میرے فرماں بردار بھی۔ اگر میں بیوی کو طلاق دے چکا ہوتا تو یہ سارے بچے آج نفسیاتی مریض ہوتے۔ میرے گھر میں میری پسند کی بیوی بھی آ جاتی مگر میرے دل کو وہ راحت و سکون نہ ملتا جو آج میسر ہے۔ میں صرف اللہ کی رضا کی خاطر اپنے دل کی خواہش کو روک کر کے بس اس گھنے درخت کے مانند اس آنگن میں چھاؤں بچھائے بیٹھا ہوں۔“

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ جمال نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

”آؤ چلتے ہیں بیٹا۔ میری تقریریں تو ختم ہوں گی نہیں۔“ کریم داد اٹھتے ہوئے بولا۔

اور جمال اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے میں آکر جمال بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ چاچا کریم داد نے آج اس کی بغض پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ سوچوں میں گم نہ جانے کتنی دیر تک جاگتا رہا پھر اس کو نیند آ گئی۔

اس کی آنکھ کسی کی پکار پر کھلی تھی۔ اس کے سامنے نوکر ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ جمال اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ جب باہر نکلا تو نوکر جاچکا تھا اور کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھیں۔ دیکھی گئی کی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ جمال کی بھوک چمک اٹھی۔

شام سے ذرا پہلے کریم داد اسے اپنی جیب میں بٹھا کر اپنی زمینوں پر لے گیا۔ کہیں پر گندم کی فصل تھی تو کہیں پر کوئی اور فصل سراسٹھائے کھڑی تھی۔ ہر طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے وہ واپس لوٹ آئے۔ رات کو بھی کافی دیر تک دونوں گپ شپ لگاتے رہے۔ اس دوران کریم داد نے اس کی نجی زندگی پر کوئی بات نہیں کی، بس اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتا رہا۔

پھر جمال نے ایک سوال کر دیا۔

”چاچا! آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ اس میں بھی تو کوئی حرج نہیں تھا۔“

”حرج تو تھا۔“ کریم داد بولا۔ ”طلاق کی طرح اس کی بھی اجازت ہے، حکم نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ دوسری شادی انسان خود اپنی خواہش سے نہیں کر سکتا۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آپ کو

دوسری شادی کرنی پڑ جاتی ہے۔ پھر رے دل میں بھی خواہش تھی کہ دوسری شادی کر لوں مگر اللہ... کو جب منظور ہی نہیں تھا تو میں کیسے کرتا۔“

”آپ کی باتیں بہت عجیب ہیں۔“ جمال بولا۔

”میں نے اپنی سینسٹھ سالہ زندگی میں جو دیکھا، جو محسوس کیا۔ وہ سب تجھے بیان کر دیا۔ اچھا اب تو آرام کر، وہ سامنے لی وی رکھا ہے۔ ریوٹ بھی اس کے قریب ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا جھجک فون کر دینا۔ صبح کی نماز کے لیے تجھے جگانے آ جاؤں نا؟“ کریم داد نے سوال کیا۔

جمال نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کریم داد بھی سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

بستر پر ڈھیر ہوتے ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر حنا نمودار ہو گئی۔ اس نے حنا کی یاد کو ہٹانا چاہا مگر وہ اور بھی شدت کے ساتھ براجمان ہو گئی۔ جمال نے ریوٹ اٹھایا اور لی وی آن کر دیا۔ مختلف چینل گھماتے گھماتے اس نے اسپورٹس چینل پر نظر س جمادیں۔ فٹ بال کا میچ لگا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میچ دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر اسے نیند آ گئی۔

صبح کی اذان کے ساتھ ہی وہ خود ہی بیدار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے کریم داد کھڑا تھا۔

”مسجد چلو گے یا یہیں نماز پڑھو گے؟“ کریم داد نے مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

”آپ اگر مسجد جا رہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔“ جمال نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر دونوں گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ باہر ہلکی ہلکی سردی تھی، درختوں پر پرندوں کی چچھاہٹ ماحول کو پاکیزہ بنا رہی تھی۔ ہوا کی ٹھکیوں سے درختوں کے پتے یوں سرسرا رہے تھے جیسے خوشی سے جھوم رہے ہوں۔ مسجد بہت سادہ سی تھی۔ نمازیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ دونوں نے نماز ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد دو تین لوگوں نے کریم داد سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھا پھر ایک سفید ریش جو کہ کریم داد سے زیادہ عمر کا تھا، کریم داد سے مخاطب ہوا۔

”بھائی کریمو آج پنچایت بلوائی ہے ہم لوگوں نے۔ اس میں تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔ آخری فیصلہ ہم تم پہ چھوڑیں گے۔“

”پنچایت کس لیے بلوائی ہے خیر تو ہے نا؟“ کریم داد نے تشویش ناک انداز میں سوال کیا۔

”وہ اپنا رحمت ہے نا رحمت آرائیں۔“ تجھے معلوم تو ہے کہ وہ سعادت بلوچ کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ سعادت بلوچ تو بہت بڑا زمین دار ہے، اس نے پنچایت بلوائی ہے۔ رحمت آرائیں نے اس کی بیٹی سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ آج کل وہ اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ سعادت بلوچ کہتا ہے کہ اس نے میری غیرت کو لٹکا رہا ہے، مجھے انصاف دیا جائے ورنہ میں رحمت آرائیں کو قتل کر ادوں گا۔ اسی سلسلے میں گاؤں کے بڑے آج میری جگہ پر بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ سفید ریش بزرگ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر دوسرا آدمی بولا۔

”گاؤں کی عزت تو سب کی سامجھی ہوتی ہے۔ ہم سب بہو بیٹیوں والے ہیں۔ اس رحمت آرائیں کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی کی بیٹی کو اس طرح نہ ورغلا سکے۔“ باقی لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ تقریباً تمام نمازی اب ان کے آس پاس جمع تھے اور جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق سب کچھ نہ کچھ رائے زنی کر رہے تھے۔ جمال بھی کریم داد کے قریب کھڑا تمام ماجرا دیکھ رہا تھا۔ پھر کریم داد گویا ہوا۔

”ٹھیک ہے فضل دین میں آج پہنچ جاؤں گا۔ کتنے بچے آنا ہے؟“

”عصر کی نماز کے بعد۔“ فضل دین نے جواب دیا۔ کریم داد آنے کا کہہ کر جمال کے ہمراہ مسجد سے نکل گیا۔

☆☆☆

چار بجتے ہی فضل دین کے ڈیرے پر گاؤں کے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ رحمت آرائیں کا بوڑھا باپ بھی کانپتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا آیا اور محن میں پچھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ باقی تمام لوگ بھی دیگر چار پائیوں پر براجمان ہو گئے۔ اکاڈکا لوگوں کی آمد ابھی جاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد سعادت بلوچ موٹھوں کو تاؤ دیتا ہوا آیا اور فضل دین کے قریب بیٹھ گیا۔ کریم داد جب جمال کے ہمراہ وہاں پہنچا تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ اور جمال فضل دین کے قریب رکھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے چھ سات بزرگوں کا رخ دیگر حاضرین کی طرف تھا۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو فضل دین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے پنچایت کی غرض و غایت پر روشنی ڈالنے کے بعد رحمت آرائیں کے خلاف باقاعدہ چارج شیٹ پیش کی اور سعادت بلوچ کے مطالبات بیان کرتے ہوئے کہا۔

”بھائیو ہم سب بہو بیٹیوں والے ہیں اور کسی کی بہن

بٹی پر غلط نگاہ ڈالنا جرم سمجھتے ہیں کیونکہ شریعت بھی یہی کچھ کہتی ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس گاؤں کے ایک نمک حرام رحمت آرائیں ولد شوکت آرائیں اپنے ہی گاؤں کے ایک معزز انسان کی بیٹی کو ورغلا کر لے گیا اور عدالت میں جا کر شادی کر لی اور آج اسی گاؤں میں رہنے کے لیے آ گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مکمل انصاف ہو۔ اس سلسلے میں انصاف کا حق چودھری سعادت بلوچ ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنے دو مطالبات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک مطالبہ لازمی پورا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت میں یہ ذاتی طور پر رحمت آرائیں سے بدلہ لینے کا مجاز ہوگا۔ دونوں مطالبات یہ ہیں۔ رحمت آرائیں ولد شوکت آرائیں پر لازم ہے کہ وہ ہر جانے کے طور پر مبلغ میں لاکھ روپے سعادت بلوچ کو ادا کریں۔ اگر یہ بھی نہیں مانتے تو دوسری صورت میں شوکت آرائیں اپنی بیٹی چودھری سعادت بلوچ کے نکاح میں دے گا۔ پھر فضل دین روئے سخن چودھری سعادت بلوچ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”کیوں سعادت بلوچ! تیرے یہی مطالبات ہیں نا؟“ چودھری نے جواب میں ہاتھ اٹھا کر اس کی تائید کی۔

حاضرین میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ شوکت آرائیں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ فضل دین کریم داد سے مخاطب ہوا۔ ”بھائی کریم داد! تم گاؤں کے محوزین میں شمار ہوتے ہو، پہلے بھی کئی فیصلے تم کر چکے ہو۔ ہم چودھری سعادت بلوچ کے ان مطالبات کو تمہارے سامنے رکھتے ہیں پھر جو تمہارا فیصلہ ہوگا ہمیں قبول ہوگا۔“

کریم داد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اس لمحے اس کی آنکھوں میں گاؤں کی کسی بھی مسجد جیسا تقدس موجود تھا۔ اس نے کھٹکھار کے گلا صاف کیا اور حاضرین کی طرف متوجہ ہوا۔ تمام حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا، صرف چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دے رہی تھی جو محن میں موجود درختوں پر بیٹھی ہوئی اس تمام کارروائی سے بے خبر اپنے ہی کاموں میں مصروف تھیں۔ کریم داد سلام کر کے گویا ہوا۔

”میرے بھائیو دوستو اور بزرگو! میں چودھری سعادت بلوچ کی بلوائی گئی اس پنچایت میں فضل دین اور دیگر بزرگوں کے کہنے پر شامل ہوا ہوں۔ انہوں نے سارا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ میں جو فیصلہ کروں گا وہ سب کو قبول ہوگا نا؟“ تمام لوگوں نے یک زبان ہو کر ہاں میں جواب دیا۔ اس نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

”چادر اور چادر یواری کا تقدس ہم سب کو عزیز ہے۔ چودھری سعادت بلوچ کی بیٹی میری بیٹی ہے، سارے گاؤں کی بیٹی ہے۔ اس نے گھر کی چادر یواری کو پھلانگا اور رحمت آرائیں نے اس سے عدالت میں جا کر شادی کر لی۔ یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ اب میں ایک سوال آپ سب لوگوں کی موجودگی میں چودھری سعادت بلوچ سے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مجھے جواب دے کہ اس کے بزرگوں نے اپنے مزارعین کی کتنی ہی بیٹیوں کی آبرو کو پامال کیا۔ اس مکروہ کھیل میں اس کے دادا پر داد بھی شامل تھے۔ یہ جس مزارع کی بیٹی کو اپنے ڈیرے پر کام کاج کے بہانے بلاتے تھے، اس کے ساتھ ان کی حویلیوں میں کیا کچھ ہوتا تھا اس کے گواہ آج بھی وہی درو دیوار ہیں۔ گاؤں کے مزارعین کی مسکین بیٹیاں کئی کئی ہفتوں تک پامال ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت تو کوئی پنچایت بلانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک زمیندار کی عزت پر حرف آیا تو فرد جرم بھی عائد ہو گئی اور غیر شرعی مطالبات بھی رکھ دیے گئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو ہوا برا ہوا، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سعادت بلوچ تمہاری نو جوانی کیسی گزری، اس کے گواہ آج بھی سفید ڈاڑھی کے ساتھ یہاں موجود ہوں گے۔ قدرت کے کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم مکافات عمل کہتے ہیں۔ یعنی جو تم دوسروں کے ساتھ کرو گے وہی تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ دونوں بچوں سے غلطی ہوئی مگر نکاح کے بعد انہوں نے کافی حد تک اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا۔ رحمت آرائیں اور اس کا باپ معمولی زمیندار ہیں۔ وہ اتنی بڑی قیمت ادا نہیں کر سکتے اور اس سارے معاملے میں شوکت آرائیں کی محصور بیٹی کا کیا قصور جو بدلے میں ایک ساٹھ سالہ آدمی سے بیاہ دی جائے۔ میں شوکت آرائیں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹے کو بلائے اور وہ سب کے سامنے اپنی غلطی پر معافی مانگے گا۔ اس کے بعد اس کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ نہ تو ہر جانے میں بیس لاکھ دیے جائیں گے اور نہ ہی لڑکی کا نکاح چودھری سعادت بلوچ سے ہوگا۔ رحمت آرائیں کی معافی کے بعد بھی اگر چودھری سعادت بلوچ نے اس کو نقصان پہنچایا تو میں کریم داد ولد فضل داد بذات خود تھانے میں جا کر اس کی ایف آئی آر کٹاؤں گا۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے، آؤ بحال چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر کریم داد حاضرین کو سلام کر کے واپس لوٹ گیا۔ تمام لوگ طے چلے تبصروں کے ساتھ اس کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ شوکت آرائیں کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں اور چودھری سعادت بلوچ پر گویا سکتہ طاری تھا۔

کریم داد اور جمال واپسی پر بالکل خاموش رہے۔ جمال اس دلیرانہ فیصلے پر دل ہی دل میں بے حد حیران تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دونوں کمرے میں آگئے۔ کریم داد ہنوز خاموش تھا پھر جمال دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

”چاچا! آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر کے چودھری سعادت بلوچ سے دسٹی مول نہیں لی کیا؟ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

کریم داد ہنس پڑا۔ ”پتر جمال..... سعادت بلوچ کو میں بچپن سے جانتا ہوں، اس کا کردار کبھی صاف نہیں رہا۔ جن بچوں کے ماں باپ ہی اچھے کردار کے نہ ہوں تو ان بچوں کو بھٹکنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ غیرت مند ہوتا تو اس کا کردار صاف ہوتا اور غیرت سے عاری انسان فطرتاً بزدل ہوتا ہے یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں اگر قدرت کی طرف سے کوئی نقصان لکھا ہے تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔“

جمال کی آنکھوں میں عقیدت کا دریا اٹھ آیا تھا۔ اس مرد قلندر کی کسی بات کو رد کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔

”چاچا! آج میرا واپسی کا ارادہ ہے۔ یقین کریں دل تو نہیں کرتا کہ یہاں سے جاؤں مگر ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے واپسی کے لیے دل بے قرار سا ہے۔“

”اس بزرگ کے حزار پر نہیں جاؤ گے کیا جس کے لیے اتنا سفر کر کے آئے ہو؟“ کریم داد نے سوال کیا۔

”اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔“ جمال اس کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے ساتھ گزرے ہوئے چار دن مجھے بہت کچھ سکھائے ہیں۔ آپ کے قول اور فعل کی یکسانیت مجھے اپنے بہت سے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے میں مدد دے گی۔“

”آج مت جاؤ کل سویرے نکل جانا۔“ کریم داد نے کہا تو جمال مسکرا دیا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد جمال نے اپنا بیگ سنبھالا اور فون کر کے کریم داد کو اپنے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے کمرے میں آگیا۔ ”بس روائی ہے؟“ کریم داد نے اس کے بیگ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں چاچا بس اب چلنا ہے۔ میں گاہے بگاہے آتا رہوں گا اور آپ کو لاہور آنے کی اپیل دے رہا ہوں۔ یہ لیس میرا کارڈ..... اس پر میرے گھر کا ایڈریس بھی ہے اور دفتر کا بھی۔ مجھے آپ کی میزبانی پر واقعی دلی خوشی

ہوگی۔“

کریم داد نے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”میں تجھے اڈے تک چھوڑ آتا ہوں۔“ کریم داد اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”نہیں، چاچا! آپ یہیں بیٹھیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ ہر بات آپ کی مانتا آیا ہوں، آپ میری بات مان لیں۔“

کریم داد مسکرا کر رہ گیا پھر وہ اس کو دروازے تک چھوڑنے آیا۔ دروازے پر جمال نے اس سے بغل گیر ہونے کے بعد غم آلود آنکھوں سے اس کو دیکھا اور گویا ہوا۔

”میں آپ کا منتظر رہوں گا۔“

”میں ضرور آؤں گا اور میرے گھر کے دروازے بھی تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ کسی نیک ماں کے بیٹے نکتے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اگلی بار اپنی اسی بیوی کے ساتھ آؤ جس کو چھوڑنے کی ہمت تم میں آج بھی نہیں ہے..... اور ہاں آخری بات سن لو۔ قدرت کے فیصلوں کا انتظار خاموشی سے کرو گے تو ہر فیصلہ تمہارے حق میں آئے گا۔ اپنی ذات کو اس چھپر کی طرح بنا لو جو اپنے اوپر دھوپ کی شدت برداشت کر کے اوروں کو چھاؤں فراہم کرتا ہے، پھر دیکھ لینا کہ تمہارے نصیب میں کیسی کیسی راحتیں آتی ہیں۔“

جمال نے کریم داد سے ہاتھ ملایا اور پکی سڑک کی طرف چلنے لگا جس کے بارے میں کریم داد اس کو بتا چکا تھا۔ تارکول سے بنی یہ تنگ سی سڑک مختلف دیہاتوں کو آپس میں ملانے کے بعد بڑی سڑک سے منسلک ہو جاتی تھی جو ملتان کی طرف جاتی تھی۔ وہ دس بجے کے قریب ملتان پہنچ گیا پھر وہاں سے لاہری پریشہ کر لاہور روانہ ہو گیا جو اس کی منزل تھی۔

☆☆☆

حتا کو جمال سے جدا ہوئے تین ماہ بیت چکے تھے۔ اس دوران دل کی شدید خواہش کے باوجود اس نے حتا سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ موبائل فون کی ہر گھنٹی پر دعا کرتا تھا کہ کاش یہ حتا کا فون ہو اور وہ اس طویل جدائی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہو مگر ایک بار بھی حتا نے رابطہ نہ کیا اور نہ ہی جمال نے کوئی پیغام بھیجا جبکہ اس کی دل کی شدت سے خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حتا سے رابطہ ہو جائے۔ وہ اپنے سینے پر مبر کی بھاری اینٹ رکھ کر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر چکا تھا۔ ماں سے اس نے پھر اپنے رشتے کی بات نہیں کی۔ وہ اگر بات چھیڑ دیتی تو یہ کہہ کر خاموش کر دیتا کہ ابھی میں دوسری شادی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اپنا شہر والا گھر اس نے کرائے پر دے دیا تھا۔ اب وہ مستقل طور پر ماں

”ارے کچھ سنا تم نے؟“

”کیوں، کیا ہوا؟“

”اسلم مر گیا!“

”کون اسلم؟“

”ارے وہی جو لنڈے بازار میں کندھے پر

کوٹ ڈال کر بیٹھا کرتا تھا۔“

”ارے کیسے مرا؟“

”رات سردی سے!“

بات تو سچ ہے

ایک بچے کی ادھی چھت پر بیٹھی ایک چڑیا نے دوسری چڑیا سے کہا۔ ”انسان کتنا فضول خرچ ہے۔ اتنی رقم خرچ کر کے چھت اور عمارتیں بناتا ہے اور چلتا فرش پر ہے۔“

”بلاوا“

میاں بیوی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔

”میں جا کر دیکھتا ہوں۔“ خاوند باہر کی طرف

لپکا اور دروازے کے اندر سے پوچھا۔ ”کون؟“

دروازے کے دوسری طرف سے آواز آئی۔

”موت کا فرشتہ!“

خاوند اگلے قدموں واپس آگیا۔ ”بیگم تمہیں

بلا رہے ہیں۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

اس کے قریب آیا۔

”خیر تو ہے، کیوں منہ پھولا ہوا ہے تمہارا؟“

”اپنی ماں اور بہن سے جا کے پوچھو جنہوں نے ایک

تو میرا قیمتی کپ توڑ دیا اوپر سے مجھے ہی برا بھلا کہنے

لگیں۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ندیم فوراً کمرے سے نکلا

اور ماں کے سر پر پہنچ گیا۔

”امی! عنبرین رو رہی ہے آپ کو کچھ احساس کرنا

چاہیے۔ وہ نئی ٹوپی دہن ہے، کیا سوچے گی کہ کیسے لوگوں

سے پالا پڑ گیا ہے۔“

ماں نے حیرت سے بدلے بدلے لہجے والے ندیم کو

دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”واہ جی واہ ابھی سے بیوی کی

پوجا پاٹ شروع ہو گئی۔ اپنی بیوی سے بھی پوچھو کہ وہ حنا سے

کیوں بد تمیزی کر رہی تھی۔ معمولی کپ تھا ٹوٹ گیا۔“

”ایک کام کریں امی جان! آپ پلیز حنا کو اپنے گھر

کے پاس مقیم تھا۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر۔ گھر آتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ ماں کے سامنے وہ خود کو خوش باش ثابت کرنے کے لیے خوش گپیاں کرتا رہتا تھا مگر جانتا تھا کہ آنکھوں اور الفاظ کی آپس میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ ماں بھی اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کرتی تھی جس کا جمال کو بخوبی اندازہ تھا مگر اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کو ٹھیک کرنا اس کے بس میں نہیں تھا اس کی سوچوں کے تمام راستے حنا پر جا کر ختم ہو جاتے تھے۔ ٹی وی کے ہر چینل پر حنا کا وجود لہراتا تھا۔ سردراتوں میں ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے کواڑ بجتے تو اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے حنا پائل پہنے کہیں آس پاس موجود ہے۔

☆☆☆

حنا کے بھائی کی شادی ہو گئی۔ نئی ٹوپی بھابی نے گھر میں قدم رکھا تو گھر کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ حنا نے بھی کسی پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ وہ صبح کو جاتی اور دوپہر کو واپس آ کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ایک دن وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی کہ اس کی بھابی کے جھینر کا کوئی برتن اس کے ہاتھ سے گر کے ٹوٹ گیا۔ بھابی نے جو نئی ٹوٹنے کی آواز سنی وہ فوراً کچن کی طرف بھاگی۔ اس کے سامنے چائے کا کپ کرچی کرچی پڑا تھا جسے حنا سمیٹ رہی تھی۔ بھابی فوراً اس کے سر پر پہنچ گئی۔

”حنا! تم بچی تو نہیں ہو جو تم سے میرے ٹی سیٹ کا قیمتی

کپ ٹوٹ گیا۔“ عنبرین اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”بھابی! میں نے جان بوجھ کے تو نہیں توڑا۔“ حنا

نے صفائی پیش کی۔

”صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ

میرے جھینر کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، سن لیا تم نے۔“

عنبرین نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کی مگر قریب سے

گزر رہی ہوئی حنا کی ماں نے یہ بات سن لی۔

”کیا ہوا؟“ ماں نے حنا سے سوال کیا۔

”امی ان کا ایک معمولی سا کپ میرے ہاتھ سے گر

کر ٹوٹ گیا ہے جس پر یہ خفا ہو گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر حنا

رو پڑی۔

”بھو! بھول چوک میں تو بڑے بڑے نقصان ہو

جاتے ہیں دل بڑا رکھنا چاہیے انسان کو۔“ ماں کی طنز میں

ڈوبی ہوئی بات عنبرین کو پسند نہیں آئی اور وہ کچن سے نکل کر

اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ قریب میں ندیم اخبار پڑھ

رہا تھا۔ اس نے دو تین بار اخبار پھا کر عنبرین کو دیکھا پھر وہ

بھیجیں شادی شدہ بہن ملنے آئے تو ٹھیک ہے یوں میکے میں جم کر بیٹھ جانا اور اوپر سے سینہ زوری کرنا کہاں کا انصاف ہے۔“

حنا اندر داخل ہوئی۔

”ندیم! اس کل کی چھوکری نے تم پر ایسا جادو کر دیا کہ آج تم اپنی ماں سے بدتمیزی کر رہے ہو۔ شرم آتی چاہیے تمہیں۔ بہن کا وجود بھی تمہیں کھلنے لگا ہے۔“

”رہنے دو حنا۔“ ندیم نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”تم اگر اتنی اچھی ہو تیں تو اپنا گھر آباد کر لیا ہوتا۔“

حنا اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گئی۔ ندیم خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس دن کے بعد اس گھر میں دو گروپ بن گئے۔ بہن بھائی کی بول چال بند ہو گئی۔ ندیم اپنی ماں سے بھی کم بولتا تھا، زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا جہاں سے ان کے خواہشوار قہقہے ماں کو اپنی بیٹی کی بربادی کا گویا احساس سا دلاتے رہتے تھے۔

آہستہ آہستہ عنبرین کے اخلاق اور خوش مزاجی کے رنگ پھیکے پڑتے گئے اور دو تین ماہ بعد اس نے باقاعدہ ندیم پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اس گھر میں خوش نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ دونوں ماں بیٹیاں اس پر تعویذ گنڈے کرتی ہیں تاکہ میرے اور آپ کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں۔ ایک دن کھانے کی ٹیبل پر ندیم نے عنبرین کے دل کی بات کر دی۔

”امی! ایک بات کہوں آپ سے؟“

”ہاں کہو۔“ ماں نے جواب دیا۔

”حنا کب تک یہاں رہے گی؟ آج چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ نہ تو خدا نخواستہ یہ بیوہ ہے، نہ اس کو طلاق ہوئی ہے۔ پھر اس کا یہاں رہنا کچھ عجیب سا نہیں ہے؟“

حنا کے ہاتھ رک گئے۔ ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب تم اس سوال کا جواب دو مگر وہ مزے سے کھانے میں مصروف تھا۔

”سنا آپ نے؟“ وہ بول پڑی۔ ”آج اس کو ایک بہن کا وجود کھٹک رہا ہے کیونکہ اس کی بیگم حنا کو پسند نہیں کرتی۔“ مگر حنا کے باپ نے سنی ان سنی کر دی۔ حنا نے کھا جانے والی نظروں سے بھابی کی طرف دیکھا پھر اطمینان سے بولی۔

”میں اپنے باپ کے گھر میں رہتی ہوں کسی میں ہمت نہیں ہے جو مجھے یہاں سے نکالے۔ جس کو میرا چہرہ پسند نہیں

ہے، وہ کہیں اور جا کے رہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عنبرین نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے اور توڑا ہوا نوالہ واپس رکھ کر پاؤں پگھلتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ ندیم نے بھی کھانا ادھورا چھوڑا اور وہاں سے چلا گیا۔ ایک کپ کے ٹوٹنے سے دل ٹوٹنے کا ایک لائق ہی سلسلہ چل نکلا تھا اور پھر اپنی تلخیوں کے بیج ندیم کی شادی کو دس ماہ ہو گئے۔ اب اس نے باقاعدہ علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عنبرین کے باپ کا ایک چھوٹا سا گھر جو عنبرین کے نام تھا انہوں نے اسی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس کا اعلان کرنا ندیم کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ حنا کا باپ جیسے اس تمام معاملے سے الگ تھلگ تھا ماں کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے گروپ میں شامل کر لیا جائے۔ ایک دن ندیم کی ماں نے اپنے خاوند سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

ندیم کے ایورٹائرمنٹ کے بعد اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہے تھے۔ ایک رات وہ اسٹور سے واپس آئے تو ان کی بیوی چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کپ سائنڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

حنا کے ابو نے بیوی کو حیرت سے دیکھا پھر چائے کے کپ پر نظر ڈالی۔

”خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ انہوں نے سوال کیا۔

”کیا مطلب ہے..... میں آپ کو چائے نہیں پلا سکتی؟“ بیوی نے جواب دیا۔

”آج کئی سالوں کے بعد کیسے خیال آ گیا؟ کیا کوئی فرمائش کرنی ہے یا..... اچھا۔“ انہوں نے اچھا کولبا کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے گروپ میں شامل کرنا چاہتی ہو۔“

”طنز مت کریں، میں پہلے ہی بہت افسردہ ہوں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

”افسردہ ہوں تمہارے دشمن، یہ بتاؤ چاہتی کیا ہو؟“ انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ندیم کے تیور بالکل بدلے بدلے سے ہیں شادی کے بعد تو وہ بالکل بدل گیا ہے۔ میری طرف دیکھتا تک نہیں، بس بیوی کے اشاروں پہ چلتا ہے۔ مجھے تو شک سا ہو رہا ہے کہ وہ کہیں ہمیں چھوڑ کر چلا نہ جائے۔“ یہ کہہ کر وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

”ہاں بھئی یہ تو تم پر بڑا ظلم ہوگا اگر اس کی بیوی اسے

اپنی دلی خواہش کا اظہار کرنے آئی ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرا فرماں بردار بیٹا انکار نہیں کرے گا۔“

”جی فرمائیے اماں۔“ وہ ہمدن گوش ہو گیا۔

”مجھ سے تمہارا دکھ اب برداشت نہیں ہوتا۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ سانسوں کا کیا اعتبار۔ بوڑھی ہوں، بیمار بھی ہوں، کوئی بھی لمحہ مجھے۔۔۔۔۔“

”بس بس اماں! آگے کچھ مت کہیے اور جہاں تک آپ کی خواہش کی بات ہے تو آپ اپنی خواہش پوری کیجیے۔ آپ میرے لیے جو بھی لڑکی پسند کریں گی، میں انکار نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک مردہ سی مسکراہٹ اپنے

چہرے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

”اللہ تمہیں خوش رکھے بس میں تمہارے منہ سے یہی سنتا چاہتی تھی۔“ ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ ان کی بڑی بہو حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”امی بات سنئے۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے بولی۔

”کیا بات ہے؟“ ماں اٹھتے ہوئے بولی۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر وہ اسے لے کر کمرے سے نکل گئی۔

”حمیدہ! کیا بات ہے، خیر تو ہے نا۔“ اس نے سوال کیا۔

”جی سب خیریت ہے۔ کوئی خاص مہمان اپنے بورے بستر سمیت آیا ہے بلکہ آئی ہے، آپ کے کمرے میں ہے۔“

یہ سنتے ہی جمال کی ماں اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے بیڈ پر حنا بیٹھی تھی، قریب ہی اس کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی حنا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور آگے بڑھ کر پہلے ان کے پاؤں چھوئے پھر سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

”کیا لینے آئی ہو؟“ ماں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”کیا کوئی کسریا رہ گئی ہے؟“

”بس آپ مجھے معاف کر دیں۔“ حنا نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں تجھے اس وقت تک معاف نہیں کر سکتی جب تک جمال تجھے معاف نہیں کرے گا۔“ ماں نے جواب دیا۔

”وہ آپ کا فرماں بردار بیٹا ہے آپ سفارش کریں گی تو وہ معاف کر دے گا۔“

”میں سچ میں نہیں پڑتی۔ وہ سامنے اس کا کراہے، خود

اس سے بات کر لے۔۔۔۔۔ جا۔“ ماں نے بے رخی سے کہا۔

”مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ آپ میرے ساتھ

چلیں۔“ حنا بے قراری سے بولی۔

لے کر اپنے میکے چلی جائے سچ سچ سچ۔“ یہ کہہ کر وہ چائے پینے لگے۔

”آپ کو تو ذرا بھی افسوس نہیں ہے، اس وقت بھی

آپ کے چہرے پر طمانیت ہے۔ میرے اندر جھانک کر

دیکھیں میرا دل کرجی کرجی ہو رہا ہے۔“

”بیگم کوئی مسئلہ نہیں، تم نے اپنی شادی شدہ بیٹی کو

اپنے گھر بٹھا رکھا ہے۔ ہماری بہو کی ماں بھی یہی کرنے

جارہی ہے۔ اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟“

”آپ کیا چاہتے ہیں، کیا میں اپنی بیٹی کو واپس بھیج

دوں؟“ بیوی نے سوال کیا۔

”ہاں، اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے گناہ کی تلافی

ہو جائے۔ اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی میں تمہاری بار بار کی

مداخلت کے باعث آج وہ اجڑ کے رہ گئی ہے۔ جس طرح تم

حتا کی زندگی میں بربادی لے کر آئی ہو، اسی طرح روزانہ کی

ٹیلی فون کالز جو کہ عنبرین کی ماں کرتی ہے اس کی زندگی میں

تباہی لے کر آنے والی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ بہو اگر حنا

کو برداشت نہیں کر رہی تو حنا کو اپنے گھر واپس بھیج دو اور

اسے پرانی عورتوں کی طرح نصیحت کرو کہ اب اس گھر سے

تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا۔ کمال ہے بار! ہماری دادی نانی نے

اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی مگر کس طرح اپنے اپنے

گھروں کو آباد کرتی تھیں۔ آج کی تم جیسی پڑھی لکھی ماؤں

نے روزانہ موبائل فون پر بیٹی سے بات کر کر کے اپنی بیٹی کو

نہ میکے کا رہنے دیا، نہ سسرال کا۔“ یہ کہہ کر وہ چائے پینے

میں مشغول ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ کچھ دیر سوچوں میں گم رہی پھر

کمرے سے نکل گئی لیکن اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ

بیٹے کو ہاتھ سے نکلنے سے بچانے کے لیے حنا کو واپس بھیجنا

ضروری ہے۔

☆☆☆

ایک اور دبیر جمال کے آگن میں دستک دے رہا تھا۔

حنا کو گھر چھوڑے پورا سال ہو چکا تھا۔ اس دوران

ان دونوں کا کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ماورا سے بھی جمال

کا رابطہ نہیں تھا ورنہ وہ اس کو حنا کے بارے میں ضرور بتا

دیتی کہ وہ کس حال میں ہے۔

وہ ایک اداس شام تھی۔ جمال اپنے کمرے میں بیٹھا

ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

”آئیے بیٹھے ماں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”جیتے رہو۔۔۔۔۔ اماں سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے

گویا ہوئی۔“ میں تم سے کچھ کہنے آئی ہوں بلکہ یوں سمجھ کہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”نہ بابائے..... ابھی میں اس کو دوسری شادی کے لیے راضی کر کے آئی اور اب تجھے لے کر پہنچ جاؤں..... اگر اس کی نظر میں تیرا قصور قابل معافی ہوا تو وہ معاف کر دے گا ورنہ تیرے لیے تیری ماں کا گھر پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔“

”اب وہاں میری جگہ نہیں رہی امی جان۔“ حنا رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تو نے اس کے صبر کو بہت آزمایا ہے حنا..... تو خود جا اور اس سے بات کر۔“ یہ کہہ کر ماں اپنے بستر پر دراز ہو گئی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

حنا لڑکھڑاتے قدموں سے جمال کے کمرے کی طرف بڑھی، اندر داخل ہو کر اس نے کھٹکھار کے اپنی آمد کا احساس دلایا۔ جمال نے چونک کر اس کو دیکھا۔ محبت اور نفرت کی ملی جلی کیفیت اس کے دل میں بیدار ہوئی پھر اس نے حنا کو نظر انداز کر دیا اور ٹی وی اسکرین پر نظریں جمادیں۔

”جمال! میں ہر چودھویں رات کو چھت پر چاند دیکھنے جاتی تھی۔ اس امید پر کہ شاید تمہاری نظریں بھی اس سے چاند پر ہوں گی..... میں نے ہر پل، ہر لمحہ تمہاری یادوں میں بسر کیا ہے۔ میں نے ایک سال تک تم سے رابطہ نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے تمہیں یاد نہیں کیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک سال تک تم مجھے یاد کرتے رہے مگر ایک ٹیکسٹ میسج تک نہیں کیا۔ میری طرف دیکھو جمال۔ میں نے اپنے اندر کی انا پرست عورت کو چل دیا ہے۔“ پھر وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ جمال نے پہلی بار اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے اندر کی شکستگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے تھے۔ اس وقت وہ سراپا انکسار بن کے کھڑی تھی۔

”بیٹھو۔“ جمال نے اس کو اپنے قریب بیٹھنے کو کہا تو حنا تیزی سے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک صاف طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

جمال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور گویا ہوا۔

”میرے مرشد نے کہا تھا کہ قدرت کی ہر قسم ظریفی پر خاموشی کی مہر لگا دو۔ کسی سے اپنے دکھ کا اظہار مت کرو پھر دیکھنا کہ قدرت کس طرح سارے فیصلے تمہارے حق میں کرتی ہے۔ کتنا بڑا سچ کہا تھا اس نے۔ تمہارے لہجے کی سچائی بتا رہی ہے کہ تم واقعی بدل گئی ہو۔“

”یہ مرشد کب سے رکھنے شروع کر دیے تم نے؟“ حنا ہنستے ہوئے بولی۔

”مرشد رکھے نہیں جاتے، تقویٰ فیض کیے جاتے ہیں۔“

”تو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ حنا نے سوال کیا۔

”میری بات چھوڑو، میں تو ہر رات تمہارے انتظار میں گزارتا تھا۔ اگر اماں تمہیں معاف کر دیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرے گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں۔“

”میں انہیں منالوں گی۔“

”اسی گھر میں رہنا ہوگا۔“

”رہوں گی۔“

”میری ماں کو کوئی دکھ یا تکلیف نہیں پہنچاؤ گی کیونکہ وہ پہلے ہی میرے حوالے سے صدمات جھیل چکی ہیں۔“

”میں بیٹی سے بڑھ کر ان کی خدمت کروں گی! انشاء اللہ ان کے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔“ حنا نے جواب دیا۔

”میں نے شہر والا گھر کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اب تم کو اسی گھر میں رہنا پڑے گا۔ رہ لو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے مختصر مگر دل کی گہرائیوں سے جواب دیا۔

”اماں کو منا لو، انہوں نے میری زندگی پر کڑھتے کڑھتے بہت سی بیماریوں کو سینے سے لگایا ہے۔ وہ مان جائیں تو ایک کپ چائے بنا کر لے آنا۔“ یہ کہہ کر جمال نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا ہی تھا کہ حنا نے سگریٹ اور ڈبیا چھین کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

”آج سے سگریٹ ختم بس..... میں تم پر یہ پابندی تو ضرور لگا سکتی ہوں نا۔؟ تمہیں اس ڈبیا پر کینسر زدہ سگریٹ نوش کی تصویر سے ڈر بھی نہیں لگتا۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں امی کو مناتی ہوں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ایک منٹ میں مان جائیں گی۔“

”سنو۔“ جمال نے اس کو پکارا۔

”جی۔“ اس نے مڑ کر جواب دیا۔

”تمہارے روٹھ کر جانے سے ایک دن پہلے میں پر پل کلر کی لپ اسٹک لایا تھا۔ تمہیں دے نہ سکا۔ وہ سامنے الماری کے اوپر والے خانے میں رکھی ہے، لگا لینا..... تمہیں تو شاید اب بھی یہ کہنے میں مشکل ہے کہ..... آئی لو یو۔“

”جمال.....“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور پلٹ کر جمال کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اس لمحے اس کی غم آلود آنکھوں میں دھنک کے سارے رنگ آن بے تھے۔